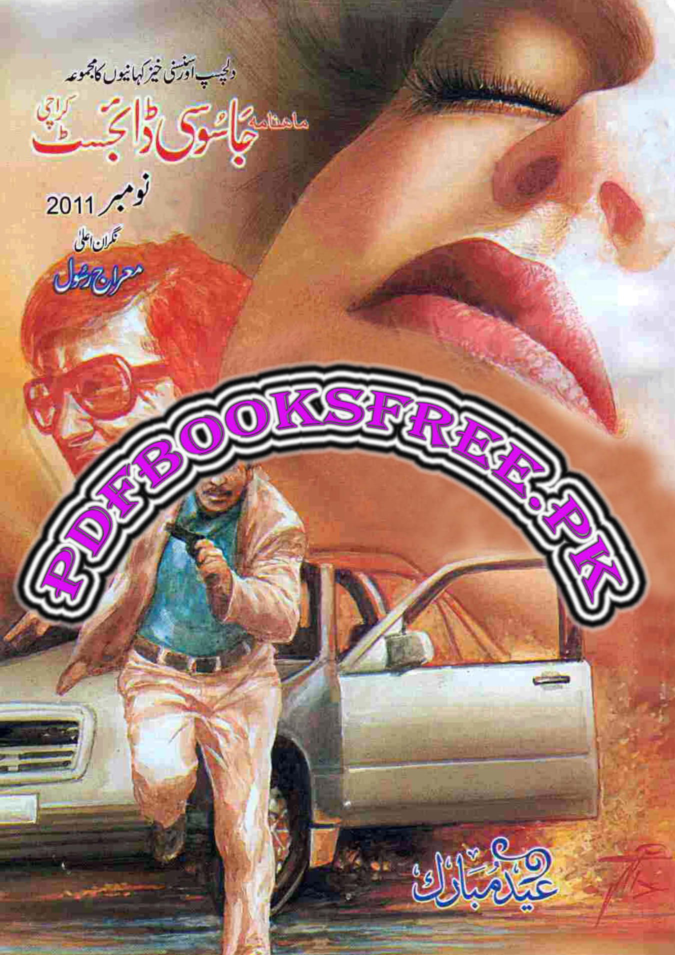
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
نومبر 2011
نگران اعلیٰ
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK
عید مبارک

جاسوسی ڈائجسٹ

12 — چینی نکتہ چینی — مدیرِ اعلیٰ

قارئین کی گرما گرم فرمائیاں کچھ ادائیں نامہ و پیام محبتیں عنایتیں اور [illegible]

18 — گھر کا چراغ — ایچ اقبال

انسانی سرشت میں پنہاں لالچ و طمع کے ان دیکھے سمندر کا مدوجزر

63 — انعام — تنویر ریاض

ایک لڑکی کی چالاکی و عیاری جو اپنے مخصوص ہدف تک جا پہنچی تھی

73 — سودا — بابر نعیم

قانون اور قانون شکن افراد کے مابین طے پانے والے انوکھے سودے کا احوال

83 — بے باق — سلیم انور

ازدواجی زندگی کے شوخ رنگوں کو پھیکا کر دینے والے عنصر کا تماشائے عبرت

88 — للکار — طاہر جاوید مغل

محبت کے محاذ پر بکھرے ہوئے شخص کی جدوجہد اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

131 — وفادار — مریم کے خان

ایک کتے کی وفاداری جو اپنے مالکان کی محبتوں کا حق ادا کرنا چاہتا تھا

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

143 — انتقام — مختار آزاد

نئے راستے پر گامزن ایک بھٹکے ہوئے انسان کی عبرت ساماں کہانی

159 — سفر نامہ — منظر امام

استاد کی مخصوص و دلفریب زبان میں مزہ دوبالا کرتا دل پذیر قصہ سفرنامہ

166 — گرداب — اسما قادری

تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی اور مقدر کا کھیل ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

195 — یومِ تقدیر — عکسِ فاطمہ

اس منہ زور شخص کا ماجرا جو جرم اور قانون کے شکنجے میں جکڑتا چلا گیا

208 — دلدل — آصف ملک

اس شخص کا المیہ جو ایک دلدل سے نکل کے دوسری دلدل میں جا پھنسا تھا......

221 — طے شدہ محبت — کاشف زبیر

تیمور اور شامی کی بزم میں ایک اور فسادِ محبت کا یادگار اضافہ

256 — چاہ در پیش — شکیل صدیقی

پڑوسی ملک ایران کی سیاست و انقلاب کے پس منظر میں لکھی جانے والی [illegible] رازوں کی کتھا

جلد 40 • شمارہ 11 • نومبر 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 3502551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

گردشِ وقت میں اپنا سفر مکمل کرتے ہوئے جاسوسی ڈائجسٹ، نومبر 2011ء تک آپہنچا ہے... تاریخِ انسانی میں غالباً وقت کا وہ حصہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے جس میں آج ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں... اس دور نے انسانی ترقی کے سفر میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سائنسی ایجادات نے دنیا میں تیز ترین رابطے کی بنیاد ڈالی اور اب انٹرنیٹ کی بدولت دنیا سمٹ کر ایک بڑے عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ برق رفتار پیغام رسانی اور اطلاعات کا یہ دور انسانی تاریخ کا نہایت اہم سنگِ میل ہے۔ ہم آج لمحہ بھر میں دنیا کے دور دراز حصے میں موجود کسی بھی شخص سے ای میل، وائس میل اور اسی طرح کے دیگر ذرائع استعمال کرتے ہوئے لمحوں میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ موبائل فون، انٹرنیٹ اور سیٹلائٹ فون نے تار کی اہمیت کو ختم کر دیا ہے مگر کتنی عجیب بات ہے کہ ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ ہماری دیواروں کے ساتھ رہنے والے پڑوسی کس حال میں ہیں... جوں جوں ہم مادی ترقی کرتے ہوئے اپنا سفر آگے بڑھاتے جا رہے ہیں... توں توں ہم ان رابطوں سے گریزاں ہو چکے ہیں جو کہ صحیح معنوں میں رابطے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں... انسانی معاشرے کی ترقی میں سائنسی ایجادات کے کردار سے کسی کو انکار نہیں لیکن یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ معاشرے میں جذبوں کو پروان چڑھانے میں خود انسان کے ایک دوسرے سے رابطے کا سب سے اہم ترین کردار رہا ہے... جب تک یہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا... اس وقت حجاج مقدس میں لاکھوں عازمین حج فریضۂ حج ادا کر رہے ہوں گے۔ حج کی مقدس تعلیمات سے ہمیں باہمی رابطوں کا درس ملتا ہے۔ اللہ کے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ہمیں آپس کے رابطوں کی تلقین کی ہے۔ وقت کی قلت کا بہانہ کر کے ہم اکثر اپنے پیاروں سے مدتوں نہیں ملتے۔ یہ ہم سب کا تجربہ ہے۔ کوشش کریں کہ اس عالمی گاؤں یا گلوبل ویلج میں باہمی رابطوں کی یہ ڈور ٹوٹنے نہ پائے، کمزور نہ ہو... عید قرباں مناتے ہوئے اپنے گرد و پیش میں ان حاجت مندوں کا خیال ضرور رکھیں جن کے شکم مہینوں گوشت کی ایک بوٹی کے لیے ترستے ہیں اور ہاں... عید کے بعد ہی شاعرِ مشرق کا یومِ ولادت بھی آ رہا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک حسبِ حال شعر یاد آ رہا ہے۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

تمام قارئین اور اہلِ اسلام کو عیدالاضحیٰ بہت بہت مبارک ہو۔

چلتے ہیں آپ کی بزم میں اور دیکھتے ہیں کہ آپ کے سندیسے اس بار کیا کہہ رہے ہیں۔

چشتیاں سے آصفہ صداقت مزے سے لکھتی ہیں ”سب سے پہلے بات کرتے ہیں پیارے سے ڈاکر انکل کے سرورق کی۔ ہائے ہائے، کیا ہو گیا ہے انکل جی آپ کو۔ لگتا ہے آج کل آپ بھی کسی ٹینشن میں ہیں۔ کبھی ایسا سرورق بنا ڈالا۔ کیا غضب کر ڈالا۔ اتنے بے تکے اور بکواس بندے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ (نہیں دیکھے نا... تو اب دیکھ لیں) ایسے لگ رہا تھا کہ تین تو بے لکار رکھے ہیں۔ چلو تو بے بنا ہی دیے تو ان پر کوئی اچھا سا ڈیزائن ہی بنا دیتے۔ یہ صنفِ کرخت کے منہ چھاپنے کی کیا ضرورت تھی اور حسینہ ماہ جبیں جو اتنی بھی حسین نہیں تھی۔ یہ صنفِ مخالف ہمیشہ جھکی ہوئی کیوں ملتی ہے؟ (کیونکہ وہ جھکے ہوئے ہی زیادہ اچھے لگتے ہیں) شاباش، گندے گٹروں میں جھانکنے کا کام رہ گیا تھا، وہ بھی کر ڈالا۔ اب یہ بے چاری قوم بھی کیا کرے۔ تاک جھانک ان کا پیشہ جو ٹھہرا۔ لیکن لگتا ہے موصوف کچھ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ارے کہیں کسی حسینہ کے دل تک پہنچنے کا راستہ تو نہیں ڈھونڈ رہے۔ (لاحول ولا... یہ کیا لکھ دیا؟ کیا طبیعت خراب ہو رہی ہے خواتین کے دل کا وہاں کیا کام؟) ہی ہی ہی... لگے رہو منا بھائی۔ بیک گراؤنڈ میں دو منزلہ کچھ پراسرار سا گھر نظر آ رہا تھا لیکن ڈاکر انکل آپ نے اندر آگ کے بھانبھڑ کیوں جلا رکھے تھے؟ خیر سرورق کو نچوڑتے اور اشتہارات سے آنکھ مچولی کھیلتے، اپنی پیاری سی محفل چینی، نکتہ چینی میں پہنچے۔ وکٹری اسٹینڈ پر سید شکیل کاظمی نظر آئے، مبارک ہو جی۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ لیہ کی مصباح صاحبہ کے دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ ماں باپ جیسی نعمت کا چلے جانا دنیا کا خالی ہو جانا ہی ہے مگر جب تک زندگی ہے جینا تو پڑے گا۔ اللہ آپ کے والدین کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اب لوگوں نے بھی کیسے کیسے نام رکھنا شروع کر دیے جیسا کہ کبیر والا کے سعد ہارٹ۔ انکل جی تیار رہیے جلد ہی لیور، کڈنی، برین وغیرہ بھی آنے والے ہیں پھر یہ چینی، نکتہ چینی نہیں، پپو قصائی، ٹو کے والی کی دکان لگے گی۔ دلنشین بلوچ جتنا پیارا آپ کا نام ہے اتنا پیارا ہمیں آپ کا شہر بھی لگتا ہے۔ کاش ہم بھی یہیں کے رہنے والے ہوتے۔ خیر، محفل میں گھمسان کی جنگ لڑنے کے بعد ہم نے اپنی فیورٹ للکارتی ہوئی کہانی للکار پڑھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب! آپ تو ہمیشہ سے ہی ہمارے فیورٹ رہے ہیں۔ بہت زبردست کہانی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے اسکرین پر چلتی ہوئی فلم۔ پسندیدہ کریکٹر عمران بھائی ہیں۔ ان کے بغیر یہ کہانی ایسے ہوتی ہے جیسے بریانی بغیر نمک کے۔ دال بغیر تڑکے کے۔ کسٹرڈ بغیر فروٹ کے اور چائے بغیر پتی کے... ہاہاہا۔ کیسی مزے کی مثالیں ہیں۔ (ہمارے تو منہ میں پانی آ رہا ہے) اسماجی کی گرداب بھی ہماری فیورٹ ہے۔ بس کہانی کا ٹیمپو تھوڑا سست ہے۔ پہلا رنگ منظر امام صاحب نے بکھیرا ہوا تھا۔ ارے منظر صاحب! آپ ہمارے بہت ہی فیورٹ رائٹر ہیں لیکن اس دفعہ کہانی میں مزہ نہیں آیا۔ پوری کہانی میں ہم دوڑتے ہی رہے اور اینڈ پر جا کر تھک ہو گئے۔ بھئی باپ بیٹے کو ملوا تو دیتے۔ بہرحال، اینڈ دکھی کر گیا۔ دوسرا رنگ پروین زبیر کا تھا۔ واہ پروین صاحبہ! سواد آ گیا۔ اب تو آپ کا اسٹائل کاشف زبیر جیسا ہوتا جا رہا ہے۔ شروع سے لے کر اینڈ تک مزہ آ گیا مگر بہروز اور افتخار کے ساتھ برا

ہوا۔ یہ تو وہی ہوا چمڑی بھی گئی اور ہاتھ دمڑی بھی نہ آئی۔ کہانی پڑھ کر کافی دیر تک ہم جھومتے رہے۔ رنگوں میں ڈوبنے کے بعد ہم نے الٹی جمپ لگائی۔ الٹی جمپنگ کرتے ہوئے کاشف صاحب کی الجھاوا تک پہنچے اور الجھتے الجھتے بچے۔ یہ کیا بھئی؟ کن کرداروں سے کہانی شروع کی اور کہاں پہنچ گئے۔ ہم تو خوش ہو گئے تھے کہ زراعت اور فصلوں کے متعلق کافی معلومات ملیں گی مگر وہی ایکشن، وہی مار دھاڑ۔ کہانی کا ٹیمپو کافی تیز تھا اس لیے ہم نے بھی تیز تیز پڑھ ڈالی۔ کاشف صاحب! آپ تو ہلکا پھلکا پُرمزاح لکھتے تھے۔ سچ پڑھ کر مزہ آ جاتا تھا۔ اب آپ بھی سنجیدہ ادب میں گھس گئے۔ کوئی مزے دار سی کہانی ہمارے لیے قسط وار لے کر آئیں۔ امید ہے ہماری درخواست پر آپ غور ضرور کریں گے۔ برعکس عمدہ کہانی تھی۔ کبھی کبھی چور کو پڑ گئے مور والا معاملہ بھی ہو جاتا ہے۔ مارٹن ایک ذہین پولیس والا تھا اس لیے سمجھ گیا۔ اب ہماری پاکستانی پولیس ہوتی تو... خیر جانے دیں، پولیس کے ساتھ پنگا ہوتا نہیں چنگا۔ سیر ناراض کی اعترافِ رقابت دل کو چھوتی محسوس ہوئی۔ جم کی کہانی دردناک تھی لیکن بورگیس کے اینڈ کا پتا نہیں چلا زندہ رہا یا مر گیا تھا۔ مختار صاحب کی گمشدہ تصویر اور بابر نعیم کی زود پشیماں اچھی کہانیاں تھیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی تو ہمیشہ ہی بہترین لکھتے ہیں۔ کیمیا گر پڑھ کر مزہ آ گیا۔ پروفیسر نے سری چند کو جو سزا دی، وہ اسی لائق تھا۔ پاجی، نالائق کہیں کا۔ ایسے لالچی بکروں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ رضوانہ منظر کی وفاپرست میں آخرکار محبت جیت ہی گئی۔ تنویر ریاض کی واجب القتل میں سنجے واقعتاً قتل کے لائق تھا۔ کیا کوئی باپ اپنی اولاد کے بارے میں ایسا سوچ سکتا ہے۔ لیکن معاشرے میں ہوتے ہیں ایسے شقی القلب باپ بھی۔“ (ہاں بھئی)

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی باتیں ”جاسوسی سے فلرٹ صادق کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ بک اسٹال والے انکل نے مجھے جاسوسی کا برانڈ ایمبیسیڈر بنا کے ہر قسم کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا۔ (مبارک ہو) بقول ان کے میری وجہ سے جاسوسی اور سسپنس کی ڈیمانڈ بڑھ گئی ہے۔ (یقیناً) حالانکہ اس کا سارا کریڈٹ معراج انکل کی ٹیم اور ہمارے مایہ ناز رائٹرز کو جاتا ہے مگر پھر بھی میں یہ کریڈٹ بڑی شانِ بے نیازی سے وصول کر رہا ہوں۔ سرورق پر موجود عجیب بے کشش ماتھے والی خاتون بڑی مشکل سے چھ عدد پلیٹ نما بندوں کا بوجھ برداشت کر رہی تھی چینی نکتہ چینی میں داخل ہوئے۔ کاظمی برادر! بس تو پھر سمجھ لو کہ دوستوں کے لسٹ میں مخلص ترین دوست کا اضافہ ہو گیا۔ یاد رکھنا راج نے کم ہی کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ آغا جان! ہم پہلے خود گرفتار ہوتے ہیں اور پھر گرفتار کرنے والوں کو گرفتار کرتے ہیں۔ مصباح کا دکھ دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ جاوید بھائی! تمہارے سب دوستوں کے نام قیمتی اور فری مشورے ہمیں بے حد اچھے لگے اور اپنی ماہا خود بھی بے حد اچھی ہیں اور باتیں بھی اچھی کرتی ہیں۔ بس تم میرے کہنے پر یقین کر لو۔ اجاگر صاحب! آپ تو لگتا ہے گلاب جامن منہ میں رکھ کے سوتے ہو۔ عباس بھائی! آپ نے اتنی سانولی سلونی لڑکی کو ماہا سے ملایا۔ ہمیں اچھا نہیں لگا۔ ماہا جی! ہماری سوچ کتنی ملتی جلتی ہے کیونکہ میں بھی صرف اپنے گھر کے اجالے سے مستفید ہونے کا خواہش مند ہوں۔ سعد سویٹ ہارٹ! ماہا سب سے نہیں لڑتی۔ سب ماہا سے لڑتے ہیں۔ مرزا بہنو! عینی جی کرسی پر کھڑی تھیں تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ مجھے بھی ہنسنا تھا۔ دلنشین صاحبہ! بجا فرمایا لیکن ہماری معلومات کے مطابق جب آپ میٹرک میں تھیں تو پیاری سی کیوٹ سی بشریٰ ساتویں کلاس کی ہونہار طالبہ اور جاسوسی کی کامیاب تبصرہ نگار تھیں۔ کمیرا، سعدیہ اینڈ کاشف آپ سب کو راج کھلے دل سے ویلکم کرتا ہے۔ سب سے پہلے للکار کی جانب دوڑے کیونکہ آخری سین نے ہمیں ایک مہینے تک بے چین رکھا تھا۔ گورے کی شان دار موت نے روح افزا جیسی تسکین عطا کی۔ حسبِ عادت، حسبِ فطرت ہندوؤں نے پھر مسلمانوں پر پیٹھ پیچھے وار کرنے کی کوشش کی جسے عمران نے کمال دانشمندی سے ناکام بنا دیا۔ گرداب میں حسبِ سابق ماہ بانو ایک بار پھر بال بال بچ گئی۔ شفقت راؤ کی داستان نے دکھی کیا۔ جہاں ایک طرف شفقت جیسے والدین اپنی جوان اولاد کو منشیات کی وجہ سے قبر میں اتار رہے ہیں، وہاں چودھری جیسے لوگ اس زہر کو ہر نوجوان تک پہنچانے کے لیے اپنا ضمیر تک بیچ رہے ہیں۔ چودھری کا کمینہ پن قسط بہ قسط بڑھتا جا رہا ہے۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر ایک لاجواب اور حقیقت سے قریب تر کہانی لیے حاضر تھے۔ سلطان جیسے بے شمار ہیرے اس پاک سرزمین پر جابجا بکھرے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ جوہر شناس حکام ناپید ہیں۔ یہودی پوری دنیا کو اپنے زیرِ اثر رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی کبھی مسلمان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ ہمارے حکمراں اس کو جتنا جلد سمجھ لیں اتنا ہی ہمارے لیے کم برا ہوگا۔ (یہ سوچنے کا ٹائم کس کے پاس ہے برادر!) پہلا رنگ لبِ بام دل پر ایک خاص اثر چھوڑ گیا۔ تنویر سا یا غلاظت کی زندگی چھوڑ کر شرافت کی زندگی گزارنے آیا مگر پھر بھی اسے چین سے نہیں رہنے دیا گیا۔ دوسرا رنگ حریفِ جاں تو ذرا بھی اچھی نہ لگی۔ یقین نہیں آیا کہ یہ پروین زبیر کی کہانی ہے۔ مجموعی طور پر اس کہانی نے حد سے زیادہ مایوس کیا۔“ (معلوم نہیں آپ کو کیوں پسند نہیں آئی...)

احسان سحر کی افسردگی میانوالی سے ”اس ماہ کا جاسوسی انتظار کے بعد 3 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق پر اوپر کی طرف گھر کی ایک جھلک اور حسینہ 2015ء کے نئے ایجاد کردہ جھمکے جو کہ رتی کی مدد سے باندھ کر کان سے لٹکے ہوئے تھے۔ خواتین کے لیے انوکھے جھمکے کے ساتھ اس میں قدرت اللہ نیازی سڑک پر گھٹنوں کے بل سر جھکائے کسی کی جاسوسی کر رہے تھے۔ محفل میں قدم رکھا۔ اس مرتبہ اسلام آباد سے سید شکیل کاظمی کرسیِ صدارت پر جلوہ گر ہوئے۔ مبارکاں جی۔ سب قارئین کو دلی عیدالاضحیٰ مبارک۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے للکار پڑھی۔ ہمیں لڑائی کا انتظار تھا کہ کیا ہوتا ہے لیکن جلد ہی تابش نے پہلے ہی سین میں جارج گورا کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ واہ کیا سین تھا خوشی کے مارے رسالہ بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جان چھوٹی اس کمینے سے بھی، اب سلطانہ کا کردار مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ الجھاوا، کاشف زبیر صاحب... یادگار تحریر ڈاکٹر ایاز درانی کا کردار دل میں اتر گیا، ساتھ امینہ بھی حیران ہوں کہ لڑکیاں بھی اتنی ہمت والی ہوتی ہیں یہ تو چھپکلی اور لال بیگ سے ڈر کر چیخنا شروع کر دیتی ہیں۔ (وہ غیر معمولی نہیں ہوتی نا) زود پشیماں میں وہی جو انسان کرتا پہلے ہے اور سوچتا سمجھتا بعد میں ہے، خاص کر یہ خوبی ہم مسلمانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیمیا گر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی اچھی تحریر تھی۔ سرورق کے رنگوں میں پروین زبیر صاحبہ جو کہ اچھی رائٹر ہیں، اس دفعہ متاثر نہ کر سکی۔ حریفِ جاں کچھ خاص نہ لگی۔ دوسرا رنگ دل میں اتر گیا لبِ بام لیکن اختتام افسردہ کر گیا۔“

بعض قارئین خصوصاً زاہد شفیع اور جاوید جٹ... نے اعتراض کیا ہے کہ الجھاوا کی کہانی ایک فلم پر مبنی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے ادارے کو آگاہ کیا ہے کہ کہانی کے ساتھ حوالہ نہ دینے کی لغزش ضرور ہوئی مگر یہ کہانی ایک فرانسیسی ناول کے انگریزی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترجمے سے ماخوذ ہے۔ اس ناول پر مبنی ایک سے زائد فلمیں بنائی گئی ہیں۔ انگریزی ادب سے شغف رکھنے والے قارئین کی دلچسپی کے لیے اس غیر معمولی کہانی کو مقامی ناموں اور ماحول کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔۔۔ جسے قارئین کی بڑی تعداد نے پسند کیا ہے۔

گجرات سے طارق محمود راہی کی باز پرس ''ماہِ اکتوبر کا شمارہ 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ حسینہ کا چہرہ کچھ زیادہ آگے نکلا ہوا تھا۔ لپ اسٹک اور آئی شیڈ زیادہ گہرے تھے اور کانوں میں بندے ایک دم بوگس ڈیزائن کے تھے۔ (آپ بھول رہے ہیں، وہ آپ کے لیے نہیں تھے) ایک حضرت گھٹنوں کے بل سیل فون کان سے لگائے گٹر کی جالی سے پتا نہیں کس کو جھانک رہے تھے۔ (کہیں وہ۔۔۔) اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے پہنچے۔ چینی، نکتہ چینی میں کرسیِ صدارت پر شکیل کاظمی براجمان تھے۔ کاظمی صاحب مبارکاں ہوون جی۔ آپ کا تبصرہ جان دار تھا۔ میں 1999ء سے جاسوسی کا قاری ہوں، پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ دوستوں کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوگی۔ (اتنا عرصہ کہاں رہتے رہے؟) للکار بہت زبردست کہانی ہے۔ آخر کار تابی نے جارج گورا کو ختم کر ہی دیا، ویلڈن تابی۔ اولین صفحات پر میرے پسندیدہ رائٹر کاشف زبیر کی الجھاوا واقعی الجھاوا تھی۔ برعکس اور اعتراف رقابت نارمل ہی تھیں، زود پشیماں نے اداس کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی کیمیا گر میں پروفیسر رندھیر کی گیم کامیاب رہی اور سری چند کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے تھی۔ واجب القتل میں پٹیل کی بے حسی پر بہت غصہ آیا۔ سرورق کے رنگ پہلی بار ایسا ہوا کہ مجھے پسند نہیں آئے۔ پہلا رنگ دوسرے رنگ کی نسبت بہتر تھا۔ (ہمیں افسوس ہے) نکتہ چینی میں لکھنے والوں کو بہت بہت سلام اور جہانگیر اسلم گوندل کہاں غائب ہو؟ آپ کا فون بھی بند ہے اور بتاؤ کہ کب رہا ہو کے گھر آ رہے ہو؟''

آتش خان فرام مری کا مفت مشورہ ''ماہِ اکتوبر کا شمارہ روایتی آن بان کے ساتھ 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ اپنے بندوں کی نمائش کرتی ہوئی نظر آئی۔ سید شکیل کاظمی! کرسیِ صدارت مبارک باد قبول فرمائیں۔ تبصروں میں ماہا ایمان کا تبصرہ اچھا لگتا ہے اور بھی سب کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنی من پسند کہانی للکار کو پہنچے۔ تابش کی جیت کی بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن مجھے تابش کے بجائے عمران کی شخصیت زیادہ پسند ہے۔ طاہر جاوید مغل، آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اس کے بعد گرداب کی طرف چھلانگ لگائی مگر افسوس گرداب کافی بور ثابت ہوئی، معمول کے مطابق ماہ بانو منظرِ عام سے غائب۔ (اچھی چیزیں اسی طرح جھلک دکھا کر اوجھل ہو جاتی ہیں) پہلا رنگ بالکل بھی اچھا نہ لگا دی اینڈ کی وجہ سے۔ اگر اینڈ بھی زبردست ہوتا تو مزہ آ جاتا۔ کاشف زبیر کی الجھاوا پڑھتے پڑھتے کیا بتائیں خود ہی الجھ گئے۔ (پھر سلجھے کیسے؟ خط کس نے لکھ دیا؟) رضوانہ منظر کی وفا پرست پڑھی، اچھی کہانی تھی۔ کہتے ہیں دوسروں کے لیے کھودا گیا گڑھا کبھی کبھی الٹ ہو جاتا ہے۔ انکل جی پلیز! ایک دفعہ پھر شامی، تیمور، نوشی، فولاد خان اور نواب صاحب سے ملاقات کروا دیجیے۔ ان کے کردار مجھے بہت پسند ہیں۔ (آنکھ بند کریں۔۔۔ وہ ملنے آ جائیں گے) ایک مفت کا مشورہ میرا بھی شامل کر لیں۔۔۔ ہر کہانی کے ساتھ رائٹر کی تصویر ہو جائے تو کیسا مزہ آئے گا۔ (کس کو؟) بہت سے لوگ میرے نام کو پڑھ کر حیران تو ہوں گے مگر ڈونٹ وری دوستو! پریشان نہیں ہوتے۔ ہمیں بھی اپنی فرینڈ لسٹ میں شامل کر لیجیے گا۔'' (لیجیے کر لیا)

جھڈو سندھ سے ام ثمامہ کی حاضری ''اس دفعہ ٹائٹل بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ ٹائٹل اچھا ہو تو تبصرہ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ ویسے بھی کسی اچھی کتاب کا فرسٹ امپریشن اس کا ٹائٹل ہی ہوتا ہے۔ عجیب وغریب حسینہ اور نہایت بھونڈے بندے جن میں ہیرو صاحب کا چہرہ ٹکڑوں میں بنا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے سید شکیل کاظمی صاحب کو کرسیِ صدارت کی مبارک باد۔ تبصرہ اول آنے کے قابل ہی تھا۔ آغا فرید صاحب کی جاسوسی سے محبت قابلِ ستائش ہے کہ وہ گوڈے گوڈے پانی میں اسے لینے پہنچ گئے۔ مصباح! اللہ آپ کے والدین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ماں باپ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ محبت اور شفقت سے بھرپور اک گھنے سایہ دار شجر کے مانند۔ پرانی اور اچھی یادیں ہمیشہ دل کو چھو لیتی ہیں، چاہے وہ اپنی ہو یا کسی اور کی۔ اسعد صاحب سے گزارش ہے کہ وہ جاسوسی کے مستقل تبصرہ نگار بن جائیں۔ ان کا تجربہ اور تجزیہ یقیناً اچھے تبصرے تخلیق کرے گا۔ ذیشان بھائی خط کی تعریف کا شکریہ۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں مس نہیں مسز ہوں وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا، ماحول کیسا بھی ہو انسان کو اپنے اندر کی اچھائی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور رب تعالیٰ کی بے کراں رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے آف کورس ناٹ للکار جارج گورے کا عبرت ناک انجام دیکھ کر دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ تابی نے ثابت کر دیا کہ وہ ہیرو بھائی اور باروندا جیکی کا شاگرد ہے۔ اس دفعہ فساد پلس کے چربلے نے ثابت کر دیا کہ واقعی ہیرو کہلانے کے قابل ہے۔ تہ خانے کے اندر آفتاب اور سلطانہ کی خفیہ ملاقات نے ایک لمحے کے لیے دماغ کو گھما ہی ڈالا تھا۔ ویسے اب مغل صاحب سے گزارش ہے کہ کہانی کو زرگاں اور تل پانی کی ریاستوں سے باہر نکالیں۔ اسما قادری اس دفعہ مبارک باد کی مستحق ہیں کیونکہ کتنے عرصے بعد انہوں نے اس قسط میں کسی کو نہیں مارا اور نہ وہ تو کسی کا چالیسواں بھی ہونے نہیں دیتیں۔ اور کہانی میں پھر وہی یکسانیت کہ ماہ بانو پھر غائب اور مصیبت سے دوچار۔ دوسرا رنگ حریفِ جان پروین زبیر صاحبہ کی وی آئی پی قسم کی ٹاپ کلاس کی تھوری پن کی کہانی تھی۔ نبیلہ باجی کے کردار نے مزہ دے دیا۔ ویری ویلڈن پیر دین جی۔ ہم سب گھر والوں نے کہانی پڑھی اور انجوائے کیا۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں ابھی تک رسد اور ڈاک کا سسٹم بحال نہیں ہوا ہے۔ بقول شاعر۔۔۔ دل کے نازک تار سے لکھا کوئی خط رستے میں کھو جائے تو اداسی ٹھہر جاتی ہے۔'' (واہ۔۔۔)

تونسہ سے کاشف عباس کی شمولیت ''میں بی اے کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ گزشتہ 15 سال سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں۔ سرکش کہانی بہت پسند تھی۔ وجہ جس نے خط لکھنے پر مجبور کیا، طاہر جاوید مغل صاحب کی اسٹوری للکار ہے۔ جیسے کسی خوابیدہ شخص کو سورج کی کرن اٹھا دے، ایسے ہی اس اسٹوری نے مجھے جگا دیا۔ (آپ کہاں جا سوئے تھے؟) بلاشبہ یہ شاہکار ہے، اتنی تیز فل آف سسپنس۔ بہت خوشی ہوئی ہے ان لوگوں سے جو ایس ایم ایس اور نیٹ کی دنیا میں بھی جاسوسی ڈائجسٹ سے وابستہ ہیں۔ پڑھتے ہیں اور ان پر جو خطوط لکھتے ہیں۔ تبصرہ عبدالغفور خان اٹک کا پسند آیا اور حافظ آباد کی ماہا ایمان کا اپنائیت بھرا خط جو انہوں نے جاسوسی ڈائجسٹ کو لکھا۔ علی آتش کسی اور کو بھی موقع دو، اتنا لکھا کہ میں اب کس کو چھیڑوں؟ نام کے اعتبار سے غالب کے زمانے کے لگتے ہیں آپ تو، ہماری کیا مجال جو بزرگوں کو کچھ کہیں۔ ذیشان افتخار شانی یہ حوصلہ کہاں سے پایا۔ جیل کی زندگی میں تو انسان مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں

میں ہوتا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ خط لکھتے ہو اور جاسوسی بھی پڑھتے ہو۔ تسی گریٹ ہو بھرا جی۔ پہلا خط ہے سمجھ نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیا نہیں۔'' (خط شائع ہونے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آپ کہانیوں پر بھی جامع تبصرہ فرمائیں۔۔۔ آپ کا خط دیر سے ملا ہے۔۔۔ اور اس میں پچھلے ماہ کی کہانیوں پر تبصرہ ہے۔۔۔ سو معذرت)

سید شکیل حسین کاظمی کی درخواست اسلام آباد سے ''اکتوبر کی تین تاریخ کو ہم نے قریبی بک اسٹال سے جاسوسی خریدا۔ سرورق میں کچھ نیا پن نہیں تھا سوائے جھمکوں کے۔ (کچھ تو نیا تھا۔۔۔) میں اس دوشیزہ کی ہمت کی داد دیتا ہوں جو اپنے کان سے تقریباً ایک کلوگرام کا وزن لٹکا کر گھوم رہی ہے۔ (وزن اس نے اٹھایا ہوا ہے اور تکلیف آپ کو ہو رہی ہے۔۔۔ کیا بات ہے صنفِ نازک کی۔۔۔) اپنا تبصرہ اول دیکھ کر خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ ایک گزارش ہے کہ میرا نام مکمل لکھا کریں، مجھے اپنے نام سے بہت محبت ہے۔ آغا فرید احمد کا تبصرہ مجھے بہت پسند آیا۔ تفسیر بابر عباس اس دفعہ غیر حاضر تھے، بنا اطلاع کے۔ ہمایوں سعید راج کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح مسالے دار تھا۔ مصباح جی! آپ کے حالات اور آپ کے والدین کے بارے میں سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے اور آپ کے لیے کوئی ایسا سبب پیدا کر دے جو آپ کے دکھ میں کمی کا باعث ہو کیونکہ ان رشتوں کا نعم البدل تو کائنات میں کہیں نہیں ہو سکتا۔ سعدیہ گڑھ مہاراجہ سے! محترمہ آپ کی جذباتی بلیک میلنگ سے متاثر ہو کر میں نے اپنی الماری کو کھنگال ہی ڈالا اور مجھے جنوری 2010ء کا ڈائجسٹ مل گیا اور اس کے ساتھ پیچھے والے سات آٹھ شمارے بھی مگر کسی میں دیوی کی آخری قسط موجود نہیں تھی۔ وہ یقیناً جنوری 2009ء میں ہوگی اور مارچ 2009ء سے پچھلے شمارے میں پہلے ہی تقسیم کر چکا ہوں، اگر 2010ء والا چاہیے ہو تو وہ میں بھیج دوں گا اور میں جنوری 2009ء کا بھی ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔ (واہ جی۔۔۔ بہت فرصت ہے۔۔۔ کیا جادو ہے صنفِ نازک میں) کہانیوں کی طرف آئے تو کاشف زبیر کو پہلے صفحات پر دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ مگر اسٹوری کے 2 ورق ہی پڑھتے ہی اکتاہٹ ہونے لگی۔ کیونکہ یہی کہانی قریباً ایک ماہ پہلے میں فلم کی صورت میں دیکھ چکا تھا۔ للکار میں جارج گورا اپنے متوقع انجام کو پہنچا۔ خس کم جہاں پاک مگر سلطانہ اور آفتاب خاں کی مشکوک حرکتیں اور انتہا پسندانہ رویہ پھر سے نمکین کر گیا۔ پتا نہیں کون لوگ اس کو سید ھا راستہ سمجھتے ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ گرداب میں ماہ بانو پھر سے گم ہو گئی ہے۔ اب پتا نہیں کہاں سے دریافت ہو گی۔ کہانی دائرے میں گھوم رہی ہے، آگے نہیں جا رہی۔ سرورق کا پہلا رنگ لبِ بام منظر امام کی بہت اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ پروین زبیر نے اس دفعہ سرورق کے دوسرے رنگ حریفِ جاں میں اسٹار پلس کی طرز کا کوئی رشتے داروں سے بھرپور ڈراما دکھا دیا۔ مختصر کہانیاں اس دفعہ سب ہی اچھی تھیں، خاص طور پر کیمیا گر اور زود پشیماں بہت اچھی لگیں۔''

فتح پور لیہ سے آمنہ پٹھانی کی آمدِ بہار ''طویل غیر حاضری کے بعد بندی حاضرِ خدمت ہے، طوالت کی وجہ تعلیمی مصروفیات تھیں۔ (اوہ۔۔۔ کیا تمام تعلیمی دور سے ایک ہی وقت میں سبکدوش ہونا تھا) جن دوستوں نے ہمیں یاد رکھا، ان کا تہ دل سے شکریہ اور جنہوں نے یاد نہیں رکھا ان کا بھی بے حد شکریہ۔ ہمیشہ کی طرح خوب صورت ٹائٹل گرل سے مزین اور ایک دو دوسرے لوازمات سے سجا سرورق اچھا لگا۔ سید شکیل کاظمی بھرپور تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت کے حق دار ٹھہرے، سو مبارک باد۔ آغا فرید! ہم بڑے متحیر ہیں کہ آپ کے ہاں جاسوسی رات کو آتا ہے۔ وہ بھی تاروں سے چمکتی رات اور بارش میں۔ (وہ بھی آئیں گی۔۔۔) ہمایوں سعید کا آدھے سے زیادہ تبصرہ صنفِ نازک کے اردگرد گھومتا رہا۔ مصباح ڈیئر! خدائے قدوس آپ کے والدِ محترم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل۔ آئی تھنک میں آپ کو جانتی ہوں۔ اختر عباس! آپ پولیس میں تو نہیں ہو؟ پھر حافظ بلال کی انویسٹی گیشن کیسی؟ سعدیہ جانی! آپ کا مطلوبہ رسالہ صرف پانچ ماہ قبل میرے پاس موجود تھا، اب بھی کوشش کروں گی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ابتدا للکار سے کی۔ دلوں کو دھڑکاتی، لہو کو گرماتی تابش اور جارج گورا کی لڑائی آخر کار تابی کی فتح پر ختم ہوئی۔ بہرحال کہانی اپنی خوب صورتی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ گرداب میں حسبِ توقع دو چار نئے کرداروں کی انٹری ہونے اور حسبِ سابق ماہ بانو کی مشکلات پر قسط ختم ہو گئی۔ منظر امام کا پہلا رنگ لبِ بام نے کافی بور کیا، کرداروں کا آپس میں تال میل نظر نہیں آیا۔ البتہ دوسرا رنگ حریفِ جاں قدرے بہتر لگا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

فتح پور سے محی الدین اشفاق کی شکایت ''9 اکتوبر کو ہماری سالگرہ تھی۔ (بہت بہت مبارک ہو۔۔۔ عمر کی کون سی بہار تھی۔۔۔ یاد ہے؟) دیگر تحائف کے ساتھ ایک عدد سیف بھی گفٹ ملا۔ ہم نے جلدی سے اپنے خطوط والے ڈائجسٹ اس میں سیٹ کر لیے۔ انکل جی! آپ جتنا بھی اپنا اور حسینہ کا رخ ہم سے موڑ لیں، ہم اس محفل سے جانے والے نہیں۔ (ہماری کیا مجال کہ حسینوں کا رخ موڑیں۔۔۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ کچے دھاگے سے بندھ کے کھنچے آئیں آپ رخِ کائنات کو دیکھ کر۔۔۔) حسینہ کن انکھیوں سے ہمیں تلاش کر رہی تھی۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ للکار پڑھی۔ کہانی اپنے عروج پر ہے۔ جارج گورا کو اچھی سزا ملی۔ عمران کے جوہر عیاں ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرا رنگ پروین زبیر کا تھا۔ کرنزی کی نوک جھوک والا رنگ اچھا لگا حالانکہ اس کہانی کا پلاٹ اتنا اچھا نہ تھا۔ لبِ بام میں معاشرتی حالات اور معاشرے پر چوٹ کی گئی ہے مگر منظر امام ہمیشہ کی طرح الجھی ہوئی تحریر لکھتے ہیں۔ (کیونکہ وہ خود الجھے الجھے سے نظر آتے ہیں) ہر کالم میں نئے کردار ہوتے ہیں۔ سید شکیل کاظمی صاحب! وننگ سیٹ مبارک ہو۔ ہمایوں سعید صاحب! کیا واقعی آپ کو دیکھ کر کسی کی دھڑکنوں کو فل اسٹاپ لگ جاتا ہے؟ مصباح! اللہ آپ کو صبر دے۔ جاوید بلوچ! اچھا تبصرہ تھا۔ ماہا ایمان جی! کر دی نا خواتین والی بات، آپ کو بھولنے کی بیماری ہے شاید۔ بھئی آپ بچپن کے بعد اب پچپن کی طرف گامزن ہیں۔ دلنشین میڈم! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ آج کل کم نظر آ رہی ہیں۔ انکل جی! ہمارا تبصرہ کیوں شائع نہیں ہوتا؟'' (ہم جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے۔۔۔ ترتیب وار خط آتے جاتے ہیں اور محفل کی زینت بنتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے خط پورا شائع نہیں ہوتا۔۔۔ لیکن آپ لوگوں کے نام شائع کر دیے جاتے ہیں)

اکتوبر کے شمارے میں للکار کی قسط میں صفحات نمبر 195 اور 201 کے متن پیسٹنگ کے دوران ایک دوسرے سے تبدیل ہو گئے تھے۔ ادارہ اس غلطی پر قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عاطف گجر کی کھاریاں سے رائے ''اس دفعہ شمارہ چار چکر لگانے کے بعد 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ صنفِ نازک ایک آدمی پر سحر پھونکنے کا کام بڑی تندہی سے سرانجام دے رہی تھی۔ بہرحال ہمیں شمارے کا سرورق پسند نہ آیا۔ اس کے بعد اشتہار کو خیرباد کہتے ہوئے محفلِ یاراں میں پہنچے۔ کرسی صدارت پر سید شکیل کاظمی کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اب یہ نہ کہہ دینا کہ آپ دماغی کمزوری میں مبتلا ہیں۔ بہرحال تبصرہ سید صاحب کا بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں للکار نے اپنا حق ادا کر دیا۔ گورا واصل جہنم ہوا اور گرداب نے سلو ٹیمپو کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ دونوں رنگ پسند آئے۔ چھوٹی کہانیوں میں کیمیاگر اچھی کہانی ثابت ہوئی اور دوسری کہانیاں اتنی اچھی نہ تھیں۔ قلم نگاروں سے التجا ہے کہ روزانہ کے معمول سے ہٹ کر کشمیر کے موضوع پر کچھ ضرور اس دفعہ لکھیں اور قلم کے جہاد کا کفارہ ادا کریں۔ انڈیا کی پالیسی پر بھی کچھ روشنی ڈالیں۔ انڈیا والے میرے پیارے ملک کے متعلق جس طرح کی ذہنیت رکھتے ہیں اس کو اجاگر کریں۔''

کنگن پور سے **محمد اسحاق انجم کا خوب صورت پارہ** ''ہم نے تو اس روز سے چینی پر نکتہ چینی چھوڑ دی جب سے ہمارے خط کی تراش خراش، کسی کیمیاگر کے کہنے پر شروع کی گئی۔ ہم مانتے ہیں یہ بھی الجھاوا، برعکس، تھا مگر اعترافِ رقابت، تسلیم کر لیتا اس گمشدہ تصویر کے بارے میں جو گرداب میں پھنس گئی تھی، بڑی بات ہے۔ غلط فہمی پیدا ہونا اور پھر زود پشیماں ہو جانا اور پھر للکار کے ساتھ کہنا کہ یہ سب فریب نظر تھا، تمام الجھاوا ختم ہوتا جاتا ہے۔ وفاپرست، لوگ واجب القتل نہیں ہوا کرتے۔ وہ تو لبِ بام ہر بات کہہ دیتے ہیں چاہے ان کے سامنے حریفِ جاں ہو، ذاکر صاحب کی مہربانی اپنی جگہ مگر اس میں بھی جناب معراج رسول اور عذرا رسول صاحبہ کا ساتھ شامل ہے۔ تمام رنگ ہی ٹھیک ہیں۔ سب سے بڑی بات بروقت جاسوسی ڈائجسٹ کا آ جانا ہی ہمارے لیے خوش کن ہے۔ سب کا شکریہ! ورنہ پھر تراش خراش ہو جائے گی۔'' (الحمدللہ)

منڈی بہاؤالدین سے **جہانگیر اسلم گوندل کی خوشیاں** ''تقریباً 2 سال بعد دوبارہ محفل میں حاضر ہو رہا ہوں خوشبو لگا کے۔ (کیوں کہاں تحلیل ہو گئے تھے؟) اتنی دیر غیر حاضری کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں آپ کو ہی بھول گیا بلکہ ہر ماہ کا ڈائجسٹ اور آپ کے خط پڑھتا ہوں خوشبو لگا کے۔ کچھ تو ذہنی پریشانی تھی اور بعض دفعہ رسالہ لیٹ ملتا ہے، ہم اسیران جو ٹھہرے خوشبو لگا کے۔ (وہاں یہ بھی میسر ہے) یقین کیجیے مجھے اکتوبر کا شمارہ بھی 18 اکتوبر کو ملا ہے۔ میں نے ابھی تک ڈائجسٹ نہیں پڑھا، سوچا پہلے آپ سب کو خوش خبری سنا دوں خوشبو لگا کے۔ میری ڈیڑھ ملین روپے میں صلح ہو گئی ہے اور میں انشاء اللہ اکتوبر یا نومبر تک رہا ہو جاؤں گا۔ نو سال بعد۔ ہے نا خوش خبری کی بات؟ خوشبو لگا کے۔ (بہت مبارک) ان سب دوستوں کا شکریہ جو ہمارے لیے دعا کرتے ہیں اور ان کا بھی شکریہ جو ہمارے لیے دعا نہیں کرتے لیکن ہمیں بھول بھی نہیں پاتے خوشبو لگا کے۔ ان نو برسوں میں، میں نے تو بہت کچھ گنوا دیا ہے جو کہ شاید ساری زندگی دوبارہ حاصل نہ کر سکوں۔ ہاں ان نو برسوں نے مجھ سے میری پڑھائی چھین لی، میری محبت بھی مجھ سے جدا ہو گئی جسے میں زندگی کی آخری سانسوں تک بھول نہیں پاؤں گا۔ اگلا خط انشاء اللہ آزاد فضاؤں میں بیٹھ کر لکھوں گا خوشبو لگا کے۔ رانا ادیب الرحمن، دل پسند سیال، آبگینے آفندی، مونا خان، جبرنا علی اور میری پیاری آپی میرب حجازی آپ کے بغیر محفل میں مزہ نہیں آتا۔ پلیز واپس آ جائیں خوشبو لگا کے۔ بہت اچھا وقت گزرا ہے آپ کے ساتھ۔ سب دوستوں کا شکریہ میری طرف سے سب قارئین اور جاسوسی کی پوری ٹیم کو عید مبارک اور محبتوں بھرا اسلام۔ پھر ملاقات ہوگی بشرطِ زندگی خوشبو لگا کے۔'' (آزاد فضاؤں میں لکھے گئے آپ کے محبت نامے کے ہم منتظر رہیں گے، خوب خوشبو لگا کے)

محمد قدرت اللہ خان نیازی حکیم ٹاؤن خانیوال سے لکھتے ہیں ''اکتوبر 2011ء کا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل بہت منفرد سا ہے۔ بنی سنوری حسینہ کانوں میں خود سے بڑے آویزے پہنے ہوئی ہے۔ مرد بے چارہ اس کے سامنے مرغا بنا ناک سے لکیریں نکال رہا ہے۔ ایک کونے میں بنی ہوئی پرانے طرز کی عمارت آسیبی سا تصور پیدا کر رہی ہے۔ سرورق کے نظارے سے فارغ ہوئے تو چھلانگ لگا کر چینی دان میں جا پہنچے۔ سید شکیل کاظمی کرسیِ صدارت پر قابض نظر آئے مبارکاں۔ آغا فرید جاسوسی کی تلاش میں بھٹکتے نظر آئے اور صنفِ نازک کو لتاڑنے کا فریضہ بھی خوب انجام دیا۔ ہمایوں سعید راج! یہ چینی دان شادی دفتر نہیں جو آپ اپنی خوب صورتی منوانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ بھائی اتنا ہی شوق ہے تو اپنی تصویر بھجوا دو سب دیکھ لیں گے کہ تم میں ہے کتنا دم۔ مصباح سسٹر! ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ آپ کے والدین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبر دے آمین۔ ناامید نہ ہوں، اللہ سب کا سہارا ہے اس سہارے کے ہوتے ہوئے ناامیدی اچھی بات نہیں۔ جاوید بلوچ! واہ بھئی کیا خوب صورت مثال دی ہے برائلر مرغی کی۔ ہم آپ کے ہم خیال ہیں۔ چاند چہرہ، غزالی آنکھیں، زلف سیاہ کچھ بھی تو نہیں پھر بھی ہر قاری کے قلم کی نوک پر ماہا ایمان۔ اصل میں آپ کے کھلے تبصروں نے سب کو گولی دے رکھی ہے۔ (آپ کیوں چنے چبا رہے ہیں؟) اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ کہانی کا پہلا صفحہ پڑھتے ہی نعرہ لگایا۔ تابی ساڈا شیر اے تے باقی ہیر پھیر اے۔ طاہر انکل کے مشکور ہیں کہ ایک مشکل مقابلے کے بعد تابی کو جارج گورا کو ڈھیر کرنے میں کامیاب کیا۔ اگر تابی کو آسانی سے یہ مقابلہ جتوا دیا جاتا تو شاید ہم سے ہضم نہ ہوتا۔ اب پلیز اس ماحول سے ہماری بھی جان چھڑوائی جائے اور کہانی کو اپنے ٹریک پر واپس لایا جائے۔ لبِ بام سرورق کے پہلے رنگ کو اچانک ہی اینڈ دے دیا گیا۔ لگتا ہے منظر امام صاحب کو بازار جانا تھا سودا سلف کے لیے جو اچانک کہانی ختم کر کے اٹھے اور چل دیے۔ پروین زبیر کے دوسرے رنگ میں مرد حضرات کو بالکل ہی عقل سے پیدل دکھایا گیا۔ آج کل تو لڑکے بڑے تیز ہیں۔ لڑکی کو دیکھ کر ہی درست اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کس ٹائپ کی ہے اور یہاں بہروز وغیرہ دونوں ہاتھوں سے لٹنے کے باوجود بھی اس کو سمجھ نہیں رہے تھے کہ لڑکی کس طرح انہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ (سب آپ کی طرح چالاک تھوڑی ہوتے ہیں) جمال دتی کی برعکس، واقعی برعکس ثابت ہوئی۔ انسپکٹر مارٹن نے ذہانت سے اصل مجرم کو تلاش کر لیا۔ مختار آزاد کی گمشدہ تصویر بورنگ ثابت ہوئی۔ کیمیاگر میں پروفیسر نے سری چند کو اچھی سزا دی۔ فریب نظر میں آرتھر کے غیر فطری رویے نے ایرون وغیرہ کو مشکوک کر دیا اور وہ گرفتار ہو گیا۔ وفاپرست میں ایک اجرتی قاتل محبت کی خاطر اپنے کسٹمر کو مار کر اپنے اصولوں سے تو روگردانی کر گیا مگر محبت کو جیت لیا۔ کاشف زبیر کی الجھاوا واقعی الجھاوا ہی ثابت ہوئی۔ اس کو پڑھا تو پتا چلا کہ قابل لوگ باہر جا کر کیوں رہنا پسند کرتے ہیں۔'' (کیوں؟)

محمد جاوید بلوچ تحصیل علی پور سے لکھتے ہیں ''خوب صورت جاسوسی گرل کے چہرے میں سب سے زیادہ ہونٹ پیارے لگے۔ ضرورت سے زیادہ بڑے بُندے نے حسینہ کی دلکشی میں واضح کمی کی۔ دائیں جانب ہمایوں سعید راج حسینہ کی ترچھی نگاہوں سے بچنے کی کوشش میں کوشاں ہیں۔ کاجل کی دھار میں عورت محبوب چھپا لیتی ہے تو سنا تھا، بندے میں بھی چھپا لیتی ہے پہلی بار دیکھا ہے۔ کاشف زبیر روایتی کہانیوں سے ہٹ کر خوراک کے عالمی مسائل کی جانب اشارہ کرتی ہوئی تحریر لائے۔ طاہر جاوید مغل جارج گورے کی دردناک موت کے بعد للکار کو نیا موڑ دے رہے ہیں۔ سلطانہ پر ویسے یقین تھا کہ یہ عورت بدکار نہیں ہو سکتی۔ طاہر صاحب دلوں کو دھڑکانا خوب جانتے ہیں۔ (اچھا انکشاف ہے) گرداب واقعی نام کی طرح گرداب ہے۔ ہر کردار خاص ہو یا عام، گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ ماہ بانو کس نئی مشکل میں پھنس گئی ہے، یہ تو اگلی قسط پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔ منظر امام پُراثر تحریر لائے ہیں۔ تنویر سا پایا جیسے لوگ تائب ہو رہے ہیں تو کہیں یعقوب جیسے لوگ مغربی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ بس میں خودکش دھماکے کی گونج دل نے بھی محسوس کی، انجام انتہائی افسوس ناک ہوا۔ پروین زبیر نے ہنسا ہنسا کر پہلے رنگ کی چھائی ہوئی اداسی کی دبیز تہ ہٹا دی۔ حریفِ جاں میں ناکام عاشقوں کی بے بسی قابلِ دید تھی۔''

مالاکنڈ ایجنسی سے **صبا گل کی آتش فشانی** ''کہیے کیسا مزاج ہے؟ اس دفعہ تو ڈائجسٹ نے اتنا انتظار کروایا کہ ہمیں خوار ہی کیا۔ جتنا جلدی ملنا چاہیے تھا، اتنا ہی لیٹ ملا۔ چینی نکتہ چینی میں اپنا خط نہ پا کر غصہ دہرا ہو گیا۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔ اپنے ہاتھ پر کاٹنے کے سوا۔ میرے خط کو شاید یا تو آپ لوگوں نے ہاتھ لگانا ضروری نہ سمجھا تھا یا پھر ڈاک والوں کی غیر معمولی کارکردگی تھی یعنی پوسٹ نہیں ہوا تھا۔ دل کرتا ہے کہ خوب کھری کھری سناؤں مگر کس کو؟ (ارے ارے اتنا غصہ! بلڈ پریشر بڑھ جائے گا۔ خط وقت پر تو پوسٹ کیا تھا نا آپ نے؟) بس راتوں رات جتنی کہانیاں پڑھ لی تھیں، ان پر تبصرہ حاضر خدمت ہے۔ (شکریہ بہت بہت) سب سے پہلے للکار پڑھی۔ جارج گورا بدترین انجام سے دوچار ہوا مگر میرا کلیجا اب بھی گرم ہے۔ ٹھنڈا یہ تب ہوتا جب میں اپنی آنکھوں سے اس کو تڑپ تڑپ کر مرتا ہوا دیکھ لیتی۔ (رحم ..... رحم ...) بہرحال، خس کم جہاں پاک ہو گیا۔ عمران کے ہلکے پھلکے موڈ سے محظوظ ہوئی۔ (شکر ہے) آخر میں سلطانہ کے کردار پر جو شک کیا گیا تھا، ایک عورت کی ذکاوت حس سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ سلطانہ ہرگز ایسی نہیں کہ شوہر کی موجودگی میں کسی غیر مرد سے ناجائز تعلق استوار کر سکے۔ (واہ بھئی، آپ تو پہنچی ہوئی بھی ہیں ...) دوسرے نمبر پر کاشف زبیر صاحب کی الجھاوا پڑھی جو کہ بے حد عمدہ کہانی تھی۔ تیسری اور آخری کہانی گرداب پڑھی۔ ماہ بانو اور اسلم کا ساتھ حسبِ معمول برا لگا۔ اچھا ہی ہوا کہ بچھڑ گئے دونوں۔ اللہ کرے کبھی نہ ملیں پھر۔ (افوہ، اب دل جلی باتیں چھوڑ بھی دو ..... ابھی تک کھول رہی ہو ...) انعام کے حق دار شکیل کاظمی صاحب! آپ کو بہت مبارک۔ بھئی اپنی دعاؤں میں یاد کر کے کبھی ہمیں بھی حکمرانی کا موقع دے دیں نا! ہمایوں سعید! تمہارے الفاظ ایک بار راج کی طرف دیکھو گی تو دھڑکنوں کو فل اسٹاپ لگ جائے گا، پڑھ کر ہنسی آئی۔ دھڑکنیں تب دھڑکتی ہیں جب سامنے کوئی پری چہرہ آ جائے۔ جب سامنے راج ہو تو دھڑکنوں کو واقعی فل اسٹاپ لگ جاتا ہے۔ سعدیہ صاحبہ! اگر آپ کو آئندہ ماہ تک کسی نے مطلوبہ رسالہ ارسال نہ کیا تو میں ضرور ارسال کروں گی۔''

محمد نعمان پیارے کی کاوش ملتان ''جاسوسی 14 اکتوبر کو ملا۔ ٹائٹل حسبِ روایت جاذبِ نظر اور ڈائجسٹ کے شایانِ شان تھا۔ ٹائٹل حسینہ کانوں میں انسانی چہرے والی بالیاں پہنے سائیڈ پوز دے رہی تھی اور اس کے نیچے واقع شخص کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا؟ یہ معلوم نہیں۔ اس کے بعد محبت کی گاڑی میں سوار ہو کر محفلِ یاراں کی سیر کا پروگرام بنایا۔ گاڑی کو محفل کے تھوڑا پیچھے پارک کر کے باقی کا سفر پیدل طے کرنے کا سوچا۔ سب سے پہلے کرسیِ صدارت پر براجمان سید شکیل کاظمی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ شکیل صاحب! تبصرہ شان دار تھا اور مبارک باد۔ گلے لگا کے۔ دلنشین صاحبہ! آپ ماہ جبیں کی تعریف ضرورت سے کچھ زیادہ کر گئی ہیں۔ ہتھ ہولا رکھو۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی خوب صورت تھے۔ کہانیوں کی ابتدا برعکس سے ہوئی۔ برعکس اچھی کہانی تھی۔ مجرم مائیکل گو کہ بہت چالاک تھا مگر اچھے اچھوں سے بھی ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جو کہ پکڑے جانے کا باعث بنتی ہیں، ایسا کچھ مائیکل کے ساتھ بھی ہوا۔ اعترافِ رقابت ایک دردناک داستان تھی۔ واقعی بظاہر پُرسکون نظر آنے والے لوگوں کے اندر کتنا بڑا طوفان پوشیدہ ہے اور وہ کتنے سخت مصائب جھیل چکے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ دماغ لگا کے۔ تیسرے نمبر پر مختار آزاد کی گمشدہ تصویر پڑھی جو کہ ایک پیچیدہ مگر لاجواب کاوش تھی۔ ڈیوڈ نے تندہی سے کام کر کے مجرموں کو پکڑوانے میں قانون کی مدد کی۔ اپنی من پسند اور ہر دلعزیز سلسلے وار کہانی للکار کی اس مرتبہ کی قسط پڑھ کر تو مزہ دوبالا ہو گیا۔ بدبخت جارج گورا اپنے منطقی انجام کو پہنچا اور تابی کو فتح نصیب ہوئی۔ رہائی کے ڈھونگ میں رنجیت پانڈے اور اس کے ہرکاروں نے عمران اور تابی کی موت کا مکمل سامان کر رکھا تھا مگر وہ عمران ہی کیا جو دشمنوں کی چال میں آ جائے۔ سلیم انور صاحب کی فریب نظر دلچسپ کہانی تھی۔ آرتھر کو اپنی بیوی سے بالکل بھی محبت نہیں تھی اور ایسے شخص کے لیے بہترین جگہ جیل سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی۔ رضوانہ منظر کی داستان وفاپرست، سنجیدہ اور قابلِ ستائش تھی۔ باقی کہانیوں میں واجب القتل اور لبِ بام بھی کافی پسند آئیں۔''

سید عبادت کاظمی ڈیرہ اسماعیل خان سے حاضر ہیں ''ماہ اکتوبر کا شمارہ حسبِ معمول 7 تاریخ کو ملا۔ اس دفعہ ٹائٹل سے زیادہ ٹائٹل گرل کے جھمکے نے متوجہ کیا البتہ حسینہ کی آنکھیں کافی خوب صورت تھیں۔ تبصروں کی محفل میں سید شکیل کاظمی کرسیِ صدارت پر براجمان تھے۔ اتنا خوب صورت اور مکمل تبصرہ مبارک ہو بھئی۔ ہمیں جھٹکا تب لگا جب ہمایوں سعید کو ماہا ایمان کی تعریف کرتے پایا، گڑبڑ ہے۔ ہمایوں صاحب! آپ کو کیا اگر تفسیر عباس ماہا ایمان کے پیچھے منہ دھوئے بغیر پڑے یا منہ دھو کر۔ ماہا ایمان ہمیشہ کی طرح سب سے لڑتی نظر آئیں۔ (بھئی وہ کسی سے نہیں لڑتیں ..... اتنی نوک جھونک زندگی کے لیے ضروری ہے) کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی جو کہ اب بہت بور ہوتی جا رہی ہے۔ للکار واہ جی واہ! تابی کی جیت کی بہت خوشی ہوئی۔ یہ سلطانہ تو بہت خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر نے ہمیشہ کی طرح اچھا لکھا۔ رنگوں میں منظر امام نے ہمارے معاشرے کے ایک پہلو کو اجاگر کیا۔ روزنہ جانے کتنے راجو جیسے لڑکے ان ظالموں کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ پروین زبیر کی کہانی نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ اعترافِ رقابت اور وفاپرست بھی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔''

ان قارئین کے نام جن کے مکتوبات جگہ کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکے۔

چودھری محمد سرفراز، جتوئی۔ رابعہ صفدر، ضلع لیہ۔ عامر رسول، راولپنڈی۔ تحریم تلوکر، خوشاب۔ محمد طیب، منچن آباد۔ سارہ راجپوت، راولپنڈی۔ محمد عزیز ترین، راولپنڈی۔ علی آتش، الہ آباد۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا، چکوال۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ محسن علی، بالاکوٹ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اولین صفحات کی زینت ایچ اقبال کے قلم کی خاص سوغات

گھر کا چراغ

ایچ اقبال

زندگی کے دورا ہے پر بعض اوقات ایسی سنسنی خیزاور تکلیف دہ غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں ... جن کا ازالہ ممکن تو ضرور ہوتا ہے ...لیکن ذہن کے نہاں خانے سے ان کے نقش محو نہیں ہوتے ...وہ ان مٹ نقوش ہمیں تادم۔ مرگ ایک کسک میں مبتلا رکھتے ہیں ... ایک ایسے ہی تکون کے گرد گھومتی داستانِ رنج والم ... جس کے کردار بظاہر ایک ہی بندھن میں بندھے ہوئے تھے لیکن ان کی راہیں جداجدا کردی گئی تھیں...

انسانی سرشت میں پنہاں لالچ وطمع کے ان دیکھے سمندر کا مدوجزر

ٹرین ابھی دکھائی بھی نہیں دی تھی، صرف اس کی سیٹی کی آواز سنائی دی تھی لیکن پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی۔ لوگ بڑی عجلت میں اپنا سامان ٹھیک کرنے لگے۔ کیونکہ میل ٹرین اس اسٹیشن پر صرف پانچ منٹ رکتی تھی۔

وہ ایک چھوٹے سے شہر کا اسٹیشن تھا لیکن یہ چھوٹا سا اسٹیشن شہر کے علاوہ ایک قصبے کے لوگوں کے لیے بھی کام آتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے ایک جانب شہر اور دوسری جانب ایک قصبہ بھی تھا۔ قصبہ بھی کیا، اسے کسی حد تک ترقی یافتہ گاؤں کہا جاسکتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن اور ایک نہر قصبے اور شہر کے درمیان گویا حدِ فاصل تھی۔ نہر پر ایک پل تھا جس پر اپنے چھکڑوں وغیرہ میں وہ لوگ اسٹیشن آیا جایا کرتے تھے۔

شہر کے حصے کی طرف کے پلیٹ فارم پر جو روشنیاں تھیں، وہی دوسرے پلیٹ فارم کو کسی حد تک روشن رکھتی تھیں۔ روشنی کا وہ عکس پلیٹ فارم سے آگے چند گز تک جاتا تھا۔ اس کے بعد تاریکی پھیلی ہوئی تھی یا بہت دور گاؤں کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ کوئی ایک میل کا فاصلہ تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ نہر اور اس کا پل بھی دکھائی نہیں دیتا تھا جو اسٹیشن اور اس گاؤں کے درمیان واقع تھا۔

سیٹی کی آواز سن کر جو لوگ سرگرم ہوئے تھے، ان میں شمعون اور اس کی بیوی سمیرا نہیں تھے۔ اس جوان العمر جوڑے کے پاس زیادہ سامان ہی نہیں تھا۔ بس ایک سوٹ کیس اور ایک ہینڈ بیگ۔ زیادہ سامان کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ شمعون صرف ایک دن کے لیے اپنے والد جہاں داد خاں سے ملنے شہر آیا تھا۔ جہاں داد اس شہر کا ایک رئیس تھا۔ شمعون نے ایک بڑے شہر میں انٹیریئر ڈیکوریٹر کی حیثیت سے اپنا دفتر کھول لیا تھا جس کی شہر میں خاصی شہرت تھی۔

جب ٹرین کی ہیڈ لائٹس دکھائی دینے لگیں تو سمیرا نے ہینڈ بیگ سنبھالا۔

''اتنی عجلت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' شمعون بولا۔ ''ہم بڑے آرام سے سوار ہو سکتے ہیں۔''

''میں تمہاری طرح تحمل مزاج نہیں ہوں ڈیئر!'' سمیرا نے بڑی محبت سے شمعون کی طرف دیکھا۔

شمعون چپ رہا۔

ٹرین قریب آتی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پلیٹ فارم کی ہلچل میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

اچانک کچھ لوگوں نے چونک کر دیکھا کہ ایک جوان العمر لڑکی دوسری طرف پھیلے ہوئے اندھیرے سے اس طرف کے پلیٹ فارم پر چڑھی تھی۔ کم روشنی کے باعث اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کی حرکات وسکنات ظاہر کررہی تھیں کہ وہ بہت گھبرائی ہوئی ہے۔

وہ پلیٹ فارم سے اس طرف اترنے لگی جہاں ٹرین کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پٹریاں تھیں۔

''ارے ارے۔'' کوئی چیخا۔

''ادھر ہی رہو لڑکی۔'' کوئی اور چیخا۔ ''ٹرین قریب آگئی ہے۔''

اس کے بعد تو خاصا شور مچ گیا۔ جن لوگوں نے لڑکی کو دیکھا تھا، وہ بھی شور مچانے لگے، لیکن لڑکی نے پہلی پٹری عبور کرلی۔ اب وہ اتنی روشنی میں تھی کہ اس کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔

''کیا یہ کوئی پاگل ہے؟'' سمیرا نے شمعون سے کہا۔ ''یہ اپنی موت کو دعوت دینے جارہی ہے۔''

اسی وقت شمعون تیزی سے آگے بڑھا اور جست لگا کر نیچے کود گیا۔ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ وہ اس لڑکی کو ٹرین کی زد پر آنے سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود لوگوں نے اسے بھی روکنے کے لیے چیخ پکار کی۔ خود سمیرا بھی چیخ پڑی تھی۔

''شمعون!''

پلیٹ فارم میں داخل ہونے کے بعد ٹرین کی رفتار سست تو ہوچکی تھی لیکن بہت زیادہ سست بھی نہیں تھی۔ اس کا انجن خاصا آگے جاکر رکتا۔ اس کی ٹکر لڑکی اور شمعون کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ لڑکی نے دوسری پٹری بھی پار کرلی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ٹرین سے پہلے اس پلیٹ فارم پر آجانا چاہتی ہو۔

''شمعون!'' اس مرتبہ سمیرا کی چیخ ہذیانی تھی۔

دھڑ دھڑ کرتا انجن بالکل سامنے آنے کو تھا لیکن اس وقت شمعون نے اپنی طرف کی دوسری پٹری پار کرلی تھی اور اس پٹری پر آنے والی لڑکی کو زور سے دھکا دے چکا تھا۔

انجن شور مچاتا ہوا سامنے سے گزر گیا۔ اب ڈبے گزر رہے تھے۔ اب لوگوں کی نظریں دوسری طرف دیکھنے سے قاصر تھیں۔ انہوں نے بس اتنا دیکھا تھا کہ شمعون اس لڑکی کو ٹرین کی زد میں آنے سے بچانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

''شمعون!'' سمیرا روہانسی ہوکر بے تابانہ آگے بڑھی لیکن کسی عورت نے اسے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''ٹرین سے ٹکراؤ گی کیا؟'' سمیرا کو روکنے والی نے کہا۔

اسی وقت کئی گولیاں پے در پے چلیں۔ ان دھماکوں سے لوگ گھبرا گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے مگر گولیاں ان کے پلیٹ فارم پر نہیں چلی تھیں۔

کوئی چیخا۔ ''ٹرین کے اس طرف ہوئی ہے فائرنگ۔''

''شمعون!'' سمیرا سسکنے لگی۔

''گھبراؤ نہیں۔'' عورت بولی۔ ''تمہارے ساتھ جو تھا، وہ بچ گیا ہے۔ اس نے بڑی بہادری سے لڑکی کو بھی بچا لیا ہے۔''

''گولیاں چلی ہیں۔'' سمیرا کی آواز کانپ گئی۔

اس بات کے جواب میں عورت کچھ نہیں کہہ سکی لیکن گولیاں چلنے کی آواز سے پلیٹ فارم پر خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ریلوے پولیس کے آدمی بھی دوڑے چلے آئے تھے۔

جیسے ہی ٹرین رکی، لوگوں نے ڈبوں میں سوار ہونا شروع کردیا۔ وہ جاننے کے لیے متجسس تو ہوں گے کہ وہاں کیا ہوا تھا لیکن انہیں یہ فکر بھی تھی کہ ٹرین چھوٹ گئی تو وہ وہیں رہ جائیں گے۔

ایک ڈبے میں سمیرا بھی چڑھی اور دوسری طرف کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے دوسری طرف کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑتے ہوئے شمعون کو پکارا لیکن شمعون دکھائی دیا، نہ وہ لڑکی۔

دراصل شمعون قریب کے دوسرے ڈبے کے دروازے سے ٹرین پر چڑھ آیا تھا۔

زیادہ تر مسافر ٹرین میں سوار ہوچکے تھے۔ اس طرف کے پلیٹ فارم پر چند مسافروں اور چند قلیوں کے علاوہ ریلوے پولیس کے لوگ تھے۔ انہوں نے شمعون کو ڈبے سے اترتے دیکھا۔ وہ لڑکی کو اپنے دونوں ہاتھوں پر سنبھالے ہوئے تھا اور ایک ہی نظر میں یہ بات محسوس کی جاسکتی تھی کہ وہ لڑکی بے ہوش تھی۔

''شاباش بہادر نوجوان!'' کسی بوڑھے نے کہا۔ ''اس لڑکی کی زندگی بچالی تم نے۔ یہ ضرور ٹرین کے نیچے آجاتی۔''

شمعون نے بوڑھے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اسے ریلوے پولیس کے لوگوں نے گھیر لیا تھا۔

''یہ بے ہوش ہوگئی ہے۔'' نوجوان شمعون نے پولیس والوں سے کہا۔ ''اسے کہیں لٹا کر ہوش میں لانا ہوگا۔''

''اسٹیشن ماسٹر کا کمرا۔'' کسی نے تجویز دینے والے انداز میں کہا۔

اس دوران میں سمیرا واپس آچکی تھی اور اس نے شمعون کا بازو پکڑتے ہوئے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''تم ٹھیک ہونا شمعون؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' شمعون نے پولیس والوں کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دی تھیں؟''

''میں نے چلائی تھیں۔'' شمعون نے کہا۔ ''ہوائی فائرنگ کی تھی۔ کچھ لوگ اس لڑکی کے پیچھے دوڑے چلے آرہے تھے۔ یہ لڑکی انہی سے بچنے کے لیے بھاگ رہی تھی۔ ہوائی فائرنگ ہوئی تو وہ لوگ بھاگ گئے۔'' پھر شمعون نے دوبارہ کہا۔ ''تم سامان کا خیال رکھو۔''

''ادھر کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟'' ریلوے پولیس کے آفیسر نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے نہیں۔'' شمعون نے جواب دیا۔

اس جواب کے باوجود آفیسر نے کچھ سپاہیوں کو دوڑا دیا۔ وہ ٹرین کے ڈبوں میں سوار ہوگئے تاکہ دوسری طرف سے اتر سکیں۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی ٹارچیں تھیں۔

شمعون پولیس والوں کے ساتھ لڑکی کو اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں لے آیا اور اسے ایک لمبی بینچ پر لٹا دیا۔

''گولیاں آپ نے چلائی تھیں؟'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''لائسنس تو ہوگا آپ کے پاس؟''

''پہلے اس لڑکی کو ہوش میں لانے کی فکر کیجیے۔'' شمعون نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے پوچھ گچھ آپ بعد میں بھی کرسکتے ہیں۔ میں کہیں بھاگا نہیں جارہا ہوں۔ میری بیوی بھی میرے ساتھ ہے۔'' اس نے اشارہ کیا۔

اس وقت سمیرا اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک قلی تھا جو سوٹ کیس اور بیگ اٹھائے ہوئے تھا۔

کہیں سے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا گیا جس نے لڑکی کا معائنہ کیا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ ابھی ہوش میں آجائیں گی۔'' اس نے کہا اور لڑکی کو انجکشن لگانے لگا۔

شمعون تشویش سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ سمیرا اب اس سے لگی کھڑی تھی۔ قلی کو اس نے کچھ پیسے دے کر رخصت کردیا تھا۔

ٹرین کی سیٹی سنائی دی۔ وہ روانہ ہونے والی تھی۔

''اب ہمیں کل تک انتظار کرنا ہوگا۔'' سمیرا نے شمعون سے کہا۔

شمعون کچھ نہیں بولا۔ اس کی توجہ لڑکی کی طرف تھی۔

''آپ کا لائسنس؟'' پولیس آفیسر نے دوبارہ شمعون سے پوچھا۔

شمعون نے اسے کچھ غصے سے دیکھا اور پھر جیب سے لائسنس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''شمعون!'' سمیرا بولی۔ ''ڈیڈی کو اطلاع دے دوں؟'' اس نے اپنا موبائل فون نکال لیا تھا۔

''نہیں۔'' شمعون نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ اس کی نظریں لڑکی ہی پر جمی ہوئی تھیں۔

اس وقت وہ پولیس والے بھی واپس آگئے جنہیں ان کے آفیسر نے بھیجا تھا۔

''وہاں کوئی نہیں ہے سر!'' انہوں نے بتایا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ وہ بھاگ گئے تھے۔'' شمعون بولا۔ اس کی توجہ اب بھی لڑکی ہی کی طرف تھی جس کے پپوٹے اب لرزنے لگے تھے۔

''یہ ہوش میں آرہی ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔

پولیس آفیسر نے شمعون کا لائسنس واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی کے پیچھے آنے والے کون لوگ تھے؟''

''میں ان کا ساتھی نہیں ہوں کہ ان کے بارے میں بتا سکوں۔'' شمعون نے تلخی سے کہا۔

پولیس آفیسر بگڑ کر بولا۔ ''آپ اتنے اکھڑے ہوئے انداز میں جواب کیوں دے رہے ہیں؟''

''آپ کا سوال ہی غلط ہے۔'' شمعون نے کہا۔ ''میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ وہ لوگ کون تھے؟ یہ تو شاید یہ لڑکی ہی بتا سکتی ہے۔''

پولیس آفیسر چپ ہوگیا۔ اسے بھی احساس ہوگیا کہ واقعی اسے شمعون سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''یہ لڑکی بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔'' پولیس آفیسر نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''مجھے یہی بتایا گیا ہے... پھر یہ بے ہوش کیسے ہوگئی؟''

''دہشت سے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''جب ان صاحب کی وجہ سے اس نے خود کو محفوظ پایا تو بے ہوش ہوگئی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ خطرے سے بچ نکلنے کے بعد اس خطرے کا خیال اتنا دہشت زدہ کردیتا ہے کہ انسان بے ہوش ہوجاتا ہے۔''

اس وقت لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''تم اب محفوظ ہو بچی۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔

لڑکی جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اب وہ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اسے وہ حالات یاد آگئے تھے جن سے وہ گزری تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' پولیس آفیسر نے اس سے پوچھا۔ ''وہ لوگ کون تھے جن سے بچ کر تم بھاگ رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں؟''

پولیس آفیسر نے بیک وقت دو سوال کر ڈالے تھے مگر لڑکی نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں شمعون پر جم گئی تھیں۔

''انہی صاحب نے تمہیں بچایا ہے۔'' ڈاکٹر نے اسے بتایا۔ ''ورنہ تم ٹرین کے نیچے آسکتی تھیں۔''

نہ جانے کیوں اس وقت شمعون لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''کون ہیں یہ؟'' لڑکی نے آہستہ سے پوچھا۔ اب اس کے چہرے سے خوف کے تاثرات زائل ہو گئے تھے۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' آفیسر نے شمعون سے پوچھا۔

''لائسنس پر آپ نے نہیں پڑھا؟''

''کچھ نامانوس سا نام ہے آپ کا، میں صحیح طور پر پڑھ نہیں سکا۔''

''شمعون۔'' شمعون نے جواب دیا اور کچھ متفکر انداز میں لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

لڑکی اب اس طرح ہر ایک کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ان سب کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

آفیسر جو سوال اس سے کر چکا تھا، وہ اس نے پھر دہرائے۔

جواب دینے کے بجائے لڑکی کے چہرے پر الجھن کا تاثر ابھرا۔

''میرا نام... میرا...'' لڑکی اس طرح بڑبڑانے لگی جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اس وقت ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثر کے ساتھ تشویش بھی نظر آئی۔

''مجھے... مجھے...'' لڑکی ہانپنے لگی۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔''

''کچھ لوگ تمہارا پیچھا کر رہے تھے۔'' پولیس آفیسر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم ان سے بچ کر بھاگ رہی تھیں اور ریلوے اسٹیشن تک آگئی تھیں۔ تم ٹرین کے نیچے آجاتیں، اگر ان صاحب نے تمہیں بچانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر نہ لگائی ہوتی۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔'' لڑکی روہانسی ہوئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈاکٹر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''یہ لڑکی شاید اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہے۔''

''آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔'' شمعون نے آہستگی سے کہتے ہوئے نرمی سے پولیس آفیسر کا بازو پکڑا۔

پولیس آفیسر نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''پلیز!'' شمعون نے کہا۔ اب اس کا لہجہ بہت نرم پڑ گیا تھا۔ اس نے ایک طرف قدم بھی بڑھایا۔ پولیس آفیسر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ان کے پیچھے سمیرا نے بھی قدم بڑھائے۔

''تم یہیں رکو سمیرا!'' شمعون نے پلٹ کر اس سے کہا۔ ''لڑکی کے پاس۔''

سمیرا رک گئی۔ لڑکی اب بھی رو رہی تھی۔ ڈاکٹر اور پولیس والے اس کے قریب تھے۔ پولیس والوں نے کسی اور کو وہاں نہیں رکنے دیا تھا، ورنہ کئی قلی اور اسٹیشن کے عملے کے لوگ وہاں ضرور رکتے۔ اسٹیشن سے تعلق رکھنے والوں میں سے صرف اسٹیشن ماسٹر ان کے ساتھ تھا۔

''رو نہیں بچی۔'' ڈاکٹر بہت دردمند قسم کا شخص تھا۔ ''تمہیں گھبرانا نہیں چاہیے۔ تم جلد ہی سنبھل جاؤ گی۔ تمہیں سب کچھ یاد آجائے گا۔''

مگر لڑکی روتی رہی۔

شمعون اور پولیس آفیسران سب کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

سمیرا بہت پریشان نظر آرہی تھی۔ وہ کبھی روتی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتی، کبھی اس طرف جدھر شمعون اور پولیس آفیسر گئے تھے اور کبھی وہ کچھ سوچنے لگتی۔

دفعتاً بجنے والی موبائل فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ وہ آواز اس کے وینیٹی بیگ سے آئی تھی۔ موبائل بیگ ہی میں تھا۔ وہ اس نے جلدی سے نکالا۔ اسے حیرت ہوئی کہ کال کرنے والا شمعون تھا۔

''کیا بات ہے شمعون؟'' اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم کہاں چلے گئے ہو؟ میں بہت پریشان ہوں۔ وہ لڑکی...''

دوسری طرف سے شمعون نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں قریب ہی ہوں۔ بس دس منٹ لگیں گے۔ تم اپنا موبائل آف کر دو۔''

''کیوں؟'' سمیرا کی حیرت فطری تھی۔

''کسی وجہ سے کہہ رہا ہوں، بعد میں وجہ بھی بتا دوں گا۔ اب تم میری باتوں کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے

بس اپنا موبائل آف کر دو۔''

سمیرا نے شمعون کی ہدایت کے مطابق اپنا موبائل آف کر دیا۔ شمعون کی یہ ہدایت اس کے لیے پریشانی کا سبب بنی تھی۔

☆☆☆

اسٹیشن ہی کے کسی کمرے میں پولیس آفیسر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر شمعون! اور اب اس معاملے کا کہیں کوئی اندراج نہیں ہوگا۔''

''اسٹیشن ماسٹر؟''

''آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ میں سب دیکھ لوں گا لیکن اصل بات... بلکہ مسئلہ اس لڑکی کا ہے۔ کیا وہ آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے گی؟''

''وہ صدمے سے اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔ اس وقت اسے کہیں سے بھی کوئی سہارا ملے گا تو وہ اس سے گریز نہیں کرے گی۔''

''لیکن اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا مسٹر شمعون!''

اس مختصر سی گفتگو کے دورانیے میں پولیس آفیسر کے لہجے میں جارحیت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے برخلاف اس کا انداز کچھ خادمانہ سا ہو گیا تھا۔

شمعون نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''اگر وہ لڑکی میرے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو پھر آپ اپنے فرائض کے مطابق کام کیجیے گا... آئیے۔'' شمعون واپسی کے لیے مڑا۔

پولیس آفیسر بھی اس کے پیچھے آیا۔ وہ دونوں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سمیرا تیزی سے شمعون کے قریب پہنچی۔

''کہاں چلے گئے تھے؟'' وہ کچھ روہانسی ہو گئی تھی۔

''پندرہ منٹ لگا دیے۔''

''سب ٹھیک ہے۔'' شمعون نے اس کا شانہ تھپک کر اس کی ڈھارس بندھائی۔

اس دوران میں پولیس آفیسر نے اپنے تمام آدمیوں کو کمرے سے رخصت کر دیا تھا۔ پولیس آفیسر ہی کے کہنے پر اسٹیشن ماسٹر نے اپنے لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر کو بھی رخصت کر دیا تھا۔

وہ لڑکی اب رو نہیں رہی تھی، بس ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''لڑکی!'' پولیس آفیسر نے لڑکی سے کہا۔ ''تمہیں اپنا نام یاد آیا؟''

لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

پولیس آفیسر پھر بولا۔ ''یہ بھی یاد نہیں کہ تمہارا گھر کہاں ہے؟''

لڑکی نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

تیسری بار بھی پولیس آفیسر ہی بولا۔ ''تو اب تم کہاں جاؤ گی؟''

اس وقت شمعون بول پڑا۔ ''میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہوں نا آفیسر۔''

سمیرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

شمعون نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں اس کا علاج کرواؤں گا۔ جب اس کی یادداشت واپس آجائے گی تو یہ اپنے عزیزوں کے پاس چلی جائے گی۔ ہاں، اگر اس دوران میں اس کا کوئی وارث سامنے آئے تو آپ مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنا کارڈ دے دیا ہے آپ کو۔ اس پر میرا موبائل نمبر، گھر کا ٹیلی فون نمبر، میرا پتا، سب کچھ ہے۔''

پولیس آفیسر نے سر ہلا کر اس لڑکی سے کہا۔ ''یہ صاحب تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو؟''

لڑکی خالی خالی نظروں سے شمعون کی طرف دیکھنے لگی۔

شمعون نے دھیمی آواز میں سمیرا سے کہا۔ ''تم اسے سہارا دے کر اٹھاؤ۔ تم بھی اس سے کہو کہ یہ ہمارے ساتھ چلے۔''

سمیرا نے پریشانی کے عالم میں شمعون کی ہدایت پر عمل کیا۔ لڑکی ابھی تک اسی بینچ پر لیٹی ہوئی تھی جہاں اسے لٹا کر ہوش میں لایا گیا تھا۔ سمیرا نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

لڑکی کچھ نہیں بولی لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو گیا کہ وہ شمعون اور سمیرا کے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہے۔

اسی دوران میں شمعون نے محسوس کیا کہ اسٹیشن ماسٹر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پولیس آفیسر سے کوئی سوال کیا تھا۔ پولیس آفیسر نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے جواب دیا تھا۔ غالباً اسٹیشن ماسٹر نے اس معاملے کا پس منظر جاننا چاہا ہوگا اور پولیس آفیسر نے اسے تسلی دے دی ہوگی کہ وہ بعد میں اسے تفصیل سے آگاہ کر دے گا۔

شمعون نے اپنا موبائل فون نکالا۔ وہ کسی سے رابطہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شمعون نے جلدی سے فون اپنے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں جمیل۔''

''میں اسٹیشن کے باہر موجود ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''تم نے کہا تھا، اس لیے میں اندر نہیں آیا۔''

''ٹھیک ہے، ہم آرہے ہیں۔'' شمعون نے کہا اور موبائل بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

وہ لڑکی نظریں جھکائے سمیرا کے ساتھ کھڑی تھی۔

''چلو۔'' شمعون نے سمیرا سے کہا۔ ساتھ ہی لڑکی کی طرف بھی اشارہ کیا۔ سمیرا نے لڑکی کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔

''شکریہ آفیسر!'' شمعون نے جلدی سے پولیس آفیسر سے مصافحہ کیا۔ اسے اتنی عجلت تھی کہ اس نے اسٹیشن ماسٹر کو نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ سمیرا اور اس لڑکی کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے باہر آ گیا۔

پولیس والے وہاں موجود تھے۔ اسٹیشن کے عملے کے کچھ افراد بھی نظر آئے۔ انہوں نے لڑکی کو سمیرا اور شمعون کے ساتھ جاتے ہوئے کچھ تعجب سے دیکھا۔ شمعون سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ خود اٹھائے ہوئے تھا۔

لڑکی اب پھر کچھ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''ڈرو نہیں کسی بات سے۔'' شمعون نے اس سے کہا۔

''ہم ہیں نا تمہارے ساتھ۔''

لڑکی کچھ نہیں بولی۔ وہ تینوں کمرے سے نکل آئے۔

وہاں قندیلوں جیسے دو الیکٹرک پولز تھے جن کی مدھم روشنی میں وہاں دو کاروں کے علاوہ کسی قسم کی سواری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اب وہاں سے نہ کسی ٹرین کو اس وقت آنا تھا، نہ جانا تھا اس لیے آٹو رکشا یا دوسری گاڑیوں والے وہاں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے۔

وہاں جو دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں، ان میں سے اگلی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک نوجوان اترا۔ شمعون، سمیرا اور اس لڑکی کے ساتھ اسی کی طرف بڑھا۔

''تھینک یو جمیل!'' شمعون نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت بروقت گاڑی لے آئے۔''

جمیل نے سمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی اور پھر اس لڑکی پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے شمعون سے پوچھا۔ ''آخر معاملہ کیا ہے؟''

''میں نے فون پر تمہیں مختصر طور پر جو کچھ بتایا تھا، اس سے زیادہ فی الحال نہ پوچھو... میں جلد ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ ابھی تو مجھے ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دوسری گاڑی تمہارے ہی ساتھ ہے نا؟''

''ہاں، بھائی صاحب کی گاڑی ہے۔ شوفر کو ساتھ لانا مجبوری تھی۔''

''تم دونوں پیچھے بیٹھ جاؤ۔'' شمعون نے اس کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے سمیرا سے کہا۔ پھر خود سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ ڈکی میں رکھنے لگا۔

سمیرا نے پہلے لڑکی کو بٹھایا پھر خود بیٹھنے لگی۔

''ابھی تم کسی سے بھی کچھ کہنا نہیں۔'' شمعون نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے جمیل سے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ تمہاری کار تمہیں کل تک واپس مل جائے۔''

''مجھے کار کی فکر نہیں ہے۔ یہ معاملہ مجھے الجھن میں ڈالے رکھے گا۔''

کار کی چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ شمعون نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا نا... میں جلد ہی تم سے رابطہ کروں گا اور تمہیں تفصیل بتا دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی شمعون کار حرکت میں لے آیا تھا۔

''یہ جمیل صاحب...'' سمیرا بولی۔ ''شاید ایک بار ملایا تھا تم نے مجھے ان سے۔''

''ہاں۔'' شمعون نے جواب دیا۔

''ڈیڈی کے گھر چل رہے ہو نا؟''

''نہیں۔''

''اپنے گھر؟'' سمیرا نے تیزی سے کہا پھر بولی۔ ''چھ گھنٹے کا راستہ ہے شمعون!''

اسی وقت شمعون کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا لیکن کال ریسیو کرنے سے پہلے کسی سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا بات ہے؟ کس کا فون ہے؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''ڈیڈی کا۔'' شمعون نے متفکر لہجے میں جواب دیا۔

''تو کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

''سوچ رہا تھا کہ... اچھا خیر... اب تم بالکل چپ رہنا۔ میں کال ریسیو کر رہا ہوں۔'' شمعون نے موبائل کان سے لگایا۔ ''جی ڈیڈی۔''

''تم کہاں ہو شمعون؟'' دوسری طرف سے اس کے باپ جہاں داد خاں نے پوچھا۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ''اسٹیشن پر جو واقعہ پیش آیا ہے، مجھے ابھی ابھی اس

کی اطلاع ملی ہے۔''

''کس نے اطلاع دی ڈیڈی؟''

''اسٹیشن کے عملے کا ایک نوجوان ہے۔ وہ سرکاری ملازمت میں جانے سے پہلے میری فیکٹری میں کام کیا کرتا تھا۔ وہ تمہیں بھی پہچانتا ہے۔ اسی نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم نے شاید کسی کو فون کر کے کار منگوائی تھی اور اب اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر اسٹیشن سے روانہ ہوئے ہو۔''

''جی ہاں ڈیڈی۔''

''کیوں؟ اسے اپنے ساتھ کیوں؟ اور تم نے ایک اجنبی لڑکی کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی؟''

جہادادخاں کا لہجہ اس مرتبہ جھنجلایا ہوا سا تھا۔

''انسانیت کا تقاضا یہی تھا ڈیڈی۔''

''اچھا، اب گھر آؤ تو تم سے بات کرتا ہوں۔''

''میں آپ کے پاس نہیں آرہا ہوں ڈیڈی۔''

''کیوں؟ جب ٹرین ہاتھ سے نکل گئی ہے تو اب کہاں جاؤ گے؟''

''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ مجھے اپنے دفتر میں کوئی بہت ضروری کام ہے۔ اسی لیے تو میں اور سمیرا آپ کے پاس ایک دن رکتے۔''

''چھ گھنٹے کا سفر کار میں کرو گے؟''

''مجبوری ہے ڈیڈی۔'' شمعون نے کہا پھر جلدی سے بولا۔ ''پلیز ڈیڈی! آپ کچھ اور کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے گا۔ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ آپ سنیں گے تو چونک جائیں گے۔''

''ایسا کیا معاملہ ہے؟'' جہاں داد خاں نے تیزی سے پوچھا۔

''میں ابھی آپ کو نہیں بتا سکوں گا۔''

''کیوں؟''

''کوئی وجہ ہے ڈیڈی... پلیز! اب کوئی سوال مت کیجیے۔ میں گھر پہنچتے ہی آپ کو فون کر کے سب کچھ بتاؤں گا۔ اچھا، اب میں بند کر رہا ہوں۔ کار بہت تیز چلا رہا ہوں۔ مناسب نہیں ہوگا کہ ایک ہی ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے رہوں۔''

دوسری طرف سے جہاں داد خاں نے شمعون کا آخری لفظ پوری طرح سنے بغیر جلدی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے فون کرنا۔''

''جی ڈیڈی!'' شمعون نے جواب دے کر موبائل فون نہ صرف بند کیا بلکہ اسے ''آف'' ہی کر دیا۔

''یہ کیا چکر ہے شمعون؟'' سمیرا ہیجانی سے انداز میں بولی۔ ''ایسا کیا معاملہ ہے جو تم نے ابھی ڈیڈی کو نہیں بتایا؟''

''تمہیں بھی میں اس کی وجہ بعد میں بتاؤں گا سمیرا... پلیز! اب کوئی سوال نہیں۔''

''کار بھی تم نہ جانے کہاں لے جا رہے ہو؟'' سمیرا کا لہجہ ہیجانی ہی رہا۔ ''یہ راستہ ہمارے شہر کی طرف تو نہیں جاتا۔''

''ہاں، ہم دوسرے شہر کی طرف جا رہے ہیں۔''

''کیوں... تم نے ڈیڈی سے تو کہا تھا کہ...''

''مصلحتاً جھوٹ بولنا پڑا۔'' شمعون نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ وہ اور جرح کرنے لگتے۔ میں ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے سنبھالے کہاں تک بات کرتا ان سے۔''

''لیکن مجھے تو بتاؤ کہ آخر معاملہ کیا ہے؟''

اس سارے دورانیے میں وہ لڑکی اس طرح دم سادھے بیٹھی رہی تھی جیسے ان باتوں کا اس کی ذات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

''ہاں۔'' شمعون نے سمیرا کو جواب دیا۔ ''تمہیں میں بتا سکتا ہوں، کسی مضبوط دلیل کے بغیر۔ مجھے شبہ ہے کہ اس راستے میں وہ لوگ موجود ہوں گے جو اس لڑکی کے دشمن ہیں۔ اسٹیشن پر تو وہ میری فائرنگ سے گھبرا کر واپس لوٹ گئے ہوں گے لیکن اب وہ پوری تیاری کے ساتھ حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ وہ ہم سے اس لڑکی کو چھیننے کی کوشش کریں گے۔''

''اوہ گاڈ!'' اس مرتبہ سمیرا کا لہجہ کچھ ڈرا ڈرا سا تھا۔

شمعون کو کار کی رفتار کچھ کم کرنا پڑی کیونکہ سڑک اب زیادہ ہموار نہیں تھی۔

سمیرا نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی اور اپنے برابر میں دم سادھے بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا۔ ''کیا تم انگریزی سمجھ سکتی ہو؟''

لڑکی اس کا منہ تکنے لگی۔ دوسری مرتبہ سمیرا نے اپنا سوال اردو میں دہرایا۔

لڑکی کچھ توقف سے بولی۔ ''انگریزی... کیا؟''

شمعون نے عقب نما آئینے میں لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ سڑک پر لگے ہوئے الیکٹرک پولز کی روشنی اتنی نہیں تھی کہ کار کے اندر ہر چیز کو نمایاں کر سکتی اور کار کی اندرونی روشنی شمعون نے مصلحتاً بند ہی رہنے دی تھی۔

اب سمیرا نے انگریزی میں شمعون سے کہا۔ ''تم نے بھی حد کر دی شمعون! تم نے پلیٹ فارم پر بھی اس اجنبی لڑکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی، پھر ایک دوسرا خطرہ محسوس کر لینے کے بعد بھی اس لڑکی کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ وہ لوگ اگر اس لڑکی کو ہم سے چھین لینے کی کوشش کریں گے تو ہمیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''اسی نقصان سے بچنے کے لیے تو میں نے راستہ تبدیل کیا ہے۔''

''لیکن خطرات مول لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''انسانیت سمیرا... انسانیت!'' شمعون نے کہا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ یہ ایک مظلوم لڑکی ہے لہٰذا اگر ہم اسے ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے تو ہمارا شمار بھی ظالموں میں ہوگا۔''

''تم لٹریری باتیں کرنے لگے شمعون!'' سمیرا پھر کچھ روہانسی ہوگئی۔ ''اچھا ہوگا کہ اس لڑکی سے جان چھڑاؤ۔''

''ہرگز نہیں سمیرا! میں انسانیت کی تذلیل نہیں کر سکتا۔''

''تمہیں میری بات اتنی سختی سے تو رد نہیں کرنا چاہیے شمعون! آخر میں تمہاری بیوی ہوں۔''

''بیوی ہونے کے باوجود تم میرے مزاج کو نہیں سمجھ سکیں۔''

''شمعون!'' سمیرا اتنا ہی کہہ کر چپ ہوگئی۔ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

کار دوڑتی رہی۔

کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ لڑکی نے پھر رونا شروع کر دیا۔

''اب پھر تمہیں کچھ ہو گیا۔'' سمیرا لڑکی سے بڑے کھردرے لہجے میں بولی۔

لڑکی روتی رہی۔

''اب کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اس نے پہلے ہی جیسے کھردرے لہجے میں کہا۔

''سمیرا پلیز!'' شمعون بول پڑا۔ ''تمہیں اس مظلوم لڑکی سے ایسے لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے۔''

سمیرا خاموش رہی۔ لڑکی کے انداز سے ظاہر ہونے لگا جیسے اب وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہو۔

چند لمحے بعد سمیرا نے شمعون سے کہا۔ ''یہ کتنی دیر کا سفر ہے؟''

''ڈیڑھ گھنٹا اور لگے گا۔''

''پھر وہاں سے؟''

''وہاں ائرپورٹ تو ہے لیکن اتنی رات کے بعد وہاں سے ہمیں کوئی فلائٹ نہیں مل سکتی۔ باقی رات ہم کسی ہوٹل میں گزاریں گے۔ کل صبح دیکھیں گے کہ ہمیں کون سی فلائٹ مل سکتی ہے۔''

سمیرا کچھ نہیں بولی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ لڑکی اب رک رک کر سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے اب پھوٹ پھوٹ کر رونا بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

گاؤں کا جاگیردار اپنی حویلی کے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور موبائل فون کان سے لگائے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''میرے آدمیوں نے اطلاع دی ہے جہاں داد صاحب کہ انہیں آپ کے بیٹے کی وہ کار دکھائی ہی نہیں دی جس پر وہ اسٹیشن سے روانہ ہوا تھا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' دوسری طرف سے جہاں داد نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''کار کا نمبر دیکھنے میں ان سے چوک نہ ہوگئی ہو۔''

''میرے آدمی ایسے کچے نہیں ہیں جہاں داد صاحب۔''

''آپ نے مجھے بتایا تھا جاگیردار صاحب کہ آپ نے اپنے آدمیوں کو راستے میں کس جگہ بھیجا ہے۔ اسٹیشن سے وہاں تک کا فاصلہ پون گھنٹے سے زیادہ نہیں اور اب ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ وہ کار ابھی تک میرے آدمیوں کو دکھائی نہیں دی۔''

''تو کار راستے میں کہیں خراب نہ ہوگئی ہو؟'' جہاں داد کا لہجہ متفکر تھا۔

''مجھے بھی خیال آیا تھا۔'' جاگیردار نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے اپنے آدمیوں میں سے ایک کو حکم دیا ہے کہ وہ بائیک پر تیزی سے اسٹیشن تک جائے اور سارا راستہ چھان ڈالے۔''

''یہی ایک بات ہو سکتی ہے کہ کار راستے میں خراب ہو گئی ہو۔'' جہاں داد نے کہا۔ ''آپ نے اپنے آدمی کو اسٹیشن کی طرف کب بھیجا ہے؟''

''پندرہ منٹ پہلے روانہ ہوا ہے وہ۔'' جاگیردار نے جواب دیا۔ ''ابھی مجھے اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ جو اطلاع مجھے ملی تھی، وہ میں نے آپ کو دے دی۔''

''میں ابھی مایوس نہیں ہوں۔ کار راستے میں کہیں خراب ہی ہوئی ہے۔''

''مجھے جیسے ہی معلوم ہوگا، میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔''

''آپ سے رفعت کے فرار ہونے کی اطلاع سنتے ہی میں اتنا پریشان ہوگیا تھا کہ آپ سے ایک بات پوچھنا بھول ہی گیا۔ آخر یہ ہوا کیسے؟ رفعت کو بھاگ نکلنے کا موقع ملا کیسے؟''

جاگیردار نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''بس اسی وجہ سے تو میں شرمندہ ہوں آپ سے... میرا ایک بوڑھا کارندہ ہے، اس کے سبب۔'' جاگیردار نے اپنے اس بوڑھے کارندے کو ایک گندی سی گالی بھی دی پھر کہا۔ ''اسے ترس آ گیا تھا رفعت پر... وہ...'' اس نے پھر ایک گالی دے کر کہا۔ ''اس سال حج کر کے آیا تھا وہ... نیکی کمانے کی سوجھی اسے۔ اب میرے آدمی اسے اور نیکیاں دے رہے ہیں۔ چمڑے کی بیلٹ سے خبر لی گئی ہے اس کی... بے ہوش ہوگیا ہے۔ ہوش آجائے تو اسے پھر نیکیاں دی جائیں گی۔''

''کسی طرح بھی رفعت ہاتھ آنا چاہیے جاگیردار صاحب!'' جہاں داد نے شاید اس تفصیل پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ''اور ہاں... میں ایک بار پھر یہ بات کہہ دوں کہ میرے بیٹے شمعون اور اس کی بیوی سمیرا کو ذرا بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''اس طرف سے آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں نے اپنے آدمیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔'' جاگیردار نے کہا۔ ''اب جیسے ہی اس آدمی کی طرف سے کوئی اطلاع ملی... میرا مطلب ہے... جسے میں نے اسٹیشن کی طرف بھیجا ہے... تو میں آپ کو صورتِ حال بتانے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''ابھی میرے دماغ میں اچانک ایک بات آئی ہے۔ مجھے پہلے ہی یہ خیال آنا چاہیے تھا لیکن دماغ اتنا منتشر ہے کہ... خیر، میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں خود شمعون کو فون کر کے پوچھتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''میرا خیال ہے، یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ شمعون کو آپ پر کوئی شبہ نہ ہو جائے۔''

''یہ ممکن نہیں، وہ مجھ پر شبہ نہیں کر سکتا۔ میں اس سے بات بھی اس طرح کروں گا جیسے اس کی طرف سے بہت فکرمند ہوں اور اضطرابی حالت میں اسے فون کر بیٹھا ہوں۔''

''سوچ لیں... پھر جیسا آپ مناسب سمجھیں۔''

''میں ابھی آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جہاں داد نے لائن منقطع کر دی۔

جاگیردار خیالوں میں کھویا ہوا اپنے بستر کی طرف گیا اور بیٹھ کر خالی نظروں سے اپنے موبائل کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے شدت سے انتظار تھا کہ اسے کوئی حسبِ دل خواہ اطلاع ملے۔ وہ اس معاملے میں جہاں داد خاں سے شرمسار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جہاں داد خاں سے اس کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ اسے جب بھی اپنی زمینوں کے سلسلے میں کسی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ مسائل جہاں داد ہی کی وجہ سے چٹکی بجاتے ختم ہو جاتے تھے۔ سرکاری سطح پر جہاں داد خاں کا کافی اثر رسوخ تھا۔

دو منٹ بعد ہی جاگیردار کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال جہاں داد ہی کی تھی۔

''شمعون سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے جاگیردار صاحب!'' جہاں داد کے لہجے میں پریشانی تھی۔ ''اس کا موبائل آف مل رہا ہے۔''

''کیا؟'' جاگیردار چونکا۔ ''موبائل کیوں آف کر دیا اس نے؟''

''شاید اتفاقاً ایسا ہوگیا ہو۔''

جاگیردار نے ایک طویل سانس لی۔ ''بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر، اب انتظار ہی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جس آدمی کو اسٹیشن کی طرف بھیجا ہے، اس کی طرف سے کوئی اطلاع تو ملے گی۔''

''خدا کرے میرا بیٹا اور بہو خیریت سے ہوں۔'' جہاں داد کے دماغ میں شاید یہ خیال تھا کہ شمعون کی کار کسی حادثے کا شکار نہ ہوگئی ہو۔

''مجھے یہ اتفاق بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے اغوا کروایا تھا، وہ فرار ہوئی تو آپ کے بیٹے ہی کی وجہ سے میرے آدمیوں کے ہاتھ نہیں لگ سکی... اور اب آپ کا بیٹا ہی اس کا ہمدرد بن گیا ہے۔ آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ وہ لڑکی آخر ہے کون؟''

''میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ یہ بات آپ مجھ سے کبھی نہ پوچھیے گا۔''

''اچھا۔'' جاگیردار نے ایک طویل سانس لی۔

''آپ نے ایک بات نہیں سوچی۔'' جہاں داد بولا۔ ''ریلوے پولیس نے اس لڑکی کو شمعون کے ساتھ جانے کیوں دیا؟''

''یہ میرے لیے کوئی بڑی الجھن نہیں ہے۔'' جاگیردار نے کہا۔ ''پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہاں، یہ بات البتہ میری الجھن کا سبب ہے کہ اس لڑکی سے آپ کے بیٹے کو اتنی ہمدردی کیسے ہوگئی کہ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پولیس کو رشوت بھی دے بیٹھا۔ مجھے یقین ہے کہ رشوت بھی معمولی نہیں ہوگی۔"

"مجھ سے جب اس کی بات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ اس مظلوم لڑکی کی خاطر انسانیت کا تقاضا پورا کر رہا ہے لیکن... دراصل..."

"دراصل؟" جاگیردار چونکا۔

جہاں داد نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا ہو کہ وہ ایک ایسی بات کہنے والا تھا جو اس کی زبان پر نہیں آنا چاہیے تھی۔

"ہیلو!" جاگیردار نے بے چینی سے کہا۔ "آپ کچھ بتاتے بتاتے رک گئے؟"

"جی۔" جہاں داد کو شاید مجبوراً کہنا پڑا۔ "دراصل وہ رفعت کو پہچان گیا ہوگا۔"

"اوہ!" جاگیردار کے منہ سے نکلا۔

"خیر، میں آپ کی طرف سے اطلاع کا منتظر رہوں گا۔" دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اب جاگیردار کے چہرے پر الجھن کے تاثرات خاصے بڑھ گئے تھے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جس لڑکی کو جہاں داد خاں نے اغوا کروایا تھا، وہ شمعون کے لیے اجنبی نہیں تھی اور وہ اس لڑکی کا ہمدرد بھی تھا۔

جاگیردار خیالوں میں کھویا ہوا پھر ٹہلنے لگا۔

رفعت کو اس نے جب اپنے آدمیوں کے ذریعے اغوا کروایا تھا تو جہاں داد خاں ہی نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ اس وقت فلاں شاپنگ سینٹر میں شاپنگ کر رہی ہوگی۔ رفعت کی تصویر وہ پہلے ہی جاگیردار کو دے چکا تھا اور وہ تصویر جاگیردار نے اپنے آدمیوں کو دکھا دی تھی۔ رفعت کو اس وقت اغوا کیا گیا تھا جب وہ شاپنگ کے بعد واپس جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اسے ایک قدرے ویران سڑک پر روک لیا تھا۔ کسی کی کار روکنا کوئی بہت مشکل کام نہیں ہوتا۔ کار روکنے کے بعد انہوں نے رفعت کو گھسیٹ کے کار سے نکال لیا تھا۔ وہاں جو تھوڑے بہت لوگ تھے، ان میں سے کوئی رفعت کو بچانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ جاگیردار کے آدمی رفعت کو اپنی کار میں ڈال کر وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس کام کے لیے انہوں نے چوری کی ایک کار استعمال کی تھی۔ بعد میں وہ کار کسی ویران سی جگہ پر چھوڑ دی گئی اور رفعت کو وہ لوگ بے ہوشی کی حالت میں اپنی کار میں ڈال کر گاؤں لے آئے تھے۔

لیکن اب وہ فرار ہو چکی تھی۔ نہ صرف فرار ہو چکی تھی بلکہ اب اس شخص کے ساتھ تھی جس کے باپ نے اسے اغوا کروایا تھا۔

جاگیردار، اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جہاں داد اس سے کوئی بات چھپا رہا تھا۔ یہ شبہ اسے یوں ہوا کہ باپ اور بیٹا، دونوں ہی رفعت سے واقف تھے۔ جاگیردار کے لیے مشکل یہ تھی کہ اصل بات جاننے کے لیے وہ جہاں داد پر دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اسے اب فکر صرف یہ کرنا تھی کہ وہ کسی طرح بھی رفعت کو شمعون کی پناہ سے نکلوا لے۔

خاصے انتظار کے بعد اسے اطلاع ملی کہ اسٹیشن تک کے راستے میں وہ کار کہیں دکھائی نہیں دی۔

"اچھا۔" جاگیردار نے کچھ سوچتے ہوئے اطلاع دینے والے سے کہا۔ "تم ابھی اسٹیشن کے پاس ہی رکو۔ میری کال کا انتظار کرو۔"

اس نے جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر کے جہاں داد کا نمبر ملایا۔

جہاں داد نے اس کی کال ملتے ہی بڑی بے چینی سے پوچھا۔ "کیا معلوم ہوا جاگیردار صاحب؟"

"آپ کو اچھی طرح یاد ہے جہاں داد صاحب کہ آپ کے بیٹے نے فون پر آپ سے کیا کہا تھا؟ میرا مطلب ہے... اس نے یہی کہا تھا نا کہ وہ اپنے شہر جا رہا ہے؟"

"ہاں جاگیردار صاحب! اس نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ آپ کو کیا اطلاع ملی ہے؟"

"اس راستے پر تو آپ کے بیٹے کی کار کہیں نہیں ہے۔" جاگیردار نے جواب دیا۔ "اگر وہ کسی حادثے کا شکار ہوئی ہوتی تو یہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے آدمی نے اسٹیشن پہنچ کر مجھے اطلاع دی ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ کار کیا ہوا میں غائب ہو جائے گی؟" جہاں داد نے جھنجلاہٹ سے کہا۔

"آپ بہت زیادہ ہیجان میں گرفتار ہو گئے ہیں جہاں داد صاحب... ورنہ اس امکان پر آپ بھی غور کر لیتے جس کا خیال مجھے آ چکا ہے۔"

"کیا خیال آیا ہے آپ کو؟"

"آپ کا بیٹا اپنے شہر جانے کے بجائے مخالف سمت میں نکل گیا ہوگا۔" جاگیردار نے کہا۔ "اسے خیال آیا ہوگا کہ رفعت جن لوگوں سے بچ نکلی ہے، وہ لوگ اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور یہ کوشش کرنے کے لیے وہ اس راستے پر مورچا لگا سکتے ہیں جس راستے سے اسے گزرنا ہے۔"

"اگر اس نے یہ سوچا ہوتا تو مجھ سے جھوٹ کیوں بولتا؟"

"شاید اسے شبہ ہو کہ رفعت کو آپ نے غائب کروایا ہے۔"

"ناممکن۔" جہاں داد نے تیز لہجے میں کہا۔ "کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے کہ اسے مجھ پر شبہ ہو۔"

"تو دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے آپ سے بات کرنے کے بعد اپنا فیصلہ تبدیل کیا ہو... میرا مطلب ہے، اس کو یہ خیال بعد میں آیا ہوگا کہ رفعت کے دشمن اس کے راستے میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔"

"ہاں، یہ بات ہو سکتی ہے۔"

"ایسی صورت میں وہ قریب ہی کے دوسرے شہر کا رخ کرے گا۔"

"وہاں رات کہاں گزارے گا؟ میرے علم کے مطابق وہاں اس کا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ وہاں کیوں رکے گا؟"

"ائرپورٹ ہے اس شہر میں... وہ وہاں سے بائی ائر اپنے شہر جا سکتا ہے۔"

"اس وقت تو اسے کوئی فلائٹ نہیں ملے گی۔"

"میں سوچ چکا ہوں یہ بات... اگر وہاں اس کا کوئی جاننے والا نہیں ہے تو وہ بقیہ رات گزارنے کے لیے کسی ہوٹل کا رخ کر سکتا ہے۔"

"ہوں۔" جہاں داد کچھ سوچنے لگا۔

جاگیردار پھر بولا۔ "آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" جہاں داد نے کہا۔ "لیکن ایسی صورت میں اب کرنا کیا چاہیے؟ اب کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ دیکھیں جاگیردار صاحب! رفعت کسی صورت سے بھی دوبارہ آپ کے قبضے میں ہونا چاہیے۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔ میں ابھی اپنے آدمیوں کو ہدایت کرتا ہوں۔ وہ صبح ہونے سے کافی پہلے اس شہر میں پہنچ جائیں گے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کا بیٹا وہاں کسی تھرڈ کلاس ہوٹل میں قیام کرے۔ وہاں دو ہی ہوٹل کچھ بہتر ہیں۔ وہ وہیں جائے گا۔ میرے آدمی ان ہوٹلوں کی اور ان ہوٹلوں سے ائرپورٹ جانے والے راستوں پر کڑی نظر رکھیں گے۔ شمعون میرے آدمیوں سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ جو سوچ رہے ہیں، اس کے مطابق کریں۔ میں ہر صورت میں بس یہ چاہتا ہوں کہ رفعت میرے بیٹے کے پاس نہ رہے۔"

"بس تو اب میں فون بند کرتا ہوں اور اپنے آدمیوں کو ہدایات دیتا ہوں۔"

جاگیردار نے سلسلہ منقطع کیا اور موبائل پر ہی اپنے آدمیوں کو وہی ہدایات دینے لگا جن کا ذکر اس نے جہاں داد سے کیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دوبارہ جہاں داد سے بات کی۔ اس نے کہا۔

"میرے آدمی روانہ ہو چکے ہیں۔ رفعت کو دوبارہ اغوا کرنے کے لیے وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔"

"لیکن میرے بیٹے اور اس کی بیوی کو بالکل نقصان نہ پہنچے۔"

"آپ بار بار یہ بات کیوں کہہ رہے ہیں جہاں داد صاحب؟" اس مرتبہ جاگیردار کا لہجہ کچھ کھردرا ہو گیا لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور نرمی سے کہا۔ "حوصلہ رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اب آپ سکون سے سونے کی کوشش کریں۔ کل صبح آپ کو میری طرف سے خوش خبری مل جائے گی۔"

"سکون!" جہاں داد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "سکون تو مجھے اسی وقت ملے گا جب آپ مجھے خوش خبری سنائیں گے۔ نیند تو آج رات میری آنکھوں کے قریب بھی نہیں آ سکتی۔"

"کوشش کیجیے گا۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اس معاملے میں جاگیردار کا ذہن بھی اتنا الجھ گیا تھا کہ اس رات وہ اپنی حویلی کے زنان خانے میں جانے کے بجائے اسی کمرے میں لیٹ گیا۔ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ اس کے آدمی رفعت کو دوبارہ اغوا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس لیے ذرا دیر بعد اسے نیند بھی آ گئی۔

صبح اس کی آنکھ موبائل فون کی گھنٹی سے کھلی۔ اس وقت سورج کی روشنی ایک دریچے سے کمرے میں آ رہی تھی۔ جاگیردار نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا اسی کا آدمی تھا۔

"بولو۔" جاگیردار نے تیزی سے کہا۔

"ان کا یہاں بھی کچھ پتا نہیں ہے سائیں۔" جواب ملا۔

"کیا؟" جاگیردار کے ذہن کو زوردار جھٹکا لگا۔

"جی سائیں! ایک فلائٹ یہاں سے جا چکی ہے۔ وہ تینوں کہیں نظر نہیں آئے۔ نہ ائرپورٹ کے راستے میں، نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ائرپورٹ پر۔ ہم نے ان دو ہوٹلوں کے علاوہ اور کئی ہوٹل بھی دیکھ ڈالے۔ رات میں جو مسافر ان ہوٹلوں میں آئے تھے، ان میں صرف ایک ادھیڑ عمر جوڑا تھا۔ باقی سب مرد تھے۔''

جاگیردار کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ کیا شمعون اس سے آگے کسی شہر میں نکل گیا تھا؟

''تم لوگ وہیں رکو۔'' جاگیردار نے حکم صادر کیا۔ ''میں ابھی تمہیں فون کرتا ہوں۔''

جاگیردار نے رابطہ منقطع کر کے جہاں داد کا نمبر ملایا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''کیا خبر ہے جاگیردار صاحب؟'' اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''وہ لوگ اس شہر میں بھی نہیں ملے۔'' جاگیردار نے تذبذب سے کہا۔

''کیا؟'' جہاں داد کے منہ سے نکلا۔

''شاید آپ کے بیٹے نے اس سے بھی آگے نکل جانا ضروری سمجھا ہو۔'' جاگیردار نے کہا پھر فوراً ہی اس نے پوچھا۔ ''موبائل پر اس سے رابطہ ہوا آپ کا؟''

''نہیں۔ اس کا موبائل بند ہی مل رہا ہے۔'' جہاں داد نے کہا۔ ''یہ بہت برا ہوا ہے جاگیردار صاحب! بہت برا۔ اب رفعت کا آپ کے آدمیوں کے ہاتھ لگنا مشکل ہے۔ اب وہ کسی نہ کسی طرح اپنے گھر پہنچ ہی جائے گا۔''

''میں آپ سے شرمندہ ہوں لیکن یہ وعدہ میں ضرور کروں گا کہ اگر وہ رفعت کو لے کر اپنے گھر پہنچ گیا ہوگا تو میں اسی شہر سے رفعت کو پھر اغوا کروا لوں گا۔''

''شاید اب یہ آسان نہیں ہوگا۔'' جہاں داد کے لہجے میں مایوسی بھی تھی اور پریشانی بھی۔ اور مایوسی شاید اتنی زیادہ تھی کہ اس نے جاگیردار سے مزید کوئی بات کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

جاگیردار نے چند لمحے کچھ سوچ کر موبائل پر اپنے آدمی سے رابطہ کیا اور اسے ہدایات دینے لگا۔

☆☆☆

گھر پہنچنے پر ثمیرا کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بس کا آٹھ گھنٹے کا سفر کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس بڑے باپ کی بیٹی نے اتنا طویل سفر کبھی کار میں بھی نہیں کیا تھا لیکن شمعون کی بات اسے ماننا پڑی تھی۔

شمعون نے اس شہر کے ہوٹل میں ٹھہرنے اور دوسرے دن کی فلائٹ پکڑنے کا ارادہ اچانک بدل دیا تھا۔

''یہاں سے ہم بس میں اپنے شہر کی طرف لوٹیں گے۔''

جب شمعون نے یہ کہا تھا تو ثمیرا کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

''مگر کیوں؟'' پریشانی اور بےچینی اس کی زبان پر یہ سوال لے آئی تھی۔

''مجھے خیال آیا ہے کہ ان لوگوں نے اگر ہمارے راستے کی ناکا بندی کی ہوگی تو ہماری کار نہ ملنے پر ان کے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ میں نے اس طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں سفر شروع کر دیا ہوگا۔ ایسی صورت میں وہ یہاں تک کی دوڑ بھی لگا سکتے ہیں۔ بس کا خیال شاید انہیں نہیں آئے گا اور ہم انہیں ڈاج دے کر اپنے شہر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

ثمیرا نے بحث کی۔ ''ہمارے ساتھ تمہارے دوست کی کار بھی ہے؟''

''اس کا حل میں نے سوچ لیا ہے۔''

شمعون نے اسی وقت اپنے موبائل پر جمیل سے بات کی تھی اور اسے بتایا کہ وہ کہاں آگیا ہے۔

''لیکن۔'' جمیل نے کہا۔ ''تم تو...''

شمعون نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''حالات کچھ ایسے ہی ہیں جمیل کہ مجھے اچانک پروگرام تبدیل کرنا پڑا ہے۔ بیچ میں مت بولنا۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ تم بس میری بات سنو۔ یہاں بس اڈے کے قریب ایک پلازا ہے۔ یہاں گارڈن اور چار منزلہ اپارٹمنٹ کی درمیانی سڑک پر خاصی کاریں پارک ہیں۔ ان کاروں کے مالکان کا تعلق اس پلازا یا اپارٹمنٹس کی عمارت سے ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ اپنی کاریں رات کو یہیں پارک کرتے ہوں گے۔ میں تمہاری کار یہیں پارک کر رہا ہوں۔ تم خود یا کسی اور کو بھیج کر اپنی کار یہاں سے منگوا لو۔''

''کار وہاں چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو؟'' جمیل نے بےچینی سے پوچھا۔

''میں نے کہا نا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اگر کار کے بارے میں اطلاع نہ دینا ہوتی تو میں تمہیں فون کرنے کے لیے بھی وقت نہ نکال پاتا۔ بس اب میں بند کر رہا ہوں۔ تم کسی طرح بھی اپنی کار منگوا لینا۔''

شمعون نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کیا اور پھر موبائل کا سوئچ بھی آف کر دیا۔

ثمیرا اس کے بہت قریب کھڑی تھی اس لیے وہ جمیل کی آواز بھی سنتی رہی۔ وہ لڑکی جس کو شمعون نے بچایا تھا، گم صم

انداز میں کسی اور طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز اب کچھ ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ صرف ایک کٹھ پتلی ہو جسے شمعون کے اشارے پر ناچتے رہنا تھا۔

اس کے بعد وہ تینوں بس میں سوار ہو گئے۔ اپنے شہر میں بس سے اتر کر انہوں نے ٹیکسی کی تھی اور اپنے بنگلے پر پہنچ گئے تھے جو بہت بڑا تو نہیں لیکن چھوٹا بھی نہیں تھا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے جسم کی ساری ہڈیاں بکھر جائیں گی۔'' اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی شمعون سے کہا۔

''آئی ایم سوری۔'' شمعون نے کہا۔ ''یہی ایک محفوظ طریقہ مجھے سوجھ سکا تھا۔ بس اب تم آرام کرو۔ اس لڑکی کو بھی بیڈروم میں اپنے ساتھ سلا لو۔''

''اور تم؟''

''میں دوسرے کمرے میں سو جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ لڑکی کسی کمرے میں اکیلی سوئے۔ ہو سکتا ہے، یہ ڈرے۔''

''لیکن... تم دیکھ رہے ہو... اس کے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں؟ میں اسے اپنے ساتھ کیسے سلاؤں؟'' ثمیرا نے انگریزی میں کہا۔

''اسے اپنا کوئی لباس دے دو۔ تمہارا لباس اس کے جسم پر کچھ ڈھیلا ہوگا لیکن مجبوری ہے۔'' شمعون نے بھی انگریزی ہی میں جواب دیا۔ ''اس سے کہنا کہ نہا لے... اس طرح...''

''نہانا تو مجھے بھی پڑے گا۔ اس سفر سے سارا جسم اور بال گرد و غبار سے اٹ گئے ہیں۔ مجھے اس حالت میں نیند آ ہی نہیں سکتی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم بھی نہا لو۔''

اب ثمیرا نے اردو میں لڑکی سے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

لڑکی شمعون کی طرف دیکھنے لگی۔

''چلی جاؤ ان کے ساتھ۔'' شمعون نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ لڑکی سے کہا۔ ''یہاں اب تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خود کو بالکل محفوظ سمجھو... اور ابھی میں تمہاری حفاظت کا مزید بندوبست بھی کروں گا۔''

ثمیرا چونکی۔ ''اب کیا بندوبست کرو گے؟''

''بتا دوں گا۔ ابھی تو تم اسے لے جاؤ اور نہا دھو کر آرام کرو۔'' شمعون نے اردو ہی میں ثمیرا سے کہا پھر لڑکی سے بولا۔ ''تم بھی نہا لینا۔ دیکھو، تمہارے بال کتنے گندے

گزشتہ نمبر کی بھرپور پذیرائی اور قارئین کے اصرار پر
ماہنامہ سرگزشت
پراسراریت نمبر II
نئے سال کا نیا رنگ ۔ خاص نمبر خاص شمارہ
ایسا خاص شمارہ جو صرف ماہنامہ سرگزشت ہی پیش کرسکتا ہے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گئے ہیں۔ تمہیں صاف کپڑے بھی مل جائیں گے۔"
لڑکی نے آہستگی سے سر ہلا دیا مگر کچھ بولی نہیں۔
"آؤ۔" سمیرا نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا۔
لڑکی نے شمعون پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر سمیرا کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔
کمرے میں داخل ہو کر سمیرا نے کپڑوں کی الماری سے اپنا ایک سادہ لباس نکالا۔ لڑکی خاموشی سے کھڑی ہوئی تھی۔ سمیرا نے لباس اسے دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باتھ روم کے دروازے تک لے گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس نے لڑکی سے کہا۔ "جاؤ... نہالو... تمہارے بعد میں بھی نہاؤں گی۔"
لڑکی لباس لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ سمیرا نے دروازہ بند کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ بستر پر لیٹی تو اسے نیند آ جائے گی۔
وہ کرسی پر بیٹھ کر اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے دماغ میں دو شبہات رات ہی سے کلبلا رہے تھے۔ ایک شبہ یہ تھا کہ وہ لڑکی شمعون کے لیے اجنبی نہیں تھی اور دوسرے شبہے کے مطابق اس لڑکی نے اپنی یادداشت نہیں کھوئی تھی، بس یادداشت کھونے کا ڈھونگ رچا رہی تھی۔ مگر کیوں؟ سمیرا یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔
باتھ روم کے شاور سے پانی گرنے کی آواز آئی تو وہ چونک پڑی۔ اسے خیال آیا کہ لڑکی شاور کا استعمال بھی جانتی تھی حالانکہ ایک دیہاتی لڑکی کو اس سے بے خبر ہونا چاہیے تھا۔ وہ دیہاتی لباس میں ہی ملبوس تھی لیکن اس کی شکل و صورت سے بھی سمیرا کو شبہ ہوا تھا کہ وہ دیہاتی نہیں ہے۔
اس کی عمر اکیس بائیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ اس کے نقش و نگار بھی اچھے تھے۔ اگر اس کی صحت اچھی ہوتی تو وہ خوب صورت نظر آتی۔ شاید ان نامعلوم لوگوں کی قید میں رہ کر ہی اس کی صحت اتنی زیادہ خراب ہوئی کہ اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔
اس لڑکی سے شمعون کا واقف ہونا، سمیرا کا ایک ایسا شبہ تھا جو اس کے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟
وہ ان خیالوں میں اتنی محو ہوئی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ وہ اس وقت چونکی جب باتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔
لڑکی باتھ روم سے باہر آ رہی تھی۔ اس نے باتھ روم میں ہی تولیے سے اپنے بال خشک کر کے کنگھی بھی کر لی تھی، تاہم اس کے نم بال اس کے شانوں اور پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ سمیرا نے اسے غور سے دیکھا۔ صاف لباس پہن کر وہ خاصی بہتر دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے سمیرا کو غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اس کی نظریں جھک گئیں۔
سمیرا کھڑی ہو گئی۔ "اب میں غسل کر لوں۔ تم بیٹھو... کیا میں تمہارے لیے ناشتا منگوا دوں؟"
لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"کیوں؟" سمیرا بولی۔ "بھوک نہیں ہے؟ ناشتا نہیں کرو گی؟"
اس مرتبہ لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔" سمیرا بولی۔ "تم نے ناشتا کرنے سے انکار بھی کیا اور ناشتا کرنا بھی چاہتی ہو۔"
"میں بعد میں کر لوں گی۔ پہلے آپ نہا لیں۔"
"اوہ۔" سمیرا نے طویل سانس لی۔ "میرے ساتھ ناشتا کرنا چاہتی ہو؟"
لڑکی نے دوسری مرتبہ اثبات میں سر ہلایا۔
"اچھا تو بیٹھو۔" سمیرا نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے اپنے لیے ایک لباس نکالا اور باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے لڑکی سے دوبارہ کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"
لڑکی گم صم انداز میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کرسی کے قریب گئی اور بیٹھ گئی۔
'کن خیالوں میں گم ہے یہ؟' سمیرا نے باتھ روم میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔ 'کیا سوچ رہی ہے؟ اگر واقعی اس کی یادداشت کا مسئلہ نہیں ہے تو یہ ضرور اپنے ماضی ہی کے بارے میں سوچ رہی ہو گی۔'
'اس کا ماضی؟'
سمیرا کے لیے یہ بھی ایک اہم سوال تھا۔
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ناشتا کر رہی تھیں۔ ناشتا سمیرا نے گھر کی ایک ملازمہ سے منگوایا تھا۔ سمیرا کو لڑکی کے ناشتا کرنے کے انداز میں بھی دیہاتی پن نظر نہیں آیا۔
"تمہیں اپنے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں؟" سمیرا نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"مجھے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی اور اس کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ناشتا کرتی رہی اور سوچتی رہی۔
سمیرا بولی۔ "تم نے بتایا نہیں؟"

"میں۔" لڑکی نے ایک مرتبہ نظر اٹھا کر سمیرا کی طرف دیکھا پھر بولی۔ "میں کہیں قید تھی۔ مجھے نہیں معلوم، مجھے قید کرنے والے کون تھے۔ ایک بوڑھے آدمی نے مجھے قید سے نکلنے کا موقع دیا۔ میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ پھر ان لوگوں نے مجھے بھاگتے دیکھ لیا۔ وہ میرے پیچھے دوڑنے لگے۔ میں اس جگہ تک پہنچ گئی جہاں ریل کی پٹریاں تھیں۔ ریل بھی آ رہی تھی۔ میں پٹریوں پر اتر گئی۔ وہاں کچھ لوگ تھے۔ میں چاہتی تھی کہ ریل آنے سے پہلے دوسری طرف پہنچ جاؤں تو وہ لوگ مجھے نہیں پکڑ سکیں گے۔ ریل بیچ میں آ جائے گی لیکن وہ جو آپ کے ساتھ آئے ہیں اور مجھے اپنے ساتھ لائے ہیں، وہ کود کر میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے گولیاں چلائیں تو شاید وہ لوگ ڈر گئے جو میرے پیچھے آ رہے تھے۔"
"عجیب بات ہے یہ۔" سمیرا نے کہا۔
لڑکی خاموش رہی۔
"ان لوگوں نے تمہیں کیوں قید کیا تھا؟"
"پتا نہیں۔"
"تمہیں ان لوگوں نے کہاں سے اغوا کیا تھا؟"
"پتا نہیں؟"
"تمہارے گھر والے؟"
اس مرتبہ لڑکی نے جواب دینے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔
"یہی تو میں نے ابھی کہا تھا کہ عجیب بات ہے۔" سمیرا بولی۔ "تمہیں اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یاد نہیں لیکن تم جانتی ہو کہ ریل کیا ہوتی ہے، پٹریاں کیا ہوتی ہیں اور تمہیں گولیوں کے بارے میں بھی معلوم ہے جو تمہارا پیچھا کرنے والوں پر چلائی گئی تھیں۔ یہ سب کچھ تم کیسے جانتی ہو؟"
لڑکی نے کچھ بے بسی کے انداز میں سمیرا کی طرف دیکھا۔
"پتا نہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ ایک بار پھر روہانسی نظر آنے لگی۔
"اب رونا مت شروع کر دینا۔" سمیرا جلدی سے بولی۔ "چلو ناشتا کرتی رہو۔ تم نے ہاتھ کیوں روک لیا؟"
لڑکی نے اپنے دونوں بازوؤں کی آستینوں سے اپنی آنکھوں کی نمی خشک کی اور چائے کی پیالی اٹھا لی۔
ناشتا کرنے کے بعد سمیرا نے اس سے کہا۔ "یہاں بستر لگا ہے۔ سو جاؤ۔ تمہیں نیند تو آ رہی ہو گی؟"
لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
خود سمیرا محسوس کر رہی تھی کہ نہانے کے باعث اس کے جسم کا درد بڑی حد تک کم ہو گیا ہے اور اب وہ نیند کا زیادہ دباؤ بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔
لڑکی بستر پر لیٹنے کے بعد بہت جلدی سو گئی۔ اس کی لمبی لمبی سانسوں سے سمیرا نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس لڑکی کو نامعلوم لوگوں کی قید میں شاید ٹھیک سے سونا بھی نصیب نہیں ہوتا ہو گا۔
بستر پر لیٹے لیٹے سمیرا نے اپنا موبائل اٹھایا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ بات آئی تھی کہ وہ فون کر کے اپنے پاپا کو ان حالات سے آگاہ کر دے۔
وہ اس شہر کے ایک بہت بڑے بزنس مین سعید جعفری کی بیٹی تھی۔ جہاں داد خاں سے سعید جعفری کے تعلقات تجارت ہی کی بنیاد پر استوار ہوئے تھے۔ انہی تعلقات کے باعث تین ماہ قبل سمیرا اور شمعون کی شادی ہوئی تھی۔
سمیرا کو شمعون بہت پسند آیا تھا۔ وہ شمعون سے اس طرح محبت کرنے لگی تھی جیسے لڑکے لڑکیاں شادی سے قبل ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔
شمعون نے سمیرا کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور ہر طرح اس کا خیال رکھتا تھا لیکن سمیرا کو اس سے ایک شکایت بہرحال تھی۔ اگرچہ وہ اپنی شکایت زبان پر کبھی نہیں لائی تھی لیکن اسے یہ خیال بہرحال رہتا تھا کہ وہ شمعون کو جس شدت سے چاہنے لگی تھی، شمعون کی طرف سے اتنی شدت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔
سمیرا اس کے باوجود ایک وفا شعار بیوی تھی اس لیے اس نے اپنے والد کو ان حالات سے... باخبر کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے سوچا کہ اسے شمعون کی اجازت کے بغیر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔
وہ اسی وقت جا کے شمعون سے اس کی اجازت لیتی لیکن اس کا خیال تھا کہ شمعون سو چکا ہو گا۔

☆☆☆

سمیرا کا یہ خیال غلط تھا کہ شمعون سو چکا ہو گا۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس وقت وہ اپنے موبائل فون پر جہاں داد سے کہہ رہا تھا۔ "میں رفعت کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا ڈیڈی!"
"رات کو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ لڑکی رفعت ہے؟"
"سمیرا ساتھ تھی۔ اسی کی وجہ سے میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ تم نے اچھا کیا... ٹھیک ہے... لیکن اگر تم سیدھے اپنے گھر پہنچے ہو تو تمہیں مجھے فون کرنے میں اتنی دیر تو نہیں لگانا چاہیے تھی... اتنی اہم بات بتانے کے لیے تو تمہیں بے چین ہو جانا چاہیے تھا۔''

''بس ذرا سی تساہلی ہو گئی ڈیڈی۔'' شمعون نے کہا۔ ''ڈرائیونگ نے بہت تھکا دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کو فون کرنے سے پہلے ذرا اپنی کمر سیدھی کر لوں جو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تختہ ہو گئی ہو لیکن بس لیٹنا ہی غضب ہو گیا۔ آنکھ لگ گئی میری... بس ابھی جاگا ہوں تو آپ کو فون کر رہا ہوں۔'' وہ صریح جھوٹ بول رہا تھا لیکن اس کی وجہ بھی تھی۔

دوسری طرف سے جہاں داد نے کہا۔ ''تم نے مجھے رات بھر بہت پریشان رکھا ہے۔ میں تم سے رابطہ کرنے کے لیے اتنی کوششیں کر چکا ہوں کہ اب مجھے اس کی گنتی بھی یاد نہیں۔''

''مجھے کچھ خیال نہیں ڈیڈی کہ میرا موبائل بند کیسے ہو گیا تھا۔ شاید اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔ مجھے اس کے بند ہونے کا علم اس وقت ہوا جب میں نے ابھی آپ سے بات کرنے کے لیے اپنی جیب سے نکالا۔ اسے آن کرنے میں مجھے بالکل کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آتا، اس میں ایسی کیا خرابی ہوئی ہے کہ یہ خود ہی بند ہو گیا تھا۔''

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''اتنے طویل عرصے تک وہ نامعلوم لوگوں کی قید میں رہی ہے۔ پتا نہیں اس پر کیا گزری ہوگی۔''

''میں خود بھی جاننا چاہتا ہوں لیکن اس کی یادداشت ہی جاتی رہی ہے۔ شاید اس پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہے۔''

''تشدد کس سلسلے میں کیا جا سکتا ہے؟''

''یہ تو رفعت ہی بتا سکتی ہے۔''

''میں شام تک تمہارے پاس پہنچوں گا۔ اس کا کوئی راستہ تو نکالنا ہوگا۔'' جہاں داد نے کہا۔

''آپ ضرور آیئے ڈیڈی! میں چاہتا ہوں کہ آپ کے مشورے ہی سے کچھ کیا جائے۔''

''میں بائی کار ہی آؤں گا۔'' جہاں داد نے کہا۔ ''ابھی مجھے یہاں کچھ کام ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی روانہ ہو سکوں گا۔ شام سے پہلے ہی آ جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ سہ پہر تک پہنچ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ڈیڈی۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ شمعون نے جب اپنا موبائل میز پر رکھا تو خاصا متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔ اس پر نیند کا شدید دباؤ تھا لیکن بستر پر لیٹنے کے باوجود یہ الجھن نیند آنے میں رکاوٹ بنی رہی کہ رفعت کو اغوا کرنے والے کون تھے اور رفعت کے اغوا کا مقصد کیا تھا؟

تقریباً گیارہ ماہ بعد وہ لڑکی اسے غیر متوقع طور پر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر نظر آئی تھی جس کی صحت خاصی حد تک خراب ہو چکی تھی لیکن شمعون نے اسے پلیٹ فارم کی کم روشنی کے باوجود پہچان لیا تھا۔ وہ اس کی پہلی بیوی رفعت تھی۔

ان دنوں شمعون اپنے باپ کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ رفعت اس بینک میں نئی نئی ملازم ہوئی تھی جہاں شمعون کا ذاتی اکاؤنٹ تھا۔ وہ اسے پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوئی تو وہ اسی سے شادی کرے گا۔

دوسری طرف رفعت کو بھی شمعون اچھا لگا تھا۔ شمعون کسی نہ کسی بہانے روزانہ ہی بینک جانے لگا۔ اس طرح ان دونوں میں کسی حد تک بے تکلفی ہو گئی۔ وہ بے تکلفی زیادہ بھی ہو جاتی لیکن دونوں ہی کو اس بات کا خیال رکھنا پڑا کہ بینک میں کام کرنے والے دوسرے لوگ کچھ بھانپ نہ جائیں۔

پھر ایک دن شمعون نے چپکے سے رفعت کو بینک کے اوقات کے بعد ایک ریسٹورنٹ میں چائے کی دعوت دے ڈالی اور خوش ہوا کہ رفعت نے اس کی دعوت قبول کر لی تھی۔

پھر دو دو، چار چار دن کے وقفے سے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دونوں کے دلوں میں پرورش پانے والی محبت میں شدت آتی چلی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی رفعت کی تشویش اور پریشانی میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔

رفعت کا تعلق ایک اوسط درجے کے گھرانے سے تھا۔ اسی لیے اسے بینک کی ملازمت بھی کرنا پڑی تھی۔ اس کا باپ جواد احمد کسی انشورنس کمپنی میں معمولی ملازم تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل میں سرمایہ داروں کے خلاف شدید نفرت تھی۔ وہ ان لوگوں کو ''غریبوں کا خون چوسنے والا طبقہ'' کہا کرتا تھا۔ رفعت کی پریشانی کی وجہ بھی یہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جواد احمد اس کی شادی ایک سرمایہ دار کے بیٹے سے کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوگا۔ اس نے اپنے اس خیال کا اظہار شمعون سے بھی کر دیا تھا۔

تھوڑی سی پریشانی شمعون کو بھی اپنے والد کی طرف سے تھی۔ اسے بھی یہ ڈر تھا کہ جہاں داد خاں ایک معمولی گھرانے کی لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

خاصے شش و پنج کے بعد ان دونوں ہی نے یہ فیصلہ کیا کہ بعد میں جو کچھ بھی ہو، وہ سول میرج کر کے ایک دوسرے کے شریکِ حیات تو بن جائیں۔

سول میرج کے بعد ان دونوں نے ''شبِ عروسی'' کے بجائے ''روزِ عروسی'' بنایا تھا۔ اس دن رفعت نے بینک سے چھٹی کر لی تھی۔ سول میرج کرنے کے بعد وہ گیارہ بجے سے شام کے چھ بجے تک ایک ہوٹل میں رہے تھے۔ رفعت سات بجے اپنے گھر پہنچی تھی۔ اس نے شمعون کے مشورے سے ہی گھر پہنچنے میں اتنی تاخیر کی تھی کہ اس کے ''غائب'' ہو جانے کی وجہ سے وہاں ہلچل مچ چکی ہو اور جب وہ گھر پہنچے تو اس سے پہلا سوال یہی ہو کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔

توقع کے مطابق یہ سوال ہوا اور رفعت نے طے شدہ پروگرام کے مطابق جرأت سے کام لے کر اپنے والدین کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ سول میرج سرٹیفکیٹ کی فوٹو اسٹیٹ بھی والدین کے سامنے رکھ دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کا باپ جواد احمد اس کی شادی ایک سرمایہ دار کے بیٹے سے کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتا اس لیے اسے مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا کیونکہ وہ شمعون سے اتنی ہی محبت کرنے لگی تھی۔

توقع کے مطابق اس کا ردِعمل بھی ہوا۔ رفعت نے بعد میں بتایا تھا کہ اس کے باپ نے غصے میں آ کر اسے کئی تھپڑ مارے تھے اور اسے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔

شمعون کو اس کا اندیشہ بھی تھا۔ رفعت سے اس بارے میں بات بھی ہو گئی تھی اور شمعون نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایسا ہونے کی صورت میں پہلے وہ خود جواد احمد سے بات کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کرے گا لیکن اس طرح بات نہیں بن سکی تو قانونی مدد حاصل کرے گا۔

اندیشہ یہ بھی تھا کہ رفعت سے اس کا موبائل فون چھین لیا جائے گا اور وہ شمعون کو صورتِ حال سے آگاہ نہیں کر سکے گی اس لیے ایک اور موبائل فون خریدا گیا تھا۔ وہ رفعت اپنے لباس میں چھپائے رہی تھی۔ اسی موبائل فون کے ذریعے اس نے شمعون کو حالات سے آگاہ کیا تھا۔

جواد احمد بے حد مشتعل تھا۔ شمعون نے اس سے ملاقات کی تو اس ملاقات کا کوئی مثبت نتیجہ نکلتا نظر نہیں آیا۔ جواد احمد نے اسے بھی برا بھلا کہا۔

رفعت کی ماں ٹھنڈے دل و دماغ کی عورت تھی لیکن شوہر پرست ہونے کے باعث اس نے بھی جواد احمد کا ساتھ دیا۔ اس کے نتیجے میں شمعون کو ان دونوں سے کہنا پڑا کہ وہ لوگ اس کی بیوی کو حبسِ بے جا میں رکھنے کے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں اس لیے وہ اب پولیس سے رابطہ کرے گا۔

اس بات پر جواد احمد پہلے سے زیادہ مشتعل ہو گیا تھا لیکن اس کی بیوی نے سمجھ لیا تھا کہ پولیس گھر پر آئی تو رسوائی بھی ہوگی اور وہ اپنی بیٹی کو روکنے میں کامیاب بھی نہیں ہو سکیں گے۔

جواد احمد کی خواہش تھی کہ شمعون اس کی بیٹی کو فوراً طلاق دے دے لیکن شمعون ظاہر ہے کہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایسی صورت میں بیوی کے سمجھانے بجھانے پر جواد احمد کو ٹھنڈا ہونا پڑا لیکن وہ بس اسی حد تک ٹھنڈا پڑا کہ اس نے گرجنا برسنا بند کر دیا تھا، اس کے چہرے پر غصے کی علامات برقرار رہی تھیں۔

رفعت کی ماں نے شمعون سے اس کے باپ کا فون نمبر مانگا تاکہ سارا معاملہ شمعون کے بڑوں کے علم میں بھی آ جائے۔

شمعون نے نمبر دے دیا۔ وہ ساری زندگی اپنے باپ سے یہ معاملہ چھپا بھی نہیں سکتا تھا لہٰذا جس طرح رفعت نے ڈٹ کر حالات کا سامنا کیا تھا، اسی طرح اسے بھی مقابلہ کرنے کی ضرورت تھی۔

جہاں داد خاں کو فون جواد احمد نے کیا تھا۔ اس وقت اس کی رگ پھر پھڑک اٹھی اور اس نے جہاں داد خاں سے بڑے غصیلے لہجے میں کہا تھا کہ اس کے بیٹے نے اس کی بیٹی رفعت کو ڈرا دھمکا کر اس سے شادی کی ہے۔

فون پر یہ بات سنتے ہی جہاں داد خاں جواد احمد کے گھر دوڑا چلا آیا۔ جواد احمد کی رگ اس وقت بھی پھر پھڑکی۔ اس نے فون پر جہاں داد خاں سے جو کچھ کہا تھا، وہی اس کے منہ پر بھی کہہ دیا۔

شمعون سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب جہاں داد نے اس سے پرسش کی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ شادی کسی ڈرانے یا دھمکانے کا نتیجہ نہیں بلکہ فریقین کی خوشی سے ہوئی ہے۔

اس پر جہاں داد نے جواد احمد سے کہا کہ رفعت کو سامنے لا کر اس سے بھی پوچھا جائے۔

اب یہ ان میاں بیوی کی مجبوری تھی کہ وہ رفعت کو اس کمرے سے نکال کر لائیں جہاں اسے قید کیا گیا تھا۔ وہ وہاں آتے ہی شمعون سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس کے گالوں پر طمانچوں کے نشانات اس وقت بھی نظر آ رہے تھے۔

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ شادی کسی بھی قسم کے جبر کا نتیجہ نہیں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس وقت رفعت شمعون سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی، اس وقت جواد احمد کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ بس غصے میں اپنی مٹھیاں بھینچتا رہا تھا۔

''جواد صاحب!'' جہاں داد نے بڑے نرم لہجے میں بات شروع کی۔ ''دیکھیں جواد صاحب! جس طرح یہ شادی ہوئی ہے، اس سے مجھے بھی خوشی تو نہیں ہوئی لیکن زمانہ ہی کچھ ایسا آ گیا ہے۔ جوانی کے جذبات میں بہہ جانے والے بچے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بڑوں کو اس صورتِ حال سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ جو کچھ ہوگیا، اسے رد تو نہیں کیا جاسکتا۔''

جواد احمد نے اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔ رفعت کی ماں سے باتوں کا سلسلہ کچھ دیر تک جاری رہا جس میں یہ بات طے پائی کہ ان دونوں کا شرعی نکاح بھی ہونا چاہیے۔

گھنٹا بھر بعد ہی ایک قاضی نے شمعون اور رفعت کا نکاح پڑھا دیا۔

''اب تم اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھو گی۔'' جواد احمد نے بیٹی کو رخصت کرتے وقت کہا تھا۔

صرف ماں کچھ دیر تک رفعت کو لپٹا کر روتی رہی تھی۔

پھر اپنے گھر پہنچنے کے بعد شمعون کو بھی جہاں داد کی جھاڑ پھٹکار سننا پڑی۔ اس وقت اس کی یہ سوچ بھی واضح طور پر سامنے آئی تھی کہ انسان کو دوسرے کی صرف شرافت دیکھنا چاہیے، شرافت جو غربت میں بھی ہوتی ہے اور غربت کوئی گالی نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس وقت جواد احمد کا غصہ ایک فطری بات ہے لیکن چہرے مہرے سے وہ دونوں ہی میاں بیوی شریف معلوم ہوتے ہیں۔

جہاں داد کے بقول اگر شمعون اسے رفعت کے بارے میں اپنے جذبات سے آگاہ کر دیتا تو وہ خود جا کر جواد احمد کو کسی نہ کسی طرح اس شادی پر آمادہ کر ہی لیتا۔

بعد میں جہاں داد نے دو تین بار کوشش بھی کی تھی کہ رفعت ہمیشہ کے لیے اپنے والدین سے جدا نہ ہو لیکن یہ مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ رفعت کی ماں تو بے چاری بیٹی کے لیے تڑپ رہی تھی لیکن جواد احمد اس بات پر اڑا ہی رہا کہ اب وہ اپنی بیٹی کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے، لہٰذا وہ اس کے گھر میں اس کی لاش پر بھی نہ آئے۔

دن گزرتے رہے۔ جواد احمد کے مؤقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ رفعت ماں سے موبائل فون پر بات کر لیا کرتی تھی لیکن باپ کی خفگی کا اثر اس پر بہرحال ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کبھی کبھی افسردہ ہو جاتی تھی اور شمعون اسے سمجھایا کرتا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آخرکار اس کے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہو ہی جائے گا۔

رفعت نے ایک بہت اچھی بہو ہونے کا ثبوت تو صرف ایک ماہ میں دے دیا۔ جہاں داد اس سے بہت خوش رہنے لگا۔ وہ کبھی کبھی شمعون سے کہا بھی کرتا کہ اس نے خوش قسمتی سے بہت اچھی بیوی پائی ہے۔

وہ اس پر بھی افسوس کا اظہار کیا کرتا تھا کہ جواد احمد کسی طور بھی اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا ہے اس لیے رفعت اپنی ماں سے ملنے بھی نہیں جا سکتی۔

شادی کے تین ماہ بعد شمعون اپنے باپ کے کسی کام کے سلسلے میں بہت مصروف تھا اس لیے کچھ ضروری شاپنگ کرنے کے لیے رفعت کار لے کر اکیلی ہی ایک شاپنگ سینٹر چلی گئی۔

شاپنگ سینٹر سے واپسی پر اسے کچھ نامعلوم لوگوں نے اغوا کر لیا۔ اس کی کار کے نمبر کی وجہ سے پولیس بہ آسانی جہاں داد کے گھر پہنچ گئی اور اس طرح شمعون کو اسی دن معلوم ہوگیا کہ کیا ہوا تھا۔ اس کے دل پر قیامت گزر گئی۔

اس وقت جہاں داد کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ جواد احمد کو اس کی اطلاع دیتا۔ یہ اطلاع ملنے پر دونوں میاں بیوی پہلی مرتبہ جہاں داد کے گھر آئے۔ ماں کا تو رو رو کر برا حال تھا لیکن جواد احمد کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی نظر آئیں۔

پولیس، رفعت اور اس کے اغوا کنندگان کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔

شمعون کی آس بندھی ہوئی تھی کہ اس کے باپ کے اثر رسوخ کے باعث پولیس کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی اور جلد یا بہ دیر اس کی رفعت اسے واپس مل جائے گی لیکن دو ماہ بعد وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

پولیس کو بعض مخبروں سے اطلاع ملی تھی کہ رفعت کو اغوا کرنے والے، بردہ فروش تھے جنہوں نے رفعت کو سمندر پار کسی ملک میں اسمگل کر دیا تھا۔

شمعون کی زندگی ویران ہو کر رہ گئی۔ اس نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا۔ ہر وقت گم صم رہنے لگا۔ جہاں داد اس کی دل جوئی کیا کرتا۔

''مجھے اندازہ ہے بیٹے کہ تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں خود بھی رفعت کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ تمہاری ماں کے بعد یہ گھر ویران سا ہوگیا تھا۔ رفعت آئی تھی تو اس نے یہ گھر پھر سے ہرا بھرا کر دیا تھا لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ اس گھر کی رونق ختم ہو جائے... مگر انسان کو زندہ تو رہنا پڑتا ہے۔ پہاڑ جیسے غم بھی انسان کو سہنا پڑتے ہیں۔ وہ اپنے لیے نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو دوسروں کے لیے زندگی کی طرف پلٹتا ہے یا پلٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ تمہیں میری خاطر زندگی کی طرف پلٹنا چاہیے۔ اس دنیا میں اب صرف تم ہی تو میرے ہو۔''

کبھی وہ کہا کرتا۔ ''ہو سکتا ہے کبھی قانون ان بردہ فروشوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے لیکن ہمیں اس سے کیا حاصل ہوگا۔ ہماری رفعت تو اب ہمیں واپس نہیں مل سکے گی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید اب وہ زندہ بھی نہیں ہوگی اور اگر ہوگی تو اس وقت کا انتظار کرے گی جب اسے خودکشی کرنے کا موقع مل جائے۔ ہمیں تو اب دعا کرنا چاہیے کہ اسے ایسا کوئی موقع مل جائے اور اسے اپنی زندگی ذلت آمیز طریقے سے بسر نہ کرنا پڑے... بلکہ ہمیں اپنے سکون کے لیے یقین کر لینا چاہیے کہ وہ اس ذلت آمیز زندگی سے بچنے کے لیے خود کو ختم کر چکی ہوگی۔''

ان باتوں سے شمعون کبھی کبھی سسک پڑتا لیکن باپ کی یہ باتیں کچھ اثر پذیر ہو کر رہیں۔ باپ کے اصرار پر وہ اس کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ دوست احباب جو اس کی گوشہ نشینی کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے، اس سے ملنے جلنے لگے۔ ان میں سے جو بے حد پُرخلوص تھے، انہوں نے بھی کسی نہ کسی طور سے شمعون کی افسردہ دلی ختم کرنے کی کوششیں کیں۔

چند ماہ گزر گئے۔ شمعون بظاہر نارمل نظر آنے لگا۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آ جاتی تھی۔

ایک دن جہاں داد نے اسے چونکا دیا۔ ''تم شادی کر لو۔''

شمعون چونک کر باپ کا منہ تکنے لگا۔

''ہاں بیٹے!'' جہاں داد نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم ساری زندگی اپنی ذات کے ویرانے میں بھٹکتے رہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم اپنے دوستوں کی رفاقت میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہو۔ یہ تنہائی دھیرے دھیرے ختم ہو سکتی ہے اگر تم دوسری شادی کر لو۔ تم اپنے لیے نہ سہی، اس بوڑھے باپ کی خواہش کی لاج رکھنے کے لیے شادی کر لو۔''

شمعون نے فوری طور پر آمادگی ظاہر نہیں کی لیکن سوچتا رہا۔ رفعت اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکی تھی۔ یہ غم شاید ساری زندگی کے لیے اس کے وجود کا حصہ بن چکا تھا۔ شادی کر لینے سے بھی اس کا وہ غم ختم نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس طرح اس کے باپ کی ایک خواہش پوری ہو جاتی۔

وہ باپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے شادی پر آمادہ ہوگیا۔

جہاں داد بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے لیے بہو پہلے ہی تلاش کر لی تھی۔ اسے ایک بہت بڑے بزنس مین سعید جعفری کی لڑکی سمیرا پسند آ گئی تھی۔

سعید جعفری کو اس کا علم نہیں تھا کہ شمعون کی ایک شادی ہو چکی ہے۔ جہاں داد نے اپنے اثر رسوخ سے کام لے کر رفعت کے اغوا کی بات اخبارات میں نہیں آنے دی تھی۔ اس نے خود بھی سعید جعفری کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

جہاں داد نے شمعون کو سعید جعفری سے ملایا تو سعید جعفری نے بھی اس کے بیٹے کو پسند کیا لیکن شادی کے سلسلے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ پھر یہ بات سامنے آئی کہ وہ اپنی بیٹی کسی دوسرے شہر میں نہیں بیاہنا چاہتا تھا۔

شمعون کا ایک دوست اس بڑے شہر میں انٹیریئر ڈیکوریٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن خاصی مہارت کے باوجود اسے کوئی خاص اہمیت نہیں مل سکی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ اس کے پاس سرمائے کی کمی تھی۔ وہ اپنے لیے کوئی بڑا دفتر نہیں بنا سکا تھا جبکہ اس دور میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے نمود و نمائش کی ضرورت پڑتی ہے۔

جہاں داد نے اس کے لیے ایک شان دار دفتر قائم کروا دیا جس کا مالک شمعون تھا لیکن عملی طور پر سارے کام

بغداد کے خلیفہ ہارون رشید ایک دن کسی شاہراہ سے گزر رہے تھے اور ان کے پیچھے کچھ وزرا اور مصاحبین بھی تھے۔ انہوں نے ابونواس کو دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل لیے جا رہا ہے۔

خلیفہ نے اسے طلب کیا اور دریافت کیا۔

''آپ کے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟''

ابونواس نے کہا۔

''یہ دودھ ہے یا امیر المومنین!''

ہارون رشید نے بوتل کو بغور دیکھا اور کہا۔

''حیرت ہے دودھ تو سفید ہوتا ہے۔''

ابونواس نے کن انکھیوں سے بوتل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''امیر المومنین! آپ جو فرماتے ہیں وہ حق ہے۔ بلاشبہ یہ دودھ ہی تھا لیکن جب اس نے آپ کو دیکھا تو مارے شرم کے سرخ ہوگیا۔'' یہ سن کر خلیفہ ہنس پڑا۔

اس کے دوست کو ہی کرنا تھے۔

اس بڑے شہر میں جہاں داد نے شمعون کے لیے ایک بنگلا بھی بنوا دیا۔ وہ تو بہت شان دار بنگلا بنوانا چاہتا تھا لیکن شمعون نے اسے روک دیا۔

”مجھے بڑے گھر میں وحشت ہو گی ڈیڈی!“ شمعون نے کہا تھا۔

سعید جعفری اس شادی کے لیے اسی شرط پر آمادہ ہوا تھا کہ اس کی بیٹی اسی شہر میں رہے گی۔

اس شادی سے صرف ایک ہفتے پہلے کسی جگہ رفعت کے باپ جواد احمد سے شمعون کا آمنا سامنا ہو گیا۔

”میرے خیالات غلط نہیں ہیں۔“ اس نے بڑے زہریلے لہجے میں شمعون سے کہا۔ ”سرمایہ دار صرف غریبوں کا خون چوسنے والی مخلوق ہیں۔ تم نے رفعت سے شادی کر ہی لی تھی اس لیے تمہارا باپ اس وقت بے بس ہو کر خاموش رہ گیا لیکن پھر اس نے میری بیٹی کو اغوا کروا دیا اور اب وہ تمہاری شادی ایک سرمایہ دار گھر میں کروا رہا ہے۔“

جواب میں شمعون نے اس سے کچھ نہیں کہا اور ان باتوں کو صدمے اور غصے سے مغلوب باپ کی جذباتیت ہی سمجھا۔

سمیرا سے اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد چند ہی دنوں میں اسے محسوس ہونے لگا کہ سمیرا ایک مثالی بیوی ہے اور اسی بات کو اس کے باپ نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ اسی لیے اس نے سعید جعفری کی یہ شرط بھی منظور کر لی تھی کہ اس کی بیٹی اسی شہر میں رہے گی۔ اس نے اپنے بیٹے سے دوری بھی گوارا کر لی تھی۔ شادی کی ساری تقریبات بھی اسی شہر میں ہوئی تھیں تا کہ سعید جعفری کے کان میں کسی طرح بھنک بھی نہ پڑ سکے کہ شمعون کی ایک شادی ہو چکی تھی۔ بعد میں بھی جہاں داد نے شمعون کو تاکید کی تھی کہ وہ اس سے ملنے کے لیے اگر سمیرا کے ساتھ آئے تو ایک دن سے زیادہ کے لیے نہ آئے تا کہ سمیرا کے کان میں بھی اس کی بھنک نہ پڑ سکے۔

سمیرا کیونکہ ایک مثالی بیوی ثابت ہوئی تھی اس لیے شمعون ہر طرح اس کا خیال رکھنے کی کوشش کیا کرتا۔ بس یہ اس کے اختیار کی بات نہیں تھی کہ وہ بھی سمیرا کو اسی طرح ٹوٹ کر چاہنے لگتا۔

ہفتے میں ایک دو بار جہاں داد ان میاں بیوی سے ملنے آ جایا کرتا تھا اور سعید جعفری کے ساتھ بھی خاصا وقت گزارتا تھا۔

ایک رات شمعون نے خواب میں رفعت کے باپ جواد احمد کو دیکھا۔ خواب میں بھی اس نے جواد احمد سے وہی باتیں سنیں جو شادی سے ایک ہفتے پہلے سُن چکا تھا۔

اس خواب کے بعد شمعون کے دماغ میں کبھی کبھی یہ خیال ابھرنے لگا، کیا واقعی جواد احمد کا خیال درست ہو سکتا ہے؟

شمعون اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا کرتا لیکن اس رات یہ خیال اس کے دماغ سے جونک کی طرح لگ گیا جب اس نے رفعت کو پلیٹ فارم پر دیکھا۔

اگر رفعت کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شمعون شاید اس طرح اپنی جان پر کھیل کر اسے بچانے کی کوشش نہ کرتا لیکن رفعت کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا اور وہ کر گزرا...

رفعت جس گاؤں سے بھاگتی ہوئی آئی تھی، اس گاؤں کے جاگیردار سے جہاں داد کے تعلقات کا شمعون کو بہ خوبی علم تھا اور وہ ان جاگیرداروں کے رویے اور مزاج سے بھی بہ خوبی واقف تھا اس لیے جواد احمد کی باتیں اس کے دماغ میں دوبارہ چکرانے لگیں۔

رفعت اس کی پناہ میں آنے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب شمعون کو اپنے باپ پر شبہ تو ہو چکا تھا لیکن اس نے فوری طور پر سمیرا پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ رفعت اس کی بیوی ہے۔

بعد میں رفعت کو بچانے کے لیے وہ موبائل فون پر اپنے باپ سے جھوٹ بھی بولتا رہا اور رفعت کو بہ حفاظت اپنے گھر لانے میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن اسے مکمل یقین اب بھی نہیں تھا کہ رفعت کو اغوا کروانے میں اس کے باپ کا ہاتھ ہو گا۔ اس نے محض شبے کی وجہ سے احتیاط سے کام لیا تھا۔

☆☆☆

نہ جانے کس وقت شمعون کو نیند آ گئی تھی۔ اسے سمیرا نے جگایا۔

”کب تک سوتے رہو گے ڈیئر۔“ شمعون کی آنکھیں کھلنے پر سمیرا نے کہا۔

شمعون جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

”وہ لڑکی کہاں ہے؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔

”وہ تو ابھی سو ہی رہی ہے۔ اسے شاید کئی راتوں سے نیند پوری کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔“

شمعون نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چار بجنے والے تھے۔

”کمرا باہر سے بند کر آئی تھیں؟“ اس نے سمیرا سے پوچھا۔

”نہیں... کیوں؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”ارے وہ کہیں...“ شمعون جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنی بات بھی پوری نہیں کی تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ سمیرا اس کے پیچھے لپکی۔

”اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے شمعون؟“

”وہ اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔“ شمعون نے جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایسے لوگ کسی وقت بے حواس بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ اٹھ کر کہیں گھر سے نہ نکل جائے۔“

لیکن شمعون کا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ رفعت بے خبر سو رہی تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد شمعون نے دروازہ بند کر کے اسے مقفل بھی کر دیا۔

سمیرا بولی۔ ”وہ اٹھے گی اور دروازہ نہیں کھول پائے گی تو پھر یہی سمجھ لے گی کہ اسے قید کر لیا گیا ہے۔“

”ہم یہاں قریب ہی رہیں گے۔ چلو اسٹڈی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہ دروازہ تھپتھپائے گی تو ہم اس کی آواز سن لیں گے۔ کسی ملازم سے کھانا لانے کے لیے کہہ دو۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ صبح میں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا، صرف چائے پی تھی۔“

”تم اس لڑکی کے لیے اتنے حواس باختہ کیوں ہو گئے ہو شمعون؟“ سمیرا نے تشویش ظاہر کی۔

”تم کھانا منگواؤ۔ ہم اطمینان سے گفتگو کریں گے۔“

سمیرا نے اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھائی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

”کچھ دیر میں ڈیڈی بھی پہنچنے والے ہوں گے۔“ شمعون نے کہا۔ ”فون پر بات ہوئی تھی ان سے۔“

”میری طرح وہ بھی الجھن میں ہوں گے کہ تم ایک اجنبی لڑکی کی وجہ سے اتنے پریشان کیوں ہو؟“

”کسی مظلوم لڑکی کے لیے کچھ کرنا کیا ایک نیکی نہیں؟“

”پولیس یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتی تھی۔“

”کچھ نہیں کرتی پولیس۔“ شمعون نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہ اپنی فائلوں میں دو چار دن کی فرضی کارکردگی کا احوال لکھتے اور پھر اس لڑکی کو دارالامان بھیج دیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن تھا کہ وہ کسی سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیتے۔“

”اب تم کیا کرو گے؟“

”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے ناشتا کب کیا تھا۔ ملازمہ نے بتایا تھا مجھے۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا اور فون پر مختلف لوگوں سے رابطے کر رہا تھا۔ اس لڑکی کا علاج کروانے کے لیے ایک بہت ماہر ڈاکٹر کا پتا لگایا ہے۔ اس سے بات بھی کر چکا ہوں۔ اس نے مجھے کل کا وقت دیا ہے۔“

”تم نے کچھ اندازہ لگایا ہے... خود میرا تو اندازہ ہے کہ وہ خاصے خطرناک لوگ ہوں گے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”کیا وہ اس لڑکی کو دوبارہ اغوا کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے؟“

”کر سکتے ہیں بلکہ شاید ضرور کریں گے۔“

”کیا انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ تم اسے یہاں لے آئے ہو؟“

”عین ممکن ہے۔“

”تو پھر تم جب اس لڑکی کو لے کر باہر نکلو گے تو...“

”میں یہ سب کچھ سوچ چکا ہوں سمیرا۔“ شمعون نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں لڑکی کو برقع پہنا کر لے جاؤں گا۔ کیا تم میرے لیے یہ کام کر سکتی ہو؟ بازار سے ایک برقع خرید لاؤ۔“

”اچھا۔“ سمیرا نے ایک طویل سانس لی۔

کھانا کھانے کے بعد سمیرا کار لے کر برقع خریدنے چلی گئی۔ شمعون اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ رفعت کو سمیرا کے ساتھ وہیں سلایا گیا تھا۔ وہ اس وقت بھی سو رہی تھی۔ شمعون نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سوچتا رہا کہ اتنے عرصے میں رفعت پر نہ جانے کیا کچھ گزر چکی ہو۔ یہ سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”رفعت!“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”تم واقعی اپنی یادداشت کھو چکی ہو یا یہ محض اداکاری ہے... اور اگر اداکاری ہے تو کیوں ہے؟“

اسی وقت ایک ملازم نے اسے جہاں داد کے آنے کی اطلاع دی۔ شمعون کے لیے یہ اطمینان بخش بات تھی کہ اس وقت سمیرا وہاں نہیں تھی۔ اسے مارکیٹ بھیجتے وقت شمعون نے یہ سوچا بھی تھا کہ اب اس کے باپ کی آمد کا وقت قریب ہے اس لیے اس وقت سمیرا کی عدم موجودگی ضروری ہے۔ اس نے ملازم سے کہا۔

”ڈیڈی کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں ابھی...“

”وہ ڈرائنگ روم ہی میں ہیں صاحب۔“

”ٹھیک ہے۔ ان سے کہو کہ میں ابھی آتا ہوں۔“

ملازم سے ہی اس نے ایک ملازمہ کو بھیجنے کے لیے کہا۔ اس کے گھر میں مالی وغیرہ کے علاوہ دو عورتیں اور ایک مرد ملازم تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملازمہ کی آمد سے پہلے شمعون نے دروازہ بند تو کر دیا لیکن مقفل نہیں کیا۔ ملازمہ کے آنے پر اس نے ہدایت کی۔

''تم یہیں رکو۔ وہ لڑکی ابھی سو رہی ہے جو صبح ہمارے ساتھ آئی تھی۔ جب وہ جاگ جائے تو اس سے کہنا کہ وہ منہ ہاتھ دھو لے۔ اسی دوران میں اس کے لیے کھانا منگوا لینا۔ خود یہاں سے بالکل نہ ہٹنا۔''

''اچھا صاب۔''

یہ بندوبست کرنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ جہاں داد وہاں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

''اتنی دیر لگا دی؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''میں واش روم میں تھا ڈیڈی۔''

جہاں داد نے اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری حالت سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم نے نہ تو کپڑے تبدیل کیے ہیں، نہ غسل کیا ہے۔ تمہارے بال بھی گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔''

''میری ذہنی حالت ایسی ہے ڈیڈی کہ مجھے کسی بات کا ہوش نہیں۔ آپ بیٹھیے تو سہی۔''

جہاں داد بیٹھ گیا۔ ''رفعت کہاں ہے؟''

''وہ ابھی تک سو رہی ہے۔''

''اور سمیرا؟''

''وہ کچھ خریداری کرنے بازار گئی ہے۔''

''یہ اچھا ہوا۔ اس کی موجودگی میں تم سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کب تک آئے گی؟''

''ابھی آدھا گھنٹا تو اور لگ سکتا ہے۔ ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں ڈیڈی!''

جہاں داد کے چہرے پر تشویش تھی۔ اس نے کہا۔ ''کچھ اندازہ لگایا کہ اس دوران میں اس بدنصیب پر کیا گزری ہوگی؟''

''میں کیا اندازہ لگا سکتا ہوں ڈیڈی؟'' شمعون کچھ افسردہ ہو گیا۔

''وہ اتنے عرصے جن لوگوں کی قید میں رہی ہے، وہ اچھے لوگ تو نہیں ہوں گے۔ رفعت سے وہ کیا سلوک کر سکتے ہیں؟''

شمعون نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اپنے باپ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''اس کی صحت کافی خراب ہو گئی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''وہ تو ہو گی۔ لیکن میں نے تم سے کوئی اور سوال کیا تھا۔''

''ڈیڈی!'' شمعون نظریں جھکائے رہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میں رفعت سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اس پر جو کچھ بھی گزری ہو، اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ وہ میری بیوی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔''

''سعید جعفری سے یہ بات زیادہ دن تک چھپی نہیں رہ سکے گی۔ اس سے پہلے سمیرا کو علم ہو سکتا ہے۔ سعید جعفری سے میرے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ وہ یہی کہے گا کہ ہم نے اسے دھوکا دیا ہے۔''

''آپ کا اصرار تھا ڈیڈی! میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔''

جہاں داد کے چہرے پر تشویش کا تاثر بدستور قائم رہا۔

''میں رفعت کا علاج کراؤں گا۔'' شمعون نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے امید ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

''کس سے علاج کراؤ گے؟''

شمعون نے اس ڈاکٹر کا نام بتا دیا جس سے وہ بات کر چکا تھا۔

''کب سے شروع کروا رہے ہو علاج؟'' جہاں داد نے پوچھا۔

''کل جاؤں گا اسے لے کر۔۔۔ گیارہ بجے کا وقت دیا ہے ڈاکٹر نے۔''

جہاں داد سوچ میں ڈوبا رہا، پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''پولیس نے کیونکہ یہ بتایا تھا کہ رفعت کو سمندر پار اسمگل کر دیا گیا ہے، اس لیے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ ہمیں کبھی نہیں مل سکے گی۔ اگر مجھے ذرا بھی خیال ہوتا کہ وہ ہمیں مل سکتی ہے تو میں سمیرا سے تمہاری شادی نہ کرواتا۔''

شمعون چپ رہا۔

جہاں داد پھر بولا۔ ''میرے شہر کی پولیس کے علم میں یہ بات آ سکتی ہے کہ رفعت ہمیں مل گئی ہے۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ رفعت میری بیوی ہے۔''

''وہ ہم سے بازپرس کر سکتے ہیں کہ ہم نے انہیں اطلاع نہیں دی۔''

''بازپرس!'' شمعون نے تلخی سے کہا۔ ''آپ کے اثر رسوخ کے باوجود یہ ہو سکتا ہے؟''

''میں نے یونہی ایک بات کہہ دی۔ میں معاملے کو سنبھال تو لوں گا۔''

''میں تو پولیس پر کیس کر سکتا ہوں کہ اس نے غلط تفتیش کی اور ہمیں غلط بات بتائی۔''

''یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ پولیس پر کیس کرنے سے حالات زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔ معاملہ شہرت بھی پا جائے گا۔ ابھی سعید جعفری سے یہ بات جتنے دن تک بھی چھپی رہے، اچھا ہے۔ میں ایسی کوئی تدبیر سوچوں گا کہ اس سے تعلقات خراب نہ ہوں۔''

''تعلقات خراب ہوتے ہیں تو ہوں۔۔۔ اس سے آپ کی صحت پر کوئی مضر اثرات تو مرتب نہیں ہوں گے۔ اور یہ بھی شاید ممکن نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو طلاق دلوانا چاہے۔''

''سمیرا تمہیں بہت چاہتی ہے۔ اس کے دل پر کیا گزرے گی؟''

''رفعت زندہ ہو، اور میرے پاس نہ ہو، اس سے میرے دل پر کیا گزرے گی؟''

شمعون نے جہاں داد کو لاجواب کر دیا لیکن اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہوتی رہی۔

''کیا میں رفعت سے مل لوں؟'' اس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، وہ سو کر اٹھ چکی ہے یا نہیں۔''

شمعون نے فوری طور پر ملازم سے معلوم کروایا۔ ملازم نے بتایا کہ رفعت اٹھ چکی ہے اور اب کھانا کھا رہی ہے۔

شمعون نے باپ سے کہا۔ ''وہ کھانا کھا چکے تو آپ اس سے مل لیں۔''

''محبت تو مجھے بھی ہے نا اس سے۔۔۔ دیکھنا چاہتا ہوں اسے۔''

''میں نے آپ کو روکا کب ہے ڈیڈی؟''

تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ رفعت کھانا کھا چکی ہے۔ اسی وقت سمیرا بھی آ گئی۔ اس نے شاپنگ بیگ ایک طرف پھینکتے ہوئے جہاں داد کو سلام کیا۔ جہاں داد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شفقت سے اپنے پاس بٹھا کر اس سے کہا۔

''تم بھی خاصی الجھن میں پڑ گئی ہو گی بیٹی!''

''یہ تو قدرتی بات ہے ڈیڈی!'' سمیرا نے کہا۔ ''شمعون ایک اجنبی لڑکی کے لیے اتنے پریشان ہیں اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

''بہت ہمدرد قسم کا انسان ہے تمہارا شوہر۔''

''چلیے ڈیڈی!'' شمعون بول پڑا۔ ''اگر آپ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہیں تو چل کر دیکھ لیجیے۔''

''ہاں، چلو۔'' جہاں داد اٹھ کھڑا ہوا۔

شمعون اور جہاں داد کے ساتھ سمیرا بھی اس کمرے میں پہنچی۔ اس وقت رفعت بستر پر بیٹھی، گھٹنوں میں سر دیے، نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکایا پھر ان لوگوں کو دیکھ کر وہ جلدی سے بستر سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھی رہو بیٹی!'' جہاں داد نے نرمی سے کہا۔

لیکن وہ نہیں بیٹھی۔ اس نے ایک بار شمعون کو اور دوسری مرتبہ سمیرا پر نظر ڈالی۔

''یہ میرے والد ہیں۔'' شمعون نے رفعت سے کہا۔

رفعت نے جہاں داد کو سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' جہاں داد نے کچھ رک کر کہا۔ پھر غور سے اس کے سراپا پر نظر ڈالنے کے بعد شمعون سے بولا۔ ''اس پیاری بچی کے لیے کچھ ملبوسات کا انتظام بھی تو کرو۔''

''میں لے کر آئی ہوں ڈیڈی!'' سمیرا بول پڑی۔

شمعون اس جواب پر نہ صرف چونکا بلکہ اسے خوشی بھی ہوئی کہ سمیرا نے رفعت کا خیال رکھا تھا۔

''تم آرام کرو۔'' جہاں داد نے رفعت سے کہا اور واپسی کے لیے مڑا۔ اس کے ساتھ ہی شمعون اور سمیرا بھی نکل آئے۔

''سمیرا!'' شمعون بولا۔ ''تم ڈیڈی کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرواؤ۔''

''جی۔'' سمیرا سر ہلا کر دوسری طرف چلی گئی۔

جہاں داد کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ اسی صوفے پر بیٹھا جس پر سمیرا نے شاپنگ بیگ پھینکا تھا۔

''کیا کیا خرید لائیں؟'' جہاں داد نے کہتے ہوئے سرسری سے انداز میں شاپنگ بیگ کھولا۔

شمعون نے دیکھا کہ وہ کسی بوتیک سے خریدے ہوئے اچھے ملبوسات تھے۔

''اچھے کپڑے لائی ہے سمیرا۔'' اس نے کہا۔

''جی ڈیڈی۔''

''لیکن برقع۔۔۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں رفعت کو جب ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا تو برقع پہنا کر لے جاؤں گا۔'' شمعون نے جواب دیا۔

جہاں داد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ نامعلوم لوگ رفعت کو پھر اغوا کرنا چاہیں گے؟''

''خیال تو نہیں ہے ڈیڈی لیکن میں احتیاط برتنا چاہتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ رفعت کو میں نے دوبارہ کھو دیا تو مجھ پر نہ جانے کیا گزرے۔''

اس موضوع پر گفتگو آگے نہیں بڑھ سکی کیونکہ سمیرا واپس آگئی تھی۔

''میں نے خانساماں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے ڈیڈی کہ وہ آپ کے لیے کیا کیا تیار کرے۔ آپ کی پسند تو میں جانتی ہوں نا۔''

''اس کی ضرورت نہیں سمیرا!'' جہاں داد نے جلدی سے کہا۔ ''میں بس اب جاؤں گا۔''

''آج رکیں گے نہیں؟''

''نہیں، کچھ کام ایسے ہیں کہ مجھے آج ہی بلکہ ابھی واپس جانا ہوگا۔ میں بس چائے پیوں گا۔''

''چائے تو بس آرہی ہے۔''

جہاں داد بولا۔ ''میں تو صرف اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا اس لیے آگیا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کے سلسلے میں شمعون نے کیا کچھ سوچا ہے۔'' پھر وہ شمعون سے بولا۔ ''اگر تمہیں کچھ خدشات ہیں تو کل اس لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا۔''

''برقع میں نے اسی لیے منگوایا ہے ڈیڈی!''

جہاں داد نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چائے پینے کے بعد وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا تو شمعون اور سمیرا بھی کھڑے ہوئے اور جہاں داد کو باہر تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ساتھ چلے۔

''تم اس لڑکی کے پاس جاؤ سمیرا۔'' جہاں داد نے کہا۔ ''اسے اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔''

''جی ڈیڈی، بہتر۔'' سمیرا لوٹ گئی۔

برآمدے سے باہر نکل کر جہاں داد نے شمعون سے کہا۔ ''سمیرا آگئی تھی اس لیے میں تم سے ایک اہم بات نہیں کہہ سکا۔ مجھے شبہ ہے کہ رفعت کی اپنی یادداشت نہیں کھوئی۔''

شمعون باپ کا منہ تکتا رہ گیا۔

''ہاں۔'' جہاں داد نے سر ہلا کر کہا۔ ''اس نے مجھے جس طرح سلام کیا تھا، بالکل اسی طرح پہلے بھی سلام کیا کرتی تھی۔''

یہ شبہ خود شمعون کو بھی تھا لیکن اس نے جہاں داد سے کہا۔ ''وہ یہ ڈھونگ کیوں رچائے گی ڈیڈی؟''

''میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا لیکن میری تشویش بڑھ گئی ہے۔ مجھے اگر ایک ضروری کام نہ ہوتا تو میں دو ایک دن کے لیے رک جاتا۔ بہر حال، کوشش کروں گا کہ کل پھر آجاؤں اور دو ایک دن کے لیے رکوں۔''

اس کے بعد جہاں داد نے شمعون کی کوئی بات نہیں سنی اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

شمعون اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک جہاں داد کی کار پھاٹک سے نہیں نکل گئی۔ اس کے بعد وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا اندر آگیا۔

☆☆☆

کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے جہاں داد کے چہرے سے فکر انگیزی صاف ظاہر تھی۔ اس نے جیب سے موبائل نکال لیا تھا لیکن اس نے فوری طور پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے شوفر سے ایک شاپنگ سینٹر کی طرف چلنے کے لیے کہا۔

شوفر نے کار کا راستہ تبدیل کیا ورنہ وہ ان راستوں پر چل رہا تھا جو اسے شاہراہ کی طرف لے جاتے۔

دس منٹ بعد ہی کار اس شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں رکی۔ وہ شاپنگ سینٹر شہر کے دو تین مشہور شاپنگ سینٹرز میں سے ایک تھا جس کی عمارت تین منزلہ تھی۔

وہاں تین لفٹ لگی ہوئی تھیں۔ جہاں داد نے چاہا کہ اسے کوئی خالی لفٹ مل جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہوا۔ وہ پہلی منزل پر لفٹ سے اتر کر اس طرف بڑھا جہاں سنگی سیڑھیاں تھیں۔

سیڑھیوں کی جانب زیادہ آمدورفت نہیں تھی۔ دکانیں بھی سیڑھیوں سے کچھ ہٹ کر تھیں۔ وہیں ایک طرف کھڑے ہو کر جہاں داد نے موبائل فون پر جاگیردار سے رابطہ کیا۔ اسے جو باتیں کرنا تھیں، وہ شوفر کے سامنے یا لوگوں کے ہجوم میں نہیں کر سکتا تھا۔

جاگیردار نے کال ریسیو کی اور فوراً بولا۔ ''مجھے علم ہو چکا ہے کہ آپ اپنے بیٹے سے ملنے پہنچ گئے تھے اور اب وہاں سے واپسی کے لیے بھی روانہ ہو چکے ہیں۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟'' جہاں داد نے تعجب سے کہا۔

''لڑکی کے فرار ہو جانے کی وجہ سے میں اتنا ہی شرمندہ ہوں جہاں داد صاحب کہ ہر صورت میں اسے دوبارہ اغوا کروا لینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے آدمیوں کو پہلے ہی ہدایت کر دی تھی کہ وہ وہاں پہنچیں۔ اس وقت آپ کے بیٹے کے بنگلے کی سختی سے نگرانی کی جارہی ہے۔ میں نے آپ سے شاید اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں آپ کو اچانک ہی خوش خبری

سنانا چاہتا تھا۔''

''یہ کتنی عجیب بات ہے جاگیردار صاحب کہ میرا بیٹا آپ کے آدمیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے گھر پہنچ گیا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا۔ بہر حال اب بھی میں مایوس نہیں ہوں۔ میرے آدمی کچھ نہ کچھ کر ہی گزریں گے۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کو وہاں جا کر کیا معلوم ہوا؟''

''میرا خیال ہے، کل آپ کے آدمی اسے اغوا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ شمعون اسے دماغی معاملات کے ایک ماہر کے پاس لے جارہا ہے۔ گیارہ بجے کا وقت ملا ہے اسے۔ وہ یہ احتیاط بھی کر رہا ہے کہ اس نے لڑکی کے لیے برقع منگوایا ہے۔ وہ برقع میں ہوگی۔ میرے یہاں آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا ورنہ یہ بات علم میں نہیں آتی۔'' آخر میں جہاں داد نے ڈاکٹر کا نام بھی بتایا۔

''میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''جہاں داد صاحب!'' جاگیردار نے کہا۔ ''آپ نے شاید اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ وہ ایک بڑا شہر ہے۔ یہاں تو میرے آدمی آسانی سے کامیاب ہو گئے تھے لیکن وہاں سرِعام کسی کو اغوا کرنا خاصا مشکل ہوگا۔ جس ڈاکٹر کا نام آپ نے بتایا ہے، اس کا کلینک خاصے بارونق علاقے میں ہے۔ وہاں اتنا ٹریفک ہوگا کہ میرے آدمیوں کے لیے وہاں سے لڑکی کو نکال لے جانا بہت مشکل ہوگا۔''

''ہوں۔'' جہاں داد نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

''بات آپ کی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ تو پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شمعون اس لڑکی کو لے کر جب گھر سے روانہ ہو تو وہیں کہیں آپ کے آدمی اپنا کام کر جائیں۔ اس رہائشی علاقے میں دس گیارہ بجے خاصا سناٹا ہوتا ہے۔''

''ہاں، یہ زیادہ آسان ہوگا بلکہ آسان ہی ہوگا لیکن ایک خطرہ وہاں یہ ہے کہ ہمارے شہر کی بہ نسبت وہاں پولیس موبائل زیادہ گشت کرتی ہیں۔ اگر کسی نے بروقت پولیس کو اطلاع دے دی تو پولیس خاصے بڑے علاقے کو بڑی تیزی سے اپنے حصار میں لے سکتی ہے۔''

جہاں داد نے منہ بنایا۔ ''اب کچھ خطرات تو مول لینا ہی ہوں گے۔''

''میں ایک اور منصوبے پر غور کر رہا تھا۔'' جاگیردار نے کہا۔ ''اسے بنگلے میں گھس کر اغوا کیا جائے۔''

''یہ تو میرا خیال ہے کہ زیادہ خطرناک ہوگا۔ پھاٹک پر ایک مسلح سیکیورٹی گارڈ کے علاوہ چوکیدار کے پاس بھی ریوالور ہے۔''

''میرے آدمی سب کچھ بتا چکے ہیں مجھے۔'' جاگیردار نے کہا۔ میرے آدمی پھاٹک سے نہیں، عقب سے بنگلے میں داخل ہوں گے۔ اس جانب بنگلے کا احاطہ نہیں ہے۔''

''عقبی دروازے سے؟''

''جی نہیں۔'' جاگیردار نے کہا۔ ''مجھے بتایا جا چکا ہے کہ وہ دروازہ بہت مضبوط ہے۔ میرے آدمی سیوریج پائپ کے ذریعے اوپر چڑھ کر، تھوڑی سی دشواری کے ساتھ ایک کھڑکی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''کھڑکی اندر سے بند ہوگی۔''

''ہاں... میرے سامنے مسئلہ صرف یہ ہے کہ مجھے بنگلے کے اندرونی نقشے کا علم نہیں۔ آپ کی کال آنے سے پہلے میں آپ سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ آپ مجھے اس بنگلے کا نقشہ بنا کر کمپیوٹر پر بھیج دیں۔''

''مجھے ابھی اپنے گھر پہنچنے میں کافی وقت لگ جائے گا ایک بجے سے پہلے اپنے گھر...'' جہاں داد یک لخت چپ ہوا۔ ''یہاں پر ایک جاننے والا ہے۔ میں اس کے گھر چلا جاتا ہوں۔ اسی کے کمپیوٹر پر بناتا ہوں نقشہ... یہیں سے آپ کو بھیج دوں گا۔''

''یہ بہت اچھا رہے گا کہ ابھی وہ نقشہ مجھے مل جائے۔ میرے آدمیوں کو منصوبہ بندی کرنے کے لیے خاصا وقت مل جائے گا۔'' جاگیردار نے اطمینان کا اظہار کیا۔

''اب ایک اور خیال بھی میرے دماغ میں آیا ہے۔'' جاگیردار نے کہا۔ ''کیونکہ رفعت کو شمعون نے گاؤں کی طرف سے آتے دیکھا تھا، اس لیے وہ یہ بات پولیس کو ضرور بتائے گا۔ پولیس گاؤں پہنچ جائے گی۔ آپ کے لیے مشکلات ہو سکتی ہیں۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو... اب ہم کوئی اور رسک نہیں لے سکتے۔'' جہاں داد نے کہا۔ ''میں ابھی جس جگہ جاؤں گا اور جہاں سے آپ کو بنگلے کا نقشہ بھیجوں گا، وہ گھر شمعون کے گھر سے صرف بیس منٹ کے فاصلے پر ہے۔ آپ لڑکی کو وہیں بھجوا دیں۔ نقشے کے ساتھ ہی میں آپ کو اس گھر کا پتا بھی بھیج دوں گا اور یہ بھی بتا دوں گا کہ آپ کے آدمی لڑکی کو کس کے حوالے کریں گے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ وہ لڑکی وہاں سے فرار نہیں ہو سکے گی؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں۔'' جہاں داد نے کہا۔ ''ایسا بندوبست ہو جائے گا۔ اب آپ نقشے کا انتظار کیجیے۔''

اس نے رابطہ منقطع کیا اور تیزی سے زینے طے کرتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ اپنی کار میں بیٹھتے وقت اس نے شوفر سے کہا۔

''زینت کے گھر چلو۔''

شوفر نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور کار حرکت میں لے آیا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ زینت کا گھر اس کے لیے کوئی اجنبی جگہ نہیں تھی۔

زینت جہاں داد کی داشتہ تھی اور کئی برس سے تھی۔ جہاں داد نے اسے گھر بھی دلا دیا تھا اور ایک کار بھی دلا دی تھی۔ وہ اسے ماہانہ اخراجات بھی دیتا تھا۔ زینت ایک بیوٹی پارلر چلاتی تھی۔

جہاں داد نے کار میں بیٹھتے ہی موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا۔

''جی خاں صاحب!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''کہاں سے یاد کر رہے ہیں اپنی کنیز کو!''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' جہاں داد نے پوچھا۔

''جب آپ یہاں نہیں ہوتے تو میرا سارا وقت بیوٹی پارلر ہی میں گزرتا ہے لیکن اس وقت میں وہاں نہیں ہوں۔ طبیعت کچھ ڈل تھی اس لیے آرام کرنے کے لیے گھر چلی گئی تھی۔ اب پھر بیوٹی پارلر جا رہی ہوں۔''

''تم ایسا کرو کہ فوراً گھر پہنچو، میں آ رہا ہوں۔''

''آپ یہاں آئے ہوئے ہیں؟'' زینت اس کے اچانک آنے پر حیرت زدہ تھی۔

''ہاں، تم جلدی پہنچو۔''

جہاں داد نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ زینت کے گھر پہنچنے سے پہلے اس منصوبے کے ہر پہلو کا جائزہ لے لینا چاہتا تھا جس کا دھندلا سا خاکہ اس کے دماغ میں اس وقت آیا تھا جب وہ جاگیردار سے بات کر رہا تھا۔

بیس منٹ میں اس کی کار ایک بنگلے کے پھاٹک پر جا رکی۔ بنگلے کی بناوٹ بہت قدیم طرز کی تھی۔ جہاں داد کے علم میں تھا کہ اس بنگلے کی تعمیر برصغیر کی تقسیم سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔

جہاں داد نے چھ سال پہلے یہ بنگلا زینت کے لیے خریدا تھا تو اس نے بھی بنگلے کے بیرونی طرز تعمیر میں کوئی تبدیلی کروانا ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن زینت کی خواہش پر اندرونی حصے کو نئے طرزِ تعمیر کے مطابق ٹھیک کروا دیا تھا۔

بنگلے کے چوکیدار نے کار پہچانتے ہی پھاٹک کھول دیا اور کار احاطے میں داخل ہو کر بنگلے کے مرکزی دروازے کے سامنے جا رکی۔

وہاں زینت پہلے ہی سے جہاں داد کی منتظر تھی۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ کبھی اس کا جسم بہت گداز ہوگا لیکن اب فربہی کی طرف مائل تھا۔ وہ ساڑی باندھے ہوئے تھی۔ بال بہت اسٹائلش انداز میں سیٹ کیے ہوئے تھے، نقش و نگار بھی اس کے اچھے تھے لیکن اس وقت میک اپ کی وجہ سے وہ بہت دل کش نظر آ رہی تھی۔

''اندر چلو۔'' جہاں داد نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے قدم بڑھایا۔

''آپ تو بہت ہی بے چین نظر آ رہے ہیں خاں صاحب!'' زینت نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اطمینان سے بتاؤں گا۔ پہلے ایک کام کر لوں۔ کمپیوٹر تو بالکل ٹھیک ہے نا؟''

''جی ہاں۔'' زینت کے چہرے سے اس کی الجھن صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

وہ دونوں جس کمرے میں داخل ہوئے، اس کی آرائش جہاں داد نے اپنی خواہش کے مطابق کرائی تھی کیونکہ زینت کے ساتھ وہ اپنا وقت اسی کمرے میں گزارا کرتا تھا۔

وہ سیدھا کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔

''تم مجھے ایک ڈرنک تو بنا دو۔'' اس نے زینت سے کہا

اس کمرے کے ایک گوشے میں خوب صورت سا بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ زینت نے جہاں داد کے لیے ایک پیگ بناتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اس وقت میرا ذہن اتنا الجھا دیا ہے کہ تھوڑی سی مجھے بھی پینا پڑے گی۔ اب آپ آ گئے ہیں تو میں بیوٹی پارلر تو نہیں جا سکوں گی۔''

جہاں داد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا۔ زینت دو گلاس لیے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔

اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی جہاں داد کے قریب گھسیٹ لی۔ جہاں داد نے ایک گھونٹ لے کر اپنا کام جاری رکھا۔

''یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟'' زینت نے تعجب سے پوچھا۔

''سب کچھ بتاؤں گا۔ فی الحال خاموشی سے بیٹھی

رہو۔''

جہاں داد اپنا کام یکسوئی سے مکمل کرنا چاہتا تھا۔ زینت خاموش بیٹھ کر اپنے گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی رہی۔

''ایک ڈرنک اور بنا دو۔'' جہاں داد نے زینت سے کہا۔ وہ اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ زینت کے گلاس میں بھی دو ایک گھونٹ باقی تھے۔

زینت دوسرا گلاس بنا کر مڑی تو جہاں داد کمپیوٹر بند کر رہا تھا۔ وہ اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس نے زینت سے گلاس لیتے ہوئے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔

''اب بھی کچھ نہیں بتائیں گے؟'' زینت ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''بس ایک فون اور کر لوں۔'' جہاں داد نے کہا اور ایک گھونٹ لے کر اس نے موبائل فون پر جاگیردار سے رابطہ کیا۔

''جی خاں صاحب!'' دوسری طرف سے جاگیردار کی آواز آئی۔ ''وہ مل گیا ہے مجھے... لڑکی کو اسی گھر میں پہنچا دیا جائے گا جہاں کا پتا آپ نے بھیجا ہے لیکن یہ تو بتائیے کہ وہاں ہوگا کون؟''

''ایک ایسی ہستی جس سے میں بہت محبت کرتا ہوں۔'' جہاں داد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ زینت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت میں آپ کو اپنے ایک اور راز میں شریک کر رہا ہوں جاگیردار صاحب! آپ کے آدمی لڑکی کو جس کے حوالے کریں گے اور جو اس گھر کی مالک ہے، اس کا نام زینت ہے۔''

''اچھا!'' جاگیردار دھیرے سے ہنسا۔ ''اس شہر میں آپ کی کوئی محبوبہ بھی ہے؟''

''جی جان سے چاہتا ہوں میں اسے۔'' جہاں داد نے زینت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس گھر میں ایک تہ خانہ بھی ہے۔ لڑکی کو وہیں پہنچانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے جہاں داد صاحب! آپ جیسا مناسب سمجھیں... میں ابھی اپنے کسی آدمی کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ ابھی سے اس پتے پر جا کر بنگلا دیکھ لے اور ارد گرد کے ماحول کا جائزہ بھی لے لے۔''

''آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔''

''فرمائیے! خادم ہوں آپ کا۔''

''شرمندہ مت کیجیے، دوست ہیں ہم ایک دوسرے کے۔ آپ کو اتنا اور کرنا ہوگا کہ آپ اپنا ایک آدمی میرے لیے وقف کر دیں۔ اس آدمی کو اسی کمرے میں رہنا ہوگا جس کمرے میں تہ خانہ ہے۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ لڑکی کے کھانے پینے کا اور دوسری ضروریات کا خیال وہی رکھے۔ زینت کو اس معاملے میں کچھ نہ کرنا پڑے۔''

''یہ بھی ہو جائے گا جناب!''

''بس تو اب آپ اپنے آدمیوں سے بات کریں۔ میں نے وہ کام کر دیا جو آپ مجھ سے چاہتے تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر کوئی خاص بات معلوم کرنا ہوئی تو میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔''

جہاں داد نے رابطہ منقطع کر کے زینت کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا جو کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''غالباً آپ کسی لڑکی کو اغوا کروا رہے ہیں خاں صاحب!'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''مجھ سے دل بھر گیا ہے آپ کا۔''

''زینت!'' جہاں داد نے کچھ خفگی سے کہا اور زینت کو چھوڑ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس میز پر ٹکا دیے جس پر کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ وہ زینت کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''اس لڑکی سے میرے اس قسم کے تعلق کے بارے میں تم آئندہ کبھی کچھ نہیں کہنا۔ کبھی کچھ سوچنا بھی نہیں۔ وہ لڑکی میری...''

جہاں داد یک لخت چپ ہو گیا۔

زینت حیرت سے بولی۔ ''کون ہے وہ آپ کی؟''

جہاں داد نے کا گلاس اٹھایا۔ اچانک اسے نہ جانے کس قسم کا ذہنی جھٹکا لگا تھا کہ شراب کا وہ دوسرا گلا اس نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

زینت الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''اور دیکھو زینت!'' اس نے زینت کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے۔ ''میں بہت گمبھیر معاملات میں گھرا ہوا ہوں۔ اس وقت مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے... نہ کہ تم مجھ سے خفگی کا اظہار کرو۔''

''آپ مجھے کچھ بتائیں تو۔'' زینت نے اپنی کھسیاہٹ پر قابو پا لیا۔

''بتاؤں گا۔'' جہاں داد نے سر ہلایا۔ ''مگر ابھی تمہیں کچھ عرصے انتظار کرنا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں لیکن بہتر ہوگا کہ ابھی میں اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھوں۔ اگر مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا تو میں اس لڑکی کو یہاں لانے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد بھی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور میں تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔ اپنی بیوی کی موت کے بعد میں نے تمہارے علاوہ کسی دوسری عورت سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔"

"میں نے بھی آپ سے جو عہد کیا تھا، اس پر قائم ہوں۔"

"اسی لیے تو مجھے تم پر اتنا ہی اعتماد ہو گیا ہے جتنا اپنی ذات پر۔" اس مرتبہ جہاں داد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، اس نے ایک بار پھر زینت کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ "چلو ذرا اس کمرے میں چلیں جہاں تہ خانہ ہے۔ میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ وہ کس حالت میں ہے۔"

زینت اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ "ایک بار میں نے اس میں اترنا چاہا تھا لیکن بس جھانک کر رہ گئی۔ وہ گرد و غبار سے اٹا پڑا ہے، مکڑیوں نے جالے تان لیے ہیں۔"

وہ دونوں اس وقت ایک ایسے کمرے میں داخل ہو رہے تھے جہاں خواب گاہ کا معمولی سا فرنیچر تھا۔ جہاں داد نے موبائل پر جاگیردار سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ "مجھے فوری طور پر کم از کم دو آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

"خیریت؟"

"لڑکی کو جس تہ خانے میں رکھنا ہے، وہ اچھی حالت میں نہیں ہے۔ اس کی صفائی کروانا ہوگی۔ اس کے علاوہ بستر اور کچھ ایسی چیزیں بھی جن کی ضرورت اس لڑکی کو پڑ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے...."

"ابھی سات بج رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، آپ چاہیں گے کہ بارہ بجے سے پہلے پہلے یہاں سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

"جی ہاں، میرے آدمی آپ کے بیٹے ــ بنگلے میں آدھی رات کے بعد ہی داخل ہوں گے۔ میں چار آدمی بھیج رہا ہوں آپ کے پاس۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ وہ پھاٹک پر پہنچ کر چوکیدار سے کہیں کہ انہیں میں نے بلایا ہے۔ انہیں یہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس سے پہلے ہی چوکیدار کو ہدایت کر دوں گا اور خود بھی برآمدے میں ان کا منتظر رہوں گا۔"

گفتگو ختم ہوتے ہی زینت بولی۔ "جن لوگوں سے آپ کام لے رہے ہیں، ان پر مکمل اعتماد ہے آپ کو؟"

جہاں داد نے کمرے کے ایک کونے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ یوں سمجھو کہ اس شخص کے غلام ہیں جس سے میں یہ سارا کام لے رہا ہوں۔"

"اگر ایسی کوئی بات ہے تو ٹھیک ہے۔"

جہاں داد نے کونے سے قالین اٹھایا اور کچھ طاقت لگا کر کھینچتا چلا گیا۔ قالین کے نیچے اتنا فرش نظر آنے لگا کہ کونے سے قالین تک کا فاصلہ چھ فٹ کے قریب ہو گیا۔

فرش کے کونے ہی میں فرش کا ایک حصہ چوبی تھا۔ اس کی چوڑائی اور لمبائی چار سوا چار فٹ کے قریب ہو سکتی تھی۔ تختے کے دیوار کی طرف کے کونے میں چھوٹا سا کنڈا لگا ہوا تھا۔ جہاں داد نے کنڈے میں دو انگلیاں پھنسا کر تختہ اٹھایا تو وہ فرش سے الگ ہو گیا۔ وہ کسی بہت ہی مضبوط لکڑی کا تھا جس کے کناروں پر آہنی پتریاں لگی ہوئی تھیں۔

"خاصا وزنی ہے نا؟" زینت بولی۔ "میں بہ مشکل اٹھا سکی تھی۔"

"ہاں۔" جہاں داد نے جھک کر تہ خانے میں جھانکا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "سیلن کی بو بھی ہے۔"

"نہ جانے کب سے بند پڑا ہے۔" زینت نے کہا۔ "آپ کو کچھ دکھائی تو نہیں دیا ہوگا، کیا ٹارچ لاؤں؟"

"ضرورت نہیں ہے۔" جہاں داد نے کہا۔ "تم دیکھ ہی چکی ہو۔ میں نے بھی بس یونہی جھانک لیا۔ جن لوگوں کو میں نے بلایا ہے، وہ خود ہی سب کچھ کر لیں گے۔ آؤ، ذرا چوکیدار کو ہدایت کر دوں۔"

وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

"کوئی خفیہ طریقہ نہیں بنایا گیا اس تہ خانے کو بند کرنے یا کھولنے کا؟" زینت بولی۔

"ہاں، اس سے میں نے سمجھا ہے کہ یہ گھر غالباً دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بنوایا گیا ہوگا۔ اس زمانے میں بہت سے لوگوں نے ایسے گھر بنائے ہوں گے۔ ان دنوں میں بمباری کے خوف سے اس قسم کے تہ خانے بنوانے کا خاصا رواج ہو گیا تھا۔"

وہ دونوں اس تہ خانے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے بنگلے سے نکل آئے۔ جہاں داد نے زینت کو برآمدے ہی میں چھوڑا اور پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار کو ہدایت کرنے کے بعد وہ واپس لوٹا۔

اس گھر میں دو ہی ملازم تھے۔ چوکیدار، مالی کا کام بھی کرتا تھا۔ ایک بوڑھی ملازمہ تھی جو صبح آ کر دوپہر تک گھر کا سارا کام کاج کر کے چلی جاتی تھی۔ زینت کو دوپہر کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی اپنے بیوٹی پارلر جانا ہوتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں بیوٹی پارلر میں کام کرنے والی عورتوں میں سے ایک کو زینت نے ان کا انچارج بنادیا تھا۔

جہاں داد نے برآمدے میں پڑی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے زینت سے کہا۔ ”میرے لیے ایک اور ڈرنک بنا ہی لاؤ۔ جب تک وہ لوگ آکر یہاں تہ خانے کا سارا کام ختم نہ کرلیں، مجھے یہاں رکنا چاہیے۔ اس کے بعد میں چلا جاؤں گا۔“

”مجھے اچھی طرح سمجھا کر جایئے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“

”ہاں، وہ تو میں تمہیں بتا کر جاؤں گا۔“

زینت ڈرنک بنانے چلی گئی۔ برآمدے سے کچھ ہی فاصلے پر جہاں داد کی کار کھڑی تھی۔

☆☆☆

رات ہو چکی تھی لیکن شمعون نے غسل کیا۔ گھر آنے کے بعد اس کا وقت اتنی مصروفیت اور الجھنوں میں گزرا تھا کہ اس نے اپنی حالت پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ وہ نہا کر نکلا ہی تھا کہ سمیرا قدرے پریشان سی کمرے میں آئی۔

”شمعون!“ وہ فوراً بولی۔ ”پاپا کا فون آیا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ شدید گھبراہٹ محسوس کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ وہ ایک انجکشن لگا کر اور کچھ دوائیں دے کر چلا گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ لو بلڈ پریشر ہے جو جلد ہی نارمل ہو جائے گا لیکن پاپا کی خواہش ہے کہ ہم کچھ دیر کے لیے ان کے پاس آجائیں۔“

شمعون سوچ میں پڑ گیا۔

”پریشان نہ ہو۔“ سمیرا پھر بولی۔ ”میں نے پاپا سے کہہ دیا تھا کہ تم بہت مصروف ہو اس لیے میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ اگر تم اجازت دو تو میں اکیلی چلی جاؤں؟“

”ہاں۔“ شمعون جلدی سے بولا۔ ”اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”تم نے اپنے پاپا کو اس لڑکی کے بارے میں بتا دیا ہے؟“

”عجیب سوال کیا ہے تم نے شمعون! تمہاری اجازت کے بغیر میں انہیں یہاں کی کوئی بات بتا سکتی ہوں؟“

شمعون مسکرایا۔ ”تم بہت اچھی ہو سمیرا۔“

”نہیں۔“ سمیرا دھیرے سے ہنسی۔ ”شاید زیادہ اچھی نہیں ہوں۔ تو میں جاؤں؟ تمہاری گاڑی لے جاؤں؟“

”ہاں لے جاؤ۔ اب تم جارہی ہو تو اس لڑکی کی وجہ سے گھر میں میرا رکے رہنا تو بہت ضروری ہو گیا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے؟“

”خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ کچھ بولتی ہی کہاں ہے۔ اگر کوئی بات کرو تو بس مختصر سا جواب دے دیتی ہے۔ میں کمرا باہر سے مقفل کر کے آئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے سمیرا! تم جاؤ... کب تک واپس آؤ گی؟ میرا مطلب ہے... کھانا؟“

”اگر پاپا نے اصرار نہیں کیا تو آکر ہی کھاؤں گی۔ زیادہ سے زیادہ دس بجے تک لوٹ آؤں گی۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

اس وقت ساڑھے سات بجے تھے۔

”تم کھا لینا۔“ وہ شمعون کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”اگر تم وہیں کھاؤ تو مجھے اطلاع دے دینا ورنہ میں دس بجے تک تمہارا انتظار کرلوں گا۔ ساتھ ہی کھائیں گے۔ پاپا کی طبیعت سے بھی باخبر کرتی رہنا۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے بنگلے کے باہر برآمدے تک آگئے تھے۔

سمیرا کو رخصت کرنے کے بعد شمعون نے اپنی خواب گاہ کی طرف رخ کیا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کئی خیال اس کے دماغ میں چکرا رہے تھے۔ اپنی خواب گاہ کے دروازے تک وہ دبے پاؤں پہنچا اور دروازے کا لاک بڑی آہستگی سے کھولنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ رفعت کو اس کی آمد کا احساس نہ ہو اور وہ دیکھ لے کہ وہ تنہائی میں کیا کرتی ہے؟

وہ بہ آہستگی دروازہ کھولنے میں کامیاب رہا۔ ذرا سا دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔ یہ دیکھ کر اسے مسرت آمیز خوشی ہوئی کہ رفعت ایک بک شیلف میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ غالباً وہ نہیں چاہتی تھی کہ اچانک کوئی آجائے اور اسے شیلف میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے دیکھ لے۔

شمعون مسکراتا ہوا دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کرنے میں بھی بہت احتیاط کی تھی لیکن اس موقع پر ہلکی سی آواز ہو ہی گئی۔ رفعت چونکی اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولی۔

”میں کوئی ایسی کتاب تلاش کر رہی تھی کہ اسے پڑھنے میں کچھ وقت گزر سکے۔“

”اس شیلف میں صرف انگریزی کتابیں ہیں۔“ شمعون مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ”اور تم نے بتایا تھا کہ تمہیں انگریزی نہیں آتی۔“

”میں نے سوچا... شاید کوئی... اردو کی کتاب...“

”نہیں۔“ شمعون نے اس کی بات کاٹی۔ ”اردو کتاب کی بات نہیں ہے یہ... تمہیں اس البم کی تلاش تھی جس میں ہم دونوں کی شادی کی تصویریں ہیں۔“

رفعت ایسے نظر آنے لگی جیسے ہونقچکارہ گئی ہو۔

شمعون نے قریب جا کر بڑے جذباتی انداز میں اس کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ”میری جان... میری زندگی! تم نے اپنی یادداشت ہرگز نہیں کھوئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم یہ جھوٹ کیوں بول رہی ہو... وہ البم میں نے یہاں سے ہٹا کر کہیں اور چھپا دی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی کی نظر میں آئیں۔“ دراصل اس کی مراد سمیرا سے تھی۔

یکایک شمعون نے محسوس کیا کہ رفعت کا سارا جسم لرزنے لگا تھا۔ شمعون نے اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھ لیا تھا۔ اب اس نے رفعت کا چہرہ اپنے سامنے کیا تو اس نے دیکھا کہ رفعت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ سسکیوں ہی کے باعث اس کا جسم لرز رہا تھا۔

”رفعت!“ شمعون بے قرار ہو کر بولا۔ ”تمہارے یہ آنسو تو میری جان نکال لیں گے۔“

اب رفعت نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ شمعون نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ خود بھی اس کے برابر میں لیٹ گیا اور اسے لپٹاتے ہوئے بولا۔ ”چپ ہو جاؤ... پلیز رفعت... پلیز...“

”شمعون!“ رفعت کی آواز میں بے حد لرزش تھی۔

”شکر ہے تمہاری زبان پر میرا نام تو آیا۔“

”اس طرح میرے ساتھ نہ لیٹو شمعون!“ رفعت سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری بیوی آگئی تو...“

”آجانے دو۔“ شمعون نے پُرجوش انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب تم نے ظاہر کر دیا ہے کہ تمہاری یادداشت نہیں گئی تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔ دیکھ لے وہ... کل سے اب تک تم سے دور رہا ہوں تو بہت بے چین رہا ہوں میں۔“

”مجھ سے... مجھ سے...“ رفعت کی سسکیاں جاری تھیں۔ ”اب بھی... اتنی... اتنی محبت ہے آپ کو؟“

”ویران ہو گیا تھا میں تمہارے بغیر... پلیز! چپ ہو جاؤ۔ تمہارے آنسو میری جان نکال رہے ہیں۔“

رفعت اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ شمعون ٹشو سے اس کا اشک آلود چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنی محبت کا اظہار کرتا رہا۔

رفعت کچھ توقف سے بولی۔ ”اتنی محبت ہوتے ہوئے بھی مجھے تلاش نہیں کیا؟ مجھے نہیں ڈھونڈا؟ دوسری شادی کرلی۔“

”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا رفعت! تمہارے اغوا ہو جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری، شادی کے لیے کیوں مجبور ہوا، سب بتاؤں گا تمہیں۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس وقت یہ بات کھل گئی کہ تمہاری یادداشت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن تم نے ایسا کیوں کیا رفعت؟ یہ ڈراما کرنے کی ضرورت تم نے کیوں محسوس کی؟“

رفعت نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تم دوسری شادی کر چکے تھے۔“

”دوسری شادی کا تم نے اتنا اثر لیا اور یہ خیال نہیں کیا کہ تمہیں ٹرین سے بچانے کے لیے میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا رفعت۔ اور مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ تم دوسری طرف کے پلیٹ فارم تک پہنچنے میں ناکام رہو گی اور ٹرین کے نیچے آجاؤ گی۔“

”یہ خیال بھی مجھے کئی بار آچکا ہے۔ یقین جانو، میری بے ہوشی کا سبب یہ انتہائی مسرت تھی کہ بالکل مایوس ہو جانے کے بعد میں نے تمہیں پھر پالیا تھا۔ وہ خطرناک لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے لیکن تمہاری پناہ میں آنے کے بعد میں نے خود کو بالکل محفوظ محسوس کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے اب دنیا کی کوئی طاقت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“

”اور تم نے بعد میں بھی دیکھ لیا کہ تمہیں بچا کر یہاں تک لانے کے لیے میں نے کیا کیا جتن کیے تھے۔“

”ہاں۔“ رفعت نے محبت سے شمعون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ بھی سوچتی رہی ہوں میں لیکن ساری بات یہاں آکر اٹک جاتی تھی کہ تم مجھے بھول گئے اور دوسری شادی بھی کرلی۔“

”مجھے یاد ہے۔“ شمعون نے کہا۔ ”جب ہم کار میں سفر کر رہے تھے اور سمیرا نے مجھ سے انگریزی میں بات کی تھی تو اس کے ایک جملے سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ میری بیوی ہے۔ یہ جاننے کے بعد تم رونے لگی تھیں۔ اسی وقت مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ تم نے اپنی یادداشت نہیں کھوئی ہے اور یہ جان کر رو پڑی ہو کہ میں دوسری شادی کر چکا ہوں لیکن بس شبہ ہی ہوا تھا۔ یقین نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یادداشت کھونے کا ڈراما تو تم نے بے ہوشی کے بعد ہوش میں آتے ہی شروع کر دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی کیا وجہ تھی رفعت؟''

''اس وقت بھی تمہاری دوسری شادی ہی کی بات نے میرے دل و دماغ کو جھٹکا پہنچایا تھا۔''

''بے ہوشی میں تم یہ کیسے جان گئی تھیں؟'' شمعون نے حیرت سے کہا۔

رفعت کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی اور پھر وہ بولی۔ ''جب مجھے ہوش آرہا تھا تو ایک آواز میرے کانوں میں آئی تھی۔ کسی نے کہا تھا... مجھے بالکل ٹھیک سے یاد نہیں۔ کچھ اس قسم کی بات کہی گئی تھی کہ مسز شمعون! آپ پریشان نہ ہوں، شمعون صاحب ابھی آجائیں گے۔''

''اوہ۔'' شمعون کے منہ سے نکلا۔

''پھر میں نے پوری طرح ہوش میں آنے کے باوجود چند لمحے بعد آنکھیں کھولی تھیں۔ اس وقت وہاں جمع لوگوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا کہ ثمیرا سے وہ بات کسی پولیس والے نے یا اسٹیشن ماسٹر نے کہی ہوگی۔''

''نہیں۔'' شمعون بولا۔ ''وہ اسٹیشن ماسٹر نہیں ہو گا۔ لیکن اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے اہم تو یہ جاننا ہے کہ تم نے میری دوسری شادی کے بارے میں جاننے کے بعد یہ ڈراما آخر کیا کیوں؟''

''سچ بتادوں شمعون؟''

''میں تم سے سچ ہی کی توقع رکھتا ہوں۔''

''میں نے سوچا تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔'' رفعت کی آواز بھرا گئی۔

''یہ تو ایک اور قیامت گزر جاتی مجھ پر۔''

''لیکن نہیں گزری نا۔'' اس مرتبہ رفعت کی مسکراہٹ میں پھیکا پن نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''جب مجھے یہ اندازہ ہوا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو تو میں بہت حیران ہوئی۔ میں سوچنے لگی کہ آخر تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے اس حالت میں قبول کرلو گے؟''

''حالت سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میں بہت عرصے تک نامعلوم لوگوں کی قید میں رہی ہوں۔ تم سوچ سکتے تھے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہوگا۔'' رفعت یہ کہتے ہوئے اداس ہوگئی۔

''کچھ بھی کیا ہو ان لوگوں نے!'' شمعون نے پُرجوش انداز میں رفعت کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے لیے جیسے پہلے تھیں، ویسی ہی اب ہو۔''

''کیا تم یقین کرو گے شمعون کہ ان لوگوں نے مجھے قید میں رکھنے کے علاوہ میرے ساتھ اور کسی قسم کی زیادتی نہیں کی؟''

''تم یہ بات کہو گی تو میں کیوں یقین نہیں کروں گا... لیکن یہاں یہ سوال ضرور آجاتا ہے کہ ان لوگوں نے تمہیں آخر اغوا کیوں کیا تھا؟''

''یہ تو میں بھی کبھی نہیں جان سکی۔ میں ان لوگوں سے پوچھتی تھی مگر مجھے اپنی کسی بات کا جواب نہیں ملتا تھا۔ میں نے بس اسی اذیت میں دن گزارے کہ مجھے کس نے اغوا کروایا اور کیوں کروایا۔ میں نے ابھی کہا نا کہ مجھے قید کرنے کے علاوہ انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ اس کے برخلاف میرا ہر طرح خیال رکھا گیا۔ ان سے مجھے کپڑے بھی مل جاتے تھے، کھانے پینے کو بھی صحیح ملتا تھا۔''

''اس کے باوجود تم اتنی دبلی ہوگئیں؟''

''ذہنی اذیت، جسمانی اذیت سے زیادہ ہوتی ہے شمعون۔''

''خیر۔'' شمعون نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ اذیت پہنچانے والوں کو اس کا خمیازہ تو بھگتنا پڑے گا۔ میں ان لوگوں کو معاف نہیں کروں گا رفعت!''

رفعت نے غور سے شمعون کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟''

''جانتا تو نہیں مگر جان لوں گا۔ ہاں البتہ ایک شخص پر مجھے کچھ شبہ تو ہے۔ اگر وہ شبہ یقین میں بدل گیا تو بھی میں اس شخص کو معاف نہیں کروں گا۔''

''میں بتاؤں تمہیں کس پر شبہ ہے؟''

شمعون غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ رفعت نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ ''تمہیں اپنے ڈیڈی پر شبہ ہے؟''

شمعون نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''یہ بات صحیح ہے رفعت جو تم نے کہی ہے لیکن تمہیں یہ خیال آیا کیسے؟''

''اسٹیشن سے اس گھر میں پہنچنے تک میں تمہارے ساتھ رہی ہوں۔ تم ڈیڈی سے موبائل پر جو باتیں کرتے رہے، وہ میں نے بھی سنی ہیں۔ تم نے انہیں اس سے بے خبر رکھا تھا کہ میرے ساتھ تم کب اور کس جگہ ہو۔''

شمعون مردہ دلی سے مسکرایا۔ ''یہ بھی میرے لیے ایک صدمہ ہوگا اگر یہ شبہ درست ثابت ہوا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ پک گیا ہے لیکن میں اندازہ بھی نہیں لگا سکا کہ اگر اس معاملے میں ڈیڈی کا ہاتھ ہے تو انہیں ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔''

''شاید وہ نہیں چاہتے کہ ایک معمولی گھر کی لڑکی ان کی بہو بنی رہے۔''

''اگر ایسی بات ہوتی رفعت، تو میرا خیال ہے کہ آج تم زندہ نہیں ہوتیں۔ تمہیں اغوا کروانے کے لیے انہوں نے جن لوگوں سے بھی کام لیا، وہ اچھے لوگ تو بہرحال نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں سے کہا جاتا تو وہ تمہیں ختم بھی کردیتے۔''

رفعت نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ''یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

شمعون نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کاش اس معاملے میں ڈیڈی کا ہاتھ نہ ہو۔''

رفعت نے شاید اس بات پر دھیان نہیں دیا اور بولی۔ ''کیا اب تم ثمیرا کو بتادو گے کہ میں...''

''ابھی نہیں۔'' شمعون بول پڑا۔ ''دراصل یہ معاملہ ایک اعتبار سے الجھا ہوا بھی ہے رفعت۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''ثمیرا سے اور اس کے والد سے یہ بات چھپائی گئی ہے کہ میری شادی ہوچکی تھی۔ ثمیرا کے والد سے ڈیڈی کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ یہ بات ثمیرا کے والد پر کھلی تو ڈیڈی سے ان کے تعلقات خراب ہوجائیں گے۔''

''اور ثمیرا سے تمہارے تعلقات؟''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ ثمیرا تمہیں قبول کرنے پر آمادہ ہوگی یا نہیں لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔''

''پھر تو یہ اس کے لیے اور زیادہ دشوار ہوجائے گا کہ وہ اپنی محبت میں مجھے بھی شریک کرلے۔''

شمعون نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اسے برداشت کرلو گی؟''

''اگر نہیں کروں گی تو یہ انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہوگی۔ وہ زبردستی تو تمہاری بیوی نہیں بنی ہے۔ اسے آخر کس بات کی سزا ملے؟ اگر تم نے اس سے علیحدگی کے بارے میں سوچا بھی تو میں اس کی شدید مخالفت کروں گی۔''

شمعون نے بے اختیار رفعت کو چوم لیا۔ ''تم نے میرا دماغ ہلکا کردیا رفعت۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ ثمیرا سے علیحدگی اختیار کروں۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ مجھ سے الگ ہونا اس کے لیے بہت ہی اذیت ناک ہوگا۔''

''تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا کہ میں اسے تم سے الگ کروانا چاہوں گی۔ ہاں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ وہ مجھے برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگی یا نہیں۔''

شمعون کے کچھ بولنے سے پہلے اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے رفعت سے کہا۔ ''ثمیرا کی کال ہے۔ اب تم بالکل خاموش رہنا۔''

''کہاں ہے وہ؟'' رفعت پوچھ بیٹھی۔

شمعون نے اسے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''ہاں ثمیرا! کیسی طبیعت ہے تمہارا پاپا کی؟''

''وہ ٹھیک ہیں۔ بس پریشان ہوگئے تھے کسی وجہ سے... اسی سے بلڈ پریشر کم ہوگیا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے کرتے وہ بالکل ٹھیک نظر آنے لگے ہیں۔ میں نو بجے تک آجاؤں گی شمعون۔''

''کھانا کھا کر آؤ گی؟''

''نہیں۔'' ثمیرا نے جواب دیا۔

شمعون نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''میں بس ذرا دیر بعد یہاں سے روانہ ہوجاؤں گی۔ اس لڑکی کا کیا حال ہے؟''

''میں ایک مرتبہ کمرے میں گیا تھا۔'' شمعون نے رفعت پر نظر ڈالتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''جیسا کہ تم مجھے بتا چکی ہو، وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے تمہارے بارے میں سوال کر ڈالا۔ میں نے اسے بتادیا کہ تم اپنے پاپا کے گھر گئی ہوئی ہو اور شاید کھانا کھا کر آؤ۔ اس پر اس نے بس اتنا ہی کہا کہ ابھی اسے بھوک نہیں ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''پاپا کے کمرے میں نہیں ہوں۔'' ثمیرا نے جواب دیا۔ ''وہاں ہوتی تو تم سے اس لڑکی کے بارے میں بات نہیں کرتی۔ اچھا، اب میں بند کررہی ہوں۔ نو بجے تک پہنچ جاؤں گی۔''

''اوکے۔'' شمعون نے رابطہ منقطع کردیا۔

رفعت اس دوران میں خاموشی سے شمعون کا منہ تکتی رہی۔ اب وہ فوراً بول پڑی۔ ''وہ اپنے پاپا کے گھر کیوں گئی ہے؟''

شمعون نے اسے سب بتادیا اور بولا۔ ''وہ دس بجے آتی تو اچھا تھا۔ خیر، ابھی نو بجنے میں بھی اتنا وقت ہے کہ ہم کچھ ضروری باتیں بھی کریں گے اور ایک دوسرے کو پیار بھی کرلیں گے۔''

رفعت نے شمعون کا اشارہ سمجھ کر نظریں جھکا لیں اور آہستہ سے بولی۔ ''ضروری باتیں کیا ہیں؟''

''مجھے اطمینان حاصل کرنا ہے کہ وہ لوگ تمہیں دوبارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اغوا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

"وہ تو شاید کریں گے۔" رفعت نے سنجیدگی سے کہا۔

شمعون چونکا۔ "تم یہ بات کیسے کہہ رہی ہو؟"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی لیکن مجھے دو ایک مرتبہ یہ دھمکی ضرور دی گئی کہ اگر میں نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو اول تو کامیاب نہیں ہو سکوں گی اور اگر ہو گئی تو وہ مجھے دوبارہ بھی اغوا کر سکتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں تم سے آملوں۔"

"گویا میرا یہ شبہ ٹھیک ہے کہ تمہیں دوبارہ اغوا کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔" شمعون نے متفکر لہجے میں کہا۔

"ہاں۔"

"یہ بھی قابلِ غور بات ہے۔" شمعون نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یعنی تمہیں صرف اس لیے اغوا کیا گیا تھا کہ تم میرے ساتھ نہ رہ سکو۔"

"ان لوگوں کی دھمکی سے تو یہی لگتا ہے شمعون!" رفعت نے کہا اور پھر روہانسی آواز میں بولی۔ "کہیں میں تم سے پھر جدا نہ ہو جاؤں شمعون۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔" شمعون نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اب تمہاری حفاظت کا بہت معقول بندوبست رہے گا۔"

"مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے شمعون! میں اب گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دوں گی۔"

"کل تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہی ہے۔"

"کہاں؟" رفعت چونکی۔

"ڈاکٹر کے پاس؟" شمعون نے جواب دیا اور پھر اس کی وضاحت بھی کر دی۔

"مگر اب کیوں؟" رفعت بے چینی سے بولی۔ "اب اس کی کیا ضرورت ہے؟ میری یادداشت کو کچھ نہیں ہوا ہے۔"

"تمہیں یہاں روکنے کا کوئی جواز تو رکھنا ہوگا رفعت!" شمعون نے کہا۔ "میں سمیرا سے کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارا علاج کرواؤں گا۔ جب تک سمیرا سے تمہاری حقیقت چھپانا ہے، اس قسم کا ڈراما تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"اور اس کے لیے تم مجھے خطرے میں ڈالو گے؟" رفعت کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔

"تم کسی خطرے میں نہیں پڑو گی۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا شہر نہیں ہے کہ تمہیں دن دہاڑے سرعام اغوا کر لیا جائے۔"

"شمعون!" رفعت زیادہ روہانسی ہو گئی۔

"میری جان! اعتماد کرو مجھ پر... تمہارا شمعون اب تمہیں کچھ نہیں ہونے دے گا۔"

"تم نے تو مجھے پریشان کر دیا۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شمعون نے مسکرا کر اس کا گال تھپکا اور پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولا۔ "تمہیں اپنے والدین یاد نہیں آتے رفعت؟"

"اب تم میرا ذہن بٹانا چاہتے ہو۔" رفعت نے مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر سنجیدگی سے بولی۔ "ماں باپ کے یاد نہیں آتے؟ میں تو اپنے والد کو بھی یاد کرتی ہوں جو مجھ سے خفا ہیں۔"

"وہ تم سے اتنے خفا بھی نہیں ہیں جتنا ظاہر ہو چکا ہے۔ جب تمہیں اغوا کیا گیا تھا تو وہ بہت اداس تھے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔ مرد ہیں اس لیے انہوں نے اپنے آنسوؤں پر قابو رکھا تھا۔"

لیکن رفعت مرد نہیں تھی۔ اس ذکر پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"جان!" شمعون محبت سے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ اب تم ان سے ملو گی نا تو ماضی کی ساری تلخیاں ختم ہو جائیں گی۔ دوبارہ بیٹی مل جائے گی تو وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ اب اپنی آنکھوں میں یہ موتی نہ لاؤ... سمیرا کے آنے میں ابھی اتنا وقت ہے کہ ہم دونوں اپنا ماضی یاد کر سکتے ہیں۔"

شمعون نے رفعت کو بڑی شوخ نظروں سے دیکھا اور اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

☆☆☆

سمیرا نو بج کر پانچ منٹ پر گھر آ گئی تھی۔ اس کے بعد ہی تینوں نے کھانا کھایا۔ رفعت اسی قسم کی اداکاری کرتی رہی جیسی کرتی رہی تھی۔ سمیرا کے کہنے پر اس نے کچھ وقت ان دونوں کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بھی گزارا۔ اس نے ٹی وی پروگرام دیکھنے کے بجائے نظریں جھکائے جھکائے وقت گزارا تھا۔

گیارہ بجے تھے جب سمیرا رفعت کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔ شمعون نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ رفعت کو "پانے" کے بعد وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ فکرمند بھی تھا۔ وہ لیٹے لیٹے خاصی دیر تک اگلے دن کے بارے میں سوچتا رہا۔ بارہ بج چکے تھے، اس وقت بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ اس وقت چونکا جب غیر متوقع طور پر سمیرا اس کے کمرے میں آئی۔ شمعون نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

"کیا ہوا؟" شمعون اسے دیکھ کر تعجب سے بولا۔

"اس طرح تو میں بور ہو جاؤں گی شمعون!" سمیرا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور بستر پر بیٹھ گئی۔

"لیکن ہوا کیا؟" شمعون نے بے تابی سے پوچھا۔

"تمہارے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔"

"اوہ!" شمعون نے طویل سانس لی۔ "میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ نہ جانے کیا ہو گیا۔"

"تم اس لڑکی کو آخر کب تک رکھو گے یہاں؟"

"جب تک اس کا علاج نہ ہو جائے۔" شمعون نے سنجیدگی سے کہا پھر بولا۔ "ابھی تو وہ بھی جاگ رہی ہو گی؟"

"سو گئی ہے۔"

"دروازہ تو مقفل کر کے آئی ہو نا؟"

"نہیں۔" سمیرا نے جواب دیا۔ "اب وہ سوتے سے اٹھ کر تو کہیں بھاگنے سے رہی۔"

"پھر بھی احتیاط میں کوئی حرج نہیں۔" شمعون بستر سے اٹھا۔

"سچ بتاؤ شمعون!" سمیرا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "کیا تم اس لڑکی کو پہلے سے جانتے ہو؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو ڈیئر؟" شمعون نے اسے پچکارنے کے انداز میں کہا۔ "چلو وہیں چلو، وہ سو رہی ہے تو ہم وہیں بیٹھ کر دھیمی آواز میں باتیں کر لیں گے۔"

"شمعون!" سمیرا اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آج تم نے پہلی مرتبہ مجھے ڈیئر کہا ہے۔"

اس وقت پہلی مرتبہ شمعون کو احساس ہوا کہ وہ سمیرا کے ساتھ زیادتی کرتا رہا ہے۔ اس نے سمیرا کی والہانہ محبت کا جواب کبھی اس طرح نہیں دیا تھا۔

"یقیناً تم بہت خوش ہو۔" سمیرا پھر بولی۔ "اور شاید اس لڑکی ہی کی وجہ سے۔"

حقیقت بھی تھی کہ رفعت کو پا لینے کے بعد وہ بہت خوش تھا، مگر فی الحال اس کے لیے یہی ضروری تھا کہ سمیرا پر اپنی خوشی کی حقیقت کا اظہار نہ ہونے دے۔

"مجھے معاف کر دو سمیرا!" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "آج تم نے مجھے احساس دلا دیا ہے کہ میں واقعی تمہارے ساتھ زیادتی کرتا رہا ہوں۔ تم مجھے جس انداز میں چاہتی رہی ہو، میں نے اس طرح اپنی چاہت کا ثبوت نہیں دیا۔"

"اور آج یہ ثبوت کیوں دے رہے ہو شمعون!" سمیرا کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شمعون نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور محبت سے بولا۔ "میں نے ابھی تم سے کہا تھا نا کہ مجھے معاف کر دو۔"

سمیرا نے اب اس سے لپٹ کر باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"سمیرا... سمیرا... پلیز!" شمعون نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

اسی وقت ایک زوردار دھماکا ہوا۔

"یہ کیا ہوا؟" سمیرا کے منہ سے نکلا۔ وہ اپنا رونا بھول کر شمعون سے الگ ہو گئی تھی۔

اس کے بعد پے در پے کئی دھماکے سنائی دیے۔

"فائرنگ۔" شمعون کے منہ سے نکلا اور وہ تیزی سے دروازے کی طرف جھپٹا۔ سمیرا اس کے پیچھے لپکی۔

فائرنگ اس وقت بھی جاری تھی لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ فائرنگ کہاں ہو رہی تھی؟ گھر کے اندر یا گھر کے باہر؟

شمعون دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ پے در پے ہونے والے دھماکے اس وقت رک چکے تھے۔ شمعون اس وقت ننگے پیر دوڑ رہا تھا۔ سمیرا اس کے پیچھے تھی لیکن وہ اتنی تیز نہیں دوڑ سکتی تھی۔

"شمعون!" رفعت کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

اس وقت تک شمعون اپنی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ سمیرا اس سے کچھ دور تھی لیکن اس نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ دروازہ کھول کر رفعت باہر نکلی تھی اور بہت وحشت زدہ نظر آ رہی تھی۔

"شمعون!" وہ سسکتی ہوئی شمعون کے سینے سے لگ گئی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے شمعون؟"

سمیرا جہاں تھی، وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے سمیرا اور شمعون کو دیکھ رہی تھی۔ اس منظر نے اسے بھونچکا کر دیا تھا۔ سمیرا شمعون کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی اور شمعون اس کو دلاسا دینے کے لیے اس کی پیٹھ تھپک رہا تھا۔

وہ منظر دیکھ کر سمیرا ذرا دیر کے لیے یہ بھی بھول گئی تھی کہ چند لمحے پہلے تک گولیاں چلتی رہی تھیں۔

☆☆☆

موبائل فون کی گھنٹی بجتے ہی جہاں داد نے کال ریسیو کی۔ وہ جاگیردار کی کال تھی جس کا وہ بے چینی سے منتظر تھا۔

"ہاں۔" جہاں داد نے موبائل کان سے لگاتے ہی کہا۔ "کام مکمل ہو گیا؟"

"کام خراب ہو گیا جہاں داد صاحب!" دوسری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف سے پُرتشویش لہجے میں کہا گیا۔

"کیا مطلب؟" جہاں داد نے تیزی سے پوچھا۔

"آپ نے بتایا تھا کہ پھاٹک پر صرف ایک سیکیورٹی گارڈ ہوتا ہے یا چوکیدار کے پاس ریوالور ہے لیکن وہاں تو تین گارڈز اور تھے اور انہیں بنگلے کے عقب میں مامور کیا گیا تھا۔"

"مجھے ان کے بارے میں علم نہیں تھا... لیکن ہوا کیا؟"

"ناکامی۔" جاگیردار نے جواب دیا۔ "میرے آدمی اندھیرے میں انہیں دیکھ ہی نہیں سکے۔ میرے پہلے ہی آدمی نے سیوریج پائپ پر چڑھنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی ٹانگ پر گولی چلائی گئی۔ جواب میں میرے لوگوں نے بھی فائر کھول دیے۔ بس خیریت یہ ہوئی کہ میرے آدمیوں کو وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی ہوگئی۔ ان کی گاڑی کسی پولیس موبائل کی نظر میں بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں۔ میرے ایک آدمی کی پنڈلی کی مرہم پٹی کی جارہی ہے۔"

"یہ تو بُرا ہوا۔" جہاں داد نے کہا۔

"ہاں برا تو ہوا۔ میرا ایک آدمی کچھ عرصے کے لیے تو ناکارہ ہوگیا۔"

"یقین کریں کہ مجھے ان تین گارڈز کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ شمعون نے میرے بعد وہ گارڈز منگوائے ہوں گے ورنہ وہ مجھ سے ان کا ذکر ضرور کرتا۔ لیکن اب کیا ہوگا جاگیردار صاحب؟"

"لڑکی ہر صورت میں اٹھائی جائے گی جہاں داد صاحب۔" جاگیردار نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ کے بیٹے نے اس معاملے کو اب میرے لیے ایک چیلنج بنادیا ہے۔ سیکیورٹی گارڈز کے بل پر اس نے لڑکی کو محفوظ سمجھ لیا ہے لیکن میں آپ کے بیٹے کا یہ خواب چکنا چور کردوں گا۔"

جاگیردار اس ناکامی یا اپنے آدمی کے زخمی ہونے کی وجہ سے غصے میں معلوم ہورہا تھا۔

"اب کیا منصوبہ ہوگا آپ کا؟"

"کل..." جاگیردار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "کل دوپہر تک وہ لڑکی زینت کے گھر میں ہوگی۔"

"یعنی کارروائی اسی علاقے میں ہوگی جہاں شمعون کا گھر ہے؟"

"ہاں۔" جاگیردار نے جواب دیا۔ "کام وہیں ہوسکتا ہے۔"

"شمعون اب بہت چوکنا ہوگیا ہوگا۔" جہاں داد کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"اسی لیے اب کارروائی اسے مطمئن کرنے کے بعد ہوگی۔"

"مطلب؟"

"کل وہ لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا نا؟"

"مجھ سے تو اس نے یہی کہا ہے۔"

"تو کارروائی اس وقت ہوگی جب وہ واپس لوٹے گا۔ جاتے وقت وہ اور اس کے گارڈز شاید چوکنا ہوں لیکن واپسی پر وہ ریلیکس کرجائیں گے۔ میرے آدمیوں کو اسی موقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔ آپ ذرا یہ تصدیق کرلیں کہ آپ کے بیٹے نے اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں کی؟"

"میں ابھی اسے فون کرکے معلوم کرتا ہوں۔"

"اسے یہ شبہ نہ ہوجائے کہ آپ اس وقت کی ناکام کارروائی کا ردِعمل جاننا چاہتے ہیں؟"

"بات کرنا جانتا ہوں میں۔" جہاں داد نے کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔

چند ہی لمحے بعد وہ موبائل فون پر شمعون سے کہہ رہا تھا۔ "شاید میں نے تمہاری نیند خراب کردی ہوگی لیکن میں چاہتا تھا کہ سونے سے پہلے ایک مرتبہ تم سے بات کرلوں۔"

"میری نیند خراب نہیں ہوئی ہے ڈیڈی۔" دوسری طرف سے شمعون نے جواب دیا۔ "میں جاگ رہا تھا۔ پولیس ابھی ابھی رخصت ہوئی ہے۔"

جہاں داد کو خیال تھا کہ فائرنگ کی آوازوں نے پولیس کو شمعون کے گھر پہنچا دیا ہوگا لیکن اس نے چونکنے کی اداکاری کی۔

"پولیس... پولیس کیوں؟"

"میرا خیال ہے کچھ ڈاکوؤں نے گھر میں گھسنا چاہا تھا۔ وہ عقب کے سیوریج پائپ کے سہارے اوپر چڑھنا چاہتے تھے لیکن سیکیورٹی گارڈز کی فائرنگ نے انہیں بھاگنے پر مجبور کردیا۔"

"او گاڈ! کہیں وہ..." جہاں داد نے کہا۔ "میرا مطلب ہے... وہ لوگ تو نہیں تھے جو ایک مرتبہ رفعت کو اغوا کرچکے ہیں؟"

"ہوسکتا ہے وہی ہوں۔ یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

"بنگلے کے عقب میں سیکیورٹی گارڈز کہاں سے آگئے؟"

"آپ کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا تھا کہ گھر کا عقب محفوظ نہیں ہے۔ سیوریج پائپ کے ذریعے ایک کھڑکی تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اسی خدشے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے سیکیورٹی ایجنسی کو فون کیا تھا۔ انہوں نے فوراً تین گارڈز بھیج دیے تھے۔ میری احتیاط کام آگئی۔"

"مجھے خوف یہ ہے کہ رفعت کی وجہ سے تمہیں بھی کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔" جہاں داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"اگر یہ وہی لوگ تھے تو اب وہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔"

"میری مانو تو کل اسے ڈاکٹر کے پاس مت لے جاؤ... اس معاملے میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرو۔ اسے بیرونِ ملک لے جاؤ۔"

"بیرونِ ملک جانے کے لیے بھی گھر سے تو نکلنا پڑے گا ڈیڈی! تو پھر فی الحال اسے یہیں کیوں نہ دکھایا جائے... گارڈز ایک کار میں میری کار کے پیچھے رہیں گے۔"

"اچھا۔" جہاں داد نے طویل سانس لے کر کہا۔ "بس محتاط رہنا۔ میں کل تم سے بار بار رابطہ کرتا رہوں گا۔"

"آپ اطمینان رکھیے ڈیڈی! سب ٹھیک رہے گا۔"

"خدا کرے۔" جہاں داد نے بڑبڑاتے ہوئے رابطہ منقطع کیا اور پھر جاگیردار سے رابطہ کرنے لگا۔

☆☆☆

سمیرا گم صم سی تھی۔ وہ، شمعون اور رفعت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شمعون اس سے انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

"یقین کرو سمیرا! ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"میں کیسے یقین کروں شمعون؟" سمیرا بولی۔ "وہ تمہارا نام لے کر چیخی تھی۔"

"جب تم اپنے پاپا کے گھر گئی تھیں اور میں کمرے میں گیا تھا تو میں نے اسے اپنا نام بتادیا تھا۔ ویسے شاید وہ پہلے بھی میرے نام سے واقف ہو۔ وہ کل رات سے ہمارے ساتھ ہے۔ تم نے کسی وقت مجھے میرے نام سے بھی مخاطب کیا ہوگا۔"

"اور وہ فائرنگ کی آوازوں سے خوف زدہ ہوکر تم سے اس طرح لپٹ گئی تھی جیسے تم ہی اس کے سب کچھ ہو۔"

"یہ فطری بات ہے سمیرا!" شمعون نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "وہ کب سے ہمارے ساتھ ہے۔ اسے احساس ہوچکا ہوگا کہ ہم اس کے ہمدرد ہیں۔ خوف زدہ ہوکر انسان اپنے ہمدردوں ہی کو پکارتا ہے۔ مجھ سے وہ اس لیے لپٹ گئی کہ میں ہی اس کے سامنے تھا۔ اگر تم ہوتیں تو وہ تم سے لپٹ جاتی۔"

"ہم اس کے ہمدرد ہیں۔" سمیرا زور دے کر بولی۔ "یہی کہا نا تم نے؟ ہم... یعنی میں بھی اس میں شامل ہوں... تو اس نے تم ہی کو کیوں پکارا؟ مجھے کیوں نہیں پکارا؟"

"یہ بظاہر ایک ٹیڑھا سوال کیا ہے تم نے۔" شمعون نے طویل سانس لے کر کہا۔ "لیکن اس کا جواب ہے۔ اگر یہ تمہیں پکارتی اور میں تم سے پوچھتا کہ اس نے تم ہی کو کیوں پکارا؟ تب تم کیا جواب دیتیں؟"

سمیرا چپ رہ گئی لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

اس دوران میں رفعت ایک طرف سر جھکائے اس طرح بیٹھی رہی جیسے وہ ان دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ رہی ہو۔

"ڈھائی بج رہے ہیں اب۔" شمعون نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اب جاکر سونے کی کوشش کرو۔"

سمیرا کچھ کہے بغیر کھڑی ہوگئی۔ اس وقت رفعت نے سر اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"چلو!" سمیرا نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں، جاؤ... شاباش۔" شمعون نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ ڈاکو تھے جنہیں گارڈز نے فائرنگ کرکے بھگا دیا۔"

رفعت کھڑی ہوگئی۔ سمیرا اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی۔ بستر پر لیٹنے کے بعد سمیرا نے آنکھیں بند کرلیں لیکن نیند اس وقت اس کی آنکھوں سے کافور ہوچکی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ اس لڑکی کا شمعون سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ اس نے شادی کے بعد شمعون کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا جتنا خوش وہ اسے آج نظر آیا تھا۔

شاید یادداشت کا معاملہ بھی محض ڈراما ہے، وہ سوچ رہی تھی۔

انہی خیالات کے باعث دوسری صبح ناشتا کرتے وقت اس نے انگریزی میں شمعون سے کہا۔ "لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے کس وقت روانہ ہوگے؟"

"سوا دس بجے تک... کیوں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس وقت میں بھی تیار ہو جاؤں گی۔''
''کیا مطلب؟ تم بھی چلو گی؟''
''کیوں؟ اس میں کوئی حرج ہے؟''
''نہیں، حرج تو نہیں مگر...''
''مگر کیا؟''
''کچھ نہیں، ٹھیک ہے۔ نہ جانے کیا شبہات ہیں تمہارے دماغ میں۔ چلو تم بھی چلنا۔''

اس وقت سمیرا کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ ان کی انگریزی میں گفتگو بلاوجہ ہے۔ وہ لڑکی انگریزی بھی جانتی ہو گی۔

سوا دس بجے شمعون کی کار بنگلے سے نکلی تو کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک کار بھی حرکت میں آئی۔ اس کار میں سیکیورٹی گارڈز تھے۔

ڈرائیونگ شمعون نے سنبھال رکھی تھی۔ سمیرا اس کے برابر میں اور رفعت پچھلی نشست پر تھی۔

شمعون نے ڈرائیونگ کے دوران میں موبائل فون پر پیچھے آنے والی کار میں موجود کسی گارڈ سے کہا۔ ''برابر ساتھ رہنا۔ ہماری گاڑیوں کے بیچ میں کوئی دوسری کار نہ آنے پائے۔''

''رائٹ سر!'' جواب ملا۔
شمعون نے موبائل بند کر کے اپنی گود میں ڈال لیا۔
سمیرا بولی۔ ''اسی لیے میں تمہارے ساتھ آئی ہوں شمعون!''
''کیا مطلب؟''
''تم نے کل رات خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ لوگ ڈاکو تھے لیکن تم سمجھ یہی رہے ہو کہ وہ وہی لوگ ہوں گے جن کی قید سے یہ لڑکی فرار ہوئی تھی اور اب بھی تمہیں انہی لوگوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ گارڈز اگر صرف گھر کی حفاظت کے لیے رکھے گئے ہوتے تو اس وقت تم انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔''

''تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔'' شمعون نے اعتراف کر لیا۔ ''میں اس لڑکی کو ہر حال میں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔''
''اور اسی لیے میں بھی ساتھ آئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ اس لڑکی کی وجہ سے تم بھی کسی خطرے میں پڑو۔ اس لیے میں اس وقت تم سے دور نہ ہوں۔''
ان دونوں میں یہ گفتگو اس وقت بھی انگریزی میں ہو رہی تھی۔
''میں جانتا ہوں سمیرا!'' شمعون نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بہت محبت کرتی ہو تم مجھ سے... اور مجھے خیال ہے کہ جلد ہی تمہاری اس محبت کے امتحان کا وقت بھی آنے والا ہے۔''
''امتحان؟'' سمیرا چونکی۔
شمعون نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''فی الحال اس بارے میں کوئی اور سوال مت کرنا۔''
سمیرا نے اسے غور سے دیکھا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔

کلینک قریب آ گیا تو شمعون نے موبائل پر سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔ ''تم لوگ باہر ہی رکنا۔ باہر رک کر تم نظر آنے والے لوگوں کی نقل و حرکت چیک کرتے رہنا۔''
''رائٹ سر!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
شمعون نے موبائل جیب میں ڈال کر کار کی رفتار کم کرنا شروع کی۔ سمیرا نے اب بالکل چپ سادھ لی تھی۔
وہ تینوں کلینک میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے ٹھیک گیارہ بجے رفعت کو بلا لیا۔ اس کے ساتھ شمعون اور سمیرا بھی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔
تقریباً ایک گھنٹا وہاں گزرا۔ سمیرا کو اب یقین آیا کہ شمعون واقعی اس لڑکی کا چیک اپ کروانا چاہتا تھا۔
واپسی پر شمعون نے سمیرا سے انگریزی میں کہا۔ ''اب تو تمہیں یقین آ گیا ہو گا کہ مجھے واقعی اس لڑکی کا علاج کرانا ہے؟''

سمیرا کی نظریں جھک گئیں، پھر اس نے بھرائی ہوئی... آواز میں کہا۔ ''تم ٹھیک سمجھے ہو شمعون! مجھے اس معاملے میں واقعی شک تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں کسی خطرے کے وقت تم سے دور نہیں رہنا چاہتی۔''
''مجھے بھی تمہاری اس دوسری بات پر یقین ہے سمیرا۔''
سمیرا خاموش رہی۔
کار جب بنگلے کے قریب پہنچ گئی تو شمعون نے موبائل پر سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔ ''اب تم لوگ گاڑی آگے نکال لے جاؤ اور عقبی گلی میں اپنی پوزیشن سنبھالو۔''
اس کے ساتھ ہی شمعون نے بریک لگا کر اپنی کار پھاٹک کے عین سامنے روکی۔
پھاٹک فوراً کھولا گیا۔ شمعون کار پھر حرکت میں لایا۔ جیسے ہی اس کی کار پوری طرح اندر داخل ہوئی، پھاٹک بند کیا جانے لگا۔
''یہ چوکیدار تو نہیں ہے۔'' سمیرا چونک کر بولی۔ اس نے اتفاقاً ہی کھڑکی سے سر نکال کر پھاٹک بند کرنے والے کو دیکھ لیا تھا۔ اگر پھاٹک بند کرنے والے کا رخ کار کی طرف ہوتا تو سمیرا یہ بھی دیکھ لیتی کہ پھاٹک بند کرنے والے کے چہرے پر نقاب بھی تھا۔
''کیا؟'' شمعون چونکا۔
اسی وقت شمعون کو بریک بھی لگانا پڑا کیونکہ جس گارڈ کو بنگلے ہی پر رہنے دیا گیا تھا، وہ اس کی کار کے سامنے آ گرا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ اسے کسی نے دھکا دے کر کار کے آگے گرایا ہو گا۔
''شمعون!'' رفعت چیخ پڑی۔
ایک نقاب پوش تیزی سے دروازہ کھول کر عقبی نشست پر رفعت کے برابر میں آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی نقاب تھا۔ ہاتھ میں ریوالور تھا جو اس نے شمعون کے سر سے لگا دیا تھا۔
''خبردار!'' وہ غرایا۔ ''اگر تم دونوں عورتوں میں سے کسی نے بھی چیخ پکار کی تو میں اس شخص کی کھوپڑی میں گولی اتار دوں گا۔''
اسی مختصر دورانیے میں تین اور نقاب پوش بھی کار کے قریب آ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی گنیں تھیں۔
''کوئی چیخ پکار نہیں۔'' ان میں سے بھی ایک نے دھمکی دی۔
پچھلی نشست کی دوسری جانب کا دروازہ ایک نقاب پوش نے ہی کھولا۔ رفعت اسی طرف بیٹھی تھی۔
''تم گاڑی سے اتر آؤ لڑکی۔'' دروازہ کھولنے والے نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔
رفعت خوف سے کانپنے لگی۔ سمیرا کا چہرہ بھی فق پڑ چکا تھا۔
''نہیں۔'' شمعون چیخ پڑا۔ ''تم میری زندگی میں میری رفعت کو مجھ سے دوبارہ نہیں چھین سکتے۔''
''اتر و لڑکی!'' رفعت کو پھر حکم دیا گیا۔ ''ورنہ سمجھ لو کہ اس شخص کی زندگی ختم ہو گی۔ اس کے سر سے جو ریوالور لگا ہوا ہے، وہ آواز بالکل نہیں کرے گا مگر گولی چل جائے گی۔ اس پر سائلنسر لگا ہوا ہے۔''
اسی دوران میں دو آدمی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر گھس آئے تھے اور انہوں نے شمعون سے اس کا ریوالور چھین لیا تھا جو اس نے اپنی جیب سے نکال لیا تھا۔ شمعون نے اپنے سر سے لگے ہوئے ریوالور کی پروا کیے بغیر ایک آدمی کے منہ پر زوردار گھونسا مارا۔
''نہیں شمعون، نہیں...'' رفعت رو پڑی۔ ''کچھ مت کرو تم! مار دیں گے یہ لوگ تمہیں... میری قسمت میں جو کچھ لکھا ہے، وہ میں بھگت لوں گی۔ تمہاری موت میں برداشت نہیں کر سکتی۔''
''جلد اترو لڑکی۔'' رفعت کو پھر حکم دیا گیا۔ ''میں تین تک گنوں گا اور پھر اس شخص کی زندگی ختم۔''
رفعت کانپتی ہوئی کار سے اترنے لگی۔
''نہیں رفعت!'' شمعون چیخا۔ دونوں آدمی اسے بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔
سمیرا اپنی نشست پر بت بن کر رہ گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ نقاب پوشوں نے اس سے کچھ کہا تو نہیں تھا مگر ایک گن کی نال اس کے سر سے بھی لگی ہوئی تھی۔
''مت جاؤ رفعت!'' شمعون نے پھر چیخنا چاہا لیکن اس مرتبہ اس کا منہ دبا دیا گیا۔ اس کی آواز گھٹ گئی تھی۔
''چلو!'' رفعت نے کار سے اتر کر نقاب پوش سے کہا۔ ''مجھے جہاں چاہو لے چلو مگر شمعون کو کچھ مت کرنا۔'' اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی اور جسم بھی کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔
''بے ہوش کر دو اسے۔'' ایک آواز سنائی دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمیرا نے دیکھا کہ شمعون کے منہ اور ناک پر ایک کپڑا رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شمعون کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔

رفعت زار و قطار روئے جا رہی تھی اور بڑی حسرت سے شمعون کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک نقاب پوش اس کا بازو پکڑ کر اسے پھاٹک کی طرف لے جانے لگا۔

پہلی مرتبہ گن والے نے جھپٹا مار کر سمیرا سے اس کا پرس چھین لیا، اسے کھولا، اس میں سے موبائل نکالا اور پرس سمیرا کی گود میں واپس پھینک دیا۔

''اب پانچ منٹ تک خاموش بیٹھی رہنا۔'' سمیرا کو پہلا حکم ملا۔ ''اگر تم نے پانچ منٹ سے پہلے شور مچایا تو اس گاڑی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ تم اور تمہارا شوہر بھی انہی گولیوں سے ہلاک ہوں گے۔''

سمیرا سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی۔ اس کے برابر کی نشست پر شمعون بے ہوش پڑا تھا۔

ایک کار پھاٹک کے بالکل قریب آ کر رکی تھی جسے سمیرا نہیں دیکھ سکی۔ رفعت کو اس کار کی پچھلی نشست پر بٹھا کر نقاب پوش بھی کار میں سوار ہو گئے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ کار بہت تیزی سے حرکت میں آئی اور دور ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

جہاں داد کی کار ایک سڑک پر دوڑ رہی تھی اور وہ اپنے کان سے لگے ہوئے موبائل پر جاگیردار کی ہنستی ہوئی آواز سن رہا تھا۔ ''جس گارڈ کو بنگلے کی حفاظت کے لیے چھوڑا گیا تھا، وہ میرے آدمیوں کی توقع سے زیادہ بے وقوف نکلا۔ میرا ایک آدمی لنگڑا بھک منگا بن کر پھاٹک کے قریب گیا تھا۔ گارڈ نے اسے سچ مچ بھک منگا سمجھ لیا۔ اب آپ خود سوچ لیجیے جہاں داد صاحب کہ ایسی صورت میں گارڈ سے اس کی گن چھیننا ذرا بھی مشکل کام نہیں رہا ہوگا۔ پھر میرے کئی آدمی بھی جھپٹ پڑے۔ چوکیدار بھی بے خبری میں مارا گیا۔ مطلب یہ کہ میرے آدمیوں نے اسے بھی باندھ لیا۔ اس کے بعد گھر کے ملازمین کی باری آئی۔ ہلاک کسی کو بھی نہیں کیا گیا۔ سب کو بے ہوش کرنے کے ساتھ ساتھ باندھ بھی دیا گیا تھا۔ صرف گارڈ کو بے ہوش نہیں کیا گیا تھا۔ پھر جب آپ کے بیٹے کی کار آئی تو میرے ایک آدمی نے پھاٹک کھولا۔ کار جب اندر آ گئی تو پھاٹک بند کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بندھے ہوئے گارڈ کو اس طرح دھکا دیا گیا کہ وہ کار کے آگے جا گرا۔ اس کے منہ پر ٹیپ بھی لگا دیا گیا تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ اس کے بعد...''

جاگیردار کی آواز آتی رہی اور جہاں داد سنتا رہا۔ جب جاگیردار خاموش ہو گیا تو جہاں داد نے جلدی سے پوچھا۔ ''اب کیا پوزیشن ہے؟ میرا مطلب ہے وہ لڑکی...''

جاگیردار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جب میں نے آپ سے رابطہ کیا، اس سے پہلے مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ میرے آدمی اس بنگلے سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر تھے۔ اب تو شاید اس لڑکی کو تہ خانے میں پہنچایا جا رہا ہو۔''

''تمہارے آدمیوں کو بالکل یقین ہے کہ کسی نے ان کا تعاقب نہیں کیا؟''

''سو فیصد یقین ہے جہاں داد صاحب! ایسے کاموں کے تو ماہر ہیں میرے آدمی... ان کے کہنے کے مطابق کوئی چڑیا بھی ان کے تعاقب میں نہیں تھی۔''

''اب میں شمعون کے گھر کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ دیکھتا ہوں جا کر کہ وہاں اب کیا صورتِ حال ہے۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد تم سے رابطہ کروں گا۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو تم بھی مجھے فون کر سکتے ہو۔''

''میں تو اب آپ کو بس یہی ایک اطلاع دوں گا کہ لڑکی کو تہ خانے میں پہنچا دیا گیا ہے۔''

''میں اس خبر کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔'' جہاں داد نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

جلد ہی جہاں داد کی کار شمعون کے بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ پھاٹک کھولنے والا چوکیدار ہی تھا لیکن اس وقت بھی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جاگیردار نے وہاں کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ صورتِ حال وہاں اب نہیں تھی۔ تمام ملازمین خائف اور پریشان ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے۔ برآمدے کی سیڑھی پر شمعون بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے لیکن اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اس کے قریب سمیرا بھی بیٹھی تھی۔ اس کا سر شمعون کے ایک گھٹنے پر تھا اور وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

''کیا ہو گیا؟ یہ کیا ہوا ہے شمعون!'' جہاں داد نے پریشانی کی بہت اچھی ایکٹنگ کی تھی۔

شمعون نے جہاں داد کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے۔

''میری رفعت مجھ سے پھر چھین لی گئی ڈیڈی!'' شمعون اس طرح بولا جیسے اس کے حلق میں کچھ اٹکا ہوا ہو۔

''مگر کیسے؟''

جواب سننے سے پہلے جہاں داد چونکا۔ اسے سائرنوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی آواز سنائی دی تھی۔

''پولیس آ رہی ہے بڑے صاحب!'' ایک ملازم بولا۔

''کس نے فون کیا تھا؟'' جہاں داد نے پوچھا۔

ملازم نے سمیرا کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''سب کچھ انہوں نے ہی کیا ہے۔ سب سے پہلے گارڈ کو کھولا تھا، پھر چوکیدار کو... گارڈ نے کار میں ہی صاحب کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے تھے تو انہیں ہوش آیا تھا۔ ہم سب کے موبائل تو وہ لوگ چھین لے گئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے گھر کے ٹیلی فون سے پولیس کو فون کیا تھا۔ یہ جب ہی سے روئے جا رہی ہیں اور صاحب بھی یہاں آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہاں سے اٹھ ہی نہیں رہے ہیں۔''

''لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟'' جہاں داد نے اپنا سوال دہرایا۔

اسے جواب اس مرتبہ بھی نہیں مل سکا کیونکہ چوکیدار نے پھاٹک کھول دیا تھا اور پولیس کی دو گاڑیاں تیزی سے اندر آتی نظر آئی تھیں۔

اسی وقت جہاں داد کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے جاگیردار کی کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ''مختصر بات کرنا۔''

''مجھے بس یہی اطلاع دینا ہے جہاں داد صاحب کہ لڑکی کو تہ خانے میں پہنچا دیا گیا ہے۔'' دوسری طرف سے جاگیردار نے کہا اور خود ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد جہاں داد، شمعون اور سمیرا کے ساتھ دو پولیس آفیسر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سمیرا نے رو رو کر سب کچھ بتایا تھا۔ کبھی کبھی شمعون اور جہاں داد بھی بول پڑے تھے۔

''لیکن وہ لڑکی ہے کون؟'' ایک پولیس آفیسر نے سوال کیا۔

''ڈیڈی!'' شمعون بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اب بہت ہو چکا۔ اب میں یہ بات نہیں چھپا سکتا۔ میں یہ جھوٹ اب نہیں بولوں گا کہ وہ ایک مظلوم لڑکی تھی اور میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔'' پھر فوراً ہی وہ پولیس والوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''وہ میری بیوی ہے آفیسر!''

سمیرا اس بات پر ذرا بھی نہیں چونکی۔ غالباً اس نے پہلے ہی بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔

شمعون نے پولیس والوں کو رفعت کے بارے میں سب کچھ بتانا شروع کر دیا۔ جہاں داد خاموش اور متفکر بیٹھا رہا۔

سب کچھ جاننے کے بعد ایک پولیس آفیسر نے خشک لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یہ سب کچھ یہاں کی پولیس کے علم میں لانا چاہیے تھا مسٹر شمعون!''

''کیا کر لیتی یہاں کی پولیس؟'' شمعون نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور اس وقت کیا کر لیا تھا پولیس نے جب رفعت پہلی مرتبہ اغوا کی گئی تھی؟''

''بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں بیٹے!'' جہاں داد نے دخل اندازی کی اور پھر پولیس آفیسر سے کہا۔ ''آپ لوگ اپنی کارروائی مکمل کریں اور پتا لگائیں کہ رفعت کو کن لوگوں نے اغوا کیا ہے اور وہ اسے کہاں لے گئے ہیں۔''

پولیس آفیسر نے شمعون سے کہا۔ ''آپ کو پولیس اسٹیشن چل کر رپورٹ درج کرانا ہوگی۔''

''میں کبھی نہیں جاؤں گا۔'' شمعون نے چڑچڑے انداز میں کہا۔ ''آپ لوگوں کو جو کچھ کرنا ہے، خود کیجیے۔''

''ہم خود تو کچھ نہیں کر سکتے۔'' پولیس آفیسر نے سرد لہجے میں کہا اور پھر شمعون سے بولا۔ ''پولیس اسٹیشن یہاں سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ آپ اتنی دور بھی نہیں چل سکتے؟''

''ہاں۔'' شمعون نے جھٹکے سے کہا۔ ''میں نہیں چل سکتا۔''

''تب تو پھر...'' پولیس آفیسر اپنی بات مکمل نہیں کر سکا کیونکہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

''یس سر!'' اس نے موبائل فون میں کہا۔ ''یہاں تو متعلقہ صاحب ہم سے کسی قسم کا تعاون کرنے ہی کے لیے تیار نہیں ہیں... جی سر!'' وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے سر!''

موبائل بند کر کے پولیس آفیسر نے جہاں داد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ایس پی صاحب کچھ زیادہ ہی دردمند قسم کے انسان ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ جس پر کوئی افتاد پڑی ہو، اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔'' پھر اس نے اپنے ساتھی پولیس آفیسر سے کہا۔ ''یہیں سب لوگوں کے بیانات قلم بند کر والو۔''

شمعون کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔

پولیس نے ملازمین کے علاوہ سیکیورٹی گارڈز کے بیانات قلم بند کیے۔ جہاں داد کا بیان بھی لیا گیا۔ سمیرا کے علاوہ شمعون کا بیان بے حد اہم تھا جس میں اس نے پولیس کے سامنے پہلی بار کہا کہ رفعت کی یادداشت ختم ہو جانے والی بات غلط تھی۔

پولیس آفیسر چونکا۔ ''اس کا مقصد؟''

''یہ میری دوسری بیوی ہیں۔'' شمعون نے سمیرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ان سے ہر بات چھپانا چاہتا تھا مگر اب جب یہ بات کھل چکی ہے کہ رفعت میری پہلی بیوی ہے تو اب میں کوئی بات نہیں چھپانا چاہتا۔''

سمیرا اس وقت بھی سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی رہی۔ غالباً وہ اس بات کا بھی پہلے ہی یقین کر چکی تھی۔

اس ساری کارروائی میں پولیس کا خاصا وقت صرف ہوا۔ ایک کانسٹیبل نے ڈرائنگ روم میں آ کر اطلاع دی۔

''ایس پی صاحب آئے ہیں صاحب!''

دونوں پولیس آفیسر اس طرح کھڑے ہوئے جیسے اپنے ایس پی کا استقبال کرنے کے لیے باہر جانا چاہتے ہوں۔ اسی وقت سوٹ میں ملبوس ایک جوان العمر شخص مسکراتا ہوا اندر آیا۔

''مقبول!'' شمعون اسے دیکھتے ہی کھڑا ہوا۔ ''کیا ہوا مقبول؟'' شمعون کے انداز میں شدید بے چینی تھی۔

''جو تم سے کہا گیا تھا، ویسا ہی ہوا ہے شمعون!'' نووارد مقبول نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بھابی برآمدے میں کھڑی رو رہی ہیں۔ نہ جانے کیوں اندر نہیں آ رہی ہیں۔ ڈیڈی انہیں سمجھا رہے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے...'' شمعون کی آواز کپکپا گئی۔ ''رفعت کو لے آئے تم؟''

''ہاں۔''

اسی وقت ایک ادھیڑ عمر پولیس آفیسر اندر آیا۔ اس کے جسم کی وردی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ایس پی تھا۔ اس کے ساتھ رفعت بھی تھی۔ ایس پی اسے سہارا دے کر اندر لا رہا تھا۔

جہاں داد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس وقت شمعون سے پہلے سمیرا اٹھ کر جھپٹتی ہوئی رفعت کے قریب گئی اور اسے خود سے لپٹا لیا۔

''رفعت... رفعت! تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا رفعت...! ارے تم میری جان کی جان ہو تو تمہیں مجھ سے زیادہ پیار کس سے مل سکتا ہے۔''

اس وقت شمعون کی آنکھوں سے پھر آنسو چھلک پڑے۔ وہ خوشی کے آنسو تھے۔ رفعت کے لیے سمیرا کے جذبات نے اسے بھی جذباتی کر دیا تھا۔

سمیرا رفعت کو لیے ہوئے شمعون کی طرف آئی اور رفعت شمعون سے لپٹ کر رونے لگی۔

''شکریہ ڈیڈی!'' مقبول نے ایس پی سے کہا۔

''آپ نے میری دوستی کی لاج رکھی۔ آپ میرے دوست سے فون پر تو بات کر چکے ہیں۔ اب اس سے مل بھی لیجیے۔ یہ شمعون ہے۔''

''وہ تو میں سمجھ گیا ہوں۔'' ایس پی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن تمہارے دوست سے پہلے میں ان کے والد سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس کی نظریں جہاں داد پر جمی ہوئی تھیں۔ ''اٹھیے جہاں داد صاحب! میں آپ کو بس اتنی رعایت دے سکتا ہوں کہ آپ کے بیٹے اور بہوؤں کے سامنے آپ کو ہتھکڑیاں نہ لگائی جائیں۔''

سمیرا اور روتی ہوئی رفعت، دونوں ہی چونک پڑیں۔ اس وقت شمعون کا ردِعمل ان دونوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے آہستگی سے سر گھما کر جب اپنے باپ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں اور چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے اسے رنج بھی ہوا ہو اور باپ کے لیے اس نے اپنے دل میں نفرت بھی محسوس کی ہو۔

جہاں داد کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

''اٹھو جہاں داد!'' اس مرتبہ ایس پی کے لہجے میں سختی تھی۔ ''باہر چل کر موبائل میں بیٹھ جاؤ۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ موبائل میں تمہاری داشتہ زینت بھی ہے اور وہ آدمی بھی جسے تہ خانے کی نگرانی پر لگایا گیا تھا۔ میں انہیں اپنے ساتھ اس لیے لے آیا ہوں کہ ساری برات ایک ساتھ ہی حوالات پہنچے۔''

جو پولیس افسر وہاں پہلے سے موجود تھے، بے حد حیران نظر آنے لگے۔

''یہ کیا معاملہ ہے سر؟'' ان میں سے ایک بولا۔

''سب کچھ بتانا ہی ہے۔'' ایس پی نے کہا۔ ''لیکن پہلے ان لوگوں کو حوالات پہنچا دیا جائے۔'' پھر اس نے جہاں داد کو گھورتے ہوئے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ''کیا تم نے سنا نہیں جہاں داد خاں؟''

اس وقت جہاں داد نے شمعون کی طرف دیکھا۔

''شمعون بیٹے!'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''نہ کہیے آپ مجھے اپنا بیٹا!'' شمعون نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

''شمعون!'' جہاں داد نے کہا۔ ''میں نے جو کچھ کیا، صرف اس دولت کے لیے کیا جو میرے بعد تمہیں ہی ملنا تھی۔''

اب شمعون نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

ایس پی غور سے شمعون کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی لیے دوسرے پولیس والوں نے بھی باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا۔

''ہاں شمعون!'' جہاں داد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں شدید ترین مالی بحران کا شکار ہو گیا تھا بیٹے! اس کا ایک حل مجھے یہی نظر آیا کہ میں تمہاری شادی سمیرا سے کرا دوں۔ اس طرح میں ایک بہت بڑے پروجیکٹ میں سمیرا کے والد سعید جعفری صاحب کا حصے دار بن گیا تھا۔ اس پروجیکٹ سے ہونے والا منافع میرے مالی بحران کو ختم کر دیتا۔ چند ماہ بعد یہ پروجیکٹ مکمل ہونے والا ہے۔ اس کے بعد میں رفعت کو کسی نہ کسی طرح تم تک واپس پہنچا دیتا۔ اس بچی سے مجھے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔ قید میں اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔''

''یہ تو رفعت مجھے بتا چکی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔'' شمعون نے کہا۔ ''لیکن مجھے آپ کی اس دولت سے کوئی دلچسپی نہیں جس کی وجہ سے طویل عرصے تک اذیت میں مبتلا رہا اور میری رفعت قید میں زندگی گزارتی رہی۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس دولت پر جو گھر کے چراغ کو آندھیوں کی زد پر لا کے حاصل کی جائے۔''

''دیکھا ڈیڈی آپ نے۔'' مقبول نے ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سوچ ہے میرے دوست کی؟''

ایس پی نے اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جہاں داد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جو کچھ کیا ہے جہاں داد خاں، وہ کوئی ایسا نیک کام ہرگز نہیں ہے کہ تم اس جرم کی سزا سے بچ سکو جس کے تم مرتکب ہوئے ہو... سزا سے نہ تم بچوں گے، نہ وہ شخص جس کے آدمیوں سے تم نے رفعت کو دو مرتبہ اغوا کروایا ہے۔ وہ سب لوگ بھی گرفتار کیے جا چکے ہیں اور اگر تم اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے تو ان لوگوں کی زبان کھلوالی جائے گی۔ وہ بتا دیں گے کہ ان کا آقا کون ہے۔ اور اب اگر تم یہاں سے نہیں اٹھے تو میں مجبور ہو جاؤں گا کہ اسی جگہ تمہاری کلائیوں میں سرکاری زیور پہنا دیا جائے۔''

جہاں داد نے ایک مرتبہ بڑی حسرت سے شمعون کی طرف دیکھا اور پھر ایسے تھکے تھکے انداز میں اٹھا جیسے کوئی جواری اپنی آخری پونجی ہار کر اٹھتا ہے۔

☆☆☆

باقی سارا دن شمعون کو پولیس کی کارروائیوں میں مصروف رہنا پڑا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹا۔

سمیرا اور رفعت اسی کمرے میں رہی تھیں جہاں وہ دو راتیں گزار چکی تھیں۔ رفعت بار بار رونے لگتی تھی۔ سمیرا مسلسل اس کی دل جوئی میں لگی تھی۔ اس نے شمعون کو دیکھتے ہی کہا۔

''میں اب اپنی بہن کی پٹائی شروع کر دوں گی اگر اس نے اپنا رونا بند نہیں کیا۔''

شمعون کے ہونٹوں پر بجھی بجھی سی مسکراہٹ نظر آئی اور پھر اس نے رفعت کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''تم تو بڑی خوش قسمت ہو رفعت کہ میں تو تمہارا شریکِ زندگی تھا ہی، اب تمہیں سمیرا جیسی شریکِ زندگی بھی مل گئی ہے۔''

رفعت سسکیاں لیتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

''یہ سب کچھ ہوا کیسے شمعون؟'' سمیرا بولی۔ ''اور یہ مقبول تمہارا کب کا دوست ہے؟ تم نے مجھے اس سے کبھی نہیں ملوایا؟''

''وہ امریکا سے پڑھ کر چند دن پہلے ہی آیا ہے۔ اتفاق سے مجھے کل ہی اس کی آمد کا علم ہوا تھا۔ میں نے اسے فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ دراصل ہماری پولیس رشوت اور سفارش کے بغیر کچھ نہیں کرتی۔ مجھے مقبول سے امید تھی کہ وہ اپنے والد کو اس کام کے لیے آمادہ کر لے گا۔''

شمعون نے تفصیل سے بتایا۔ مقبول کے بعد اس نے اس کے والد ایس پی سے بھی فون پر ہی بہت تفصیلی گفتگو کی تھی۔ اپنے شبہے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ایس پی نے اس کے سامنے ایک ایسی تجویز رکھی تھی جس پر عمل کرنا شمعون کے لیے آسان نہیں تھا لیکن ایس پی کے دلائل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس کی تجویز مان لے کیونکہ اسی صورت میں یہ سارا معاملہ چشم زدن میں ختم کیا جا سکتا تھا۔

تجویز یہ تھی کہ رفعت کو چارے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یعنی ان لوگوں کو پھر ایسا موقع دیا جائے کہ وہ رفعت کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

رفعت کو جب دوسری مرتبہ اغوا کیا جا رہا تھا تو شمعون کی ان لوگوں سے دھینگا مشتی صرف دکھاوے کے لیے تھی۔ ایس پی کی ہدایت کے مطابق اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ رفعت کو اغوا کر لیا جائے اور پھر اسے جہاں لے جایا جائے، پولیس وہاں ریڈ کر کے رفعت کو بھی بازیاب کرا لے اور مجرموں کو بھی گرفتار کر لیا جائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ایس پی صاحب نے ان لوگوں کا تعاقب کروایا تھا؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''نہیں۔'' شمعون نے جواب دیا۔ ''یہ پیشہ ور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ان کا تعاقب کیا جاتا تو یہ بھڑک جاتے۔ ان کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے ایک ڈیوائس استعمال کی گئی تھی۔ اس ڈیوائس سے سگنل نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح پولیس کو معلوم ہو گیا کہ رفعت کو کہاں لے جایا گیا تھا۔''

''وہ ڈیوائس کہاں تھی؟''

''ایک ہیئر کلپ میں۔'' شمعون نے جواب دیا۔ ''وہ کلپ میں نے آج اپنے ہاتھوں سے رفعت کے بالوں میں لگایا تھا۔''

رفعت کا ہاتھ بڑی تیزی سے اپنے سر پر گیا۔

''نہیں رفعت!'' شمعون نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب وہ کلپ تمہارے بالوں میں نہیں ہے۔ جب تم مقبول اور ایس صاحب کے ساتھ آئی تھیں اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی تھیں تو وہ کلپ میں نے تمہارے بالوں میں سے نکال لیا تھا۔ وہ ڈیوائس مجھے ایس پی صاحب نے یہاں گھر پر ہی بھجوائی تھی اور یہ میرا فرض تھا کہ میں وہ ڈیوائس انہیں واپس کر دوں۔''

شمعون کی یہ باتیں سنتے ہوئے رفعت اپنا رونا بھول گئی اور اب بس نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

شمعون بولا۔ ''ڈیڈی کے بارے میں کیونکہ میں اپنا شبہ ظاہر کر چکا تھا اس لیے ایس پی صاحب نے ان کی نگرانی کروائی تھی۔ وہ کل سے اپنے شہر واپس نہیں گئے تھے۔ انہوں نے یہیں ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ مجھ سے انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ اسی لیے جب مجھے یہ بتایا گیا کہ وہ یہیں ایک ہوٹل میں مقیم ہیں تو ان کے بارے میں میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس سارے معاملے کے پس پردہ ڈیڈی ہی تھے۔ وہ جس شخص سے کام لے رہے تھے وہ اسی گاؤں کا ایک جاگیردار ہے جہاں رفعت کو پہلی مرتبہ قید کیا گیا تھا۔ میں نے یہ بات بھی ایس پی صاحب کو بتا دی تھی۔ اپنا یہ شبہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ یہ سارے کارندے اسی کے ہوں گے۔ جاگیردار کو اس کا علم بھی ہو گیا تھا کہ اس کے کارندے گرفتار کیے جا چکے ہیں اس لیے اس نے فوری طور پر ملک سے نکل جانے کی کوشش کی۔ شام کو اسے ائرپورٹ سے گرفتار کیا جا چکا ہے۔''

''اور اس کے یا تمہارے ڈیڈی کے خلاف ثبوت؟''

''اب یہ کام پولیس کا ہے اور پولیس یہ کام بہ خوبی کر لیتی ہے اگر سارا معاملہ اس کی نظر میں صاف و شفاف طریقے سے سامنے آ جائے۔''

سمیرا نے ایک طویل سانس لی پھر کہا۔ ''کیا اب چل کر کھانا کھا لیا جائے؟ سارا دن تو بھوکا رہ کر گزر گیا۔''

''میں نے بھی کچھ نہیں کھایا سمیرا!'' شمعون نے کہا۔ ''اور ہاں، اب تم اپنے پاپا کو فون کر کے سب کچھ بتا دو ورنہ انہیں تم سے شکایت ہو گی۔ کل تو اخبارات میں سب کچھ آ ہی جائے گا۔''

''اب تم اجازت دے رہے ہو تو بات کر لوں گی ان سے۔''

''اور رفعت! تم بھی اپنے والدین سے بات کر لو۔ خوشی سے کھل اٹھیں گے وہ۔''

''مجھے اب ان کا نمبر نہیں معلوم، کہیں کھو گیا ہے۔''

''میرے موبائل میں تو ہے۔''

''تمہارا بلکہ سبھی کے موبائل تو ان لوگوں نے چھین لیے تھے۔''

''لیکن وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں۔ موبائل بھی واپس مل گئے ہیں۔''

''اب میں کل بات کروں گی ان سے۔'' رفعت نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آج تو میرا دماغ میرے قابو میں نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' شمعون نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ تو تمہاری حالت سے بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے۔''

''اس کی حالت تو میں آج ہی رات کو سنبھال دوں گی۔'' سمیرا بولی۔

''کیسے؟''

''بس دیکھنا۔''

رفعت اور شمعون نے رات کا کھانا کھانے کے بعد دیکھا جب وہ خواب گاہ میں داخل ہو رہے تھے تو سمیرا ایک قدم پیچھے تھی۔ ان دونوں کے اندر جاتے ہی سمیرا نے باہر سے دروازہ بند کر کے مقفل کر دیا۔

''سمیرا!'' شمعون نے آواز دی۔

''بس ٹھیک ہے۔'' سمیرا نے ہنس کر باہر سے جواب دیا۔ ''اب آج کی رات تم دونوں کی ہے۔ اب کل صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہو گی۔''

شمعون کو ہنسی آ گئی۔ اس نے رفعت کی طرف دیکھا جس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لی تھیں۔

●●
●●

انعام

تنویر ریاض

انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور ہوتا ہے... بظاہر اس کی زندگی ایک لگے بندھے ڈھب پہ چل رہی ہوتی ہے... اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی دوسرے فرد کی کامیابی کا سبب بھی بن سکتا ہے'' ایک ستم ظریف کی کتھا...

ایک لڑکی کی چالاکی و عیاری جو اپنے مخصوص ہدف تک جا پہنچی تھی

ڈیوڈ پیٹرک نے آنکھ کھولی تو سورج کی روشنی پورے کمرے میں پھیل چکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور پورا کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ حلق میں عجیب سی کڑواہٹ محسوس ہو رہی تھی اور پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ اس نے گزشتہ شب کے بارے میں یاد کرنے کی کوشش کی پھر اس کے ذہن کی اسکرین پر پلینو کا نام جگمگانے لگا۔ وہ اس کے ساتھ بار میں گیا تھا لیکن اس نے بہت زیادہ نہیں پی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو پیگ لیے ہوں گے لیکن پلینو کی قربت کا نشہ کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پہلے کبھی بھی ڈرنک کرنے کے بعد یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا۔ اب اسے کافی پر ہی گزارا کرنا پڑتا۔ ویسے بھی اسے کافی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ وہ بمشکل تمام بستر سے اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ اس نے لائٹ جلانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ باہر سے آنے والی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ مرجھایا ہوا لگ رہا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے نظر آرہے تھے۔ واش بیسن کے نل سے نیم گرم پانی آرہا تھا۔ جیسے ہی وہ منہ دھونے کے لیے جھکا، اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور بستر کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا اپنا پرس تلاش کرنے لگا۔

یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کا پرس معمول کے مقابلے میں بہت ہی ہلکا نظر آرہا ہے۔ جب کھول کر دیکھا تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔ پرس تقریباً خالی تھا۔ تمام نقدی، ڈرائیونگ لائسنس، کریڈٹ کارڈ، ہیلتھ کارڈ اور دیگر تمام دستاویزات غائب تھیں۔ البتہ ایک خانے میں دو سو پیسو کا نوٹ رکھا ہوا تھا۔ گویا وہ بالکل ہی خالی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے دو سو پیسو چھوڑ دیے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ پلینو کی مہربانی تھی۔

اس نے سنگھار میز کی نچلی دراز کھولی اور اس میں رکھی ہوئی تمام اشیا باہر نکال لیں۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوگیا کہ وہ باکس وہاں موجود تھا جس میں اس نے دس ہزار پیسو اور دو سو ڈالرز رکھے تھے۔ یہ اس کی جمع پونجی تھی جو اس نے ہنگامی ضرورت کے لیے بچا رکھی تھی لیکن جب اس نے باکس کھول کر دیکھا تو وہ خالی تھا۔ اس نے بیڈ کے کنارے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی لفظ بار بار گھوم رہا تھا۔۔۔ پلینو! ہاں، پلینو نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور اسے کنگال کر کے چلی گئی تھی۔

وہ ایک سول انجینئر تھا اور وسطی میکسیکو کے اس چھوٹے سے قصبے سان میگوئل میں ایک پیٹرول پمپ کی تعمیر کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ اس کے معاہدے میں تعمیراتی جگہ کی تیاری سے لے کر کنکریٹ اسٹرکچر کے مراحل تک کی نگرانی شامل تھی۔ اس کا کام تقریباً ختم ہی ہونے والا تھا لیکن اچانک ہی تیل کی قیمتیں گر جانے کی وجہ سے کمپنی نے تعمیراتی کام روک دیا تھا۔ وہ اس دوران کئی بار وہاں جاچکا تھا لیکن اسے کام دوبارہ شروع ہونے کے آثار نظر نہ آئے۔

دو ہفتے سے سام فریڈرک نے بھی اسے کوئی ہدایات نہیں دی تھیں۔ آخری ای میل میں سام نے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ آئل کمپنی کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہے۔ پیٹرک اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کمپنی میں فیصلہ سازی کا طریقہ کتنا پیچیدہ ہے اور اکثر اوقات انہیں کوئی فیصلہ کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے، لہٰذا وہ بھی اطمینان سے بیٹھا اپنے باس کی نئی ہدایت کا انتظار کر رہا تھا۔

بدقسمتی سے سام کے سوا اس کا کسی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ دو سال پہلے اسے طلاق ہوگئی تھی کیونکہ اس کی بیوی کو یہ بالکل بھی پسند نہیں تھا کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں ہر وقت سفر کرتا رہے۔ اس کی بیوی کو خود بھی سفر کرنا پسند نہیں تھا اور وہ اپنے کام کے سلسلے میں عام طور پر جن شہروں میں جاتا، وہاں سیاحوں کے لیے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا، لہٰذا اس کی بیوی نے یہ کہہ کر علیحدگی اختیار کرلی کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔

اب تک پیٹرک اپنے کام کے سلسلے میں جن شہروں میں گیا تھا، ان میں سان میگوئل کا قصبہ سب سے بہتر اور مختلف نظر آیا۔ اگر اس کی بیوی ساتھ ہوتی تو یقیناً وہ اس جگہ کو پسند کرتی۔ جس ہوٹل میں اس کا قیام تھا، وہ انتہائی آرام دہ تھا۔ اس کے عقب میں انتہائی خوب صورت لان تھا جس میں بے شمار گلاب کے پودے لگے ہوئے تھے۔ اس کا کمرا اس لان سے متصل تھا جبکہ کمرے کی بڑی سی کھڑکی بیرونی برآمدے میں کھلتی تھی۔ دو خوب صورت لڑکیاں ہمہ وقت ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کی خدمت پر مامور تھیں۔ وہ روزانہ ان کے بستر کی چادریں اور تولیے تبدیل کرتیں۔ صبح کے وقت نلکوں میں گرم پانی آتا لیکن دس بجے کے بعد اس کی دستیابی یقینی نہیں تھی۔ اسی طرح پینے کے پانی کی بوتلیں بھی ہر کمرے میں باقاعدگی سے فراہم کی جاتی تھیں۔

کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس دوران میں اس کی عادتیں کافی بگڑ گئی تھیں۔ صبح دیر سے اٹھنا اور ناشتا کرنے کے بعد قصبے کی سیر کو نکل جانا اس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے باپلونڈا نامی بار میں بھی جانے لگا تھا۔ جس کی دیواروں پر بل فائٹ میں حصہ لینے والے بیلوں کے پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی پینتالیس ویں سالگرہ بھی اسی بار میں بالکل انوکھے انداز میں منائی۔ وہ بار بار اپنے دونوں بازو پھیلا کر بار تک جاتا اور اپنے لیے پسندیدہ ڈرنک خریدتا۔ اسے فلائنگ سے بہت دلچسپی تھی بالخصوص اسے گلائیڈر اڑانا پسند تھا۔ اسے شدت سے خواہش ہو رہی تھی کہ وہ اپنی سالگرہ کے موقع پر گلائیڈر اڑائے لیکن

وہاں ایسا ممکن نہ تھا، لہٰذا وہ نشے میں ہی اس کے بارے میں بولتا رہا۔ وہ ہر بار اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اس انداز میں کاؤنٹر کی طرف جاتا جیسے کوئی پرندہ فضا میں پرواز کر رہا ہو لیکن یہ مشغلہ بھی زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا اور اسے اس سے بھی اکتاہٹ ہونے لگی۔

البتہ گزشتہ دو روز سے اس کی اکتاہٹ دور ہوگئی تھی اور اس کی وجہ پلینو تھی۔ اس نے اسے چند مرتبہ ہوٹل کی مالکہ کیسا لیلا کے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی لیکن اس کے چہرے اور جسم میں بڑی کشش تھی۔ لیلا نے اسے اپنی بیٹی کہہ کر متعارف کروایا تھا۔ پیٹرک کی نگاہیں اس کے خوب صورت چہرے پر جم کر رہ گئیں لیکن پلینو نے اس کی جانب دیکھنا گوارا نہیں کیا۔

دو روز پہلے وہ اپنے بستر پر لیٹا کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہوں گے جب اس نے اپنے کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ وہ یہی سمجھا کہ ہوٹل کی خدمت گزار لڑکیوں میں سے کوئی ہوگی جو اس کے لیے پانی کی بوتل یا سام کا پیغام لے کر آئی ہوگی لیکن وہ پلینو تھی۔ اس نے سرخ رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور اس کے گلے میں چاندی کا نیکلس جگمگا رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پیٹرک کو دیکھا اور دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا۔ پھر وہ بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ پھر منہ بناتے ہوئے بولی کہ اس کی ماں سمجھتی ہے، وہ۔۔۔ یعنی پیٹرک یہاں خوش نہیں ہے۔ پھر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور ترچھی نظروں سے پیٹرک کو دیکھنے لگی جیسے اپنے سوال کا جواب چاہ رہی ہو۔ پیٹرک نے کندھے اچکا دیے اور سوچنے لگا کہ کیا یہ لڑکی اسے خوش کرسکتی ہے؟

پلینو نے وہ پیکٹ کھولا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس میں ایک انتہائی مہنگی شراب کی بوتل تھی پھر اس نے پیٹرک سے دو گلاس مانگے۔ بوتل کھول کر ایک گلاس بھر کر اسے دیا اور دوسرا اپنے لیے بنایا۔ وہ دونوں ڈرنک کرتے رہے۔ پلینو کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں پھر اس نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا اور اپنے بازو پھیلا دیے۔ اس مسکراہٹ میں جو دعوت پنہاں تھی، پیٹرک اس کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔

پیٹرک جانتا تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے لہٰذا اس نے دھیان ہٹانے کے لیے دوسری باتیں چھیڑ دیں لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ یہاں رہتے ہوئے بور ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک اور پیگ لینے میں کیا حرج ہے۔ شراب واقعی بہت عمدہ تھی۔ وہ دونوں پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح ہوئی تو اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ یہ بھی نہ جان سکا کہ پلینو کب اس کے کمرے سے گئی تھی۔

دوسرے دن وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں کئی سوال جنم لے رہے تھے۔ اس کی سوچ کی سوئی بار بار ایک ہی نکتے پر آکر اٹک جاتی تھی کہ آخر وہ کیوں اس کے کمرے میں آئی تھی؟ اسے اپنے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی کہ جوان لڑکیاں یوں اس پر فدا ہونے لگیں۔ کیا واقعی لیلا نے اسے بھیجا تھا؟ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی ماں ایسا کر سکتی ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی ماں ہی نہ ہو پھر کیا وہ کسی کی طرف سے بھیجا ہوا تحفہ تھی؟ وہ کون ہوسکتا ہے اور اس نے کس مقصد کے تحت اسے بھیجا تھا؟ وہ دن بھر اسی بارے میں سوچتا رہا لیکن کوئی واضح رائے قائم نہ کرسکا۔ اسے شبہ تھا کہ وہ دوبارہ اس کے پاس آئے گی۔

وہ دوسری رات بھی آگئی۔ ٹھیک گیارہ بجے اپنی بغل میں شراب کی بوتل دبائے وہ قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ پیٹرک نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے لیکن اس نے بڑی خوب صورتی سے یہ سوال ٹال دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں پھر حسب معمول شراب کا دور چلا اور صبح ہونے تک پیٹرک کو یاد بھی نہ رہا کہ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔

اگلے روز اس نے اپنے باس سام فریڈرک کو ایک سخت پیغام بھیجا اور کہا کہ اب اس کی واپسی کا وقت آگیا ہے۔ نہ جانے کیوں اسے پلینو کے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اسے شک تھا کہ وہ اس رات بھی آئے گی یا نہیں لیکن وہ نہیں آئی۔ اب اسے یہ فکر ستانے لگی کہ وہ کیوں نہیں آئی۔ تین بجے کے قریب وہ بستر سے اٹھا اور لیلا کے باغ میں چلا گیا۔ وہاں چاروں طرف گلاب کے پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ وہیں بینچ پر بیٹھ کر اس خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اگلے دن وہ سام کی ای میل کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی جانب سے مایوس ہو کر اس نے سام کو ٹیلی فون کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ اسے اندازہ تھا کہ ای میل کا جواب نہ دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اس معاملے کو ٹال رہا ہے اور فون پر بھی وہ یہی کہتا کہ پیٹرک کچھ عرصہ رک کر مزید انتظار کرے۔ پیٹرک کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا اس نے پوری سہ پہر بار میں گزاری۔ البتہ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عجیب بات یہ ہوئی کہ اس رات پلینو واپس آ گئی۔

☆☆☆

اس بار پلینو کی آمد اس کے لیے بہت بڑا حادثہ ثابت ہوئی۔ جاتے جاتے وہ اسے پرس میں رکھی ہر چیز اور دراز میں چھپائی گئی نقدی سے محروم کر گئی تھی۔ اس کے ساتھ بہت برا ہوا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ کیا وہ لیلا کے پاس جائے اور اس سے پلینو کی شکایت کرے؟ یا پھر پولیس میں رپورٹ درج کرائے کہ اس نے جس لڑکی کے ساتھ رات بسر کی تھی، وہ اسے کنگال کر کے چلی گئی؟ یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز خیال تھا۔ سفارت خانے والوں کو اپنی مشکل سے آگاہ کرے؟ شاید وہ اسے ہوسٹن بھجوانے کا انتظام کر سکیں۔ وہاں جا کر وہ سام فریڈرک کو اپنی بپتا سنا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاملات مزید بگڑ جائیں۔

وہ تکیے سے سر ٹکا کر لیٹ گیا اور چھت کو دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر چھت پر پڑی ہوئی ایک دراڑ پر گئی جو فانوس سے لے کر دروازے کے کونے تک چلی گئی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اس جانب توجہ نہیں دی تھی۔ ایسی اور بھی کئی چیزیں ہوں گی جن پر اس کی نظر نہیں گئی ہو گی کیونکہ اس پر ایسا وقت نہیں آیا تھا اور پہلے وہ کافی بہتر پوزیشن میں تھا لیکن اب وہ اس حال کو پہنچ گیا تھا کہ اس کی جیب میں صرف دو سو پیسو تھے۔ ان پیسوں سے وہ کیا کر سکتا تھا۔ کافی۔۔۔ اسے شدت سے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

وہ ہوٹل سے باہر آ گیا اور کاسا کیفے کی جانب چل دیا۔ سڑک کے دونوں جانب مکانوں کی اونچی اونچی دیواریں تھیں جن میں کہیں کہیں بڑے بڑے گیراج کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ وسط میں بڑے بڑے درخت لگے ہوئے تھے جنہوں نے سڑک کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چلتے چلتے اس کے سینے میں تکلیف شروع ہو گئی۔ اسے سانس لینے میں بھی مشکل ہو رہی تھی اور پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

اچانک ہی ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز اس کے برابر میں آ کر رکی۔ اس کے سامنے کا دایاں اور عقب کا بایاں دروازہ ایک ساتھ کھلا اور اس میں سے دو افراد بیک وقت باہر آئے۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے جبکہ چہروں پر سیاہ چشمے چڑھائے ہوئے تھے۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے سڑک کی جانب دیکھا، وہ خالی پڑی تھی لیکن وہ بھاگ نہیں سکتا تھا کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

"سینور پیٹرک۔" کار کے اندر سے ایک تیز آواز آئی۔ "کیا تم میرے ساتھ بیٹھنا پسند کرو گے؟"

اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اگر یہ اغوا کی واردات ہوتی تو اسے پہلے ہی کار میں بٹھا دیا جاتا۔ اس نے جھک کر کار کے اندر دیکھا۔ ایک دبلا پتلا شخص عقبی نشست کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پیٹرک کو اپنے بائیں جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پیٹرک نے ایک بار پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کو دیکھا اور خاموشی سے کار میں بیٹھ گیا۔ کار سے اترنے والے افراد میں سے ایک فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا عقبی نشست کا دروازہ بند کرنے کے بعد خود گاڑی کے باہر ہی کھڑا رہا۔ کار کا انجن خاموش تھا البتہ ائر کنڈیشنر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"سینور پیٹرک۔" وہ شخص بولا۔ "کیا میں تمہیں ڈیوڈ کہہ سکتا ہوں؟ میرا نام پال ہے اور یہ میرے ساتھی ہیں۔" اس نے ہاتھ سے ڈرائیور اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کیا۔

"مجھے تمہارے ڈیوڈ کہنے پر کوئی اعتراض نہیں۔" پیٹرک نے کہا۔ "لیکن یہ سب کیا ہے؟"

"تم امریکنوں کو ہر بات کی تہ تک پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔" اس شخص کا نام پال تھا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی اور اس کا رنگ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں قدرے صاف تھا۔

"تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔" پال نے کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے سامنے صرف ایک تجویز رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ ہم دونوں کے درمیان تبادلے کی ایک شکل ہو گی۔"

پیٹرک اس کی بات سنتا رہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اس ادل بدل کی شکل یہ ہو گی کہ تم ہمارے لیے کچھ خدمات سرانجام دو گے اور ہم اس کے عوض وہ تمام چیزیں واپس کر دیں گے جن کا تعلق تمہاری ذات سے ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے دائیں جانب مڑا اور اس نے ایک بریف کیس اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ پھر اس نے بریف کیس میں سے کئی تھیلیاں نکالیں اور انہیں پیٹرک کے سامنے کر دیا۔ ایک تھیلی میں اس کی نقد رقم تھی۔ دوسری میں پلاسٹک کارڈز اور تیسری میں اس کا پاسپورٹ رکھا ہوا تھا جبکہ پیٹرک کا دھیان پاسپورٹ کی جانب نہیں گیا۔ اس نے اسے ایک فولڈر

میں دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھا تھا اور یہ فولڈر بھی اس کے کپڑوں کے نیچے چھپایا گیا تھا لیکن اب یہ سب چیزیں پال کے قبضے میں تھیں۔ پیٹرک کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ اس نے پوچھا۔

"مجھے کس قسم کی خدمات انجام دینا ہوں گی؟"

پال مسکرایا اور اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم ایک پائلٹ بھی ہو اور ہوائی جہاز اڑاتے ہو۔ تم گلائیڈر بھی اڑا سکتے ہو۔ کم از کم اس لائسنس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

اس کی آواز مدھم ہو گئی۔ اس نے بیگ میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس میں تمہارا لائسنس دیکھا ہے۔ اس کے مطابق تمہیں گلائیڈر اڑانے کی اجازت ہے۔"

پیٹرک کو یاد آیا کہ اس نے بار میں نشے میں دھت ہو کر گلائیڈر اڑانے کی شیخی بگھاری تھی اور بارٹینڈر ہورتیو اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ کہیں اس کا تعلق بھی اس گروہ سے تو نہیں ہے؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ پال کی بات کا کیا جواب دے۔

"میرے پاس ایک گلائیڈر ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اڑاؤ۔"

پیٹرک کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"شمال کی جانب ٹیکساس کے آس پاس۔ وہاں ہمارے پاس گلائیڈر اتارنے کے لیے اپنی جگہ ہے۔"

"نارکوٹک۔" پیٹرک کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیاہ لباس میں گہرے سانولے رنگ کے میکسیکن لوگ، سیاہ مرسیڈیز، سرحد پار کرتا ہوا جہاز، ہیروئن کے پیکٹ، یہ سب کچھ ایک فلمی کہانی کی طرح تھا۔ پال کیا کہنا چاہ رہا تھا؟ اس فلم کا اسکرپٹ کیا تھا؟

"اس میں کئی خطرات ہیں۔" پیٹرک نے کہا۔ "ریڈار کے ذریعے نگرانی ہوتی ہے اور منٹوں میں جنگی طیارے اسے گھیر لیتے ہیں۔ اس طرح کی پرواز کا لوگوں سے بچنا مشکل ہے۔"

"ان کی نظریں گلائیڈر پر نہیں ہوتیں۔ ریڈار پر اس کی کوئی تصویر نہیں آتی۔ تم اونچی پرواز کرو گے۔۔۔ بادلوں کے درمیان۔ تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

"ایک گلائیڈر کے ذریعے بادلوں کے اوپر پرواز کرنا ممکن نہیں۔" پیٹرک نے جواب دیا۔

"ممکن ہے کہ تم ایسا کر سکو۔" پال نے کہا۔

"یہاں سے ٹیکساس تک ایک طویل فاصلہ ہے۔" پیٹرک نے پھر اعتراض کیا۔

"گلائیڈر کے ذریعے یہ فاصلہ کتنا ہو گا؟" پال نے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ ٹیکساس میں کہاں جانا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ فاصلہ پانچ سو میل ہو۔"

"ایک گلائیڈر اتنا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔" پال نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے۔۔۔ اگر موسم اچھا ہو، تیز ہوا نہ چل رہی ہو اور آپ بھٹک نہ جائیں۔"

"گلائیڈر میں ایک آلہ لگا ہوا ہے جو سمت اور وقت بتاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، جب تمہیں فاصلے کے بارے میں معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" پیٹرک نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"صرف یہ جاننے کے لیے کہ تمہیں اس بارے میں کتنی معلومات ہیں۔"

پیٹرک کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ "اور اس خدمت کے عوض مجھے کیا ملے گا؟ تم نے کسی تبادلے کی بات کی تھی۔" اسے اپنے کہے ہوئے الفاظ پر یقین نہیں آیا۔ وہ ایک ایسے شخص سے بارگیننگ کر رہا تھا جو منشیات کا اسمگلر تھا۔

"تم مقررہ جگہ پر گلائیڈر اتارو گے تو کوئی شخص تم سے ملنے آئے گا اور گلائیڈر میں رکھا ہوا سامان لینے کے بعد وہ یہ سب چیزیں تمہارے حوالے کر دے گا۔" پال نے بریف کیس پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "گلائیڈر تمہارے پاس ہی رہے گا۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

"میں کس طرح کہیں اور جا سکتا ہوں؟ گلائیڈر کیسے اوپر اٹھے گا؟"

"اس کے لیے تمہیں اس شخص کی مدد درکار ہو گی۔ یہ سب باتیں تم اس سے طے کر سکتے ہو۔"

"اور اگر میں اس کام کے لیے راضی نہ ہوں تب کیا ہو گا؟" پیٹرک نے پوچھا۔

پال نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور بولا۔ "پھر یہ سب چیزیں میرے پاس ہی رہیں گی۔ ممکن ہے کہ یہ بعد میں کسی اور جگہ پر ظاہر ہوں۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر یہ کاغذات کسی اور کے ہاتھ لگ جاتے تو پیٹرک کے لیے بڑی مشکل ہو سکتی تھی۔ اسے ایک جانب ایف بی آئی اور دوسرے اداروں کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑتا تو دوسری جانب فریڈرک بھی اسے ملازمت سے برخاست کر سکتا تھا۔ اس کے پاس پال کی بات ماننے کے سوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی چارہ نہیں تھا۔

''تم یہ گلائیڈر کب اڑانا چاہتے ہو؟''

''کل۔'' پال نے کہا۔

اس سے اندازہ ہو گیا کہ پال اسے بالکل بھی مہلت نہیں دینا چاہ رہا تھا اور پیٹرک بھی اچھی طرح یہ بات سمجھتا تھا کہ اب یہ کام کیے بغیر چھٹکارا ممکن نہیں۔

''مجھے گیارہ بجے تک فضا میں جانے کی ضرورت ہو گی۔''

''اس کا انتظام ہو جائے گا۔'' پال نے کہا۔ ''ہم کل صبح سات بجے یہیں ملیں گے۔ اس کے بعد سیدھے گلائیڈر پر جائیں گے۔ اگر تم آ گئے تو ٹھیک ہے ورنہ۔۔۔''

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور بریف کیس پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''خوب ڈٹ کر کھانا کھاؤ اور لمبی تان کر سو جاؤ۔ صبح سات بجے سے پہلے اٹھنا بھی ہے۔''

''ہاں! یہ تو ہے۔'' پیٹرک نے کہا اور اپنی طرف کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ باہر کھڑا ہوا آدمی فوراً آگے بڑھا لیکن پال نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ پیٹرک کار سے باہر آیا۔ اس کی کمر اور ٹانگوں میں درد شروع ہو چکا تھا۔ باہر کھڑا ہوا آدمی اس کی جگہ پر بیٹھ گیا اور کار ایک تیزی کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

پیٹرک کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ اس کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اسے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لینا چاہیے تھا لیکن پھر خود ہی اسے اس خیال پر ہنسی آ گئی۔ جب تک اس کی چیزیں پال کے پاس تھیں، وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ پھر اسے کافی کا خیال آیا جو ابھی تک نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کاسا کیفے وہاں سے پانچ بلاک کے فاصلے پر تھا۔ وہ ان پیسوں سے کافی کے ساتھ سینڈوچ بھی لے سکتا تھا پھر بھی کچھ رقم بچ جاتی۔ اگر وہ واقعی گلائیڈر اڑانے جا رہا تھا تو اسے پانی کی ضرورت بھی ہوتی جس کے لیے پیسوں کی بھی ضرورت تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح پونے سات بجے وہ مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ اس نے نیلے رنگ کی پتلون، سفید قمیص، ہیٹ اور دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنا سارا سامان ہوٹل میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ گلائیڈر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی۔ اس نے لیلا کے نام ایک خط چھوڑ دیا تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا اس کا سامان امانت کے طور پر رکھ لے۔ وہ بعد میں اس سے رابطہ کرے گا۔

آسمان بالکل صاف تھا اور دور دور تک بادل نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اپنا پلاسٹک بیگ زمین پر رکھا جس میں پانی کی چار بوتلیں اور دو سینڈوچ رکھے ہوئے تھے۔

چھ بج کر پچپن منٹ پر سیاہ مرسیڈیز اس کے قریب آ کر رکی۔ وہ جھکا اور پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ کار میں تین افراد سوار تھے جو سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں پال نہیں تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ تیس منٹ بعد وہ ایک لکڑی کے گیٹ سے گزرتے ہوئے ایک کچی سڑک پر آ گئے۔ دائیں جانب ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی لیکن پیٹرک کی توجہ اس گلائیڈر ٹریلر پر تھی جو تین سو گز آگے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سیاہ رنگ کی کار بھی نظر آ رہی تھی۔ جیسے ہی مرسیڈیز وہاں پہنچی تو کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے پال دیگر دو افراد کے ساتھ باہر آیا۔

دو گھنٹے بعد گلائیڈر پرواز کے لیے تیار تھا۔ یہ ایک سفید رنگ کا بڑا گلائیڈر تھا جس کے پروں کی لمبائی پچیس میٹر تھی۔ اس کے کاک پٹ میں دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ گلائیڈر پر نیلے رنگ سے اے ایس ایچ لکھا ہوا تھا لیکن اس کی دُم پر رجسٹریشن نمبر درج نہیں تھا۔ تھوڑا سا ذہن پر زور دینے کے بعد پیٹرک سمجھ گیا کہ اے ایس سے مراد الیگزینڈر شیلشر ہے جو کہ ایک جرمن کمپنی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اس کمپنی کا کوئی گلائیڈر نہیں اڑایا تھا۔

آخر کار پیٹرک نے گلائیڈر کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ سب چیزیں درست حالت میں تھیں البتہ ریڈیو موجود نہیں تھا جبکہ پینل پر صرف وہ سوراخ نظر آ رہے تھے جہاں کبھی ریڈیو نصب کیا ہو گا۔ جب پیٹرک اپنے کام سے فارغ ہو گیا تو پال نے کہا۔

''میں ایک بار پھر اس تبادلے کی تفصیل دہرا دیتا ہوں۔ ہم نے گلائیڈر کی سمت کا تعین کر دیا ہے، تم سیدھے ٹیکساس جاؤ گے۔ وہاں اس کا سامان اتار کر متعلقہ لوگوں کے حوالے کرو گے اور تمہاری چیزیں تمہیں واپس مل جائیں گی اور یہ گلائیڈر بھی تمہارا ہو جائے گا۔ تم جہاں چاہو اسے لے جا سکتے ہو۔''

''کیا مجھے اس گلائیڈر کے کاغذات بھی مل سکیں گے جن سے ظاہر ہو کہ یہ میری ملکیت ہے؟''

پال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دوسرے کاغذات کے ساتھ یہ کاغذ بھی تمہیں مل جائے گا۔''

پیٹرک نے کندھے اچکا دیے لیکن کچھ بولا نہیں۔

اس کے بعد پال نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ کار سے سامان نکالنے لگے۔ وہ دو عدد دو فٹ کے مکعب نما سفید ٹکڑے تھے جن پر چکنا کاغذ لپیٹ کر ڈوری باندھ دی گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے وہ سامان گلائیڈر کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ پیٹرک نے پال کو ایک مرتبہ دیکھا اور جھک کر اپنی سیٹ بیلٹ باندھنے لگا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے گیارہ بج رہے تھے اور اس کے خیال میں اڑان کے لیے یہ مناسب وقت تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا پھر اس نے دوسو میٹر لمبی نائیلون کی رسی کے بارے میں سوچا جو گلائیڈر کو کھینچنے کے لیے باندھی گئی تھی۔ پیٹرک کا خیال تھا کہ رسی کی جگہ کیبل استعمال کرنا چاہیے تھا مگر پال نے یہ کہہ کر اسے خاموش کردیا کہ اس میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

پال نے اپنا بازو فضا میں لہرایا اور اس کے ساتھ ہی پیٹرک نے کار کے انجن کے غرانے کی آواز سنی۔ اس کے پچھلے ٹائروں کی زوردار رگڑ سے ریت کا طوفان اٹھا۔ گلائیڈر کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ رن وے کے ساتھ دوڑنے لگا۔ پھر اس کا سامنے کا حصہ اوپر کی جانب اٹھا۔ اس نے اس وقت تک لیور کو پکڑے رکھا جب تک اسے ہوا کی رفتار میں کمی ہونے کا احساس نہ ہوگیا۔

پیٹرک نے پینل پر لگے ہوئے میٹر پر نظر ڈالی۔ گلائیڈر دو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا اور اب تک زمین سے ڈیڑھ سو میٹر بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ پیٹرک نے گلائیڈر کے پہیے اوپر کھینچے اور انہیں لاک کردیا۔ گلائیڈر کی رفتار تیز ہوگئی تھی اور اب وہ پانچ میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اوپر جارہا تھا۔ تاہم اب بھی بادل پندرہ سو میٹر اوپر تھے لیکن وہ بہت کم وقت میں وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

پیٹرک نے اگلے پانچ منٹوں میں کئی بار گلائیڈر کو اوپر لے جانے کا عمل دہرایا اور بادلوں کے درمیان پہنچ کر گلائیڈر کا رخ شمال کی جانب کردیا۔ پھر اس نے پانی کی بوتل اور سینڈوچ نکالے اور سکون سے اپنی منزل کی جانب بڑھتا گیا۔ پینل پر لگی ہوئی اسکرین سے اسے معلوم ہوگیا کہ وہ امریکا کی سرحد میں داخل ہوچکا ہے لیکن تین ہزار میٹر کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے وہ کسی ریڈار کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا۔ تاہم وہ چوکنا تھا اور اس کی نظریں گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے حیرت تھی کہ بارڈر عبور کرتے وقت کسی نے اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟

عین اسی وقت اس نے ایک بلیک ہاک طیارے کی آواز سنی۔ اس کے انجن کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ پیٹرک نے اسکرین پر دیکھا۔ ابھی وہ اس سے ایک ہزار میٹر نیچے تھا اور تیزی سے اوپر کی جانب آرہا تھا۔ اس سے دوسو میٹر کی بلندی پر بادلوں کے غول فضا میں تیر رہے تھے۔ اس نے گلائیڈر کا رخ بائیں جانب کیا اور تیزی سے اوپر جانے لگا۔ اب اس کے پاس یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا۔ پال نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ شاید اسے بادلوں کے درمیان اڑنا پڑے۔

اس نے آخری بار بلیک ہاک کو دیکھا جو اب صرف پانچ سو میٹر نیچے رہ گیا تھا۔ اس کی پوری توجہ افق کی جانب تھی۔ تین سیکنڈ بعد اس نے گلائیڈر کا رخ سیدھا کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے بادلوں میں تلاش نہیں کرسکیں گے۔ اب اسے بادلوں میں اتنی دیر ٹھہرنا تھا جب تک وہ اس کی تلاش ترک نہیں کردیتے۔ وہ جلد از جلد بادلوں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ تیز ہوا، بارش یا برف باری سے گلائیڈر کے پروں کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پھر اسے آکسیجن کا خیال آیا۔ اس نے ماسک منہ پر لگا کر والو کھولا اور اپنی ناک میں گیس کی بو محسوس کرکے مطمئن ہوگیا۔

ہوا کے تیز جھونکوں کی وجہ سے وہ ساڑھے چھ ہزار میٹر کی بلندی سے گر کر چار ہزار میٹر پر آگیا۔ گلائیڈر کے پر ایک دائرے کی شکل اختیار کرچکے تھے لیکن وہ گلائیڈر کو دائیں بائیں گھماتا آگے بڑھتا گیا۔ گھڑی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اسے بادلوں کے درمیان پرواز کرتے ہوئے نصف گھنٹا گزر چکا تھا۔ اس نے اسکرین پر نظر دوڑائی۔ وہ بالکل صاف تھی۔ چنانچہ اس نے بادلوں سے باہر آنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے گلائیڈر کا رخ ایک بار پھر شمال کی جانب کیا پھر آہستہ آہستہ بادلوں سے نکل کر نیلے آسمان پر آگیا۔

اس نے ایک بار پھر بلیک ہاک کو دیکھنے اور اس کے انجن کی آواز سننے کی کوشش کی لیکن فضا میں بالکل خاموشی تھی۔ ایک گھنٹے بعد اسے اسکرین پر کچھ دھبے نظر آنے لگے۔ وہ منزلِ مقصود سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پیٹرک کی نظریں صحرا کو تلاش کررہی تھیں جہاں وہ اپنا گلائیڈر اتار سکے۔ لیکن وہ اس وقت تک گلائیڈر نیچے نہیں اتار سکتا تھا جب تک اسے وہاں کوئی گاڑی نظر نہ آجاتی۔

پینل پر لگے ہوئے آلے سے معلوم ہوا کہ مغرب کی جانب سے پچیس کلومیٹر کی رفتار سے ہوا چل رہی ہے لیکن اسے زمین پر کہیں ریت اڑتی ہوئی نظر نہیں آئی، نہ ہی وہاں کوئی عمارت تھی اور نہ گلائیڈر کے اترنے کے لیے رن وے نما پٹی۔ پھر اچانک ہی اسے ریت اڑتی ہوئی نظر آئی۔ اس کی نظر ایک خستہ حال سڑک پر گئی۔ پھر اس نے وہاں اس پٹی کو بھی دیکھا جہاں گلائیڈر اتارا جاسکتا تھا۔

پیٹرک نے گلائیڈر کے پہیے کھول دیے اور گلائیڈر کو نیچے اتارنا شروع کردیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک پک اپ اس جگہ آکر رک گئی تھی جہاں گلائیڈر کو اترنا تھا۔ اس کا دروازہ کھلا

اور اس میں سے لوگ اترنا شروع ہوگئے۔ وہ اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کی توجہ لینڈنگ پر تھی۔

گلائیڈر کے پہیے زمین سے ٹکرائے اور وہ کچھ دور پھسلنے کے بعد رک گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔ اس نے اپنی ٹانگیں باہر نکالیں اور کھڑا ہوگیا۔ اس کی داہنی پنڈلی میں بہت زیادہ اینٹھن ہورہی تھی۔ ایک ٹرک اس کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے شیشے سیاہ رنگ کے تھے۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر آکر رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ٹرک کے اگلے حصے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے دو سانولی رنگت کے لوگ باہر آئے۔ انہوں نے جینز، شرٹ اور بیس بال کیپ پہن رکھی تھیں۔

''بیونس ٹریڈز۔'' سرخ ٹوپی والے نے ہسپانوی لہجے میں کوڈ ورڈ ادا کیا جبکہ سیاہ ٹوپی والا اس کے پیچھے کھڑا رہا۔

''بیونس ٹریڈز۔'' پیٹرک نے بھی کوڈ ورڈ دہرایا۔

''تمہاری پرواز کیسی رہی؟'' سرخ ٹوپی والے نے پوچھا۔

''بہت عمدہ۔'' اس نے بلیک ہاک والا واقعہ سنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب وہ جلد از جلد یہاں سے فارغ ہونا چاہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم دروازہ کھولو۔ ہم سامان نکالتے ہیں پھر تم سے بات ہوگی۔''

پیٹرک نے کاک پٹ کا عقبی دروازہ کھول دیا اور خود ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ سرخ ٹوپی والے نے اندر جھانک کر دیکھا۔ ایک مکعب نما باکس نکالا اور سیاہ ٹوپی والے کو پکڑا دیا۔ دوسرا باکس اس نے خود اٹھا لیا پھر وہ دونوں ٹرک کے عقبی حصے میں گئے اور وہ سامان وہاں رکھ دیا۔ پیٹرک کو شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔ گلائیڈر میں ایک بوتل باقی رہ گئی تھی لیکن وہ معاملات نمٹائے بغیر گلائیڈر میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا۔ اس کے چہرے سے تھکاوٹ عیاں تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ گویا وہ ساڑھے چھ گھنٹے تک فضا میں رہا اور اس نے تقریباً آٹھ سو پینتیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ گویا اس کی اوسط رفتار ایک سو تیس کلومیٹر فی گھنٹا تھی۔ اس کے حساب سے یہ رفتار بری نہیں تھی جبکہ اسے کچھ دیر بادلوں میں بھی رہنا پڑا تھا۔

اس کی توجہ ایک بار پھر ٹرک کی جانب مبذول ہوگئی۔ وہاں نہ جانے کیا ہورہا تھا۔ وہاں زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لڑکا باہر آیا۔ اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے تنگ سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے پیٹرک کی طرف دیکھا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر کش لینے لگا پھر کیبن کے عقبی حصے سے ایک اور شخص برآمد ہوا اور ٹرک کے پچھلے حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے بھی سیاہ پتلون اور سفید قمیص پہن رکھی تھی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ پال جیسا لگ رہا تھا لیکن اسے تو وہ سان میگوئیل میں چھوڑ کر آیا تھا۔ بہرحال، وہ کسی عام پرواز کے ذریعے یہاں پہنچ سکتا تھا۔

ان تینوں کے درمیان بحث جاری تھی پھر یوں لگا جیسے وہ کسی بات پر متفق ہوگئے ہوں۔ انہوں نے پیٹرک کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ سفید قمیص والا ان سے ایک قدم پیچھے تھا اور اس نے ایک بھاری بریف کیس اٹھا رکھا تھا جبکہ باقی دونوں کے ہاتھ میں ہتھیار تھے۔ سرخ ٹوپی والے کی کمر میں پستول بندھا ہوا تھا جبکہ سیاہ ٹوپی والے کے دائیں ہاتھ میں ایک آٹومیٹک ریوالور تھا۔ پیٹرک کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پال نے تو کہا تھا کہ تبادلہ بالکل شفاف ہوگا لیکن منشیات کے اسمگلر کی بات کا کیا بھروسا۔۔۔ یہ سوچ کر اس کے دل کی دھڑکن مزید تیز ہوگئی۔

وہ تینوں اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اب ان کے درمیان تیس فٹ سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ دونوں مسلح افراد اچانک رک گئے لیکن سفید قمیص والا آگے بڑھتا رہا۔ اس نے بریف کیس بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں منتقل کرلیا تھا اور سیاہ چشمے کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھیں پیٹرک کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ قریب آکر اس نے بھی وہی مخصوص کوڈ ورڈ دہرایا۔

''بیونس ٹریڈز۔''

پیٹرک یہ آواز سن کر چونک گیا۔ وہ بلاشبہ پلینو ہی تھی اور اس سے پانچ فٹ کے فاصلے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر پیٹرک قدرے پُرسکون ہوگیا۔ کم از کم اب اسے اپنی جان کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

''پلینو!'' وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہاں تمہاری موجودگی کی توقع نہیں تھی۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم نے ایسا سوچا بھی نہ ہوگا۔'' وہ بولی۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''تمہیں ہم پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' وہ بولی۔ ''پال نے کہا تھا کہ یہ تبادلہ شفاف ہوگا۔۔۔ خواہ ہمارے دوسرے ساتھی اس سے متفق ہوں یا نہیں۔''

''پال؟'' پیٹرک ایک بار پھر حیرت زدہ ہوگیا۔ ''تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے کیسے جانتی ہو؟"

"وہ میرا بھائی ہے۔" پلینو سپاٹ لہجے میں بولی۔

اس نے سرہلا دیا۔ اب اس کی حیرت دور ہو چکی تھی۔

"تمہارا سارا سامان اس میں موجود ہے۔" وہ بریف کیس اٹھاتے ہوئے بولی۔ "نقدی، کارڈز، کمپنی کے کاغذات اور پاسپورٹ وغیرہ۔"

"اور گلائیڈر کے کاغذات؟" پیٹرک نے پوچھا۔

"اس کی ملکیت بھی تمہارے نام کر دی گئی ہے۔ پال کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔"

پیٹرک نے مطمئن انداز میں ایک بار پھر اپنا سر ہلا دیا۔

"اس کے علاوہ بھی بریف کیس میں کچھ اور چیزیں ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بریف کیس میں سے ایک الیکٹرانک پیڈ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ "اس آلے میں امریکا سے متعلق تمام تفصیلات موجود ہیں۔ اس کی مدد سے تم ہر اس جگہ جا سکتے ہو جہاں ہم جانا چاہیں۔"

"ہم۔۔۔؟" وہ بری طرح چونک گیا۔

پلینو مسکرائی اور بولی۔ "ہاں تم اور میں۔" پھر اس نے بریف کیس کھول کر ایک کاغذ نکالا اور اسے پڑھتے ہوئے بولی۔ "ڈیوڈ ایلن پیٹرک اور پلینو مارگریٹ کی شادی انتیس جولائی انیس سو دس کو انجام پائی۔" اس کاغذ پر پیٹرک کے دستخط بھی تھے۔ وہ حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"دو دن پہلے ہماری شادی ہو چکی ہے۔ یہ ایک قانونی دستاویز ہے جس پر تمہارے دستخط موجود ہیں۔ یہ دستاویز تمہارے سفارت خانے میں جمع کرائی جا چکی ہے۔ لہٰذا اب تم جہاں بھی جاؤ گے، میں تمہاری بیوی کی حیثیت سے ساتھ چلوں گی۔ لہٰذا اب ہمیں چلنا چاہیے۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"ایک منٹ۔" پیٹرک ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے؟"

"میں بتا چکی ہوں کہ پال میرا بھائی ہے، بڑا بھائی اور وہی میری دیکھ بھال کرتا ہے۔ اسے میری شادی کی بڑی فکر تھی اور وہ چاہتا تھا کہ میں جلد از جلد سان میگوئیل سے چلی جاؤں۔ وہاں میرا رہنا ٹھیک نہیں تھا۔"

"لہٰذا تم دونوں نے مل کر مجھے پھانس لیا؟" وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"شاید اسے تمہاری ہی ضرورت تھی۔ اب تک میں اس کا سامان لے کر امریکا کی سرحد عبور کیا کرتی تھی۔ تم جانتے ہو کہ اس میں کتنے بکھیڑے ہیں۔ پاسپورٹ، ویزا اور سب سے بڑھ کر پکڑے جانے کا خطرہ۔ لیکن اب۔۔۔" اس نے شادی کا سرٹیفکیٹ فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "تم سامان سمیت سرحد عبور کر سکتے ہو کیونکہ تمہیں گلائیڈر اڑانے میں مہارت حاصل ہے۔ آؤ، میں تمہیں فلپ سے ملواؤں۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹرک کی جانب اشارہ کیا۔ "فلپ بہت ہی وفادار بندہ ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ یہ سامان لے جائے گا اور تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

"یوں کہنا چاہیے کہ تم مجھے لے جاؤ گی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"ایک ہی بات ہے۔ میرے خیال میں یہ کوئی برا سودا نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بریف کیس کھول کر اس میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ وہ سو سو ڈالر کے نوٹ تھے۔ "یہ مجھے جہیز میں ملے ہیں۔ پال کو میرا کتنا خیال ہے۔"

پیٹرک نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"سورج غروب ہونے والا ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ بولی۔

پیٹرک نے گھڑی پر نظر ڈالی، پانچ بج کر چھپّن منٹ ہوئے تھے۔ گویا پچپن منٹ میں سب کچھ ہو گیا۔ اس نے آلے کا بٹن دبایا اور ائرپورٹ کی فہرست پر نظر ڈالی۔ دوسرے نمبر پر ہی کووا کا ائرپورٹ تھا۔ وہ اس کے بارے میں جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہاں گلائیڈر اتارنے اور اڑانے کی سہولت موجود تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں اس کا جاننے والا ایک مقامی پائلٹ رینالڈ بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے وہاں پہنچ کر کچھ انتظامات کرنے تھے اور اس کے لیے اس کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس نے ایک اور بٹن دبایا۔ اسکرین پر پورا روٹ نمایاں ہو گیا۔ اس کے مطابق وہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔

"کیا تمہارا دوست اپنے ٹرک سے گلائیڈر کو کھینچ سکے گا؟" اس نے پلینو سے پوچھا۔

پلینو نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر اس نے بریف کیس کھول کر ایک بنڈل نکالا۔ یہ بالکل ویسی ہی رسی تھی جس سے صبح اس کے گلائیڈر کو کھینچا گیا تھا۔ دو سو میٹر لمبی نائیلون کی رسی۔ پیٹرک نے ایک سرد آہ بھری۔ اب یہی اس کا مقدر تھا۔ پلینو نے فلپ کو ٹرک لانے کا اشارہ کیا۔ پیٹرک نے ساری زندگی اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ انتہائی ضبط کے باوجود وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"واقعی پال ہر بات کا خیال رکھتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کاک پٹ کی طرف بڑھ گیا۔ فلپ کا ٹرک لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا۔

●●●

قانون اور قانون شکن افراد کے مابین

طے پانے والے انوکھے سودے کا احوال

بعض جگہوں پر قانون کی پاسداری اور جرم کی بیخ کنی کے لیے خون سے آبیاری کرنی پڑتی ہے ... اور غیر معمولی صورتِ حال میں ایسے قدم اٹھانے پڑتے ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ...ان گلی کوچوں کی کہانی جہاں جرم کی جڑیں پروان چڑھ رہی تھیں...

سودا

بابر نعیم

لیونارڈ اسمتھ اپنے بے داغ ریکارڈ اور شان دار کارکردگی کی بدولت بہت جلد حکامِ بالا کی نظروں میں آجاتا تھا اور اکثر اسے ایسی مہم پر بھیج دیا جاتا جس کا نام سنتے ہی دوسرے اہل کار کانوں کو ہاتھ لگا لیتے تھے اور حکامِ بالا بھی اسے ایسی مہمات کے لیے موزوں سمجھتے۔ اس بار بھی قرعہ فال اسمتھ کے نام ہی نکلا۔ کہنے کو تو وہ کانسٹیبل تھا لیکن اپنی مثالی کارکردگی کی بدولت اسے ڈپارٹمنٹ میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اسے وہ تمام سہولتیں مہیا کی جاتیں جو اس مہم کے لیے ضروری ہوتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ آہستہ آہستہ اپنی لینڈ کروزر چلاتا ہوا ہیڈ ومن کمیونٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک بوسیدہ سے اسکول کے سامنے اپنی گاڑی روکی اور نیچے اتر کر قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی نظر اینٹوں سے بنی ہوئی دو عمارتوں پر گئی۔ ان میں سے ایک پر آسمانی اور دوسری پر زرد رنگ کیا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ عمارتیں ایک دوسرے کو چیلنج کر رہی ہوں۔ اس نے ایک عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر بورڈ کو پڑھا۔ یہ ایک کمیونٹی اسٹور تھا جہاں سبزیاں، کریانے کا سامان، برف اور مشروبات ملتے تھے۔ بورڈ پر دکان کھلنے کے اوقات یعنی نو سے پانچ بھی درج تھے۔ دو آدمی ننگے پاؤں ٹانگیں پھیلائے اسٹور کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اسمتھ کو گاڑی سے اترتے اور اپنی جانب آتے دیکھا تو لاتعلقی کے انداز میں مکھیاں اڑانے لگے۔

"گڈ ڈے۔" اسمتھ نے قریب آ کر کہا۔

ان میں سے ایک نے سر ہلا دیا اور دوسرے نے اس طرح گھورا جیسے اسے اسمتھ کی آمد ناگوار گزری ہو۔ اسمتھ نے اس کے رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ڈینس وینٹوری کہاں ملے گا؟"

"معلوم نہیں، میں نے آج اسے نہیں دیکھا۔" اسی شخص نے جواب دیا جس نے اسے دیکھ کر سر ہلایا تھا۔

اسمتھ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے سے اسے جنریٹر کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھوٹے چھوٹے مکان بے ترتیب انداز میں بنے ہوئے تھے۔ ان کے برآمدے پر ٹین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں جو سورج کی گرمی اور دھوپ سے بچنے کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ اسمتھ کو اس دور افتادہ علاقے میں آنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ایک ہفتہ قبل پڑوس میں واقع نیلڈ وکمیونٹی کے وارڈن جونی بیکر نے ونڈہم پولیس اسٹیشن کو فون کر کے ہیڈ ومن میں رہنے والے ایک شخص کی موت کی اطلاع دی جسے سنتے ہی کانسٹیبل ہیرس ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اس دور افتادہ مقام تک پہنچا۔ متوفی کی لاش ایک درخت کی شاخ سے لٹکی ہوئی تھی اور کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کانسٹیبل ہیرس نے وارڈن بیکر اور علاقے کی ایک بڑی شخصیت ڈینس وینٹوری کی مدد سے لاش کو شناخت کیا اور مرنے والے کی ماں کو اطلاع کر دی۔ لاش کو اسپتال لے جایا گیا جہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابتدائی معائنے کے بعد اسے تفصیلی پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ موصول ہوگئی اور ونڈہم پولیس نے اس کی روشنی میں موت کی تحقیقات شروع کر دیں۔ طبی افسر نے اس کی بنیاد پر جو نتائج اخذ کیے، ان کی روشنی میں ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈ کوارٹر کے سینئر سارجنٹ نے معاملے کی تفصیلی چھان بین کی ذمے داری اسمتھ کو سونپتے ہوئے کہا۔

''گو کہ ہمیں جائے واردات سے کافی ثبوت نہیں ملے اور نہ ہی علاقے کا کوئی شخص گواہی دینے کے لیے آیا تاہم پیتھالوجسٹ کا خیال ہے کہ جس وقت لاش دریافت ہوئی، لینل ٹیلر کو مرے ہوئے چوبیس سے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ طبی افسر نے اسے خودکشی قرار دیا ہے۔''

اسمتھ کے لیے یہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ جب لڑکے کی لاش درخت کی شاخ سے لٹکی ہوئی پائی گئی تو اسے خودکشی ہی کہا جائے گا۔ وہ سارجنٹ کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔

''اس علاقے میں حال ہی میں ہونے والی یہ تیسری موت ہے۔ اس سے پہلے دو لڑکیاں بھی موت کو گلے لگا چکی ہیں۔ ان میں سے ایک چار مہینے پہلے ڈوب کر مر گئی تھی جبکہ دوسری نے اپنے آپ کو چاقو مار کر ہلاک کر لیا اور اس کے پندرہ دن بعد یہ واقعہ پیش آ گیا۔ بظاہر یہ خودکشی کے واقعات ہیں اس لیے ان کی تحقیقات کے لیے پرتھ سے کوئی سراغ رساں نہیں آئے گا لیکن ڈسٹرکٹ کرائم منیجر کی خواہش ہے کہ ہم اس معاملے کو دیکھیں۔ میں نے اس سلسلے میں تمہارا انتخاب کیا ہے۔ یہ رہی فائل۔ اسے اچھی طرح پڑھ لو اور خود جا کر حالات کا جائزہ لو تاکہ ہم اس منحوس صورت کرائم منیجر کو مطمئن کر سکیں۔ جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔ یہاں ویسے ہی آدمیوں کی بہت کمی ہے۔''

ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد اسمتھ اس علاقے میں پہنچا اور اب ان دو آدمیوں کے سامنے کھڑا ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ پتھر کی مورتیوں کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت تھے۔ اسمتھ نے دوسرا سوال کیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ ڈینس کہاں رہتا ہے؟''

اس بار بھی دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ البتہ جس شخص نے پہلے سر ہلایا تھا، اسی نے عمارت کے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔

''شکریہ دوست۔'' اسمتھ نے جالی لگے ہوئے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے کہا اور اسٹور میں داخل ہو گیا۔

وہ ایک طویل سرنگ تھی جس کی دونوں دیواروں پر بنے ہوئے خانوں میں مختلف قسم کے جار، ڈبّے، پلاسٹک کی بوتلیں اور تھیلے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ خانوں میں ریڈی میڈ شرٹس، پتلونیں، چاقو چھریاں اور گھر میں استعمال ہونے والے مختلف اوزار بھی موجود تھے۔ آخری سرے پر شیشے کے شوکیس میں گوشت، دودھ کے ڈبّے اور سوڈے کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ کولڈ اسٹوریج کا زیادہ حصہ بیئر کے ڈبّوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسی شیلف کے برابر میں کیش کاؤنٹر تھا جہاں ایک عورت بیٹھی اسمتھ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

اسمتھ نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''گڈ ڈے! میں ڈینس ویٹوری سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ یہاں نہیں ہے۔'' عورت نے رکھائی سے جواب دیا۔

''باہر بیٹھے ہوئے لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ یہیں رہتا ہے۔''

اس عورت نے نظریں گھمائیں اور بولی۔ ''وہ منیجر کے کوارٹر میں رہتا ہے۔ اس عمارت کے برابر میں ہی ہے۔''

اسمتھ اس عورت کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ وہ نیلے رنگ کا مکان اسٹور کے عقب میں واقع تھا۔ اس مکان میں برآمدے کے بجائے دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا پورچ بنا ہوا تھا۔ اسمتھ کی دستک کے جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا، اس کے سر اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس کی سفید قمیص کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں اور خاکی پتلون کے پائنچے بھی مڑے ہوئے تھے۔ اس نے اسمتھ کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''ہاں، میں ہی ڈینس ویٹوری ہوں۔''

اسمتھ نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔ ''وارڈن بیکر کو لڑکے کی لاش کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''کسی شخص نے اس کی لاش درخت سے لٹکی ہوئی دیکھی۔ وہ دوڑتا ہوا ایلڈو گیا اور بیکر کو بتایا۔''

''اسے کس طرح معلوم ہوا کہ مرنے والے کا تعلق تمہارے علاقے سے ہے؟''

ڈینس اس کی ناقص معلومات پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔ ''اس لیے کہ اس علاقے میں ہم لوگ ہی آبادکار ہیں۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس پر حملہ کیوں کیا گیا؟''

''کس نے کہا کہ اس پر حملہ کیا گیا تھا؟''

''اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اور انگلی کی پشت کے جوڑوں

پر بھی زخم ہیں۔'' اسمتھ نے ڈینس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے کہ اسے لڑائی میں ہارنے پر شرمندگی ہوئی ہو اور اس نے خود ہی اپنے آپ کو یہ سزا دی ہو۔ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، میں یہاں موجود نہیں تھا لہٰذا اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''لیکن اس وقت تم یہیں تھے جب اس کی لاش دریافت ہوئی؟''

''ہاں، میں اسی روز کنونورا سے واپس آیا تھا اور میں ہی بیکر اور کانسٹیبل ہیرس کے ساتھ اس کی لاش کو نیچے اتارنے گیا تھا۔''

اسمتھ نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''حال ہی میں تمہارے علاقے میں اس نوعیت کے کچھ اور واقعات بھی ہوئے ہیں؟''

ڈینس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسمتھ نے نام لیے بغیر کہا۔ ''کیا تم ان لڑکیوں کو جانتے ہو؟''

''یہاں بمشکل پچاس افراد رہتے ہیں۔ اس لیے سب ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''کیا ان میں سے بھی کسی پر حملہ ہوا تھا؟'' اسمتھ..... نے پوچھا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم ونڈہم پولیس سے معلوم کر سکتے ہو۔''

''تمہارے خیال میں ان لوگوں کی خودکشی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''

''سرکاری اہل کاروں کا کہنا ہے کہ ایسا ہونا معمول کی بات ہے۔ بعض اوقات نوجوان ایک دوسرے کی نقل میں بھی ایسا کرتے ہیں اور اس کے پیچھے کوئی وجہ نہیں ہوتی۔'' ڈینس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ واقعی افسوسناک بات ہے۔ انسانی جان کے ضائع ہونے پر ہر کسی کو دکھ ہوتا ہے۔''

اسمتھ نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''کیا تم جارجینا ٹیلر کے مکان کا پتا بتا سکتے ہو؟''

''اس سے مل کر کیا کرو گے؟''

''مرنے والا اس کا بیٹا تھا۔ میرا اس سے ملنا ضروری ہے۔''

''اس طرف چوتھا مکان ہے۔'' ڈینس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس وقت وہ ویکر اسٹور میں ہوگی۔''

اس کا اشارہ زرد بلڈنگ کی جانب تھا پھر وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔

”کیوں؟“

”میں کمیونٹی کونسل چلاتا ہوں۔“

”اور کونسل باقی سب چیزیں چلاتی ہے۔“ اسمتھ نے دل میں کہا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے زرد رنگ کی عمارت کی جانب چل پڑا جو وہاں سے سو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ اس کے برآمدے میں ایک لوہے کی میز لکڑی کی بینچ اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ویمن کوآپریٹو اسٹور کے عنقریب افتتاح کی خوش خبری درج تھی۔ اندر سے آری چلنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک کارپینٹر لکڑی کا کام کر رہا تھا۔

اسمتھ نے اس کے قریب جا کر وش کیا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اسمتھ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کارپینٹر سے کہا۔ ”ڈینس ویٹوری نے بتایا تھا کہ مسز ٹیلر یہاں مل سکیں گی۔“

کارپینٹر نے کہا۔ ”وہ صبح یہاں آئی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی چلی گئی۔ اس کے بعد دوبارہ واپس نہیں آئی۔“

”کیا وہ یہاں کام کرتی ہے؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

”وہ کوآپریٹو منیجرز میں سے ایک ہے۔ سچ پوچھو تو ویمن اسٹور کا آئیڈیا بھی اسی کا تھا۔“

اسمتھ نے اسٹور کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”کیا اتنی چھوٹی جگہ میں دو اسٹورز کی گنجائش ہے؟“

”جار جینا اور کچھ دوسری عورتوں کا یہی خیال ہے۔ وہ یہاں ایسی چیزیں رکھیں گی جو کمیونٹی اسٹور میں دستیاب نہیں مثلاً تازہ سبزیاں، پھل اور اسی طرح کی صحت بخش اشیا۔“

”کپڑے اور ہارڈ ویئر کا سامان بھی ہوگا؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

”نہیں، یہاں کے لوگ ان کا زیادہ استعمال نہیں کرتے۔ اس کے لیے کمیونٹی اسٹور ہی کافی ہے۔ یہاں پانی ملی ہوئی شراب بھی نہیں ملے گی۔“

”اس کوآپریٹو اسٹور میں پیسا کون لگا رہا ہے؟“

”ان لوگوں نے ایک سرکاری تنظیم سے قرض لیا ہے جو چھوٹے کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔“

”تمہیں اس عورت کے بیٹے کی موت کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

کارپینٹر نے اپنی آنکھیں پھیر لیں اور بولا۔ ”میرا تعلق نیلڈ وسے ہے۔ میں یہاں نہیں رہتا۔“

”تم اس لڑکے کے دوستوں رسل ولیم اور ایلی لاک کو جانتے ہو؟“

کارپینٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، ...... اکثر یہاں آتے رہتے ہیں اور اپنی ماؤں سے مختلف فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ مجھے کہاں مل سکتے ہیں؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

”آبادی سے باہر۔ ممکن ہے کہ وہ مچھلیاں پکڑ رہے ہوں۔“

”کیا وہ اسکول نہیں جاتے؟“ اسمتھ نے حیرانی سے پوچھا۔

”ان کے اسکول جانے کی عمر نکل گئی ہے۔“ کارپینٹر نے تلخی سے کہا۔

اسمتھ جانتا تھا کہ ان پسماندہ بستیوں میں لڑکوں کو چھٹی جماعت سے آگے نہیں پڑھایا جاتا اور وہ چھوٹے موٹے کام کر کے پیسے کمانے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ اس نے کارپینٹر سے کہا۔ ”کیا تم مجھے مسز ٹیلر کے گھر کا پتا بتا سکتے ہو؟“ کارپینٹر نے اسے مطلوبہ پتا بتا دیا۔

اسمتھ کے دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک بھاری بھرکم عورت باہر آئی۔ اسمتھ نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔ ”کیا تم ہی مسز ٹیلر ہو؟“

اس عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسمتھ بولا۔ ”میں اسمتھ ..... ہوں اور مجھے تمہارے بیٹے کی موت کی تحقیقات کے لیے بھیجا گیا ہے۔“

اس عورت نے اپنے سر پر رکھی ٹوپی سیدھی کی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے والے کمرے میں ایک کاؤچ اور دو عدد لکڑی کی کرسیاں رکھی تھیں اور کمرے کی فضا میں سوگواری کا تاثر نمایاں تھا۔ اس عورت نے آہستہ سے پوچھا۔ ”اس کی لاش کب آئے گی؟“

”میرا خیال ہے کہ اگلے دو دنوں میں اسے پرتھ سے بھیج دیا جائے گا۔“

وہ عورت بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ اس کی لاش جلد از جلد مل جائے تاکہ میں اس کی تدفین کر سکوں۔“ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اسمتھ بولا۔ ”مجھے جیسے ہی اس بارے میں کوئی اطلاع ملی، میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“ اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولا۔

”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا؟“

عورت کے چہرے پر سختی کے آثار نمودار ہوئے اور

وہ بولی۔ ”نہیں۔“

”مرنے سے پہلے اس کی کسی سے لڑائی ہوئی تھی؟ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون تھا؟“

”لڑائی؟“ اس عورت نے چونکتے ہوئے کہا۔

”میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کا کس کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا؟ رسل ولیم یا ایلی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اس کی ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی؟“

”وہ دونوں اس کے ساتھی تھے۔“

”کیا وہ کوئی نشہ کرتا تھا؟“

”اس نے کبھی شراب نہیں پی، کبھی نہیں۔“

”کیا ویمن اسٹور کھولنے کی وجہ یہ تھی کہ تم وہاں پانی ملی شراب نہیں بیچنا چاہتی تھیں؟“

”ہم نے لائسنس کے لیے درخواست دی تھی تاکہ کمیونٹی اسٹور کی سیل کو محدود کیا جائے لیکن مرد ایسا نہیں چاہتے۔“

اسمتھ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ عام طور پر کسی بھی طبقے میں مرد اور عورتوں کے درمیان اس بات پر اختلاف ہوتا ہے کہ مرد شراب پیتے ہیں اور عورتیں اس کی فروخت کو محدود کرنا چاہتی ہیں لیکن ایسا اس نے پہلی بار دیکھا تھا جہاں عورتیں، مردوں کے مقابلے پر ایک اسٹور کھول کر انہیں چیلنج کر رہی ہوں۔

”تم نے آخری بار اپنے بیٹے کو کب دیکھا تھا؟“

”اس روز صبح میں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ سو رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے ناشتا بنایا اور کام پر چلی گئی۔ دوپہر کے کھانے پر گھر آئی تو وہ جا چکا تھا۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہوگا؟“

اس نے کھلی کھڑکی کی طرف نگاہ کی اور بولی۔ ”یہیں کہیں گیا ہوگا۔“

اسمتھ نے اسے کریدنے کی ایک اور کوشش کی اور بولا۔ ”اسے کیا پریشانی تھی مسز ٹیلر؟“

اس بار اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لیے اور نفی میں سر ہلانے لگی۔

اس نے مسز ٹیلر کے ساتھ وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر ایلی لاک سے ملنے چل دیا۔ اسے ایلی کے ملنے کی امید نہیں تھی لیکن جب دروازہ کھولنے والی عورت ملی لاک نے بتایا کہ وہ گھر پر ہی ہے تو اسے بڑی حیرانی ہوئی۔

اس لڑکے کے چہرے پر کسی چوٹ یا ضرب کا نشان نہیں تھا لیکن وہ اسمتھ کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کافی گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا اور ہر سوال کے جواب میں یہی کہتا رہا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

اسمتھ کو تنگ آکر کہنا پڑا۔ ”ایلی! تم کس سے خوف زدہ ہو؟“

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کا اوپری ہونٹ ہل کر رہ گیا۔

”مرنے سے پہلے تمہارے دوست کی کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی.. کیا وہ رسل تھا؟“

”نہیں۔“

”تمہارے خیال میں اس نے خود ہی اپنے آپ کو مار ڈالا؟“

لڑکے نے پلکیں جھپکائیں اور اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہ چھت پر گئی۔ البتہ وہ اسمتھ سے نظریں چرا رہا تھا۔

مسز لاک بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اسے تنہا چھوڑ دو۔“

اسمتھ کو لگا جیسے یہ لوگ بھی کسی انجانے خوف کا شکار ہیں۔ اس عورت کا منہ سختی سے بند ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ اس لڑکے ایلی نے اضطراب کے عالم میں پہلے ایک پاؤں اوپر اٹھایا پھر دوسرا، جیسے اس کے قدموں تلے آگ لگی ہوئی ہو۔

”کم آن ایلی۔“ اسمتھ نے کہا۔ ”تم اپنے گھر میں کسی سے ڈر کر چھپے ہوئے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ اصل قصہ کیا ہے؟“ اس لڑکے نے اسمتھ کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

”وہ نہیں چاہتا تھا کہ کچھ باتیں باہر جائیں۔“

”ایلی!“ اس کی ماں زور سے چلائی۔

”اسے بولنے دو مسز لاک۔“ اسمتھ نے کہا۔ ”مجھے بتانے کے بعد یہ بہتر محسوس کرنے لگے گا۔ ٹھیک ہے ایلی! بولتے رہو، مجھے بتانے کے بعد تم اپنے آپ کو بے قصور سمجھ سکتے ہو۔“

اس کی ماں بولی۔ ”اگر ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تو وہ اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”ایلی! تمہیں کون نقصان پہنچائے گا؟“ اسمتھ نے پوچھا۔

وہ لڑکا کچھ نہیں بولا بس سر ہلا کر رہ گیا۔

”اس معاملے کا تعلق ویمن اسٹور سے لگتا ہے۔ کیا کوئی شخص اس کی ماں کو نقصان پہنچانا چاہ رہا تھا؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ لڑکا پیچھے ہٹتے ہوئے بڑبڑایا۔ ’’یہ مردوں کا کاروبار ہے۔‘‘

’’کوئی نہیں جان سکے گا کہ یہ سب باتیں مجھے کس نے بتائی ہیں۔‘‘ اسمتھ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

لیکن لڑکا ایک بار پھر سر ہلا کر خاموش ہوگیا، وہ ڈر رہا تھا کہ اس نے پہلے ہی بہت کچھ کہہ دیا ہے لیکن اسمتھ کے لیے اتنا کافی نہیں تھا۔ وہ مزید جاننے کا خواہش مند تھا لیکن وہ لڑکا ٹس سے مس نہیں ہوا۔ تب اسمتھ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ’’رسل ولیم کہاں رہتا ہے؟‘‘

’’وہاں۔‘‘ اس نے درختوں کے جھنڈ میں گھرے ہوئے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

رسل ولیم گھر پر نہیں تھا لیکن اس کی ماں اور بہن سے ملاقات ہوگئی۔ ماں تیس کے پیٹے میں تھی جبکہ بہن کی عمر دس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ خاموش خاموش سی لڑکی اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسمتھ کو دیکھ رہی تھی۔

’’یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کسی نے اس لڑکے پر حملہ کیا تھا؟‘‘ رسل کی ماں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

’’کیا تمہارے بیٹے نے اس بارے میں کچھ کہا تھا؟‘‘

’’نہیں، وہ لڑکا ٹیلر مر چکا ہے۔ ہم اس کے بارے میں بات نہیں کرتے۔‘‘

’’تمہارے علاقے میں قانون کا محافظ کون ہے جو بلند رتبہ رکھتا ہو؟‘‘ اسمتھ نے پوچھا۔

وہ عورت یہ سوال سن کر حیران ہوئی پھر بولی۔ ’’ڈینس ڈیوری۔‘‘

’’وہی جو کمیونٹی کونسل کا سربراہ ہے؟‘‘

اس عورت نے بڑے محتاط انداز میں سر ہلایا۔

’’اس کونسل میں کتنے لوگ شامل ہیں؟‘‘ اسمتھ نے پوچھا۔

’’سارے ہی مرد اس کونسل کے ممبر ہیں لیکن تین افراد اس کا انتظام چلاتے ہیں۔ ڈینس، لائم اور ڈیوڈ جانسن۔‘‘ اس عورت نے بتایا۔ ’’وہ تینوں آپس میں دوست بھی ہیں۔‘‘

’’کیا تم، جارجینا ٹیلر اور ملی لاک، اس ویمن اسٹور میں شامل ہو؟‘‘

’’ہاں، ہمارے علاوہ اور بھی کئی عورتیں اس میں شامل ہیں۔‘‘

’’کیا ڈینس ڈیوری نے کبھی تمہارے بیٹے کو اس اسٹور کی وجہ سے دھمکی دی تھی؟‘‘

اس عورت کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ بولی۔ ’’نہیں لیکن اس نے بتایا تھا کہ مجھے اس میں نقصان ہوسکتا ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’کیونکہ میں چاہتی تھی کہ ہمیں خاص کارڈ مل جائے جس کے ذریعے ہم اپنے اسٹور میں معیاری اشیا فروخت کر سکتے تھے۔‘‘

وہ اس سرکاری اسکیم کا تذکرہ کر رہی تھی جس کے تحت خاص کارڈ رکھنے والے ان نامزد کردہ اسٹوروں سے خوراک، کپڑے اور دیگر اشیائے ضرورت حاصل کر سکتے تھے۔ وہ لوگ جو پانی ملی شراب بیچنے کے خلاف تھے، وہ اس پروگرام کے حق میں ہوگئے تھے اور اس کی وجہ سے شراب پینے والوں کو پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔

’’کیا ڈینس نے اس مرنے والے لڑکے کو بھی دھمکی دی تھی؟‘‘

وہ عورت اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سنا۔‘‘ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی اور رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ’’ان کے درمیان تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ مرنے والا ڈینس کو پسند نہیں کرتا تھا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

مسز ولیم نے اپنی بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ’’میں نہیں جانتی۔‘‘

اسمتھ نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ’’مجھے یہاں کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے، اگر کوئی شخص مجھے کچھ بتانے پر آمادہ ہوجائے تو میں اس معمے کو حل کر سکتا ہوں ورنہ کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔‘‘

’’تم جارجینا ٹیلر کے پاس جاؤ۔ ممکن ہے کہ وہ تمہیں کچھ بتا سکے۔‘‘

’’میں نے اس سے پوچھا تھا لیکن کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔‘‘ اسمتھ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

مسز ولیم نے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ ’’میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے یہی کچھ تھا۔‘‘

☆☆☆

اسمتھ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اسے اپنے قریب ایک سرگوشی سنائی دی۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ’’کون ہے؟‘‘

’’سیلی۔‘‘ ایک دبلی پتلی لڑکی اندھیرے سے نکل کر

ملگجی روشنی میں آگئی۔ ’’سیلی ولیم۔‘‘

اسمتھ نے اس لڑکی کو پہچان لیا جو دورانِ گفتگو اپنی ماں کے ساتھ چپکی کھڑی تھی۔

’’بتاؤ سیلی! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟‘‘ اسمتھ نے پوچھا۔

’’تم نے ماں سے کہا تھا کہ تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ تمہارا یہی مطلب تھا نا؟‘‘

’’ہاں۔ میں نے یہی کہا تھا۔ یہ میرا کام ہے لیکن جب تک مجھے معلوم نہ ہو کہ کیا غلط ہو رہا ہے، اس وقت تک میں کچھ نہیں کر سکتا۔‘‘ پھر اس نے اپنے تھرماس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’چائے پیو گی؟‘‘

لڑکی تھوڑا سا ہچکچائی پھر بولی۔ ’’چینی ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

وہ اس کے ساتھ ہی ریت پر بیٹھ گئی۔ اسمتھ نے ایک کپ میں تھوڑی سی چائے انڈیلی اور اس میں چینی ملاتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے تمہیں کم چائے دی ہے کیونکہ یہ تمہارے دانتوں کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔‘‘

لڑکی نے سر ہلایا اور مزے سے گرم چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

اسمتھ بولا۔ ’’تم مجھے کچھ بتانا چاہ رہی تھیں سیلی!‘‘

’’تم میری ماں کو نقصان پہنچنے سے روک سکتے ہو؟‘‘

’’میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔‘‘

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ’’لیکن تم کوئی وعدہ نہیں کر سکتے؟‘‘

’’نہیں، میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہر وقت یہاں نہیں رہوں گا البتہ اپنی طرف سے پوری کوشش ضرور کروں گا۔‘‘

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ لڑکی بولی۔ ’’مرنے والا لڑکا......‘‘

اسمتھ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ’’تمہارے بھائی کا ساتھی تھا۔‘‘

’’اس نے رسل کو بتایا تھا کہ وہ پولیس والوں سے بات کرنے جا رہا ہے۔‘‘

’’یہ بات تمہیں رسل نے خود بتائی تھی؟‘‘

’’نہیں، میں نے ان دونوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔‘‘

اسمتھ آہستہ سے بولا۔ ’’یہ کب کی بات ہے؟‘‘

’’کچھ عرصے پہلے جب ایک لڑکی نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا۔ یہ ٹیلر کے مرنے سے دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔‘‘

’’اس نے بتایا تھا کہ وہ کیوں ایسا کرنا چاہتا ہے؟‘‘ اسمتھ نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ’’لیکن ..... ہر کوئی یہ بات جانتا ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘

وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ ’’یہی کہ ایک یا ایک سے زیادہ مرد لڑکیوں کے ساتھ بدفعلی کرتے ہیں۔ وہ انہیں دھوکے سے شراب پلا کر اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔‘‘

اسمتھ نے ایک طویل گہری سانس لی اور بولا۔ ’’وہ دو لڑکیاں جن کی موت واقع ہوئی تھی یا وہ لڑکا جس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی، کیا وہ سب اسی وجہ سے پاگل ہوگئے تھے؟‘‘

’’وہ لڑکا اس لڑکی کے لیے پاگل ہوگیا تھا جس نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔‘‘

’’یہ کون لوگ ہیں، تم انہیں جانتی ہو؟‘‘

اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ وہ معصومیت سے بولی۔ ’’تم ان سے کہہ دو گے کہ یہ سب باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں۔‘‘

’’تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جب سب لوگ اس بارے میں جانتے ہیں تو مجھے کسی سے بھی یہ باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ تم بتاؤ سیلی، وہ کون لوگ ہیں؟‘‘

اس لڑکی نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے جیسے کسی فیصلے پر پہنچنا چاہ رہی ہو پھر اسمتھ نے اس کے اندر ایک عورت کو بیدار ہوتے دیکھا۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

’’ان میں سے ایک ڈینس ڈیوری ہے جبکہ دوسرا لائم میک نارڈی، اس لڑکی کا چچا ہے جس نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا۔‘‘

’’ان میں سے کسی نے تمہیں تو پریشان نہیں کیا؟‘‘

’’نہیں۔ ماما نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ ان کے ساتھ کبھی تنہائی میں بات نہ کروں۔ اس کا کہنا ہے کہ بہتر ہوگا اگر میں پانی ملی ہوئی شراب نہ پیوں ورنہ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوسکتا ہے۔‘‘

’’تمہاری عمر کتنی ہے؟‘‘

’’دس، تقریباً دس سال۔‘‘ سیلی نے جواب دیا۔

’’اس لڑکی کی ماں کا نام کیا ہے جس نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا؟‘‘

’’ایوا جیننگ۔‘‘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے سب کچھ بتا دیا لیکن کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے درمیان کوئی بات ہوئی ہے، اب گھر جاؤ۔ میں تمہاری ماں کے لیے کچھ کرتا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

☆☆☆

صبح ہوتے ہی اسمتھ نے کانسٹیبل ہیرس کو فون کر کے جائے وقوعہ سے متعلق مزید تفصیلات جاننا چاہیں۔ وہ یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ کانسٹیبل ہیرس نے اپنی رپورٹ میں سب کچھ لکھ دیا ہے اور کوئی ایسی بات نہیں جو اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہو۔ ہیرس نے اسے بتایا کہ جائے وقوعہ پر کسی قسم کے نشانات نہیں دیکھے گئے۔ سوائے اس کے کہ مرنے والے کا جسم وہاں لٹکا ہوا تھا۔

''اس مقصد کے لیے رسّی استعمال کی گئی تھی یا کوئی تار یا کپڑے کا ٹکڑا؟''

وہ نائیلون سے بنی ہوئی رسّی تھی۔ ہم نے لاش کو اتارتے وقت رسّی کو اس طرح کاٹا کہ اس کی گرہ محفوظ رہے۔ یہ بھی ایک طرح کا ثبوت ہوتا ہے۔''

''کیا تمہیں کوئی ایسی بات یاد ہے جو ویٹوری نے کہی ہو؟'' اسمتھ ..... نے پوچھا۔

''اس نے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ مرنے والے کا نام لینل ٹیلر ہے اور وہ ہیڈومن کا رہنے والا تھا۔ وہ یہ بھی جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا اس کی ماں کو واقعے کی اطلاع دے دی جائے۔''

کانسٹیبل ہیرس سے بات کرنے کے بعد وہ ایوا جیننگ کے پاس گیا جس نے اپنی لڑکی کے بارے میں کوئی بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ نہیں جانتی کہ لائم میک نارڈی کہاں ہے اور یہ کہ وہ کسی گورے پولیس والے پر بھروسا نہیں کر سکتی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میری بیٹی مر چکی ہے۔ اسے قبر میں چین سے رہنے دو۔''

اسمتھ نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف تمہاری بیٹی ہی نہیں بلکہ جارجینا ٹیلر کا بیٹا بھی مرا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ چند روز میں کسی اور کی بیٹی بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ ہم مرنے والوں کو تو واپس نہیں لا سکتے لیکن مجرموں تک پہنچ کر ان واقعات کی روک تھام تو کر سکتے ہیں۔ تم جانتی تھیں کہ میک نارڈی کیا کر رہا تھا پھر تم نے کسی ادارے سے مدد کیوں نہیں لی؟''

''میں ایسے کسی ادارے کے بارے میں نہیں جانتی۔''

''وہ ایسے بچوں کی مدد کرتے ہیں جن کے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہو۔''

وہ طیش میں آتے ہوئے بولی۔ ''میں ایسے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ان بچوں کو لے جا کر گوروں کے یہاں ملازمت کرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں یا پھر اپنے کیمپوں میں محنت مشقت کرواتے ہیں۔''

''نہیں، تمہارا خیال غلط ہے۔ وہ اس طرح کی مشکلات پر قابو پانے میں بچوں اور ان کے گھر والوں کی مدد کرتے ہیں۔ خاندانوں کو جوڑتے ہیں۔''

''سب بکواس ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں اپنے شوہر کے بھائی کو مرنے کے لیے بھیج دوں۔ کیا اس طرح خاندانوں کو جوڑا جاتا ہے؟''

اسمتھ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ''اگر میک نارڈی یونہی مکر و فریب سے کام لیتا رہا تو مزید بچوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کیا تم ایسا چاہتی ہو؟''

''اگر ہم پانی ملی ہوئی شراب کی فروخت روک دیں تو اس کا فریب بھی ختم ہو جائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ جگہ ہی چھوڑ دو۔''

☆☆☆

اسمتھ نے اس کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے جنگل کی راہ لی اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لینل ٹیلر نے پولیس کو بتانے کی دھمکی دینے کے بعد اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ شاید وہ سمجھتا تھا کہ میک نارڈی کے گھر والے پیسے دے کر اسے جیل سے رہا کروا لیں گے اور اس طرح انصاف ملنے کا امکان کم ہو جائے گا۔ لیکن اس کے لیے وہ کوئی اور راستہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ کافی دیر تک سر کھپانے کے باوجود وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ راستہ کیا ہو سکتا ہے۔

دوپہر کے قریب اس نے ایک بار پھر ڈینس ویٹوری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ''تم ابھی تک یہیں ہو؟ بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''میں لائم میک نارڈی کو تلاش کر رہا ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟''

''تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''قتل... مجھے ایک قتل کے سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔''

ویٹوری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ تیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب بالکل واضح ہے۔'' اسمتھ نے اطمینان سے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی نے لینل ٹیلر کا قتل کیا ہے۔''

ویٹوری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے خود اپنے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔''

''اس نے رسّی کہاں سے حاصل کی؟ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ رسّی خرید سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے رسّی چرائی ہو گی۔ کیا کسی نے تم سے رسّی کی چوری کی شکایت کی؟''

''نہیں، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اپنے آپ کو درخت پر لٹکانے سے پہلے زمین پر سے قدموں کے نشانات صاف کر دیے ہوں۔ کیا بعد میں اس کے بھوت نے آ کر زمین صاف کی تھی؟''

''وہ اسے کیوں قتل کرے گا؟'' ویٹوری نے پوچھا۔

''کیونکہ اس نے میک نارڈی اور ایوا جیننگ کے بارے میں پولیس کو بتانے کی دھمکی دی تھی۔ وہ پولیس کو بتا دیتا کہ لڑکی نے خودکشی کیوں کی تھی اور میک نارڈی نے اس کے ساتھ کیا بدفعلی کی تھی۔'' وہ ڈینس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''وہ پولیس کو میک نارڈی کے ان ساتھیوں کے بارے میں بھی بتا دیتا۔ اب تم مجھے اس کا پتا بتاؤ گے؟''

ویٹوری نے اپنا بازو ہوا میں لہرایا اور جنگل کے پار افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہاں، وہ اسی روز یہاں سے چلا گیا تھا اور اب اس کے بارے میں کوئی پتا نہیں ہے۔''

''جانتا ہوں۔ وہ اپنے چہرے کا زخم بھرنے تک وہیں رہے گا لیکن تم جانتے ہو، ہم اسے ڈھونڈ ہی لیں گے۔''

ویٹوری نے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟''

''کسی نے نہیں اور سب نے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے خود ہی کہا تھا کہ یہ کمیونٹی صرف پچاس افراد پر مشتمل ہے اور یہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''

''یقیناً یہ باتیں تمہیں ان عورتوں نے بتائی ہوں گی جن پر اسٹور کھولنے کا خبط سوار ہوا ہے۔''

''ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ کانسٹیبل ہیرس کی رپورٹ میں موجود ہے۔''

''کسی نے تم سے کوئی بات نہیں کی۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ.....؟''

معصومیت

بیٹا۔ ''ابا جان آپ کے بال سفید کیوں ہیں؟''

باپ۔ ''جب کوئی بیٹا شرارت کرتا ہے تو اس کے باپ کے سر کا ایک بال سفید ہو جاتا ہے۔''

بیٹا بھولی صورت بنا کر۔ ''اسی لیے دادا جان کے سارے بال سفید ہو گئے ہیں۔''

سہولت

مسافر۔ ''یہ کیسا ہوٹل ہے ساری چھت ٹپک رہی ہے میرا کمرا تو تالاب بنتا جا رہا ہے۔''

ہوٹل کا مالک۔ ''صاحب ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہر کمرے میں پانی ہو گا۔''

مرسلہ: وجاہت حسین فیصل، اوکانوار بنگلہ، چیچہ وطنی

''قانون میں اسے واقعاتی شہادت کہا جاتا ہے اور تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہے۔ شاید یہ ثبوت تمہارے دوست کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہوں۔''

ویٹوری خاموش رہا۔ شاید وہ اسمتھ کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

''لیکن کبھی نہ کبھی تو حقیقت سامنے آئے گی جب ان میں سے کوئی ایک لڑکی اپنی زبان کھول دے گی جو میک نارڈی یا شاید تمہیں بھی ان حرکتوں کی وجہ سے پسند نہیں کرتی یا وہ لڑکی جسے میک نارڈی یا تمہاری طرف سے زیادتی کا خطرہ ہو اور وہ پولیس سے مدد مانگنے پر مجبور ہو جائے۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' ڈیٹوری بولا۔

اسمتھ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور الماری کھول کر ڈی وی ڈی کے ٹائٹل پڑھنے لگا۔ یہ سب فحش فلموں کی ویڈیوز تھیں۔ اس نے انہیں میز پر رکھا اور بولا۔ ''تم یہ فلمیں اسٹورز کو کرائے پر دیتے ہو اور بچوں کو دعوت دیتے ہو کہ وہ انکل ڈینس کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں۔''

اسمتھ آگے کو جھکا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ تم بھی اس دھندے میں ملوث ہو لیکن تمہارے گھر میں ان فلموں کی موجودگی بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی مدد سے ہم عدالت میں کچھ ثابت کر سکیں۔ ویسے بھی یہاں

رہنے والا شخص اس معاملے سے اچھی طرح واقف ہے، بس کسی طرح میں ان کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاؤں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

''لائم اس لڑکے کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لڑکا اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنے بچاؤ میں جوابی حملہ کیا۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ اس کی لگائی ہوئی ضرب لڑکے کو زور سے لگی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ لیکن لائم کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔''

''اسی لیے لائم نے اسے خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی؟''

ویٹوری نے ایک گہری سانس لی اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لائم خوف زدہ ہو گیا تھا۔''

''ڈینس! وہ لڑکا چوٹ لگنے کی وجہ سے نہیں مرا تھا۔''

''کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ڈینس بے یقینی سے بولا۔

''ہاں، وہ اس وقت زندہ تھا جب لائم نے اسے درخت سے لٹکایا۔ لڑکے کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی۔''

''لائم کا خیال تھا کہ وہ لڑکا اس کی ضرب سے ہلاک ہوا ہے اور وہ یہی سمجھتا رہا کہ اس نے لڑکے کو ہلاک کر دیا ہے۔ اسی لیے وہ خوف زدہ تھا۔''

اسمتھ نے بھی ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''تم پہلے شخص ہو جس نے لائم کے جرم کی گواہی دی ہے اور اس شہادت کی بنیاد پر وہ پھانسی کے تختے تک پہنچ سکتا ہے۔ لائم زیادہ عرصے تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ بے شک یہ دنیا بہت بڑی ہے لیکن جب قانون حرکت میں آ جائے تو یہ سمٹ کر ایک نقطے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندے ہونے کی وجہ سے تمہارے قبیلے پر قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تو یہ تمہاری بھول ہے لیکن بہتر ہوگا کہ اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ قانون بیچ میں آئے، نہ کوئی جیل جائے اور سب سے اہم بات یہ کہ آئندہ کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کو نقصان نہ پہنچے۔''

''یہ کیسے ہوگا؟'' ڈینس حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''ابھی تک سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے۔ میری رپورٹ پر ہی اس کیس کا دارومدار ہوگا لیکن میں پہلے تم سے ضمانتیں لینا چاہتا ہوں کیونکہ تم کونسل کے سربراہ ہو اور اس قبیلے کے نظم و نسق کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' ڈینس ہکلاتے ہوئے بولا۔

''سب سے پہلے تمہیں بچوں کے تحفظ کی تنظیم سے رابطہ کرنا ہوگا۔ ان کے نمائندے یہاں آ کر تمہارے لوگوں کو بتائیں گے کہ بچوں کے ساتھ بدفعلی کی روک تھام کس طرح کی جا سکتی ہے۔''

ڈینس خاموش رہا۔

اسمتھ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اب یہ سلسلہ رک جانا چاہیے۔ تم یا لائم یا کوئی اور شخص جو بھی اس میں ملوث ہے، اسے یہ حرکتیں ترک کر دینی چاہئیں۔ ورنہ میں لائم کو کسی وقت اور کہیں سے بھی گرفتار کر سکتا ہوں اور میں ان لوگوں کو بھی گرفتار کر سکتا ہوں جو کسی بھی طرح اس کی مدد کر رہے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

ڈینس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں اور آہستہ سے بولا۔ ''ہاں، سمجھ رہا ہوں۔''

''یہ مت سمجھنا کہ یہاں سے جانے کے بعد میں یہاں کے لوگوں کو بھول جاؤں گا۔ میں وقتاً فوقتاً یہاں آ کر حالات کا جائزہ لیتا رہوں گا اور لوگوں سے پوچھوں گا کہ اب تو یہاں فریب کاری نہیں ہو رہی۔ کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا جا رہا۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں۔'' ڈینس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

☆☆☆

سہ پہر کے وقت واپس جاتے ہوئے اسمتھ اس رپورٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اسے سینئر سارجنٹ کو پیش کرنا تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے حقیقت بیان کر دی، تب بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ لائم کے خلاف کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ علاقے کا کوئی شخص اس بارے میں کچھ کہنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ڈینس سے جو کچھ اگلوایا تھا، وہ بعد میں اپنے دوست کو بچانے کے لیے اس سے مکر بھی سکتا تھا۔ لائم تو پولیس کے ہاتھ کبھی نہ آتا لیکن علاقے میں ہونے والے جرائم اسی طرح پھلتے پھولتے رہتے اور نہ جانے کتنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جان خطرے میں پڑی رہتی۔ اسمتھ نے ڈینس سے ایک سودا کیا تھا اور معاملے کو ختم کر کے جرائم کے خاتمے کی یقین دہانی کر لی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہی لکھا کہ قبیلے کے لوگوں سے تفصیلی پوچھ گچھ کی گئی لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ ایک لڑکی کی خاطر ٹیلر کی اپنے دوست سے لڑائی ہوئی جس کے بعد اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ لیکن اسمتھ کو یقین تھا کہ اس کی موت رائگاں نہیں جائے گی۔

بے باق

سلیم انور

زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ نئی راہیں تلاش کی جائیں... لیکن نئے رشتے استوار کرنے سے پہلے پرانے بندھن سے چھٹکارا ضروری ہوتا ہے... ایک ایسی ہی دوشیزہ کی کشمکش... جو نئے راستے اور نئے راہی کی متمنی تھی...

ازدواجی زندگی کے شوخ رنگوں کو پھیکا کر دینے والے عنصر کا تماشائے عبرت

ایک کروڑ ڈالرز مع سود۔'' رابرٹ نے لیلا کے شانوں پر سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تو زندگی بدل جائے گی۔ سوچو ہم اتنی بڑی رقم سے کیا کچھ کر سکتے ہیں؟''

''ہم؟'' لیلا نے منہ بناتے ہوئے کہا اور رابرٹ سے ایک قدم دور ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہم کا کوئی سوال نہیں ہے۔''

رابرٹ نے آگے بڑھنا چاہا تو لیلا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ''نہیں، وہیں رہو۔ تمہارے پاس سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ دیکھو رابرٹ، میں تم سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے تم جا کر ان خالی کارٹنز کی تہ لگاؤ اور انہیں باہر پھینک دو۔''

رابرٹ کچھ دیر تک لیلا کو گھورتا رہا اور تیزی سے پلٹ کر اسٹور میں چلا گیا۔

لیلا نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ رابرٹ کی احسان مند تھی کیونکہ اس نے لیلا کو اپنی چھوٹی سی دکان شروع کرنے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے رقم ادھار دی تھی۔ البتہ اب ان کے درمیان تعلقات ناقابلِ برداشت ہوتے جارہے تھے۔

لیلا کی نظریں بھڑکیلے سرخ رنگ کے پس منظر والے بڑے سے پوسٹر کی جانب اٹھ گئیں جو برابر کی دیوار پر بنا ہوا تھا۔

پوسٹر پر سیاہ چغہ پہنے ایک دراز قامت ہینڈسم شخص کی تصویر بنی ہوئی جس کے ہمراہ سنہری گھنگھریالے بالوں والی ایک چھوٹی سی پیاری سی لڑکی بھی تھی۔

یہ تصویر لیلا اور اس کے باپ کی تھی۔

لیلا دیر تک اس تصویر پر نظریں جمائے رہی۔ ”مجھے معلوم ہے ڈیڈی۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔“ وہ مدھم لہجے میں گویا ہوئی۔ ”تم نے مجھ سے کہا تھا کہ احسان۔۔۔ پیار نہیں ہوتا لیکن احسان مندی کے جواب میں مجھے اس کے ساتھ شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کسی کے احسان کو محبت نہیں سمجھنا چاہیے۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی، ڈیڈی۔“

سیٹی کی ایک نغمگی آواز نے اس کا دھیان بٹا دیا۔ وہ آواز کی سمت گھوم گئی۔ رابرٹ اسے ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیلا کو اپنے رخسار تپتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ لیکن رابرٹ کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ نے اسے احساس دلا دیا کہ یہ مسکراہٹ ”ڈالرز“ ملنے کی خوشی کی ہے۔

لیلا ایک سرد آہ بھر کے رہ گئی!

☆☆☆

لیلا کا خیال اس لاٹری ٹکٹ کی طرف چلا گیا جو اس نے لاپروائی سے اسی روز اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونس رکھا تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں سر کو جھٹکا اور اپنی بے پناہ خوشی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ انعام جیتنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ وہ گزشتہ تین برسوں سے مسلسل لاٹری کے ٹکٹ خرید رہی تھی۔ اور بالآخر اس کے ٹکٹ کا نمبر انعام کا حق دار قرار پایا تھا۔

انعام جیتنے کا مطلب تھا کہ اب وہ اپنے تنگ سے اپارٹمنٹ سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی اور ایک نیا مکان خرید سکتی تھی۔ وہ ایک نئی کار بھی لے سکتی تھی۔

اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذات کو گڈمڈ کرتے ہوئے لیلا کے ذہن میں یہ خیال ایک اٹل فیصلے کے مانند سماتا چلا گیا کہ اسے سب سے پہلے رابرٹ سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔

☆☆☆

پانچ بجے لیلا نے دروازے پر آخری گاہک کو رخصت کیا اور داخلی دروازے پر ”بند ہے“ کا سائن لٹکا کر کاؤنٹر کے پیچھے اپنی سیٹ پر واپس آگئی۔ اس کا ذہن ابھی تک منتشر خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے اسٹینڈرڈ تاش کے پتّوں کی گڈی اٹھائی اور اس کی مشاق انگلیاں چابک دستی کے سے ان پتوں کو پھینٹنے لگیں۔ وہ جو چال کھیلنا چاہتی تھی، وہ ایک فرد کے ساتھ نہیں کھیلی جا سکتی تھی۔ مقابل کا ہونا لازمی تھا۔ لیکن پتوں کی موجودگی کا احساس اسے تسکین دے رہا تھا اور اس کے ذہن میں گڈمڈ خیالات کو بھی ان سے مدد مل رہی تھی۔

رابرٹ کے لیے اس کے دل میں جو نرم احساسات تھے، وہ کبھی کے رخصت ہو چکے تھے۔ البتہ وہ اس کے احسان کو اب بھی تسلیم کرتی تھی اور اسے فراموش نہیں کیا تھا۔

وہ جواباً اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھی اور خود کو اخلاقی طور پر اس کا پابند سمجھتی تھی۔

”میری تو اب بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے مجھے خود سے شادی کرنے پر کس طرح رضامند کرلیا تھا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ”اور اب مجھے اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی اور وہ بامراد ہو جائے گا۔ آخر میں نے طلاق کے کاغذات پہلے داخلِ دفتر کیوں نہیں کروائے؟ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

لیلا نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

وہ چند لمحوں تک اسی انداز میں بیٹھی رہی۔ پھر اچانک چونک پڑی۔

عقب میں اسٹور کی جانب سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اچھل پڑی اور اسٹول پر سے گرتے گرتے بچی۔ اتنے میں رابرٹ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔ اس نے وہ جھاڑو کاؤنٹر کے ساتھ ٹکا دی۔ پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر لیلا کو گھورنے لگا۔

”میرے پاس ایک عمدہ مشورہ ہے۔“ اس نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا۔

”میں سمجھی تھی کہ تم جا چکے ہو۔“ لیلا نے کہا۔

”میں چلا گیا تھا۔“ اس نے لیلا کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”پھر کچھ ضروری کام یاد آگیا تو پلٹ آیا۔“

”چلو اچھا کیا۔ اب کیا چاہتے ہو؟“ لیلا نے اس کے تیور بھانپتے ہوئے پوچھا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں، ڈیئر۔ اپنے شوہر سے اس قسم کا سوال؟“

”تم بہ خوبی جانتے ہو کہ یہ رشتہ اب صرف کاغذی رہ گیا ہے۔“ لیلا نے کہا۔ ”اب گھر چلے جاؤ، رابرٹ۔“

”گھر؟ آہ۔۔۔ بے بی گھر وہ ہوتا ہے جہاں دل ہوتا ہے۔ مت بھولو کہ تمہارا دل میرا ہے۔ اسی طرح اس ٹکٹ کا ایک حصہ بھی جو تمہاری چھوٹی سی ٹائٹ جینز میں رکھا ہوا ہے۔“

لیلا یہ سن کر اسٹول پر سے کھسک کر نیچے اتر آئی اور چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو رابرٹ، میں کل صبح ایک وکیل سے ملاقات کر رہی ہوں اور طلاق کے کاغذات داخلِ دفتر کرا رہی ہوں۔ مجھے یہ کام بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا۔ تم ان پر دستخط کر دینا تو میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر دے دوں گی۔ پھر تم اپنی زندگی سیٹ کرلینا۔ ڈھیر ساری بیئر بھی خرید سکو گے۔“

یہ سن کر رابرٹ کے چہرے پر طاری مخلصانہ تاثرات یک دم معدوم ہوگئے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی ناچنے لگی۔

لیلا نے رابرٹ کے بدلتے تاثرات دیکھے تو تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ وہ رابرٹ کی دکھتی رگ کو چھیڑ چکی تھی۔

لیلا کو اچانک اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے حلق کو تر کیا اور پھر کاؤنٹر کے عقب سے نکلنے کی کوشش کی۔

لیکن رابرٹ زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔

وہ ایک ہی جست میں کاؤنٹر کے عقب میں جا پہنچا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے لیلا کی گردن اپنی گرفت میں لے لی۔ لیلا کو اپنا سانس گھٹتا محسوس ہونے لگا۔

”میرے ساتھ زیادہ کیوٹ بن کر کھیلنے کی کوشش مت کرو، لیلا۔“ رابرٹ نے اسے دھکیل کر دیوار سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں اتنا احمق نہیں ہوں۔“

لیلا نے رابرٹ کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچلنا شروع کر دیا لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے جلد ہی ہار مان لی۔

”اوکے۔۔۔ اوکے!“ وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔“

رابرٹ نے اپنی گرفت اور سخت کر دی۔ اس کی آنکھوں میں یکایک وحشیانہ سی چمک اُبھر آئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ لیلا کے بلاؤز کے اندر رینگنے لگا۔

”رابرٹ۔۔۔ رابرٹ۔۔۔ پلیز۔ نہیں، نہیں یہ مت کرو۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”تم چاہو تو میرے ساتھ گھر چل سکتے ہو۔“

رابرٹ نے ایک بھیانک سا قہقہہ لگایا جسے سن کر لیلا کانپ گئی۔ ”نہیں، اس انداز سے کہنے پر میں کبھی تمہارے ساتھ گھر نہیں جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے لیلا کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اسے پیچھے دھکیل دیا پھر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

دروازے کے نزدیک پہنچ کر وہ رکا اور تُند نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ مت بھولو سویٹی کہ جو کچھ تمہارا ہے وہ میرا بھی ہے۔ مجھے صرف اپنا نصف حصہ چاہیے۔“

اس نے ایک ٹوتھ پک نکال کر دانتوں میں دبائی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم دونوں کو اپنے اپنے چند کاغذات پر دستخط کرنے ہیں۔ میں تم سے کل صبح نو بجے یہیں ملوں گا۔“

رابرٹ نے باہر نکل کر دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔ جب لیلا کو یقین آگیا کہ وہ جا چکا ہے تو اس نے کاؤنٹر کی سمت قدم بڑھایا۔ اس کی ٹانگیں بے جان سی ہو رہی تھیں اور قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی اسٹول کا سہارا لیا اور اسے کھسکا کر بیٹھ گئی۔ پھر رونا شروع کر دیا۔

وہ کافی دیر تک روتی رہی۔

پھر کئی منٹ بعد اس نے چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور اپنی بے بسی کے احساس پر قابو پانے کی جدوجہد کرنے لگی۔

پھر اس کی نگاہیں اپنے باپ کی تصویر پر مرکوز ہو گئیں۔ اوہ ڈیڈ، میں واقعی تمہیں بے حد مس کر رہی ہوں۔ وہ سوچنے لگی کہ کاش اس کا باپ اسے مشورہ دینے کے لیے یہاں موجود ہوتا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور تاش کی گڈی دوبارہ اٹھالی اور تیزی سے انہیں پھینٹنے لگی۔ پتوں کے سیاہ اور سرخ رنگ اسے آنکھوں میں نمی کے باعث دھندلے سے نظر آرہے تھے جو آپس میں گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔

”اس نے مجھے وہ سب کچھ سکھا دیا تھا جو وہ جانتا تھا۔“ لیلا نے کہا۔ ساتھ ہی وہ اپنے ذہن میں اپنے باپ کی پرانی جادوئی تراکیب کو دہرانے لگی۔ ان میں سے ایک تلوار کی ٹرک بھی تھی۔ وہ رابرٹ کو کسی تیز نکیلے ہتھیار سے چھید ڈالنا چاہتی تھی۔ ”کاش میری خواہش پوری ہو سکتی۔“

اس کے باپ کے بتائے ہوئے بیشتر ایکٹ اسٹیج سے منسوب تھے۔ ”نہیں۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”پہلے ہی سب کچھ نہایت پیچیدہ ہے۔ مجھے کچھ اور سوچنا چاہیے۔ ایسی ترکیب جو نہایت آسان اور سادہ سی ہو۔“

پھر تاش کے پتے اس کے ہاتھ سے نکل کر ہر طرف بکھر گئے۔ ”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ خوشی سے چلّا پڑی۔

”آسان، اتنا آسان!“ وہ کاؤنٹر کے عقب سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”حیرت ہے، مجھے اس کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔“

☆☆☆

اگلے روز صبح لیلا نے لباس تبدیل کیا، اپنا پرس جھپٹا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر کی جانب لپکی جہاں اس کی پرانی زنگ آلود بیوک کار کھڑی تھی۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر شکستہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے چابی اگنیشن میں داخل کی اور کار اسٹارٹ کردی۔ کار کا انجن شور مچاتے ہوئے جاگ اٹھا اور سائلنسر سیاہ دھواں خارج کرنے لگا۔

اپنی کار کی خستہ حالی پر لیلا رابرٹ کے ساتھ معاملات طے کرنے کے لیے مزید بے تاب سی ہوگئی۔

سڑکیں تقریباً سنسان سی تھیں۔ کام پر جاتے ہوئے عام طور پر جو خوشی اسے محسوس ہوتی تھی، وہ اس وقت ناپید تھی۔ وہ جلد ہی اپنی دکان پر پہنچ گئی۔

جب وہ کار پارک کررہی تھی تو اس کی نگاہ رابرٹ پر پڑی جو داخلی دروازے کے باہر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیلا کی کار دیکھ کر وہ اٹھا اور مزے سے ٹہلتا ہوا اس کی جانب چل پڑا۔

"پرفیکٹ ٹائمنگ!" اس نے سلور کلر کی ایک گھڑی اپنی جیب سے نکالتے ہوئے کہا جس کا پٹا ٹوٹا ہوا تھا۔ "اگر تم اگلے چند منٹوں تک نہ آتیں تو میں تمہیں فون کرنے جارہا تھا۔"

"بے صبراپن، بے صبراپن۔" لیلا نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو نو بھی نہیں بجے ہیں۔"

"جو بھی وقت ہوا ہو، اب اندر چلو تاکہ کام نمٹا دیا جائے اور میں تمہیں پریشان کرنا چھوڑ دوں۔" رابرٹ نے دکان کی سمت پلٹتے ہوئے کہا۔

"بالآخر ہم رضامند ہوگئے ہیں۔" لیلا نے دکان کے داخلی دروازے کی چابی ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "میرا وکیل بھی جلد ہی یہاں پہنچنے والا ہے۔"

درست چابی ہاتھ میں آتے ہی لیلا نے داخلی دروازے کا تالا کھول دیا اور اندر قدم رکھتے ہوئے سوئچ آن کردیا۔ وہ خود کو حیرت انگیز طور پر پرسکون محسوس کررہی تھی۔ پھر وہ اپنے آفس کے عقبی حصے میں پہنچی اور ایک جھٹکے سے بلائنڈز کھول دیں۔ کمرا روشن ہوگیا۔

وہ دفتر میں پڑی ہوئی شکن آلود آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے رابرٹ کو دیکھنے لگی جو اپنی جیب میں سے ایک لفافہ نکال رہا تھا۔

"میں چاہتا تو واقعی لالچی ہوسکتا تھا۔" اس نے لفافہ کھول کر اس میں رکھے ہوئے چند کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے لالچ نہیں کی۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا، مجھے بس اپنا نصف حصہ چاہیے۔ تم اس پر دستخط کردو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا۔"

لیلا نے اس کے بڑھائے ہوئے کاغذات لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

لیلا نے کاغذات کی تہیں کھولیں تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ ٹائپ کی ہوئی تحریر کا جائزہ لینے لگی۔ وہ باری باری ایک ایک صفحہ پلٹ رہی تھی۔ اسے سب کچھ درست ترتیب میں دکھائی دے رہا تھا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ سب قانونی طور پر درست ہے۔" رابرٹ نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دستخط کردو۔"

"مجھے جلد بازی پر مت اکساؤ۔" لیلا نے غراتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں کیا چیز دستخط کررہی ہوں۔ بلکہ میں چاہوں گی کہ میرا وکیل بھی میرے دستخط کرنے سے پہلے اسے پڑھ لے۔ وہ کسی بھی وقت آنے والا ہے۔"

"لعنت بھیجو۔ وقت ضائع مت کرو اور اس پر دستخط کردو۔" رابرٹ نے یہ کہتے ہوئے غصے سے چاروں طرف دیکھا پھر ایک پین اٹھا کر لیلا کی جانب اچھال دیا۔ "یہ لو۔"

لیلا، رابرٹ کی دھمکی پر دل ہی دل میں مسکرا دی۔

"فائن!" اس نے رابرٹ کا اچھالا ہوا پین کیچ کرتے ہوئے کہا۔

لیلا نے قلم کا ڈھکن اتارا اور اس کی نب کاغذ پر رکھتے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

لیکن قلم لکھنے سے قاصر رہا۔

لیلا نے پین کو اوپر اٹھایا اسے دو تین مرتبہ ہلایا اور دوبارہ لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس مرتبہ بھی پین سے روشنائی نہیں نکلی اور وہ کاغذ پر خالی نشان ڈالتا چلا گیا۔ لیلا نے ایک رف کاغذ اٹھایا اور قلم کو اس پر رگڑ کر چلانے کی کوشش کرنے لگی۔

رابرٹ کی نگاہیں لیلا پر جمی ہوئی تھیں۔ جب پین نے کام نہیں کیا تو رابرٹ کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر وہ پھٹ پڑا۔ "کوئی دوسرا پین لے لو۔"

"اوکے، ٹیک اٹ ایزی۔" لیلا نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور اپنا پرس اٹھا لیا۔ اس نے پرس کھولا اور اس میں ٹٹولنے لگی۔ پھر اندر سے ایک سرخ چمک دار رنگ کا پین نکالا اور اسے رابرٹ کو دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ کیسا رہے گا؟"

رابرٹ نے غضب ناک تیوروں کے ساتھ لیلا کی طرف دیکھا۔ "یہ بھی پین ہی دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے دستخط کردو۔"

لیلا نے ہاتھ لہراتے ہوئے رابرٹ کے دیے ہوئے کاغذات کے صفحات پلٹنا شروع کیے اور پھر آخری صفحے پر دستخط کے لیے چھوڑی ہوئی جگہ پر دستخط کردیے۔ پھر مسکراتے ہوئے کاغذات تہ کرکے رابرٹ کو تھما دیے۔

رابرٹ نے کاغذات جیب میں رکھتے ہوئے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ٹائم ہوگیا۔ تمہارا وہ وکیل کہاں ہے؟"

عین اسی لمحے داخلی دروازے پر لٹکی ہوئی گھنٹیاں بجنے لگیں جو کسی کی آمد کا اشارہ تھیں۔

"جوزف؟" لیلا نے پکارا۔ "ہم یہاں پچھلی طرف ہیں۔"

دوسرے لمحے لیلا کے وکیل جوزف نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا اور اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنے لگا۔

پھر اس نے بریف کیس میں سے طلاق کے کاغذات نکال کر رابرٹ کی جانب بڑھا دیے اور ساتھ ہی ایک نمدی نوک کا قلم بھی اسے تھما دیا۔

رابرٹ نے کاغذات پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے خاموشی سے ساتھ دستخط کردیے۔

وکیل جوزف نے تمام چیزیں دوبارہ اپنے بریف کیس میں بند کردیں اور لیلا کو لیکچر پلانے لگا کہ اس نے اس کی نظرثانی کے بغیر رابرٹ کے کاغذات پر دستخط کیوں کردیے۔

"سب کچھ ٹھیک تھا۔ واقعی۔" لیلا نے اپنے وکیل کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اس بات کا فیصلہ میں کرسکتا ہوں کہ سب کچھ ٹھیک تھا یا نہیں۔" وکیل جوزف نے کہا۔ "کیا میں وہ کاغذات دیکھ سکتا ہوں جن پر تم نے دستخط کیے ہیں؟"

لیلا دونوں ہاتھ باندھ کر اطمینان سے رابرٹ کو دیکھنے لگی جس نے اپنی جیب سے کاغذات نکال کر وکیل کو تھما دیے تھے۔

جوزف نے تہ کیے ہوئے کاغذات کھولے اور انہیں پڑھنا شروع کردیا۔ جب وہ سب سے آخری صفحے پر پہنچا تو اس نے سر اٹھا کر لیلا کی طرف دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے تم نے تو کہا تھا کہ تم نے اس پر اپنے دستخط کردیے ہیں؟"

"میں نے دستخط کردیے تھے۔" لیلا نے جواب دیا۔

"کہاں؟" وکیل جوزف نے پوچھا۔ "مجھے تو اس پر تمہارے دستخط کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔"

"کیا؟" رابرٹ کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ اپنی جگہ سے یوں اچھل پڑا جیسے اس کی پتلون نے اچانک آگ پکڑ لی ہو۔ اس نے ایک جھٹکے سے وکیل کے ہاتھ میں موجود کاغذات اپنی طرف کھینچ لیے اور بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے خود دیکھا تھا۔ اس نے اس پر دستخط کیے تھے۔"

"اس نے واقعی دستخط کیے تھے؟" وکیل جوزف نے ناقابل یقین لہجے میں کہا۔ "لیکن اس پر تو کوئی دستخط نہیں ہیں۔"

رابرٹ پاگلوں کی طرح کاغذات کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔

لیلا رابرٹ کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہورہی تھی۔

رابرٹ نے آخری صفحہ پلٹا تو اس کی نظریں اس جگہ جم کر رہ گئیں جہاں دستخط کے لیے نقطہ دار سطر ٹائپ تھی۔ اس جگہ کسی قسم کے دستخط موجود نہیں تھے۔

"اوہ مائی گاڈ! میرا خیال ہے کہ مجھ سے چوک ہوگئی۔" لیلا نے رابرٹ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ساتھ ہی شوخ رنگ کا پین اٹھا کر دکھاتے ہوئے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا۔ میں نے یقیناً غلط پین اٹھا لیا تھا، اس پین میں غائب ہوجانے والی روشنائی بھری ہوئی تھی۔ تم تو جانتے ہو۔ ابھی لکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ ابھی غائب ہوگیا۔ میرے دستخط بھی اسی طرح نظروں سے اوجھل ہوگئے ہیں۔"

رابرٹ نے اسے دھمکیاں دینا شروع کردیں۔ ساتھ ہی غصے کے عالم میں وہ کاغذات بھی پھاڑ دیے جن پر سے لیلا کے دستخط غائب ہوگئے تھے۔

لیلا نے رابرٹ کی دھمکیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے وکیل جوزف کو اشارہ کیا۔ جوزف نے اپنے بریف کیس میں سے ایک اور کاغذ نکالا اور اسے رابرٹ کی جانب بڑھا دیا۔

رابرٹ حیرت سے اس کاغذ کو دیکھنے لگا۔

"میں تمہارے احسان کا بدلہ چکا رہی ہوں، رابرٹ۔" لیلا نے کہا۔ "میں تمہارے وہ پانچ ہزار ڈالر لوٹا رہی ہوں جو تم نے مجھے قرض دیے تھے۔ جوزف نے تو مجھے منع کیا تھا لیکن میں اس کے باوجود ایک لاکھ ڈالر بھی دے رہی ہوں جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ اس طرح ہمارا لین دین کا حساب بے باق ہوجائے گا۔"

رابرٹ نے بے دھیانی میں کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے شوخ رنگ کے سرخ پین کی جانب ہاتھ بڑھایا تو لیلا بے ساختہ ہنس پڑی۔ "اوں ـــ ہوں۔" اس نے لپک کر پین اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ "اس کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں۔"

پھر ایک سستا سا سیاہ بال پوائنٹ رابرٹ کی جانب اچھال دیا اور بولی۔ "اس سے دستخط کردو۔"

رابرٹ نے خاموشی سے دستخط کردیے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بائیسویں قسط

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے ۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ...... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ...... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ...... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ...... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ...... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ...... ایک للکار ہے۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔۔۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بُری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہلِ خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چلّاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اترپردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آ گئی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں کچوڑا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے کچوڑا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا اور اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہمیں ایک عجیب و الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور نمیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے۔ میں ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور بارو ندا جیکی تک جا پہنچا۔ مجھے اور جیکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ ایک دن خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ سلطانہ کی تلاش کے دوران ہم شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک روز اچانک اپنی نگرانی پر مامور لوگوں کو چکمہ دے کر دیوان سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور حکم جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ وہاں ہم نے تاؤ افضل نامی شخص کے مکان میں قیام کیا۔ پھر ہم ایک مندر میں آ گئے۔ میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صفورا کے پاس پہنچ گئے۔ میڈم نے ہمیں دھوکا دیا اور کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ وہاں میڈم کے گارڈ اور اس کے ساتھ لڑائی ہوئی تاہم اس دوران میں میڈم کو سانپ نے کاٹ لیا۔ عمران نے میڈم صفورا کی جان بچالی۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں ایک رات خاموشی سے نکل کر راج بھون پہنچ گیا اور جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ مجھے ایک مہمان کے طور پر واپس میڈم صفورا کے پاس بھیج دیا گیا۔ ادھر اسٹیل نے مجھے بتایا کہ جارج نے سامبر کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ راج بھون سے ہمارا بلاوا آ گیا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ ہمیں مارنے کے منصوبے بنائے گئے مگر وہ ناکام رہے۔ میں اور عمران بیٹھے تھے کہ باتوں باتوں میں، میں نے اسے اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں کا چودھری عمران عرف عمو کو دور دراز گاؤں کے ایک مزار پر ایک سال خدمت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عمو وہاں صبح سویرے سے رات تک صفائی کرتا۔ ایک روز وہاں کچھ مہمان آئے۔ ان میں ایک عورت ماجھاں تھی۔ اس نے عمو کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ ماجھاں نامی عورت ایک ڈاکو کی بہن تھی۔ ایک روز اس نے عمو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ عمو سے تعلق قائم کرنا چاہتی تھی تاہم عمو کو اس سے گھن محسوس ہوئی۔ ماجھاں نے عمو کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی اور ناکامی پر عمو کو سزا کے طور پر کتوں کی کوٹھری میں بند کروا دیا۔ کام کاج کرنے والی لڑکی شبانہ وہاں چوری چھپے عمو کو کھانا دینے لگی۔ عمو شبانہ سے محبت کرنے لگا اور ایک روز موقع پا کر عمو اور شبانہ نے فرار کی کوشش کی مگر وہ پکڑے گئے۔ ماجھاں نے عمو اور شبانہ پر تشدد کیا۔ اب عمو وہاں کے عام ملازموں کی طرح تھا اور اس کے پاؤں میں زنگ آلود بیڑی ڈلی رہتی تھی۔ ایک روز اچانک ماجھاں کے سرکش گھوڑے نے خوب اودھم مچایا اور ایک دو بندوں کو زخمی کر دیا مگر حیران کن طور پر عمو نے گھوڑے پر قابو پالیا اور اس پر سواری بھی کی۔ وہاں ماجھاں کا مہمان راجا نامی شخص بھی موجود تھا۔ راجا اور عمو کی دوستی ہو گئی پھر راجا نے عمو اور شبانہ کو وہاں سے نکالنے کا پروگرام بنایا اور وہ لوگ بھاگ نکلے۔ راستے میں ماجھاں سے ٹکراؤ ہو گیا مگر اس ٹکراؤ میں ماجھاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ماجھاں کی موت کے بعد وہ لوگ شاد پورہ میں روپوش ہو گئے اور کبیر احمد کے گھر رہنے لگے۔ کبیر احمد کا بہت بڑا باغ تھا۔ وہ جانوروں کو وہیں سدھاتے۔ عمو کی والدہ اچانک اپنے گاؤں سے غائب ہو گئی تھی۔ عمو اپنی ماں کو ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر راجا نے کہا کہ ان کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ عمو کچھ اختلافات کی بنا پر راجا کو چھوڑ کر سرکس کے مالک جان محمد کے پاس آ گیا اور ان کی حویلی میں ٹھہر گیا۔ وہاں اسے پیر صادق شاہ نظر آ گیا۔ عمران نے اس سے بدلہ لینے کے لیے بنگالی ٹائیگر کو اس پر چھوڑ دیا۔ اس کی

جان لوچ کی گروہ ... طلے ہو گیا مگر توہم پرستی کا شکار لوگوں نے عمو اور شبانہ کو جدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ شبانہ کی شادی ہو گئی اور ایک روز گھریلو جھگڑے میں شبانہ یہ دنیا چھوڑ کر چلی گئی۔ عمو کی زندگی اندھیر ہو گئی۔ وہ خود کا خاتمہ کرنے کا سوچنے لگا اور یوں وہ خطرات سے کھیلنے لگا۔ عمو نے دکھی لوگوں کی مدد کو اپنا مقصد بنا لیا۔ عمران کی کہانی سننے کے بعد میں نے اس سے کئی سوال کیے۔ پھر جشن کے دن ہمیں راج بھون لے جایا گیا۔ پریوں کے چناؤ کے بعد عمران نے وہاں بوتلوں پر کھڑا ہونے کا کرتب دکھایا اور مقابلہ جیت لیا۔ رتنا دیوی عمران سے متاثر ہوئی اور انعام کی پیشکش کی مگر عمران نے صرف اپنے لیے ایک گاڑی لی۔ پھر سامبر مقابلے والا دن آ گیا۔ میں اور جارج مدِ مقابل تھے۔ میں نے جارج پر حملے کیے مگر پھر اچانک میری گردن جارج کے آہنی شکنجے میں آ گئی۔ میری ہمت ٹوٹ رہی تھی اور میں زیر ہوتا جا رہا تھا۔ جارج مجھے سر سے بلند کر کے زمین پر پٹخنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ چاقو سائبان میں ہے اور جارج اس سے بے خبر ہے۔ جارج نے مجھے ہوا میں اٹھا لیا۔ وہ مجھے زمین پر پٹخنے والا تھا کہ میں نے سائبان سے چاقو حاصل کر کے جارج کی گردن پر وار کیے اور پے در پے کئی وار کر کے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ گارڈز نے مجھے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔ مجھے زرگاں کے سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مجھ پر اسپتال میں دوبارہ قاتلانہ حملہ ہوا مگر عمران نے حملہ آور کو بے بس کر دیا۔ عمران نے راہزنی کی واردات کا ڈراما کر کے انعام میں ملنے والی جیپ غائب کر دی پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ مگر یہ سب دھوکا تھا، ایک محدود فاصلے پر پہنچنے کے بعد حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ وہاں سب نے ہمارا استقبال کیا اور سلطانہ اور میرا ملن ہوا۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میری حالت عجیب تھی۔ میں نے بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے منصوبہ بنایا اور ہم ضروری کام کرنے کا کہہ کر مندر سے باہر نکلے مگر عمران اور میں مندر کے باہر چھپے رہے اور سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں چلی گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہاں کچھ ہونے والا ہے۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی چلنے کی آواز گونجی۔ پھر اچانک ایک گھوڑا گاڑی کے گھوڑے بدک گئے۔ میں نے لپک کر کسی کو اس گاڑی میں گھستے دیکھا۔ مجھے سبز اوڑھنی کی جھلک نظر آئی۔ سلطانہ کی اوڑھنی بھی سبز تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عمران نے بھی سبز اوڑھنی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسے بھی وہی شک ہوا جو مجھے ہوا تھا۔ کیا اس بھگٹٹ دوڑتی ہوئی خالی گھوڑا گاڑی میں سلطانہ داخل ہوئی تھی؟ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی نے تیزی سے یوٹرن لیا اور گھوڑا گاڑی کے پیچھے روانہ ہوئی۔ چار پانچ مقامی افراد چھلانگیں لگا کر اس ٹریکٹر ٹرالی پر چڑھے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا اور دوڑتی ہوئی ٹرالی پر چڑھ گئے اور اکیلی یہ ٹریکٹر ٹرالی ہی نہیں تھی جو گھوڑا گاڑی کے پیچھے لگی تھی، اور دو تین گھوڑا گاڑیاں اور گھڑسوار بھی گھوڑا گاڑی کو روکنے کے لیے دوڑ پڑے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ بہت سے لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ گھوڑا گاڑی میں سبز اوڑھنی والی عورت گھسی ہے اور یقیناً یہی عورت مندر میں ہنگامے کی ذمے دار تھی۔ اب ہمارے لیے اس بات میں شبے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں گھسنے والی سلطانہ تھی۔

گھوڑا گاڑی برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ دونوں طرف مکئی اور گنّے کے بلند کھیت تھے۔ وہ کافی آگے نکل گئی تھی۔ بھاری بھرکم ٹریکٹر ٹرالی کو اس کا پیچھا کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پیچھے سے آتے ہوئے گھڑسواروں میں سے ایک نے چلّا کر کہا۔ ”رستہ دو۔“

ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو راستے کے بائیں کنارے پر کر لیا۔ یوں گھڑسواروں کو تیزی سے آگے جانے کا موقع مل گیا۔ ہماری بوسیدہ ٹرالی اور دیگر دو گھوڑا گاڑیوں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔

ٹرالی پر سوار افراد بھی دیگر لوگوں کی طرح مشتعل نظر آتے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر دیہاتی کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے گرج کر کہا۔ ”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسی گاڑی میں گھسی ہے وہ۔“

دوسرا شخص بولا۔ ”اس کے پاس چاقو تھا۔ میں نے اسے چاقو چلاتے دیکھا ہے..... جیادہ عمر کی بھی ناہیں ہے۔ لڑکی سی لگتی ہے۔“

ایک اور آواز آئی۔ ”ایسی گندی ناری کو کون ہندو کہے گا۔ مندر میں گھس کر فساد کرت ہے۔ یہ تو ہندو کے بھیس میں کوئی راکھشس لگت ہے۔“

”اس نے کیا کیا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”ابھی پکڑی جاوے گی تو پتا چل جاوے گا۔“ ایک نوجوان نے کلہاڑی ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں دیہاتی حلیے میں تھے۔ ہماری کندھوں پر رکھی ہوئی ”کسّیاں“ ہمارے بہروپ کو پختہ کر رہی تھیں۔ ٹرالی کے اگلے حصے میں کھڑا ایک پنڈت نما شخص بولا۔ ”یہ زنانے حصے کی طرف سے بھاگتی ہوئی نکلی تھی۔ دو تین گوپیاں اس کے پیچھے تھیں اور پکڑو پکڑو کی دہائی دے رہی تھیں۔ چھوٹے پجاری نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے چاقو چلا دیا۔ پھر دو اور بندوں کو بھی گھائل کیا اور باہر نکل آئی۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے عقب میں دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ ایک دو گاڑیاں اور چند مزید گھڑسوار بھی اس تعاقب میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہی وقت تھا جب سب سے آگے بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں سے اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔ یہ فائر ان گھڑسواروں پر کیے گئے جو اس تعاقب میں سب سے آگے تھے اور گھوڑا گاڑی کے کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ بڑے کارگر فائر ثابت ہوئے۔ پہلی گولی تو براہِ راست گھڑسوار کو لگی۔ ہم نے اسے گھوڑے سے الٹ کر کچے راستے کی دھول میں گم ہوتے دیکھا۔ دوسری گولی نے ایک گھوڑے کو ''ہٹ'' کیا۔ گھوڑا بدک کر اچھلا اور پھر مکئی کے کھیتوں میں گھس کر ہنہنانے اور گول گول چکرانے لگا۔

تعاقب کرنے والے گھڑسوار بُری طرح ٹھٹک گئے۔ ان میں سے کوئی بھی مسلح نہیں تھا۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ گھوڑا گاڑی سے اپنا فاصلہ بڑھا دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہماری ٹریکٹر ٹرالی کے آس پاس آگئے۔ دو چار گھڑسوار رک گئے اور راستے کے کنارے پر پڑے اس موچھیل گھڑسوار کو دیکھنے میں مصروف ہو گئے جو گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولی کا شکار ہوا تھا۔

''لگتا ہے کہ کمینی گاڑی میں اکیلی ناہیں ہے۔'' ایک شخص پھنکارا۔

''لیکن گھسی تو اکیلی ہی تھی۔''

''ہوسکت ہے کہ کھیتوں میں سے نکل کر اس کا کوئی یار بھی گھس گیا ہو اندر۔'' پنڈت نما شخص نے خیال ظاہر کیا۔

میرا دھیان سیدھا آفتاب خاں کی طرف چلا گیا۔ اس واقعے سے ایک منٹ پہلے آفتاب موقع سے فائدہ اٹھا کر کھیتوں میں بھاگ نکلا تھا۔ عمران اس پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سلطانہ کو فرار ہوتے دیکھ کر وہ بھی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گیا ہو؟

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی شاید اسی انداز میں سوچ رہا ہے۔

تعاقب طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر ٹرالی بُری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہچکولوں کی وجہ سے پنڈت نما شخص دو بار فرش پر لڑھکا اور کھڑا ہوا تھا۔ سب لوگوں کے چہروں پر جوش کے ساتھ ساتھ ہراس بھی نظر آ رہا تھا۔ غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ گھوڑا گاڑی میں سے ان پر فائرنگ کی جائے گی۔ وہ سب کے سب کلہاڑیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ ہمیں صرف ایک گھڑسوار کے کندھے پر رائفل نظر آ رہی تھی لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ بھاگتے گھوڑے پر سے فائر کر سکتا۔ ویسے بھی وہ زیادہ باہمت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کافی پیچھے آ گیا تھا۔ دوسری رائفل ایک تنومند شخص کے پاس تھی اور وہ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار تھا۔ یہ گھوڑا گاڑی ٹرالی سے بھی پیچھے تھی۔ تنومند شخص اپنی رائفل کو ٹھیک سے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

یوں یہ تعاقب طویل سے طویل ہوتا جا رہا تھا.....

اگلے پندرہ منٹ میں فرار ہونے والی گھوڑا گاڑی میں سے پستول کے چار فائر مزید ہوئے۔ تین فائر تو ہوائی تھے اور گھڑسواروں کو ڈرانے کے لیے کیے گئے تھے لیکن چوتھا فائر سیدھا تھا۔ یہ اس گھڑسوار کے عین سر میں لگا جو دلیری دکھا کر گھوڑا گاڑی کے زیادہ قریب آ گیا تھا۔ یہ گھڑسوار گولی کھا کر بھی گھوڑے کی پشت سے ہی چپکا رہا لیکن وہ زندہ حالت میں نہیں تھا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد وہ ریت کی بوری کی طرح گھوڑے سے لڑھک گیا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولیوں نے دو افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ نشانے کی درستگی اس شبہے کو تقویت دے رہی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں دوسرا فرد شاید آفتاب خاں ہے۔ دوسرے گھڑسوار کے شکار ہونے کے بعد پیچھے آنے والی گھوڑا گاڑی سے تنومند رائفل بردار نے چار فائر کیے مگر یہ بے مقصد فائر تھے۔ رائفل اور نشانے کے درمیان ٹریکٹر ٹرالی اور دو گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ وہ شخص درست نشانہ لے ہی نہیں سکتا تھا....

یہ عجیب و غریب تعاقب قریباً ایک گھنٹا مزید جاری رہا۔ راستے میں بھی کچھ گھڑسوار تماشا دیکھنے کے لیے اس تعاقب میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے۔ گھوڑے اب ہانپنا شروع ہو گئے تھے۔ آگے جانے والی گھوڑا گاڑی کی رفتار بھی سست پڑتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پندرہ بیس منٹ یہ سلسلہ مزید جاری رہا تو گھوڑے بے دم ہو جائیں گے۔ تعاقب کرنے والے بھی شاید اسی وقت کے منتظر تھے..... مگر پھر جو کچھ ہوا اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔

ایک بستی کے آثار نظر آئے۔ یہ چند سو نفوس پر مشتمل کوئی کچا پکا گاؤں تھا..... گاؤں کے درمیان سے گزرتے گزرتے گھوڑا گاڑی نے ایک دم موڑ کاٹا اور سیدھی ایک نیم پختہ احاطے میں گھس گئی۔

تعاقب کرنے والے رک گئے۔ ٹریکٹر ٹرالی کی رفتار سست ہوئی پھر وہ بھی ٹھہر گئی۔ گھوڑا گاڑی جس احاطے میں داخل ہوئی تھی، اس کے آخر میں آٹھ دس نیم پختہ کمرے اور برآمدے نظر آ رہے تھے۔ چھت پر پانی کی گول پختہ ٹینکی بھی تھی۔ دیکھنے میں یہ کوئی اسکول لگتا تھا مگر پھر میری نظر لکڑی کے پھاٹک کے قریب لگے ایک بورڈ پر پڑی۔ یہ ایک شفا خانہ تھا۔ اس کے ایک علیحدہ پورشن میں شاید جانوروں کا علاج بھی ہوتا تھا۔ ہم کافی فاصلے پر تھے پھر بھی احاطے میں بندھے ہوئے مویشی اور خچر وغیرہ نظر آ رہے تھے۔

تعاقب کرنے والے اپنی اپنی سواریوں سے اترے۔ افراتفری کے عالم میں انہوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہی وقت تھا جب عمارت کے اندر سے رونے چلّانے کی آوازیں آئیں۔ تب ہم نے ایک حواس باختہ عورت کو عمارت کے اندر سے بھاگ کر باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے سر پر چادر تھی اور نہ ہی پاؤں میں چپل۔ ابھی وہ احاطے کے وسط میں بھی نہیں پہنچی تھی کہ عقب سے دو فائر ہوئے اور وہ اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گئی۔ اس جواں سال عورت کے نیلگوں لباس کو دیکھ کر مجھے لگا کہ اس طرح کا وردی نما لباس میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس عورت کو عمارت سے نکل کر بھاگنے کی سزا دی گئی ہے۔ سزا دینے والا آفتاب خاں بھی ہوسکتا تھا۔

چار پانچ منٹ کے اندر اس پُرسکون بستی میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ عمارت کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کچھ آس پاس کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ کھڑکیوں میں بھی ڈرے ڈرے سے چہرے نظر آنے لگے۔

میں اور عمران بھی کچھ قریب چلے گئے۔ کھلے ہوئے پھاٹک میں سے ہمیں وہ گھوڑا گاڑی نظر آ گئی جس کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہانپے ہوئے گھوڑے پانی اور گھاس کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے بدترین اندیشے درست ہیں۔ آفتاب خاں اس عمارت میں ہی موجود تھا۔ ہم نے چھت پر اس کی جھلک دیکھی۔ وہ بھاگ کر پانی والی ٹینکی کے پیچھے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل صاف نظر آئی۔

''یہ تو وہی ہے۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''اور اس کا مطلب ہے کہ سلطانہ بھی اندر ہی ہے۔''

''یہ تو بڑا خطرناک کام ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اب انہیں چھوڑیں گے نہیں۔'' عمران نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

عمران کی بات سو فیصد درست تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو ہمارے سامنے گر چکی تھیں۔ دو راستے میں اور تیسری یہاں احاطے میں۔ اس کے علاوہ کہا جا رہا تھا کہ بھاگنے والی عورت نے مندر میں بھی چاقو چلایا ہے۔ ہوسکتا تھا کہ وہاں بھی کوئی موت ہوئی ہو۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے کندھوں پر ''کسیاں'' تھیں۔ ہم دیہاتیوں کے لباس میں تھے اور ہجوم کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ ہم دونوں ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہم نے ابھی تک سلطانہ کو دیکھا نہیں تھا۔ اب بھی دل میں یہ موہوم سی امید موجود تھی کہ شاید سلطانہ اس خر دماغ قاتل پٹھان کے ساتھ نہ ہو۔

میں نے کہا۔ ''سوچنے کی بات ہے کہ آفتاب کے پاس رائفل کہاں سے آئی؟ ہم نے تو اس کی رائفل کھیت میں پھینک دی تھی..... سلطانہ کے پاس بھی کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ اسے اس عمارت کے اندر سے ہی ملی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، آفتاب کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا کہ وہ بھاگ کر اسی جگہ گھسے گا؟''

''لگتا تو نہیں۔'' عمران نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''تم نے دیکھا ہی ہوگا، گاڑی نے سیدھا چلتے چلتے ایک دم موڑ کاٹا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آفتاب نے اندازہ لگایا تھا کہ گھوڑے اب زیادہ دیر ساتھ نہیں دیں گے۔''

''ایسے علاقے میں ایسی صاف ستھری عمارت کا ہونا بھی حیران کن ہے۔ مجھے تو ایک اور شبہ ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' عمران نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور ایک جواں سال دیہاتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے گلے میں کئی تعویذ تھے اور وہ حلیے سے کھیت مزدور ہی لگتا تھا۔ بہت سے تماشائیوں کی طرح وہ بھی ہمارے پاس ہی کھڑا تھا اور دیوار کی اوٹ سے بار بار شفا خانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس صاف نظر آتا تھا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے مقامی لہجے میں کہا۔ ''یہ کوئی اسپتال ہے بھیّا؟''

''ہاں بھیّا! اندر مریج بھی ہیں۔ تیس چالیس تو جرور ہوں گے۔ چھوٹے بچے بھی ہیں اور خود بڑے ڈاکٹر جی اور ان کے ملاجم بھی۔''

''اوہو۔'' میں نے حیرت ظاہر کی پھر عام لہجے میں پوچھا۔ ''بڑے ڈاکٹر جی کون ہیں؟''

''پتا نا ہیں۔ ہم ان کو بس بڑے ڈاکٹر جی ہی کہوت ہیں۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔

قریب کھڑا ایک دوسرا شخص بولا۔ ''جاپانی ڈاکٹر ہیں۔ بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے ان کے ہاتھ میں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ان کا نام لی وان تو ناہیں؟''

''ہاں، اسی طرح کا ہے۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔ ''ہر مہینے تین روج کے لیے یہاں آتے ہیں۔ بڑا لمبا سفر کرتے ہیں۔ بھگوان ان کی اور ان کے ملاجموں کی رکھشا کرے۔'' دیہاتی کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ اس کی نگاہیں احاطے کے وسط میں پڑی لاش پر جم گئیں۔

''یہ کون ہے جس کو گولی لگی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑے ڈاکٹر جی کی ملاجم ہے۔ زبیدہ نام ہے۔ ہمارے گاؤں ہی کی ہے۔ بڑی اچھی عورت تھی۔'' دیہاتی کی آواز بھرا گئی۔

دراصل اس عورت کی نیلگوں وردی دیکھ کر ہی مجھے شک گزرا تھا کہ ایسا لباس میں کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اب سب کچھ یاد آگیا تھا۔ جب میں تل پانی میں تھا تو ڈاکٹر چوہان مجھے لے کر ڈاکٹر لی وان کے شاندار اسپتال میں گیا تھا۔ تب اس نے لی وان سے میری الیکٹرانک چپ کے بارے میں ڈسکشن کی تھی۔ وہیں اسپتال میں، میں نے ایسے کپڑوں والی دو تین نرسیں دیکھی تھیں۔

اچانک چھت پر سے بڑی گھن گرج کے ساتھ رائفل کے تین فائر ہوئے۔ لوگ سہم سہم کر مختلف چیزوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہمارے ساتھ بات کرنے والے دونوں دیہاتی بھی سراسیمہ ہو کر نیچے بیٹھ گئے۔ کسی شخص نے پکار کر کہا۔ ''ڈاکو گولی چلا رہے ہیں۔ سب لوگن یہاں سے دور ہٹ جاویں۔ ورنہ نقصان ہو جاوے گا۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب خاں نے لوگوں کو احاطے سے دور رکھنے کے لیے ہوائی فائر کیے ہیں۔ وہ بڑی چابک دستی اور سفاکی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اور سلطانہ نے مل کر عمارت میں موجود مرد و زن کو یرغمال بنالیا ہے اور کسی کو باہر نہیں نکلنے دے رہے۔

صورتِ حال میں بڑی تیز رفتار تبدیلیاں آئی تھیں جس نے عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی چکرا کر رکھ دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والی گھڑیوں میں کیا ہوگا۔ سلطانہ کا جو روپ میرے سامنے آیا تھا، وہ ناقابلِ تصور تھا۔ صرف ایک ہفتہ پہلے میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری بانہوں میں آکر اور آنکھیں بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانے والی سلطانہ کو میں ایک نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار دیکھوں گا اور یہ صورتِ حال اس کی اپنی پیدا کردہ ہوگی ..... میرا دل خون ہونے لگا تھا۔

آفتاب خاں کی پکارتی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ بڑی پاٹ دار آواز میں بول رہا تھا۔ تعجب تھا کہ اتنے فاصلے سے بھی اس کے الفاظ صاف سنائی دیے۔ اس نے جنوبی لہجے میں کہا۔ ''ام تم لوگوں کو صاف بتاتا ہے، اگر کسی نے اندر آنے کا کوشش کیا تو ام ان سب کو بھون ڈالے گا جو یہاں امارے پاس ہے۔ کسی سے کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اسپتال کے پھاٹک اور دیواروں سے دور رہو، ورنہ اپنے نقصان کا ذمے دار تم خود ہوگا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' ایک اونچی پگڑی والے شخص نے پکار کر پوچھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص اس ''اتھرا'' نامی گاؤں کا مکھیا تھا۔

''بس فی الحال ام یہی چاہتا ہے کہ کوئی اندر آنے کا کوشش نہ کرے۔ اگر کوئی ام سے بات کرنا چاہتا ہے تو وہ اکیلا اندر آئے اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔''

ہمارے ساتھ ٹرالی پر سوار ہو کر یہاں آنے والا ایک شخص گرج کر بولا۔ ''تم ہتھیارے ہو۔ تم نے خون کیے ہیں۔ ہم تم جیسے حرامزادے سے بات کاہے کو کریں گے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالیں گے۔''

ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والے تنومند رائفل بردار نے ایک گندی گالی دی اور آفتاب خاں کی طرف اندھا دھند دو فائر کیے۔

گاؤں کا مکھیا تڑپ کر رائفل بردار کے سامنے آگیا اور اسے مزید فائر کرنے سے روک دیا۔ وہ چلّا کر بولا۔ ''یہ کیا کرت ہو تم؟ تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ اندر ہمری عورتیں اور بچے ہیں۔ ان کا جیون خطرے میں ہے۔''

دو تین مقامی افراد آگے بڑھے اور انہوں نے تنومند رائفل بردار سے زبردستی رائفل چھین لی۔ رائفل بردار بھی طیش میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑتے، عمران ان کے درمیان آگیا۔ اس نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ''کیا کرت ہیں آپ لوگ۔ یہ جھگڑنے کا ناہیں، سوچنے کا وقت ہے۔ یہ ایک دم جنونی لوگن ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔ کسی بھی وقت کچھ کر سکت ہیں۔ ہمیں ان سے بات کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ اصل میں کون ہیں اور کیا چاہت ہیں۔''

''کون بات کرے گا آگے جا کر؟'' مکھیا نے ارد گرد دیکھ کر پوچھا۔

سب ٹھٹکے ہوئے نظر آئے۔ عمران ترت بولا۔ ''میں کرتا ہوں جی۔ یہ پٹھان لوگن ہیں اور مجھے تھوڑی بہت پشتو بھی آوت ہے۔''

مکھیا چند لمحے تذبذب میں نظر آیا پھر عمران کے چہرے کا اعتماد دیکھ کر وہ بولا۔ ''اگر تم اپنی مرضی سے جانا چاہت ہو تو چلے جاؤ۔ اگر بھگوان نہ کرے کوئی دُرگھٹنا ہوئی تو ہم ذمے دار ناہیں ہوں گے۔''

''ناہیں جی۔ آپ کی کوئی ذمے داری ناہیں۔ آپ بس پرارتھنا کریں۔''

''کیا بات کرو گے؟'' سانولی رنگت والے مکھیا نے پوچھا۔

''وہی جو آپ کرنا چاہت ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔''

چند سیکنڈ میں عمران نے مکھیا اور اس کے ساتھیوں کو شیشے میں اتار لیا بلکہ ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والا پنڈت نما شخص بھی اس بات پر راضی ہو گیا کہ عمران اندر جائے۔ عمران نے اپنی چادر اتار پھینکی اور پگڑی بھی کھول کر گلے میں ڈال لی۔ بہر حال چادر اتارنے سے پہلے اس نے اپنی رائفل بڑی صفائی سے میری چادر کی بغل میں منتقل کر دی تھی۔ رائفل دو حصوں میں تھی، اس کا بیرل کھول دیا گیا تھا۔ اپنی دھوتی کو اچھی طرح اڑس کر وہ بڑے اعتماد سے احاطے میں داخل ہوا۔ چھت پر سے یقیناً آفتاب نے عمران کو دیکھ لیا تھا اور پہچان بھی لیا تھا۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ آفتاب کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے مقامی دیہاتیوں کے سامنے ہمارے بھانڈا پھوٹ جائے۔ بہر طور اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔

چند سیکنڈ بعد آفتاب کی بلند آواز سنائی دی۔ اس نے عمران کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''قمیص اٹھا کر دکھاؤ۔''

عمران نے قمیص اٹھا کر دکھا دی۔

''دھوتی کھولو۔'' آفتاب نے چھت پر سے حکم صادر کیا۔

عمران نے اپنے میلے کچیلے تہ بند کے بند کھول کر دکھا دیے۔ تہ بند کے نیچے زیر جامہ تھا۔

''ٹھیک ہے، آگے آجاؤ۔''

عمران سیڑھیوں کی طرف اوجھل ہو گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ آفتاب اب دوست نہیں دشمن تھا۔ دو گھنٹے پہلے ہم نے اس پر رائفل تانی تھی۔ اب عمران اس کی رائفل کے نشانے پر تھا۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ آفتاب کے ساتھ صرف سلطانہ ہی ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی گھوڑا گاڑی سے نکل کر عمارت میں روپوش ہوا ہے۔ مجھے عمران کی صلاحیتوں اور اس کی ''لک'' پر بھروسا تھا۔ وہ مشکل ترین حالات میں بھی راستے نکال لیتا تھا۔ اسے گفتگو اور قائل کرنے کا فن آتا تھا مگر دوسری طرف بھی ایک نہایت سرپھرا شخص تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے یوں بیگانہ ہوا تھا جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔ اب اس کے سر پر خون سوار تھا۔

عمران کی واپسی میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ اب تقریباً پانچ چھ سو مرد و زن اس نیم پختہ عمارت کے گرد اور آس پاس جمع ہو چکے تھے۔ بہت سی لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور رائفلیں اپنی چمک دکھانے لگی تھیں۔ بہر حال، یہ سارے کے سارے مقامی دیہاتی تھے اور یہی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی نے مجھے میری اصل حیثیت سے نہیں پہچانا تھا۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں جارج گورا کو عبرت ناک شکست دے کر اس کا پیٹ چاک کرنے والا شخص ایک، گرد سے اٹے ہوئے دیہاتی کے روپ میں ان کے درمیان موجود ہے۔

عمران کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ عمران کو دیکھ کر ہجوم میں ہلچل نمودار ہوئی۔ عمران پھاٹک سے گزر کر ہمارے درمیان آگیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس کے تہ بند کی ڈب میں کوئی ایسی شے موجود ہے جو پہلے نہیں تھی..... لیکن یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ عمران نے گاؤں کے مکھیا بلرام اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ اندر ایک عورت اور دو بندے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پٹھان اور دوسرا مقامی لگتا ہے۔ دونوں کے پاس رائفلیں ہیں، اس کے علاوہ دھماکا خیز مواد بھی ہے۔ انہوں نے یہ دھماکا خیز مواد اسپتال کے اکلوتے وارڈ میں اس طرح رکھ دیا ہے کہ اسے کسی بھی وقت اڑایا جا سکتا ہے۔ بڑا ڈاکٹر لی وان بھی اندر ہی ہے۔ وہ اور اس کا عملہ، حملہ آوروں کے قبضے میں ہے۔ سب کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔

''یہ لوگن چاہتے کیا ہیں؟'' مکھیا نے پوچھا۔

''پہلے تو وہ بات ہی ناہیں سن رہے تھے جی۔ پھر میں نے پٹھان سے پشتو میں بات کی اور اس کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے وہ تھوڑے سے نرم پڑے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ یہاں سے جانا چاہت ہیں۔ انہیں تازہ دم گھوڑوں والی ایک بڑی گھوڑا گاڑی دی جاوے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے علاوہ گھوڑا گاڑی کے دو فالتو گھوڑے دیے جاویں..... اور وشواس دلایا جاوے کہ ان کا پیچھا ناہیں کیا جاوے گا۔ ایسا ہو گیا تو وہ چلے جاویں گے۔"

ہمارے ساتھ آنے والا پنڈت نما شخص تڑخ کر بولا۔ "یہ ناہیں ہو سکت۔ ان لوگن نے ہمارے گاؤں کے کم از کم دو بندوں کا جیون لیا ہے۔ یہاں آکر بھی انہوں نے ایک نردوش ناری کی ہتھیا کی ہے۔ اب یہ ہمیں الٹا دھمکا رہے ہیں اور یہاں سے نکل جانا چاہت ہیں۔"

مکھیا اور پنڈت نما شخص ایک بار پھر الجھ پڑے۔ مکھیا نے کہا۔ "تم بدھی (عقل) کی بات ناہیں کر رہے ہو پنڈت۔ کیا تم یہ چاہت ہو کہ اگر تمہارے گاؤں کے بندے مارے گئے ہیں تو اس گاؤں کے بھی دس بیس بندے مارے جاویں؟ تم دیکھ رہے ہو ان لوگن کے سر پر خون سوار ہے۔ انہوں نے بڑے ڈاکٹر جی کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کو بند کر لیا ہے۔ یہ سب کچھ اڑا دیں گے تو پھر کیا ہووے گا؟ ہمیں اس بارے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔"

پنڈت نما شخص بولا۔ "تم لوگن ضرورت سے زیادہ ڈر گئے ہو۔ دھماکے سے سب کو اڑا دینا اتنا آسان ناہیں ہے۔ اور کیا پتا ان کے پاس بارود ہے بھی یا وہ کیول ڈرا وا دے رہے ہیں۔"

عمران جلدی سے بولا۔ "میں نے خود دیکھا ہے جی۔ انہوں نے وارڈ میں دو تین جگہ کچھ رکھا ہوا ہے۔ کالے رنگ کے تار بھی بچھائے ہوئے ہیں۔ وہ بارود کے تار ہی ہو سکت ہیں۔ مجھے وشواس ہے جی....."

پنڈت نما شخص کا نام مہاویرا تھا۔ وہ بولا۔ "جو کچھ بھی ہے لیکن ہم کو جلد بازی ناہیں کرنی چاہیے۔ ہم کو چاہیے کہ ان لوگن کو کچھ دیر باتوں میں لگائیں اور ایک دو گھنٹے کا وقت گزاریں۔ اتنے میں ہم اپنے کچھ بندے ہنومان گاؤں کی طرف بھیجیں۔ وہاں چوکی موجود ہے۔ چوکی سے سپاہی یہاں آسکت ہیں۔ ہو سکت ہے کہ اتنی دیر میں کسی دوسری جگہ سے بھی مدد آجاوے۔ تب ان قاتلوں کے ساتھ اچھے طریقے سے معاملہ نمٹایا جا سکت ہے۔"

عمران نے کہا۔ "لیکن آپ لوگن نے میری آخری بات تو سنی ہی ناہیں۔"

"کیسی بات؟"

"ان کتوں نے ہمیں گھوڑا گاڑی دینے کے لیے صرف آدھ گھنٹے کا سمے دیا ہے اور اس سمے میں سے آٹھ دس منٹ گزر بھی چکے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر آدھ گھنٹے میں گاڑی ناہیں پہنچی تو وہ ایک بندے کو گولی مار کر باہر برانڈے میں پھینک دیویں گے اور پھر ہر پندرہ منٹ بعد ایک بندے کی ہتھیا کرتے جاویں گے۔ پٹھان کے پاس گھڑی ہے اور اس نے گھڑی دکھا کر مجھے ٹائم بتایا ہے۔"

مہاویرا اور مکھیا بلرام سمیت کئی افراد کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ "اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔" عمران نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کہوت ہیں کہ ہم یہاں سے جاتے وقت آٹھ دس بندوں کو ضمانت کے طور پر اپنے ساتھ رکھیں گے۔ جب سمجھیں گے کہ محفوظ جگہ پر پہنچ گئے ہیں تو انہیں چھوڑ دیویں گے۔ ضمانتیوں میں کوئی عورت ناہیں ہووے گی۔ بڑا اور چھوٹا ڈاکٹر ہووے گا اور کچھ دوسرے بندے ہوویں گے۔"

مکھیا بلرام نے اپنے ماتھے سے پسینا پونچھا اور ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ابھی پنچایت میں مشورہ کرے گا۔ اس نے اپنے آس پاس موجود پنچوں کو اکٹھا کیا اور حویلی کی طرف چلا گیا۔ لوگ عمران کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ اس سے اندر کے حالات جاننا چاہ رہے تھے۔ عمران نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے مکھیا اور دیگر لوگوں کو بتایا تھا۔ وہ اندر کی صورت حال کو سنگین بتا رہا تھا۔ تاہم میرا اندازہ تھا کہ وہ اس سنگینی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ اس کا یہ انکشاف بھی مجھے مشکوک لگ رہا تھا کہ اندر آفتاب خان کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی ہے۔

کچھ دیر بعد جب عمران کے گرد سے بھیڑ چھٹی تو میں نے مدھم لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا واقعی آفتاب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ایک نیوز چینل والا اپنی "خبر" دوسرے چینل کو نہیں دیتا، اپنی جان دے دیتا ہے۔"

"لیکن میں چینل والا نہیں ہوں۔"

"کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ چینل والا ہے یا نہیں۔ آج کل تو اینٹ اکھاڑیں تو نیچے سے کیمرے والا اچھل کر باہر آجاتا ہے۔ ناظرین کم پڑتے جا رہے ہیں، چینل زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر اینکر ایک ہی دہائی دے رہا ہے، ہمارے ساتھ رہیے گا۔ اب تو بچے بھی اور کھلونوں کی جگہ چینل چینل کھیلتے نظر آتے ہیں۔ دیکھنا بہت جلد ہر فیملی کا اپنا اپنا چینل ہوگا۔ فیملی کا سربراہ ہی اس کا ڈائریکٹر کہلائے گا۔"

"تم بکواس ہی کرو گے یا کچھ بتاؤ گے؟"

"میں بتاؤں گا، تب بھی تم کہو گے کہ بکواس کر رہا

ہے۔"

"نہیں کہتا۔"

"آفتاب خاں اکیلا ہے۔" عمران نے خلافِ توقع سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ صرف سلطانہ ہے۔ سلطانہ نیچے ہے، آفتاب چھت پر ہے۔ چھت پر ایک روشن دان ہے۔ اس روشن دان کے نیچے مریضوں سے بھرا ہوا وارڈ ہے۔ آفتاب اوپر سے کسی بھی مریض کو یا اس کے لواحقین کو شوٹ کر سکتا ہے...... وہ بالکل جنونی نظر آرہا ہے۔"

"بارود والی جو بات تم نے کی ہے؟"

"وہ بھی درست نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ لوگ دباؤ میں آئیں اور آفتاب کو یہاں سے نکلنے کا راستہ دینے میں دیر نہ کریں۔ آفتاب کے پاس بس ایک رائفل ہے اور اس کے پچاس ساٹھ راؤنڈز ہیں۔ یہ رائفل اس نے یہیں اسپتال کے چوکیدار سے چھینی ہے۔"

"کیا تم نے سلطانہ کو دیکھا ہے؟"

"نہیں لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں کہ آفتاب کے ساتھ سلطانہ ہی بھاگ کر یہاں پہنچی ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ عمران کی اس اطلاع کے بعد یہ امید دم توڑ گئی کہ شاید اس مار دھاڑ میں شریک ہونے والی سلطانہ نہ ہو۔ سینے میں اندھیرا سا اتر گیا۔

"سلطانہ کے پاس بھی کوئی ہتھیار ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آفتاب نے بتایا نہیں مگر لگتا ہے کہ ہتھیار ہے۔ ورنہ وہ اسے نیچے اکیلا چھوڑ کر اوپر نہ آتا۔"

"آفتاب کا رویّہ کیسا رہا ہے تمہارے ساتھ؟"

"وہی جو دشمن کا دشمن سے ہوتا ہے۔ وہ ایک دم غیر نظر آرہا ہے۔ اس نے مجھے خود سے پندرہ بیس فٹ دور رکھا ہے اور تمام وقت رائفل مجھ پر تانے رکھی ہے۔ پہلے تو وہ کوئی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ صرف مرنے اور مارنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر میں نے کوشش کی اور اس کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ابھی وقت ہے، وہ سلطانہ کے ساتھ یہاں سے نکل سکتا ہے۔ ابھی اس کے گرد صرف مقامی لوگ ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد جب حکم کے کارندے اور زرگاں کے مسلح گارڈز اپنے جدید اسلحے کے ساتھ یہاں پہنچ گئے تو اس کے لیے اپنی کوئی شرط منوانا ناممکن ہو جائے گا۔ شکر ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔ اب اللہ کرے یہ مکھیا اور پنچ وغیرہ بھی کوئی عقل کا فیصلہ کر لیں۔"

"اگر انہوں نے نہ کیا تو پھر؟"

"پھر خون خرابا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آفتاب اپنی دھمکی کو عملی شکل دے گا۔ وہ بے گناہ لوگوں کو مارنا شروع کر دے گا۔"

"کیا جو لوگ مندر سے آفتاب اور سلطانہ کا پیچھا کرتے یہاں پہنچے ہیں، وہ انہیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟"

"اگر یہ دونوں جلدی نکل جائیں تو نکل بھی سکتے ہیں۔ میں نے بتایا ہے نا کہ آفتاب اور سلطانہ اکیلے نہیں نکلیں گے۔ وہ اپنے ساتھ کم از کم آٹھ دس یرغمالی رکھیں گے، اسی لیے آفتاب نے بڑی گھوڑا گاڑی بھی مانگی ہے..... میں تو اس کی باتیں سن سن کر حیران ہوا ہوں۔ یہ وہ آفتاب لگتا ہی نہیں جس کے ساتھ ہم نے تہ خانوں میں وقت گزارا ہے۔"

ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے جب پھر کئی افراد عمران کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے اندر کے حالات پوچھنے لگے۔ یہ سب سیدھے سادے مقامی دیہاتی تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک اس دور دراز جگہ پر کسی نے ہمیں پہچانا نہیں تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر دور تک کھیت تھے اور ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور راستے تھے۔ اس گاؤں کے بیشتر مکان کچے تھے۔ کچی چھتوں پر اور گلیوں کی نکڑوں پر نیم عریاں بچے اور رنگ برنگی اوڑھنیوں والی دیہاتنیں نظر آتی تھیں...... ایک حویلی کی دیوار پر بہت سے اُپلے لگائے گئے تھے۔ ان اُپلوں کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔

اچانک مکھیا بلرام اور اس کے پنچ تیز قدموں سے واپس آتے دکھائی دیے۔ ان کے پیچھے روتی پیٹتی عورتیں اور بچے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے عزیز اسپتال کے اندر گھر گئے تھے۔ اس کے علاوہ احاطے میں مری پڑی عورت کے لواحقین بھی گریہ زاری کرتے دکھائی دیے۔ وہ انگلیوں سے احاطے کی طرف اشارے کر رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے جاتا اور عورت کی لاش کو اٹھا کر لے آتا۔

مکھیا اور پنچوں نے عمران سے چند ایک سوال مزید پوچھے۔ تب دو پنچ عمران کے ساتھ احاطے کے اندر گئے۔ آفتاب خاں چھت پر بالکل چوکس موجود تھا۔ اس نے پہلے یہ یقین کیا کہ اندر آنے والے افراد بالکل غیر مسلح ہیں پھر اس نے انہیں آگے جانے کی اجازت دی۔

اس بار ہونے والی گفتگو پانچ دس منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہی۔ پنچ دھوتیاں پھڑ پھڑاتے ہوئے واپس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئے۔ ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حملہ آور طیش میں ہیں۔ آدھ گھنٹے سے اوپر ہو چکا ہے۔ انہوں نے چھوٹے ڈاکٹر کو مارنے کی تیاری کرلی ہے۔ دو چار منٹ اور گزر گئے تو وہ اس راج نامی ڈاکٹر کو گولی مار کر چھت سے نیچے پھینک دیں گے۔

پنچوں کے واپس آنے کے صرف پانچ منٹ بعد مکھیا بلرام نے اعلان کیا کہ انہوں نے اندر موجود لوگوں کا جیون بچانے کے لیے حملہ آوروں کی بات ماننے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں گھوڑا گاڑی اور گھوڑے دیے جا رہے ہیں۔ یہ پیغام لے کر عمران ایک ادھیڑ عمر پنچ کے ساتھ اندر گیا۔ مکھیا بلرام اور اس کے دیگر پنچ ان لوگوں کو سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گئے جنہیں یہ فیصلہ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ امید تھی کہ عمران اور پنچ جلد ہی لوٹ آئیں گے مگر ان کی واپسی میں پھر تاخیر ہوئی۔ کچھ گڑبڑ لگ رہی تھی۔ وہ دونوں قریباً پندرہ منٹ بعد واپس آئے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ادھیڑ عمر پنچ نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

”وہ حرامجادے مکر گئے ہیں۔ وہ کہوت ہیں کہ وہ کسی کو چھوڑیں گے اور نہ یہاں سے جاویں گے۔ اگر کسی نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو وہ سب کچھ اڑا ڈالیں گے۔ انہوں نے بڑے ڈاکٹر جی کے ہاتھ پیچھے موڑ کر ایک رسّی سے باندھ دیے ہیں اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔“

”وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ مکھیا نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”کچھ پتا ناہیں جی۔ شاید ان کو شبہ ہے کہ ان کے ساتھ وشواس گھات ہوگا۔ وہ باہر نکلے تو مارے جاویں گے۔“

”لیکن اس سے پہلے تو وہ سب کچھ مان رہے تھے؟“ ایک پنچ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”لیکن اب وہ کچھ نہیں مان رہے۔ پٹھان نے کہا ہے کہ وہ سرکاری لوگن سے بات کرنا چاہت ہیں۔“

”سرکاری لوگن؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، وہ کہوت ہیں کہ کسی سرکاری بندے کو بلایا جاوے..... یا پھر کوئی فوجی افسر یہاں آوے۔“

یہ تبدیلی حیران کن تھی۔ عمران بھی الجھا ہوا اور خاموش نظر آیا۔

ہجوم میں اب اور طرح کا اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ جن لوگوں کے عزیز اندر تھے، وہ زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کئی پھر واویلا کرنے لگے۔ آفتاب خان نے عورت کی لاش احاطے میں سے اٹھانے کی اجازت دے دی تھی۔ عمران اور پنچ امام دین دو دیگر افراد کے ساتھ احاطے میں گئے اور عورت کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر باہر لے آئے۔ سات ایم ایم رائفل کی گولی اس کی پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان لگی تھی اور سامنے سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کی نیلی یونیفارم سے اٹھنے والی ”دواؤں کی بو“ سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے چاری یہاں نرس کے طور پر مریضوں کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ اس کی موت نے ہر کسی کو افسردہ اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کے رشتے دار نوحہ کناں تھے جن میں اس کا اسکول ماسٹر شوہر اور دو چھوٹے بچے بھی تھے۔

میں نے عمران کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ”یہ کیا چکر چل گیا ہے یار؟“

”ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا..... لگتا ہے کہ آفتاب اور سلطانہ نے اچانک اپنا ارادہ تبدیل کیا ہے۔ شاید کوئی نئی بات ان کے سامنے آئی ہے جس کی وجہ سے وہ جانا نہیں چاہ رہے۔“

”وہ سرکاری لوگوں کو بلانے کی بات بھی کر رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔“

عمران نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں تھیں۔ وہ بے خیالی میں اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھو رہا تھا۔ یہ بھی اس کے سوچنے کا ایک انداز تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ مجھ سے بولا۔ ”اب ہم زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتے۔ کسی بھی وقت ہمیں پہچانا جا سکتا ہے۔“

”تو پھر؟“

”ہمیں کھسکنا پڑے گا۔“ اس نے کہا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

میری سمجھ میں بھی یہی بات آ رہی تھی کہ اب یہاں سے کھسکنا ہی بہتر ہے۔ زیادہ تر لوگ جواں سال عورت کی لاش کی طرف متوجہ تھے۔ ہم ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھے۔ اچانک میری نظر تین گھڑسواروں پر پڑی وہ چمکیلی دھوپ میں گرد اڑاتے تیزی سے موقعِ واردات کی طرف آ رہے تھے۔ یہ سرخی مائل پگڑیوں والے زرگاں کے مسلح سپاہی تھے۔ عمران نے بھی انہیں تاک لیا تھا۔ ہم دونوں نے چہرے اپنی میلی کچیلی پگڑیوں میں چھپائے اور رخ پھیر کر دوسری طرف نکل گئے۔ قریباً دس منٹ بعد ہم موقعِ واردات سے محفوظ فاصلے پر کماد کے کھیت میں موجود تھے۔ ہم ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئے۔ عمران کے کہنے پر میں نے چادر کے نیچے سے دور مار رائفل نکالی اور اس کے بیرل کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فٹ کر کے اسے تیار حالت میں کر لیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے ایک چھوٹا سا ریڈیو نما آلہ نکال لیا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایک واکی ٹاکی تھا۔

”اوئے! یہ کہاں سے ملا تجھے؟“ میں نے پوچھا۔

”اسپتال سے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کا ہے، پر اب آفتاب کے قبضے میں ہے۔ اس کا دوسرا ”سیٹ“ آفتاب کے پاس ہے۔“

”اس نے خود دیا تھا؟“

”تو کیا میں چھین کر لایا ہوں؟“ عمران نے کہا اور سیٹ کو آن کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مجھے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے شبہ تھا کہ عمران کی قمیص کے نیچے تہ بند کی ڈب میں کچھ ہے۔ اب یہ شبہ درست نکلا تھا۔ عمران نے ”سیٹ“ کا چمکیلا انٹینا کھینچا۔ بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کی۔ سیٹ کے بیٹری سیل وغیرہ دیکھے لیکن اس میں زندگی کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اس نے جھلا کر سیٹ کو تھپڑ رسید کیا۔ وہ ایک دم جاگ اٹھا۔ اس پر دو چھوٹی لائٹس روشن ہو گئیں، ایک سرخ دوسری سبز۔ اسپیکر سے گھوں گھوں کی مدھم آواز آنے لگی۔

عمران نے ایک کھٹکا دبایا تو بیپ کی باریک آواز ابھری۔ یہ بیپ دوسرے سیٹ پر جا رہی تھی۔ آٹھ دس دفعہ کی بیپ کے بعد کھٹ پٹ ہوئی اور اسپیکر پر آفتاب کی آواز ابھری۔ وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ”ہیلو..... کون ہے؟“

”عمران بول رہا ہوں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”یہ کیا کر رہے ہو تم؟ بے موت مارے جاؤ گے۔ ساتھ میں وہ بھی جان سے جائے گی۔“

”تم اپنا نصیحت اپنے پاس رکھو۔ ام جو کچھ کر رہا ہے، سوچ سمجھ کر کر رہا ہے۔ اور ایک بار پھر ام تم کو بتا دینا چاہتا ہے، کسی نے کوئی چالاکی مالاکی دکھایا تو بہت خون خرابا ہوگا۔ ام کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

”لیکن اب کیا نئی بات ہوئی ہے؟ تمہارا مطالبہ تو مان لیا گیا تھا۔ مکھیا نے بڑی گھوڑا گاڑی اور گھوڑوں کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ یہ لوگ تمہیں راستہ دینے پر تیار ہیں۔ تم اپنے ساتھ ضمانت کے طور پر کچھ لوگوں کو بھی رکھ سکتے ہو۔“

”نہیں، اب ام نہیں جائے گا۔ اب امارا مطالبہ کچھ اور ہے اور یہ مطالبہ ام کسی اور کو نہیں، صرف حکم کے لوگوں کو بتائے گا۔“

عمران نے کہا۔ ”حکم کے لوگ دس بیس کی تعداد میں نہیں سیکڑوں کی تعداد میں آئیں گے اور بہت جلد ان کو یہ شک بھی ہو جاتا ہے کہ جولڑکی تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں پہنچی ہے، وہ سلطانہ ہے..... ایک بار ان کو یہ شک ہو گیا تو سمجھ لو کہ وہ آخری حد تک جائیں گے۔ تم اس پورے گاؤں کو بھی گولیوں سے اڑا دو تو وہ تمہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔“

”وہ جانے دیں گے۔ ان کا باپ بھی ام کو نہیں روک سکتا۔ تم خوامخواہ اپنا وقت برباد مت کرو عمران صاحب۔ تم اس معاملے سے نکل جاؤ ورنہ پچھتانا پڑے گا۔“

میں نے واکی ٹاکی پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”آفتاب خاں! میں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایک بار اسے بلا دو۔“

”وہ اپنی جگہ پر ہے۔ وہ اب نہیں آ سکتا۔ اس کی طرف سے بھی تم دونوں کے لیے یہی پیغام ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ بُری طرح پھنس جاؤ گے۔“

اس کے ساتھ ہی کسی بڑی عمر کے مرد کی زور زور سے رونے کی آواز آئی اور آفتاب خاں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سلطانہ کی اصلیت سامنے آنے والا صدمہ ہی کچھ کم نہیں تھا، اب یہ نئی آفت آ گئی تھی۔ آفتاب یہاں سے بحفاظت نکلنے کے بجائے ایک بڑی مصیبت کو دعوت دے رہا تھا۔

ہم نے پھر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ واکی ٹاکی یکسر خاموش تھا۔

عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آفتاب کے ہاتھ میں کوئی ایسی شے لگی ہے جس کے بعد اس کے اعتماد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور اب وہ اپنی کچھ شرطیں منوانا چاہتا ہے۔“

”ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے؟“

”ہو سکتا ہے کہ اسلحہ..... یا پھر کوئی ایک ایسا شخص جو حکم وغیرہ کے لیے بہت اہم ہو..... یا پھر حکم اور اس کے ساتھیوں کی کوئی خاص کمزوری۔“

قریباً ایک گھنٹے کے اندر صورتِ حال بہت تبدیل ہو گئی۔ حکم کے کم و بیش دو درجن سپاہی یہاں پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایک جیپ پر آئے تھے۔ یہ جیپ غالباً ان جیپوں میں شامل تھی جو ہماری تلاش میں یہاں چکرا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ایک اور جیپ بھی پہنچ گئی۔ پہلی جیپ

بڑی تیز رفتاری سے واپس روانہ ہوگئی۔ غالباً یہ لوگ مزید نفری لانے اور حکامِ بالا کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے لپکے تھے۔ ہم یہ ساری نقل وحرکت گنّے کے اونچے کھیت کے اندر سے دیکھ رہے تھے۔ اب ہمارے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ واپس بستی میں پہنچیں۔ آفتاب اور سلطانہ بھی وہ قیمتی وقت ضائع کر چکے تھے جو انہیں یہاں سے نکال سکتا تھا۔ حکم کے سپاہیوں کے آنے کے بعد اب یقیناً وہ آوازیں بھی دب گئی تھیں جو اندر پھنس جانے والے لوگوں کے عزیزوں کی تھیں۔ اب یہ لوگ اصرار نہیں کر سکتے تھے کہ حملہ آوروں کی بات مان کر لوگوں کو رہا کرالیا جائے۔

مزید ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ کوشش کے باوجود ہم دوبارہ آفتاب یا سلطانہ سے رابطہ نہیں کر سکے۔ کماد کا کھیت ہمارے لیے نہایت محفوظ پناہ گاہ تھا۔ اگر کوئی دیہاتی اس طرف آتا بھی تو ہم خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے دائیں بائیں ہو سکتے تھے۔ حرکت کرنے سے پودوں میں سرسراہٹ کی آواز ضرور پیدا ہوتی تھی لیکن اس سرسراہٹ کو کسی کتّے بلّی کی حرکت سے بھی منسوب کیا جا سکتا تھا۔

واپس جانے والی جیپ کچھ دیر بعد تیز رفتاری سے دھول اڑاتی واپس آگئی۔ اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ خوش گوار سنہری دھوپ میں سائے لمبے ہوتے جارہے تھے۔ ہم نے دور سے دیکھا، جیپ میں سے کوئی اعلیٰ فوجی افسر نکل کر شفاخانے کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس کی کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس واقعے کے بیس پچیس منٹ بعد اچانک ہمارا رابطہ ایک بار پھر آفتاب خاں سے ہوگیا۔ عمران نے بٹن دبایا تو اسپیکر پر آفتاب کی آواز ابھری۔

"ہیلو...... کون؟"

"میں عمران بول رہا ہوں۔ یہ جیپ پر ابھی کون آیا ہے یہاں؟"

"حکم کا ہندو فوجی افسر تھا۔ ام نے اسے بتا دیا ہے کہ ام کیا چاہتا ہے۔ اگر وہ امارا ڈیمانڈ پورا کرتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ام ان سب کو ایک ایک کر کے مارے گا اور لاشیں باہر برانڈے میں پھینکے گا۔" آفتاب کی آواز میں شعلے لپک رہے تھے۔

"کیا ڈیمانڈ کی ہے تم نے؟"

"ام کو ہاشم صاحب کی رہائی چاہیے...... فوراً...... ان لوگوں کو ہاشم صاحب کو چھوڑنا پڑے گا اور یہاں پہنچانا پڑے گا۔"

"ہاشم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو۔ بس ام چاہتا ہے کہ حکم اس کو رہا کرے اور وہ یہاں پہنچ جائے۔"

"لیکن وہ تمہاری بات کیوں مانیں گے؟" عمران نے پوچھا۔

"اس لیے کہ ان کا دُکھتا رگ امارے قبضے میں آگیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"راج بھون کا کاپر (کافر) عورت امارے پاس ہے۔ وہ لوگ امارا بات نہیں مانے گا تو ام اس حرامزادی کو ننگا کر کے اور اس کے سر میں روشن دان کھول کر اسے برانڈے میں پھینکے گا۔ اور یہ کوئی مامولی عورت نہیں ہے۔ یہ جارج گورا کا بہن اور سرجن اسٹیل کا بیوی ہے۔"

میں اور عمران سنّاٹے میں رہ گئے۔ میں نے پوچھا۔ "تم...... ماریا کی بات کر رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ یہ امارے سامنے بیٹھا ہے۔ ام نے اس کو مرغی کی طرح باندھ کر ڈالا ہوا ہے۔ کسی بھی وقت اس کے گلے پر چھری چلا دے گا۔"

اس کے ساتھ ہی چلّانے کی نسوانی آواز سنائی دی۔ آفتاب خاں نے شاید اسے ٹھوکر ماری تھی۔ ہم ششدر تھے۔ میں نے قریباً پہچان لیا۔ یہ آواز ماریا ہی کی تھی۔

"یہ یہاں کیسے؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بُرا وقت بندے کو خود گھیر کر اس کی اصل جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔" آفتاب بولا۔ "یہ یہاں شکار پر آیا ہوا تھا۔"

"شکار...... کس کا شکار؟"

"ڈاکٹر لی وان کا...... یہ سفید کتیا اس پر ڈورے ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس سے تم دونوں کے بارے میں سن گن لینا چاہتا تھا۔ یہ دو دن پہلے مریضہ کے روپ میں اپنا منہ سر لپیٹ کر یہاں پہنچا تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ مقامی کپڑوں میں یہ انگریز عورت ہے۔ یہ تو سلطانہ بی بی نے اسے پہچانا اور ام کو بتایا۔"

"ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عمران بولا۔

"ابھی ام تم کو سمجھا بھی نہیں سکتا۔ ابھی ام تم سے صرف یہ کہتا ہے کہ اس ماملے سے نکل جاؤ۔ ام کو امارے حال پر چھوڑ دو۔ ام ان لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اس پر بھی غور کر لیتے ہیں لیکن ہمیں بتاؤ تو سہی کہ ماریا یہاں پہنچی کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

واکی ٹاکی پر خاموشی طاری ہوگئی۔ بس گھوں گھوں کی مدھم آواز آتی رہی۔ ہمیں لگا کہ شاید آفتاب نے پھر سلسلہ منقطع کر دیا ہے مگر پھر اس کی آواز ابھری۔ "ام نے تم کو بتایا ہے نا کہ یہ شکارن ہے، اور یہ بندوق مندوق سے نہیں اپنے حسن سے شکار پر ماتا ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کو اپنی گوری چمڑی پر رجھانے کے لیے یہاں آیا تھا۔ سامبر مقابلے میں اپنے بھائی کی موت کے بعد سے یہ جلے پاؤں کا بلی...... بلکہ کتیا بنا ہوا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح یہ بھی تم دونوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس کے خصم سرجن اسٹیل کو شک تھا کہ تمہاری گردن سے "بجلی کا چپ" کسی عام شخص نے نہیں نکالا، کسی بہت سیانے ڈاکٹر نے ہی ایسا کیا ہوگا۔ ان لوگوں کے دماغ میں ڈاکٹر لی وان یا چھوٹے ڈاکٹر کے بارے میں شک تھا۔ یہ کتیا جس کو تم ماریا کہتا ہے، مریض کے روپ میں ڈاکٹر لی وان کے پاس آیا۔ یہ اس سے اندر کا بھید لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ بھید لیتا، اس کا اپنا بھید کھل گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ شکاری خود شکار ہوا۔" اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے لیٹی ماریا کو ٹھوکر وغیرہ رسید کی۔ اس کے چلّانے اور پھر انگلش میں گالیاں دینے کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔

"خاموش۔" آفتاب دہاڑا۔ "ابھی تمہارا ایک انگلی کٹا ہوا ہے۔ ام باقی بھی کاٹ ڈالے گا پھر یہ سارا انگلی تمہارے اندر ٹھونسے گا...... تمہارے پلید منہ کے اندر اور تمہیں پھانسی پر لٹکا دے گا۔" آفتاب کا لہجہ لرزا دینے والا تھا۔

ہم صورتِ حال کی اس قطعی غیر متوقع کروٹ پر ششدر تھے۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ سرجن اسٹیل کی بیوی اور جارج کی بہن، آفتاب کے قبضے میں آگئی ہے۔

ماریا نے غالباً پھر واویلا شروع کر دیا تھا۔ آفتاب نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔

اب سچویشن سمجھ میں آنے لگی تھی۔ آفتاب نے یہ بات تو ٹھیک ہی کہی تھی کہ ماریا ایک شکارن تھی۔ وہ اپنے جسم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس سے پہلے ہم دیکھ ہی چکے تھے کہ وہ رات کے اندھیرے میں ایک پارسی کو "جسمانی رشوت" دے کر راہِ فرار اختیار کر گئی تھی۔ شاید یہاں وہ ڈاکٹر لی وان یا اس کے اسسٹنٹ کو جنس کے جال میں جکڑنے کے لیے وارد ہوئی تھی۔ آفتاب کا کہنا تھا کہ وہ ان سے ہمارے بارے میں کوئی "کلیو" حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”اس کا جواب لاہور میں اکثر رکشوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے، وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”یہ تو بہت لمبا چکر چل گیا ہے۔ اگر واقعی ماریا، آفتاب کے قبضے میں آچکی ہے تو زرگاں میں تہلکہ مچ جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ انہیں ہاشم رازی کو رہا ہی کرنا پڑ جائے۔“

”لیکن یہ جو کچھ بھی ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ یہ اس بھانڈیل اسٹیٹ کو بڑی تیزی سے لڑائی اور تباہی کی طرف لے جارہا ہے۔“ عمران کی پیشانی پر بال لہرا رہے تھے اور آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔

موسم تبدیل ہو رہا تھا لیکن رات کے وقت اب بھی کافی سردی ہوتی تھی۔ جوں جوں شام کے سائے لمبے ہوتے گئے، کماد کے اس کھیت میں خنکی بڑھتی گئی۔ شام کے فوراً بعد ہی اوس بھی گرنا شروع ہوگئی۔ بستی میں چراغ روشن ہوگئے۔ شفا خانے کی عمارت کے اردگرد اب ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ زرگاں کے بیسیوں مسلح سپاہی اور گارڈز بھی یہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے شفا خانے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے ہر طرف حرکت کر رہے تھے۔

میرے سینے میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ سلطانہ کی صورت بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی اور دل کو درد سے لبریز کر دیتی تھی۔ دو چار دن میں ہی کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ اوپر تلے دل فگار انکشاف ہوئے تھے اور اب وہ ایک بدترین صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ جب دو دن پہلے میں نے تہ خانوں میں آفتاب اور سلطانہ کو رازدارانہ گفتگو کرتے سنا تھا۔ سلطانہ نے کہا تھا..... آفتاب! ایک بات ذہن میں رکھنا، یہ آخری بار ہو گا..... یقیناً وہ اسی خطرناک مہم جوئی کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ زہر سے بھرا ہوا ایک پیکٹ اپنے لباس میں چھپا کر مندر میں کسی گلزار نامی معذور عورت تک پہنچائے گی۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جائے گا۔ لیکن انسانی ارادے اور منصوبے ہمیشہ تو پورے نہیں ہوتے۔ جہاں، سلطانہ کے خیال میں اس کا کام ختم ہو جانا تھا، وہیں سے صورتِ حال نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ مندر کے اندر گڑبڑ ہوئی اور سلطانہ خود کو بچانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے دفاع میں تیز دھار آلہ بھی استعمال کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے تھا۔ وہ اور آفتاب کم از کم تین افراد کے قتل میں ملوث ہوچکے تھے اور اب سیکڑوں افراد کے گھیرے میں تھے۔ ان کے حوالے سے اگر کوئی امید تھی تو یہی تھی کہ وہ اپنے پاس سفید فام ماریا کی موجودگی کا دعویٰ کر رہے تھے۔

عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ سردی کے سبب وہ قدرے لرزاں آواز میں بولا۔ ”کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ واقعی تمہاری شاگردی اختیار کرلی جائے۔“

”کس معاملے میں؟“

”سردی، گرمی اور بھوک پیاس جھیلنے کے معاملے میں۔ یار! تم تو ایسے بیٹھے ہو جیسے خالہ جی کا ڈرائنگ روم ہو اور باقاعدہ انگیٹھی دہک رہی ہو۔ یہاں تو اپنی قلفی جمی جارہی ہے۔“

”تو بن جاؤ شاگرد۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”لو بن گیا۔“ اس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب اپنے شاگرد کے لیے کچھ کرو۔“

”کیا مطلب؟“

”یار! اپنے شاگرد کی جان بچاؤ۔ اس کے لیے کہیں سے کوئی انگیٹھی وغیرہ لے کر آؤ۔ کوئی مونگ پھلی، چلغوزے، کوئی دودھ پتی وغیرہ۔“

”ایسے کام تو شاگرد اپنے استادوں کے لیے کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ پرانے زمانے کی پرانی باتیں ہیں استاد جی۔ ہم نئے لوگ ہیں۔ ہمیں ایسی فرسودہ رسموں کو ختم کرنا چاہیے بلکہ آج ہی سے اس نیک کام کا آغاز کر دینا چاہیے۔“ اس نے میری گرم چادر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

مجھے واقعی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے چادر اتاری اور اس کی طرف بڑھادی۔ ”لو، اسے اپنی چادر سے جوڑ کر ڈبل کرلو..... تمہارا گزارہ ہوجائے گا۔“

”نہیں نہیں، یہ نہیں ہوسکتا استاد جی۔ مجھے اکڑ کر مرنا قبول ہے لیکن یہ طعنہ مجھ سے ہرگز برداشت نہیں ہوگا کہ میں نے صرف یہ چادر تم سے ہتھیانے کے لیے استادی شاگردی کا ڈراما رچایا تھا۔ نو ناٹ ایٹ آل۔“

”رکھ لو۔ مجھے واقعی ٹھنڈ نہیں لگ رہی۔“

”تمہیں ٹھنڈ نہیں لگ رہی لیکن مجھے تو بے عزتی لگ رہی ہے نا۔“ اس نے کہا۔

پھر اس مسئلے کا درمیانی حل ہم نے یہ نکالا کہ دونوں گرم چادروں کو آپس میں جوڑا اور اس کی ایک ہی بکل بنا کر اس میں گھس گئے۔ ہم نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے مگر عمران کی حسِ مزاح ہمیشہ کی طرح برقرار تھی۔ وہ میرا دھیان بٹانے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ساتھ بے مثال تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ ایک اور ایک گیارہ کا محاورہ کسی عمران جیسے ساتھی کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہوگا جب ایک بار پھر سیون ایم ایم رائفل کی خوفناک آواز نے سناٹے کو چکنا چور کیا۔ اس کے فوراً بعد بستی میں ہلچل کے آثار نظر آئے۔ پانچ دس منٹ بعد عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے دور سے دیکھا۔ کچھ لوگ ایک چارپائی اٹھائے احاطے سے نکل رہے تھے۔ یہ ویسا ہی سین تھا جیسا ہم نے صبح کے وقت دیکھا تھا۔ جب ماری جانے والی نرس کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر احاطے سے نکالا گیا تھا۔ اب یقیناً کوئی اور لاش نکالی جارہی تھی۔

آفتاب کا رویہ بے حد جارحانہ تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ جارحیت بڑھ رہی تھی۔ ”لگتا ہے کہ یہ ہوش کھوچکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہوش کھونے کے لیے ہوش کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں تو شاید ہوش ہے ہی نہیں۔“ عمران نے جواب دیا۔

”ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سیکڑوں کا مجمع ہے، اگر طیش میں آکر یہ لوگ ایک دم اندر گھس گئے تو دونوں کی تکا بوٹی کر دیں گے۔“

ابھی بات میرے منہ میں ہی تھی کہ اچانک بہت سے لوگوں کی نعرہ زنی سنائی دی۔ جے جے کار کا زوردار آوازہ گونجا اور اندازہ ہوا کہ مشتعل افراد کا ایک بڑا گروہ شفا خانے کے پھاٹک کی طرف بڑھنا چاہ رہا ہے۔ یہی وقت تھا جب پھاٹک کے قریب شعلے سے چمکے اور رائفل کے کئی فائر ہوئے۔ آگے بڑھنے والا گروہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہوائی فائرنگ کرنے والے یقیناً حکم کے سپاہی ہی تھے۔ وہ مشتعل لوگوں کو آگے بڑھنے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ اندر ایک اہم ترین عورت یرغمالی کی حیثیت سے موجود تھی۔ وہ جارج گورا کی بہن اور سرجن اسٹیل کی بیوی تھی اور سرجن اسٹیل جیسے سفید فام لوگ حکم کی ناک کا بال تھے۔ وہ ان سے معاملات بگاڑنے کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتے تھے..... وہ جانتے تھے ان لوگوں کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں، پیسا ہے، اسٹیٹ کے کئی امرا اندر خانے ان سفید فاموں کے وفادار ہیں۔ جارج کے بعد اگر ماریا کو بھی کچھ ہو جاتا تو یہ بہت بڑے نقصان کی بات تھی۔

مشتعل لوگوں کو نہ صرف منتشر کر دیا گیا بلکہ عام ہجوم کو بھی شفا خانے کی چار دیواری سے دور ہٹا دیا گیا۔ ہم دور سے صاف نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ رسیاں وغیرہ لگا کر عمارت اور لوگوں کے درمیان ایک فاصلہ بنایا جارہا ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے کے وقفے سے سیون ایم ایم کا ایک اور فائر ہوا۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہی شور و غوغا برپا ہوا۔ چند منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ ٹارچوں اور گیس لیمپس کی روشنی میں ایک چارپائی اٹھا کر احاطے سے باہر لائی جارہی ہے۔ یقیناً اس چارپائی پر بھی ایک لاش تھی اور یہ لاش آفتاب خاں کی طرف سے، محاصرہ کرنے والوں کو تیسرا تحفہ تھی۔

رات کے ٹھٹھرے ہوئے سناٹے میں ایک بار پھر عورتوں کے بین گونجے۔ ہجوم میں ہلچل نظر آئی۔ گاہے بگاہے حکم کے فوجیوں کے للکارے بھی سنائی دے رہے تھے۔ یہ للکارے عام لوگوں کو پُرسکون رکھنے کے لیے بلند کیے جا رہے تھے۔

میں اور عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ دوسری طرف یکسر خاموشی تھی۔ ہم بھی تادیر یہ کوشش جاری نہیں رکھ سکتے تھے، بیٹری کے کمزور پڑنے کا خدشہ تھا۔ آفتاب بالکل دیوانے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس طرح کا دیوانہ پن بندے کو حیران کن کامیابی دلاتا ہے یا برباد کر دیتا ہے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب نے ہاشم عرف ہاشو کی رہائی کے لیے حکم کے ہرکاروں کو ایک خاص مہلت دی ہے۔ وہ مہلت چونکہ ختم ہوگئی ہے اس لیے وہ یرغمالیوں میں سے کچھ لوگوں کو مار کر باہر پھینک رہا ہے۔

”یار! اس نے کہیں ڈاکٹر لی وان کو ہی نہ مار دیا ہو؟“ میں نے کہا۔

”میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ مقامی عورتیں جس طرح واویلا کر رہی ہیں، یہی لگتا ہے کہ کوئی مقامی ہی مرا ہے۔“

”مگر مقامی لوگ ڈاکٹر کو بھی تو بہت چاہتے ہیں۔ اس کی موت بھی انہیں دکھی کرسکتی ہے۔“ میں نے نکتہ اٹھایا۔

”لیکن میرا نہیں خیال کہ آفتاب اتنی جلدی کسی اہم یرغمالی کو مارے گا۔ وہ ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک تنظیم ہے، عام لوگوں میں آفتاب اور معذور گلزار جیسے لوگ موجود ہیں۔ یہ لوگ اپنے ظاہری روپ سے کہیں زیادہ خطرناک اور تربیت یافتہ ہیں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہاشم رازی، ان کے بڑوں میں سے ہو، یا پھر ان کا سرغنہ ہی ہو؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔ حکم کے دربار میں ہم نے ہاشم کی جو شعلہ فشانی دیکھی تھی، وہ ناقابلِ فراموش تھی۔''

''لیکن اگر وہ اہم ترین شخص ہے تو پھر اس کی رہائی زرگاں والوں کے لیے اتنی آسان نہیں ہوگی۔''

''مگر ادھر بھی تو دیکھو جگر! یہاں ماریا جیسی لڑکی پھنسی ہوئی ہے۔ یہاں کے گورے ہرگز نہیں چاہیں گے کہ ماریا کو کچھ ہو۔ وہ حکم کو ماریا کے لیے ہر قیمت دینے پر تیار کرلیں گے۔ حکم اور اس کے حواریوں کے لیے ان انگریزوں کی بات ٹالنا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے گاڑے ہوئے ہیں۔''

''یہ انگریز کتنی تعداد میں ہوں گے یہاں اسٹیٹ میں؟'' میں نے پوچھا۔

''تعداد تو زیادہ نہیں ہے۔ گیتا مکھی بتا رہی تھی کہ یہ ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ اتنے ہی لوگ فوج کے مختلف عہدوں پر ہیں۔ لیکن اس انگریز خانہ خراب میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ ہمیشہ سے مقامی لوگوں کو تقسیم کر کے اپنا کام نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے برِصغیر کی تاریخ پچھلے ڈھائی سو سال سے اسی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ یہاں بھی ان لوگوں نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود اندر خانے اپنی طاقت بنائی ہوئی ہے۔ شروع شروع میں یہ لوگ کو گرشیروں پر ریسرچ کرنے اور تینڈوؤں کا شکار کرنے یہاں آئے تھے۔ اب یہاں یہ کافی تعداد میں ہیں۔ راج بھون میں ان کا اثر رسوخ ہے۔ فوج میں انہوں نے اہم عہدے سنبھالے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے مقامی لوگوں میں سے ہی ایسے وفادار ڈھونڈ لیے ہیں جو وقت پڑنے پر حکم کو بھی ننگنی کا ناچ نچا سکتے ہیں۔ اصل میں حکم کی جو شان و شوکت نظر آرہی ہے وہ ان گوروں کی وجہ سے ہی ہے۔ حکم کے پیچھے گورے ہیں جن کی وجہ سے مقامی لوگ حکم کی ساری عیاشیوں کے باوجود اسے اوتار کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال، وہ قیدیوں کو ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ لینے والی بات ہے۔''

''ان دیکھی زنجیریں؟''

''یار! وہی بے ہودہ افواہ کہ حکم کے خاص قیدی اگر جارج گورے کی جیل سے بھاگ بھی جائیں اور کسی طرح اسٹیٹ کی حدوں سے نکلنا چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔ حکم نے انہیں روحانی عمل سے پابند کرا ہوا ہے اور وہ کہیں بھی ہوں، پکڑ لیے جاتے ہیں۔ اب ہم جان ہی چکے ہیں، یہ ''روحانی عمل'' دراصل وہی منحوس الیکٹرانک چپ ہے جو سرجن اسٹیل خاص قیدیوں کے جسموں میں پلانٹ کرتا ہے۔ اسی طرح کے اور کئی شعبدے ہیں جن کے ذریعے حکم کی ''روحانیت'' کو جلا بخشی جاتی ہے۔''

''تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! پھر وہی بے ہودہ سوال؟ تم جانتے بھی ہو کہ میں فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میرا تو کام ہی ریسرچ کرنا ہے۔ ابھی تو مجھے اپنے سر کے خوب صورت بالوں کا خیال رہتا ہے، اگر میں گنجا ہوتا [illegible] رڈ کرلوں اور اپنے دماغ کو اس کی پوری گنجائش کے مطابق استعمال کرنے لگوں تو میں ''بالکل بکواس چینل'' اور ''چغد نکمے نابینا چینل'' کو بھی مات دے دوں۔''

''یہ کون سے چینل ہیں بھئی؟'' میں نے پوچھا۔

''یار وہی ..... بالکل بکواس چینل یعنی بی بی سی اور چغد نکما نابینا، سی این این۔''

وہ پٹڑی سے اکھڑ رہا تھا۔ میں اسے بمشکل واپس لایا۔ وہ گرم چادر میں سمٹتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بہادر شاہ ظفر کا نام سنا ہوگا؟ وہی مغلیہ سلطنت کا آخری تاج دار۔ اسے انگریزوں نے اتنا کمزور کردیا تھا کہ وہ بس نام کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ اصل حکم انگریزوں کا ہی چلتا تھا۔ کچھ ایسی ہی ملتی جلتی صورتِ حال یہاں بھی نظر آرہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اورنگ زیب کا پڑپوتا بہادر شاہ مسلمان تھا اور حکم جی ہندو ہے۔ جو کچھ نتیجہ میں نے نکالا ہے، اس کے مطابق حکم نے بس اپنے راج پاٹ کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ وہ اچھا کھا پی رہا ہے۔ ایک ہندو کی حیثیت سے ناچ گانے اور خوب صورت عورتوں کی صحبت سے لطف لیتا ہے۔ ساتویں کے جشن جیسی تقریبوں کی آڑ میں اپنا الّو سیدھا کرتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ چل رہا ہے، اسی طرح چلتا رہے۔ وہ ان گوروں کے خلاف کسی طرح کا سخت رویّہ اختیار کر کے اپنے آرام سکون کو تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں ان گوروں کا اصل دشمن کوئی اور ہے۔''

''کون؟''

''یہاں کے مسلمان۔ مراد شاہ اور انور خاں جیسے لوگ۔ جو بکنا اور جھکنا نہیں جانتے ..... جو حکم کے چھوٹے بھائی ''چھوٹے سرکار'' کے ساتھ مل کر تل پانی میں بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طاقت پکڑ چکے ہیں اور کسی بھی وقت زرگاں میں حکم اور اس کے انگریز دوستوں کے لیے شدید خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نچلی ذاتوں کے کچلے مسلے ہندو اور بودھی بھی زرگاں کے عیش پرستوں کے لیے خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں۔''

''فی الوقت تو تم واقعی ایک صحافی لگ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''صحافی ایک نسبتاً چھوٹا لفظ ہے۔ تم میرے لیے مناسب لفظ استعمال کرنا چاہو تو وہ دان شور (دانشور) ہے۔ دان شور سمجھتے ہو نا تم؟ عقل مند، صاحب ذی شور۔''

''ذی شعور۔'' میں نے کہا۔

وہ میری تصحیح کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''عقل تو بچپن سے ہی میرے اندر بہت زیادہ تھی بلکہ میری ماں تو پریشان ہو جاتی تھی۔ مجھے کہتی تھی، کبھی دوسروں کے سامنے کوئی بے وقوفی کی بات بھی کرلیا کرو، ورنہ لوگ سمجھیں گے تم بونے ہو۔ میری ہوشیاری کا اندازہ لگاؤ، جہاں دوسرے لوگ پانی کے بھرے ہوئے لوٹے سے طہارت کرتے ہیں، میں صرف آدھے کپ پانی سے کام چلا لیتا تھا۔ بارہ ٹہنی کھیلنے میں، میں اپنے محلے کا چیمپئن تھا۔ ایسی ایسی چالیں چلتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ میرے ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے، تم میں قدرتی طور پر ایک اچھا ''لڑاکا'' بننے کی صلاحیت ہے۔ اگر تم فوج میں چلے جاؤ تو بڑے اچھے جرنیل بن سکتے ہو۔ میں اپنے بے تحاشا ''آئی کیو'' کی وجہ سے فوج میں نہ جا سکا۔ انٹرویو کرنے والے نے پوچھا جلدی سے بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں ..... میں نے کہا، دینے ہوں تو چار اور لینے ہوں تو بائیس۔ اس نے برا سا منہ بنایا اور پوچھا۔ نو دو اور گیارہ کتنے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا، وہ تو ہوتے ہی نہیں کیونکہ وہ تو بھاگ جاتے ہیں۔ اس نے کہا..... ٹھیک ہے تم بھی بھاگ جاؤ۔ یو آر ٹو انٹیلی جینٹ۔ میں فوج میں تو نہ جا سکا لیکن میں نے ایک اور بہت اچھا کام کیا۔ میں نے بارہ ٹہنی کے تجربے کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ پتا ہے کس طرح؟''

''کس طرح؟'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں نے جنگی چالوں اور لڑائی کی حکمتِ عملیوں پر ایک کتاب لکھی۔ وہ پاپولر ہوئی۔ بڑے بڑے لوگوں نے اس کتاب کو اور میری دان شوری کو تسلیم کیا۔ یقین کرو بہت سی حالیہ جنگوں میں میری کتاب کی دی ہوئی تکنیکیں ہی استعمال ہوئی ہیں۔ بلکہ جگر..... کبھی کبھی تو مجھے شک پڑتا ہے کہ پلاسی کے میدان میں انگریزوں نے سراج الدّولہ کے خلاف بھی یہی تکنیکیں استعمال کی تھیں۔''

''حضور! یہ بڑی پرانی بات ہے۔ آپ اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں موجود ہوتا تو انگریزوں کو اپنی کتاب کی نقل کرنے دیتا.....؟ اور سراج الدّولہ صاحب کو شکست ہونے دیتا؟'' وہ تڑخ کر بولا۔

میں خاموش رہا۔ وہ بے سروپا باتیں کر کے میری توجہ صورتِ حال کی سنگینی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ سنگینی ایک بہت بھاری پتھر کی طرح رات کے سینے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اسے کچل رہی تھی۔

یہ پہاڑ جیسی رات تھی۔ صورتِ حال کی بے یقینی نے اسے مزید گراں کردیا تھا۔ آخری فائر رات ساڑھے دس بجے کے قریب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے مکمل خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں بس کبھی کبھی بوگیر کتوں کی آوازیں گونجتی تھیں یا مسلح محافظوں کے بلند آوازے سنائی دیتے تھے۔ اب کم از کم چار جیپیں یہاں موجود تھیں۔ جیپوں کو شفاخانے کے اطراف میں مختلف جگہوں پر کھڑا کر کے ان کے انجن اسٹارٹ رکھے گئے تھے اور ان کی ہیڈ لائٹس کو سرچ لائٹس کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔

عمران واکی ٹاکی سے مسلسل چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ وہ ایک بار پھر آفتاب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو آفتاب؟ تم نے دو بندے اور مار دیے ہیں۔ تم اپنے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہو۔ تم مرو گے اور تمہارے ساتھ سلطانہ کی جان بھی جائے گی۔''

''ام مرنے سے نہیں ڈرتا اور نہ سلطانہ بی بی ڈرتا ہے۔ مرنے سے تم جیسا بزدل ڈرتا ہے۔ امارا راستہ ایک دم سیدھا ہے۔ غازی یا شہید۔''

''لیکن بے گناہ نہتّے لوگوں کو مارنا کون سا جہاد ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ بے گناہ نہیں، یہ کافر لوگ ہے۔''

''کہاں کہا گیا ہے کہ غیر مسلموں کو اس طرح مارا جا سکتا ہے؟''

''جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ تو کافروں کا ہی بنایا ہوا مقولہ ہے۔''

''ام مقولوں شقولوں کو نہیں جانتا، ام صرف اتنا جانتا ہے کہ اگر ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو نہیں چھوڑا تو ام ان سب کو اگلے جہان روانہ کرے گا۔ لیکن ام کو لگتا ہے کہ شاید اس کا نوبت نہ آئے۔ یہ بزدل لوگ اندر سے ڈھیلا پڑ چکا

ہے۔ یہ ہاشم صاحب کو چھوڑے گا...... ان کو چھوڑنا پڑے گا۔"

عمران نے کہا۔ "دیکھو آفتاب! اگر تم زیادہ سختی دکھاؤ گے تو پھر تمہارا نقصان ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی برداشت کھودیں اور تم پر حملہ کر دیں۔ ہم نے اپنی طرف سے تمہاری ہوا باندھ رکھی ہے۔ گاؤں کے سرکردہ لوگوں کو یہ بتایا ہوا ہے کہ اندر دو سے زیادہ لوگ موجود ہیں۔ ان کے پاس دھماکا خیز مواد بھی ہے جو انہوں نے مریضوں کے وارڈ میں نصب کیا ہوا ہے۔ اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ تم صرف دو ہو اور رائفل کے علاوہ تمہارے پاس کوئی کارگر ہتھیار بھی نہیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ تم پر حملہ کرنے کا پرگروام بنالیں۔"

آفتاب بے پروائی سے بولا۔ "ان کا جو جی چاہتا ہے کرے لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کچھ کرے گا تو سب کا خانہ خراب ہوگا۔ کم از کم یہ سفید رنگ کی کتیا تو بالکل بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

ایک بار پھر ماریا کے چلّانے اور کراہنے کی آواز آئی۔ آفتاب جب بھی اس کا ذکر کرتا تھا، اسے کوئی ٹھوکر وغیرہ بھی رسید کرتا تھا۔

"ڈاکٹر لی وان کہاں ہے؟" میں نے آفتاب سے پوچھا۔

"وہ ایک دم سڑی بڈھا ہے۔ ام اس کا عزت کرتا ہے کیونکہ اس نے مندر میں تمہارا آپریشن کر کے ام سب کا مدد کیا تھا۔ ام نے کل اس سے کہا تھا کہ اگر وہ یہاں سے نکلنا چاہتا ہے تو ام اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہے لیکن وہ بک بک کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے مریضوں کو اور اپنے اسپتال کو چھوڑ کر یہاں سے نہیں جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ جینا مرنا پسند کرے گا۔ ام نے کہا ٹھیک ہے، اگر تمہاری قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا ہے تو پھر مرو۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لگاتار بک بک کر رہا تھا۔ پھر اس نے چیزیں اٹھا اٹھا کر ام کو مارنا شروع کر دیا۔ ام نے اسے غسل خانے میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا دیا ہے۔ اب اس نے جو واویلا بھی کرنا ہے، اندر ہی کرتا ہے۔"

"تم نے اسے مارا بھی ہے؟"

"اس نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے مار کھایا ہے..... لیکن زیادہ نہیں..... بس ام نے رائفل کے دستے سے ایک چوٹ لگایا ہے اس کی کنپٹی پر۔ ہاں، اگر یہ اپنا منحوس واویلا بند نہیں کرے گا تو اور مار کھائے گا۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں طیش نے اندھا کر رکھا ہے آفتاب خاں! ڈاکٹر لی وان ایک خدا ترس شخص ہے۔ اس نے اس دور دراز علاقے میں یہ اسپتال بنایا ہے..... ہر مہینے بارہ چودہ گھنٹے کا مشکل سفر کر کے یہاں پہنچتا ہے۔ ضرورت مندوں کا مفت علاج کرتا ہے۔ ان ضرورت مندوں میں مسلمان بھی ہوتے ہیں....."

"لیکن وہ خود تو کاپر ہے نا..... اور کاپر کاپر ہی ہوتا ہے..... کاپر ہی ہوتا ہے۔" آفتاب کے لہجے میں پھر آگ بھڑک اٹھی۔

شاید یہ بحث طول کھینچتی مگر عمران نے مداخلت کی اور آفتاب سے درخواست کی کہ وہ کم از کم ایک بار سلطانہ کی بات ہم سے کرادے۔ پہلے تو آفتاب نہیں مانا لیکن پھر اس نے رائے بدل لی۔ شاید دوسری طرف یعنی سلطانہ کی طرف سے بھی ایسی خواہش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ واکی ٹاکی لے کر نیچے جا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سلطانہ سے بات کراتا ہے۔

دور ناگ پھنی اور کیکر کے درختوں کے پیچھے بہت سی روشنیاں حرکت کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ فوجیوں کو مزید کمک مل گئی ہے اور گھیرا مضبوط کیا جا رہا ہے۔ آنے والی گھڑیوں میں یہاں کیا ہوگا، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اسی اثنا میں سلطانہ کی پژمردہ آواز واکی ٹاکی کے اسپیکر پر ابھری۔

"مہروج..... مہروج! آپ میری آواج سن رہے ہیں؟"

"ہاں سلطانہ! میں سن رہا ہوں۔" میری آواز میں خود بخود درد لہریں لینے لگا۔

"آپ کہاں ہو مہروج؟"

"تمہارے آس پاس ہی ہوں۔ اور تم کہاں ہو؟"

"مم..... میں یہاں اسپتال کے اندر۔"

"اور کوئی ہے تمہارے پاس..... میرا مطلب ہے آفتاب خاں کہاں ہے؟"

"وہ چلا گیا ہے۔ اس وخت (وقت) میں اکیلی ہوں۔" سلطانہ کی آواز بار بار بھرّا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "سلطانہ! ایسا کیوں کیا تم نے؟ کیوں مجھے اس طرح اندھیرے میں رکھا؟ میں تمہارا شوہر تھا سلطانہ..... تمہارا شریک زندگی..... تم نے اتنا بڑا جھوٹ بولا مجھ سے۔ تم ان لوگوں کا حصہ تھیں جن میں آفتاب، ہاشو اور گلزار بی بی جیسے خطرناک قاتل شامل ہیں لیکن تم نے میرے سامنے ایک گھریلو عورت کا روپ بنائے رکھا۔ تم نے

مجھے بتایا کہ تمہاری زندگی مجھ سے اور بالو سے شروع ہو کر ہم دونوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے..... ایسا کیوں کیا تم نے؟"

جواب میں سلطانہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید آنسو بہا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم نے ہر قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے سلطانہ۔ یہاں تک کہ پرسوں رات کو بھی تم نے بس مندر سے میرے جانے کا ہی انتظار کیا اور پھر آفتاب کے ساتھ اپنے کام پر نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ سب کیا تھا سلطانہ؟"

دوسری طرف چند لمحے گہری خاموشی طاری رہی۔ تب مدھم سسکی کی آواز ابھری۔ سلطانہ نے کہا۔ "اپنی صفائی میں کہنے کے لیے میرے پاس کچھ نا ہیں ہے مہروج! میں بس آپ سے مافی اِچ مانگ سکتی ہوں۔ اتنا جرور کہوں گی کہ میں جو کچھ ہوں، پہلے سے ہوں۔ اس وخت آپ بھی میری جندگی میں نا ہیں آئے تھے۔"

"لیکن تم کیا ہو؟ مجھے پتا تو چلے سلطانہ..... میں جسے اپنی بیوی کہتا رہا ہوں، وہ اصل میں ہے کیا؟"

"وہ آپ کی بیوی اِچ ہے۔" وہ جذباتی انداز میں بولی۔ "اور آپ سے اتنا پیار کرتی ہے..... کہ..... آپ..... سوچ بھی نا ہیں سکتے..... لیکن....."

"لیکن کیا؟"

وہ گمبھیر توقف کے بعد بولی۔ "میں جو کچھ ہوں، مجھے حالات نے بنایا ہے مہروج! جب حکم جی اور جارج گورے جیسے حاکم تقدیروں کے مالک بن جاتے ہیں، لوگن پر جلم ڈھاتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، راہ چلتی عورتوں کو بُری نجر سے دیکھتے اور انہیں بے غیرت کرنا چاہتے ہیں، تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے بہت جلم سہا ہے مہروج! ہم راجپوت ہیں، ہمارا دوش بس یہ تھا کہ ہم حکم اور گورے جیسے لوگن کی من مانیوں کے سامنے سر نا ہیں جھکاتے تھے۔ شاید کسی وخت ہم ہار ہی جاتے لیکن پھر ہمیں ہاشم صاحب جیسا آسرا مل گیا۔ ہاشم صاحب وہ سب کچھ کر سکتے تھے جو ہم نا ہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا، خفیہ ٹھکانے تھے اور بڑے نڈر ساتھی بھی تھے۔ ہاشم صاحب گونگے ملازم کے روپ میں ہمارے گھر رہنے لگے تھے۔ صرف میں، میرے ابا جی اور بھائی نبیل جانتے تھے کہ ہاشم صاحب کیا ہیں۔"

"سلطانہ! تم میری شریکِ زندگی ہونے کا دعویٰ کرتی رہیں اور مجھے اتنی اہم باتوں سے بے خبر رکھا؟"

"میں نے کئی بار سوچا مہروج کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں لیکن ہر بار ڈر گئی۔ مجھے لگا کہ میں آپ کو کھودوں گی۔ آپ مجھ سے بہت دور چلے جائیں گے۔ میں یہ نا ہیں کہتی مہروج کہ میں نے ہاشم صاحب کے کہنے پر جو کچھ کیا، وہ سب ٹھیک اِچ تھا لیکن وہ سب کچھ غلط بھی نا ہیں تھا۔ یہ ان گوروں کا کٹھ پتلی حکم جی، کم جور مسلمانوں پر جس طرح کے جلم ڈھا رہا ہے، وہ سب جانتے ہیں۔ ہاشم صاحب اور ان کے ساتھی اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ کہیں ان سے جیادتی بھی ہو جاتی ہوئے گی مگر جیادتیاں تو دونوں طرف ہو رہی ہیں۔"

میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "زرگاں جانے سے پہلے میں نے تم سے کیا کہا تھا سلطانہ؟ میں نے کہا تھا کہ..... اب میں ہوں..... اب اپنے سارے غم دکھ مجھے دے دو۔ ایک بیوی کی طرح گھر کی چار دیواری میں آجاؤ۔ میں تمہارے ہر دکھ کا مداوا کروں گا، تمہارے سارے آنسو پونچھوں گا۔ میں نے کہا تھا نا؟"

وہ ایک بار پھر سسک اٹھی۔ چند لمحے بعد رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے انکار نا ہیں ہے مہروج! آپ نے کہا تھا اور آپ اپنے کہے کا پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ اب وہی کچھ کروں جو آپ چاہتے ہیں لیکن قدرت کو شاید یہ منجور نا ہیں تھا۔ میں آپ کے لیے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی مہروج! لیکن ایک آخری کام مجھے کرنا تھا..... اور..... یہ کوئی جیادہ خطرناک کام بھی نا ہیں تھا۔ لل..... لیکن ہم پھنس گئے مہروج..... اور اب جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ اگر......" اس کی آواز بیٹھ گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"وہاں مندر میں کیا ہوا تھا؟" میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ "میں اس بڑے کمرے کی طرف جا رہی تھی جہاں پرشاد پکایا جاتا ہے۔ وہیں پر مجھے گلزار سے ملنا تھا مگر راستے میں ایک بار پھر تلاشی ہو گئی۔ اس تلاشی میں بڑی گوپی کو میرے کپڑوں میں چھپے لفافے کا پتا چل گیا۔ اس نے لفافہ نکال لیا اور مجھے پکڑنے کی کوشش کی۔ پاس ہی ایک چھری پڑی تھی۔ میں نے چھری اٹھائی اور بھاگ نکلی۔ دو تین لوگن میرے راستے میں آئے۔ میں نے ان پر وار کیا اور پھر ایک بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں چڑھ گئی۔ اس وخت مجھے بالکل جانکاری نا ہیں تھی کہ آفتاب خاں بھی مجھ سے مل جائیں گا۔ گھوڑا گاڑی کھیتوں میں تھوڑا اِچ آگے گئی تھی کہ وہ ایک طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اسے پتا تھا کہ تم گھوڑا گاڑی میں ہو؟''

''ہاں، اس نے مجھے گاڑی میں چڑھتے دیکھ لیا تھا.....''

اچانک سلسلہ منقطع ہوگیا۔ خبر نہیں کہ سگنل آنا بند ہو گئے تھے یا پھر ویسے ہی واکی ٹاکی آف کر دیا گیا تھا۔

میں اور عمران کوشش کرتے رہے لیکن دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہوا۔ سلطانہ سے گفتگو شروع کرنے سے پہلے درختوں کے درمیان جو متحرک روشنیاں نظر آئی تھیں، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں حکم کے گارڈز اور سپاہیوں کو کافی بڑی کمک مل گئی ہے۔ ایک طرف آفتاب کہہ رہا تھا کہ اس کا مطالبہ مانا جانے والا ہے اور بہت جلد ماریا کے بدلے میں ہاشم رازی کو رہا کر کے یہاں پہنچایا جانے والا ہے ..... جبکہ دوسری طرف اسپتال کا گھیرا مضبوط تر کیا جارہا تھا۔ حالات تیزی سے پینترے بدل رہے تھے۔ سلطانہ سے بات کرنے کے بعد میں بالکل گم صم ہوگیا تھا۔ رگ و پے میں تاریکی سی اتر گئی تھی۔ سلطانہ وہ ہستی تھی جس نے مجھے نئے سرے سے جینا سکھایا تھا۔ ثروت کے بے پناہ غم کو بھلانے میں اس کی سحر انگیز شخصیت نے میری بہت مدد کی تھی۔ وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ نڈر، بے دھڑک اور اپنے پیاروں پر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی۔ وہ جب میرے پاس ہوتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا مرکز ومحور بس میں ہی ہوں۔ لیکن یہ غلط نکلا تھا۔ ایک بہت بڑا بھرم ٹوٹا تھا اور اس کے ٹوٹنے نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔

''کوئی آرہا ہے۔'' عمران کی سرگوشی نے مجھے ایک دم خیالوں سے چونکا دیا۔

میں نے کان لگا کر سنا۔ گنے کے پودوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ یہ سرسراہٹ پچیس تیس قدم دور تھی تاہم اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ گہری تاریکی میں ہم کچھ دیکھنے کے قابل تو نہیں تھے لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ یہ ایک سے زیادہ افراد ہیں۔ عمران نے رائفل کو تیار حالت میں کر لیا۔ میں بھی چوکس ہوگیا۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ اگر کوئی دیہاتی اپنی ''حاجت روائی'' کے لیے آیا ہوتا تو اکیلا ہوتا.....

ہم دم سادھ کر بیٹھے رہے اور سرسراہٹ کا اتار چڑھاؤ سنتے رہے۔ آنے والوں کی خوش قسمتی یا بدقسمتی انہیں ہمارے بالکل قریب لارہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب کسی بھی لمحے وہ ہمارے سامنے ہوں گے ..... لیکن پھر اچانک ہم سے صرف چھ سات میٹر کے فاصلے پر سرسراہٹ رک گئی۔ ایک باریک ڈری ڈری نسوانی آواز ابھری۔ ''کیا ہوا جی؟''

''بس یہیں بیٹھ جاوت ہیں۔'' ایک مردانہ آواز نے جواب دیا۔

ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی لڑکی لڑکا ہیں۔ پودوں کے درمیان سے ہمیں ان کے موہوم سے ہیولے بھی دکھائی دیے۔ لڑکا شاید بیٹھنے لگا تھا مگر نوجوان لڑکی نے جلدی سے کہا۔ ''نا ہیں جی ..... آپ کے کپڑے خراب ہوویں گے۔ میں اپنی چادر بچھا دیوت ہوں۔''

نوجوان لڑکا منع کرتا رہا مگر لڑکی نے ہموار جگہ پر اپنی اوڑھنی بچھا دی۔ پھر نوجوان غالباً بیٹھ گیا مگر لڑکی کھڑی رہی۔ ''بیٹھو نا تم بھی۔'' نوجوان نے کہا۔

''نن ..... نا ہیں جی ..... آپ کھتری ہیں، میں شودر ..... میں آپ کے برابر بیٹھوں گی تو مجھ کو پاپ لگے گا۔''

''نا ہیں ..... کچھ نا ہیں ہوگا۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں ..... بیٹھ جاؤ۔'' پھر شاید نوجوان نے لڑکی کو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہم سے اتنے قریب تھے کہ اگر ہم حرکت کرتے یا اونچی سانس بھی لیتے تو شاید انہیں شک ہو جاتا۔

لڑکی مسکین آواز میں بولی۔ ''باپو کہوت ہیں کہ ہم لوگن کا سایہ بھی آپ پر نا ہیں پڑنا چاہیے۔ آپ کی پوترا بھرشٹ ہو جاوت ہے۔''

''لیکن یہ تو کالی رات ہے چھپی! اس میں تو سایہ ہوتا ہی نا ہیں۔ اور ویسے بھی میں تم سے کہوت ہوں کہ یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں۔ بھگوان نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ ذات پات، یہ اونچ نیچ کی سیڑھیاں، یہ سڑی ہوئی رسمیں، یہ سب کچھ تو ہمارا بنایا ہوا ہے۔''

''نا ہیں جی! باپو کہوت ہیں ایشور نے سب کو ایک جیسا نا ہیں بنایا۔ کوئی آپ کی طرح عقل مند اور شکتی والا ہے، کوئی ہماری طرح کم عقل اور کم جور ہے۔ کوئی پیسے والا ہے، کوئی گریب، کوئی گورا، کوئی کالا، کوئی مالک کوئی چاکر ..... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سنسار ہی نا ہیں چل سکتا تھا۔''

''سارے پرانے لوگن کی طرح تمہارے باپو کے دماغ میں بھی بھس بھرا ہوا ہے چھپی! یہ نیا دور ہے۔ کبھی کسی بڑے شہر میں جا کر دیکھو۔ چھوٹی سے چھوٹی جاتی کے لوگن بھی پڑھ لکھ کر بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ بڑی جاتیوں کے ناکارہ لوگن ان کی نوکری کرنے پر مجبور ہو جاوت ہیں۔ ہمارے دھرمی مہاشوں نے دھرم کو توڑ موڑ کر رکھ دیا ہے۔

اب دیکھو، یہ جو کچھ ہمارے گاؤں مٹں ہو رہا ہے اس کا کارن بھی تو یہی ظلم اور انیائے ہے نا۔ حکم جی ان سفید چمڑی والوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ پھر ان مسلمانوں میں سے کچھ سرپھرے خون خرابا شروع کر دیوت ہیں۔''

''چھوٹے مالک! مجھ کو تو بڑا ڈر لگت ہے۔ میری دیدی کا دیور بھی اسپتال کے اندر ہے۔ دیدی کی ساس اور سسر کل سے رو رہے ہیں۔ کچھ لوگن اب کہوت ہیں کہ فوجی کبھی بھی اندر والوں کی بات نا ہیں مانیں گے۔ وہ ایک دم اندر گھس جاویں گے اور پھر بہت خون خرابا ہو جاوے گا.....''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر نوجوان کی آواز ابھری۔ ''چلو چھپی! چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی تو سب اندازے ہی ہیں۔ جو کچھ ہوگا، سامنے آجاوے گا۔ تمہیں ٹھنڈ تو نا ہیں لگ رہی؟''

''نا ہیں جی۔''

''پر تمہارے گال تو ٹھنڈے ہیں۔''

''ہائے رام ..... ایسا نہ کرو مالک۔ آپ کو پاپ لگے گا۔''

''تمہیں چھونے سے مجھے پاپ لگے گا؟'' وہ مسکراتی آواز میں بولا۔

''تو اور کیا مالک! آپ پلید ہو جائیں گے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''تو تمہیں چھوؤں گا نا ہیں تو پریم کیسے کروں گا؟''

''مم ..... مجھے بہت ڈر لگت ہے جی۔ آپ ..... مجھے کپڑوں کے اوپر سے ہاتھ لگا لیں۔''

''چلو کہیں کہیں ایسا بھی کر لیں گے لیکن پاس تو آؤ نا۔'' پھر شاید اس نے چھپی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لوگن کو پتا لگ گیا تو میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ میں آپ کے چرن چھوتی ہوں، مجھے شما کر دیں۔''

''دیکھو، غلطی میں کر رہا ہوں اور شما تم مانگ رہی ہو۔ اس کو کہوت ہیں الٹی گنگا ..... ویسے میں نے ایک دن پنڈت جی سے پوچھا تھا۔ وہ کہوت تھے کہ اگر نیچی ذات کی ناری اونچی ذات کے مرد کو سیوا (خدمت) کی نیت سے چھوئے گی اور ناری صاف ستھری بھی ہووے گی تو پھر پاپ نا ہیں لگے گا۔ تم یہ سمجھو کہ تم سیوا کر رہی ہو۔''

''لل ..... لیکن ..... مالک .....'' پھر شاید نوجوان نے لڑکی کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے ڈھانپ دیا تھا، اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

وہ دونوں اب زمین پر بچھی چادر پر لیٹ گئے تھے۔ ان کی ہانپی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ منمنائی۔ ''آپ ایسا نہ کریں۔ آپ کو صبح اپنے پتا کے ساتھ مندر جانا ہے۔ میرے انگ سے لگ کر آپ پلید ہو رہے ہیں۔''

''یہ کوئی پلیدی نا ہیں ہے۔ میں اشنان کر لوں گا۔''

''بڑے پجاری جی کہوت ہیں، ایسی پلیدی اشنان سے دور نا ہیں ہوتی۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں بڑے پجاری کو بھی۔ چار سال پہلے بھنگن کی بیٹی کو جو جڑواں بچے ہوئے تھے اور مر گئے تھے، وہ اسی پجاری کے تھے .....''

''ہائے رام! آپ کیسی باتیں کرت ہیں؟'' اچھوت لڑکی لرز کر بولی۔

کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے رہے پھر لڑکی خود کو اپنے پریمی کی بانہوں سے جدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ..... ''بس مالک! اب مجھ کو جانے دو۔ کچھ دیر میں پو پھٹ جاوے گی پھر میرا جانا مشکل ہو جاوے گا۔''

دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نوجوان اسے چوم کر بولا۔ ''مجھ سے پریم کرتی ہو نا؟''

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر دبی آواز میں بولی۔ ''بہت زیادہ ..... لیکن اس پریم کا انت کیا ہووے گا؟''

''میں تم سے بیاہ کروں گا۔''

''یہ کیسے ہو سکت ہے جی؟ میں آپ کی باندی تو بن سکت ہوں، پتنی نا ہیں۔''

''میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔ ہم دونوں نل پانی چلے جاویں گے۔ وہاں ڈنکے کی چوٹ پر بیاہ کریں گے۔''

وہ دو چار منٹ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر لڑکی نے اوڑھنی جھاڑ کر اپنے سر پر لی اور کھیت سے نکل کر چلی گئی۔ نوجوان وہیں رکا رہا۔ وہ شاید لڑکی کے ساتھ ہی کھیت سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہیولا نظر آیا لیکن وہ واپس جانے کے بجائے تھوڑا سا آگے آیا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے لیے کوئی اچھا گنا منتخب کرنا چاہ رہا ہو یا پھر شاید وہ ویسے ہی نظر دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً اسے ہماری موجودگی کے بارے میں شک ہوگیا۔ وہ ذرا ٹھٹکا پھر اس نے تیزی سے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ قمیص کے نیچے سے اپنا دیسی ساخت کا ریوالور نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''کون ہے؟''

عمران تڑپ کر اس پر جا پڑا۔ اس نے پھرتی سے پیچھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہٹنے کی کوشش کی مگر وہ تین چار گنا زیادہ پھرتیلا بھی ہوتا تو شاید عمران سے بچ نہ سکتا۔ وہ عمران کے نیچے عین اس جگہ پر گرا جہاں کچھ دیر پہلے وہ چھپی کے ساتھ موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے چھپی اس کے نیچے تھی، اب وہ خود کسی کے نیچے تھا۔ عمران نے دائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبایا اور بائیں ہاتھ سے اس کی وہ کلائی پکڑ لی جو قمیص کے نیچے تھی۔ اس نے نیچے پڑے پڑے عمران پر مکا چلایا جو خالی گیا۔ عمران نے جواباً اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا۔ وہ تکلیف سے دُہرا ہو گیا۔ عمران نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا اور اسے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جدوجہد فضول ہے۔ عمران نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا۔ ماچس کی تیلی روشن کر کے ہم نے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ اس نے مقامی انداز کی سفید دھوتی قمیص پہن رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تراشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ حلیے سے کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا تھا۔ ''یہ کون سی فلم کا سین ہو رہا تھا یہاں؟'' عمران نے اس کی گردن میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

''مم .... میں تو پیشاب کرنے آیا تھا۔''

''پیشاب کرتے ہوئے تم باتیں بہت کرتے ہو .... ہم سب کچھ سن رہے تھے۔'' عمران نے جواب دیا۔

وہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں اس نے سب کچھ مان لیا۔ اس نے اپنا نام بھرت کمار بتایا۔ وہ گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا۔ ابھی یہاں اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ ان کی حویلی کے ایک غریب نوکر کی بیٹی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے سچا پریم کرتا ہے اور اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔

بھرت نامی اس نوجوان کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ہم دونوں کی یہاں موجودگی پر بھی حیران تھا۔ میں اور عمران اس سے مقامی دیہاتیوں کے انداز میں ہی بات کرتے رہے لیکن وہ ہمارے اس انداز سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ غالباً اسے شبہ تھا کہ ہمارا تعلق نل پانی سے یا پھر حکم کے دیگر مخالف لوگوں سے ہے اور ہم یہاں ''اتھرا'' گاؤں میں ہونے والے واقعات کی ٹوہ لے رہے ہیں۔

بھرت نامی اس نوجوان سے ہمیں تازہ ترین صورتِ حال معلوم ہوئی اور یہ تشویش ناک تھی۔ اس نے بتایا کہ اسپتال کی عمارت کے اندر جن حملہ آوروں نے لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے، ان میں مختار راجپوت کی خطرناک بیٹی سلطانہ بھی شامل ہے۔

ہمارا یہ بدترین اندیشہ درست ثابت ہو گیا تھا کہ بہت جلد ان لوگوں کو یہاں سلطانہ کی موجودگی کا علم ہو جاتا ہے۔ اس انکشاف کی تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ''حکم جی کے لوگن پہلے ہی سلطانہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ شاید آپ کو بھی پتا ہووے گا کہ کچھ مہینے پہلے سلطانہ نے زرگاں میں گھس کر چار اہم بندوں کو جان سے مار دیا تھا۔ ان میں موہن کمار بھی تھا جسے یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا تھا۔ لیکن اب پتا چلا ہے کہ یہ سلطانہ کسی خطرناک گروہ میں بھی شامل ہے۔ کل یہ ایک زہریلا لفافہ لے کر پونم پور کے مندر میں گھسی تھی۔ وہاں یہ لفافہ اس نے کسی ایسی عورت کو دینا تھا جو اسے پرشاد کے حلوے میں ملا سکے .... تلاشی میں لفافے کا پتا چل گیا اور سلطانہ دو بندوں کو گھائل کر کے وہاں سے بھاگ نکلی۔ اب سوال یہ تھا کہ سلطانہ زہر والا لفافہ کس کو دینا چاہت تھی۔ مندر والوں کو تین عورتوں پر شک تھا۔ ان تین عورتوں کو باری باری ٹیکا لگایا گیا اور ان میں سے ایک نے اپنا اپرادھ قبول کر لیا۔''

''ٹیکا لگایا گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہی درد والا ٹیکا جو حکم کے سپاہی لگاتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے، دو چار منٹ میں پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔''

میں اور عمران سمجھ گئے کہ بھرت اسی منحوس انجکشن کی بات کر رہا ہے جو دو ڈھائی ماہ پہلے ہم نے میڈم صفورا کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ مقامی لوگوں میں اس انجکشن کے حوالے سے بڑا ہراس پایا جاتا تھا۔ بھرت نے روانی میں اپنی بات جاری رکھی اور بتایا کہ جرم کا اعتراف کرنے والی ایک شوبھا نام کی عورت ہے لیکن اس کا اصل نام گلزار معلوم ہوا ہے۔ یہ ٹانگوں سے معذور ہے اور مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ اس نے مانا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ، اسی کو زہر کا پیکٹ دینے کے لیے مندر میں گھسی تھی۔

بھرت کے اس انکشاف کے بعد کہ سلطانہ کو پہچانا جا چکا ہے، یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آ گئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں فوجیوں کی مزید کمک کیوں آئی ہے اور گھیرے کو مضبوط کیوں کر دیا گیا ہے۔ اب یہ زبردست تناؤ والا معاملہ بن چکا تھا۔ ایک طرف ماریا کی زندگی تھی اور دوسری طرف سلطانہ کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا معاملہ تھا۔

بھرت نامی اس کھتری نوجوان نے بتایا۔ ''رات گیارہ بجے کے قریب ہی یہ خبر ہر طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ اسپتال کے اندر حملہ آوروں میں جو لڑکی ہے، وہ مختار راجپوت کی بیٹی ہے۔ اب علاقے کے ہندوؤں .... میں بہت جوش پایا جاتا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ مختار کی بیٹی کو کسی صورت بھی نل پانی کی طرف جانے کی آگیا نہیں دینی چاہیے۔ اسے یہیں پکڑ لینا چاہیے اور اس کو اس کے کرموں کی سزا ملنی چاہیے۔ لیکن کچھ لوگن یہ بھی کہوت ہیں کہ ایسا ناہیں ہو سکے گا۔ حکم جی انگریزوں کی مرضی کے خلاف ناہیں چل سکتا اور انگریز بالکل بھی ناہیں چاہیں گے کہ سلطانہ کو مار دینے کے چکر میں اسٹیل گورا صاحب کی پتنی ماریا بھی ماری جاوے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا اپنا کیا خیال ہے .... کیا ہونا چاہیے؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نئی نسل کے ان لوگن میں سے ہوں جو دھرم کے کٹڑپن کو اچھا ناہیں سمجھتے۔ اگر سلطانہ نے زرگاں میں چار لوگن کو مار کر اپرادھ کیا تو حکم اور جارج نے بھی دھرم کی آڑ میں سلطانہ کو پری بنانے اور رکھیل بنانے کی کوشش کر کے اپرادھ کیا تھا۔ سب کو پتا ہے کہ اب تک ساتویں کے جشن کے نام پر راجواڑے کی سیکڑوں لڑکیاں ''پری'' بن کر عزت گنوا چکی ہیں۔ حکم اور اس کے غیرملکی دوست ان پریوں کے پَر نوچ کر انہیں ہمیشہ کے لیے راج بھون کی غلام گردشوں اور تہ خانوں میں سسکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ دکھ سہہ سہہ کر مر جاوت ہیں اور کچھ پرانی ہو کر نچلے درجے کے عہدیداروں کا کھلونا بن جاوت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر سلطانہ نے اس انجام سے بچنے کی کوشش کی تو کچھ غلط ناہیں کیا۔ اگر اس کے اس اپرادھ کے کارن کچھ لوگن اسے زندہ جلانا چاہت ہیں تو وہ خود بہت بڑے اپرادھی ہیں۔''

آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں ہمیں یقین ہو گیا کہ بھرت نامی یہ نوجوان، نئی پیڑھی کے ان لوگوں میں سے ہے جو دھرم کو موم کی ناک بنانے والے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی سے پیدا ہونے والی تمام خرافات کو دل سے بُرا جانتے ہیں۔ یہ نوجوان ہمیں اپنے لیے بالکل بےضرر محسوس ہو رہا تھا۔

بھرت ہمیں مسلسل کھوجنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''دیکھیں، میں نے آپ کو اپنے بارے میں ساری جانکاری دے دی ہے لیکن آپ نے ابھی تلک کچھ ناہیں بتایا۔ مم .... میرا مطلب ہے کہ آپ ہیں کون؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم کون ہیں؟'' میں نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کھیت مزدور ناہیں ہو اور نہ ہی آپ کا تعلق اس علاقے سے ہے۔ شش .... شاید آپ نل پانی سے آئے ہیں .... اور .... کسی خاص کام سے یہاں پر ہیں۔''

''کس قسم کا خاص کام؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''کہیں آپ کا تعلق چھوٹے سرکار کے سپاہیوں سے تو ناہیں؟ میرا مطلب ہے، کچھ لوگن خفیہ جانکاریاں لینے کے لیے بھی تو نل پانی سے یہاں آوت ہیں۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری پہلی بات تو درست ہے کہ ہمارا تعلق نل پانی سے ہے لیکن اگر تم ہمیں جاسوس وغیرہ سمجھ رہے ہو تو یہ غلط ہے۔ تمہاری طرح ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس خون خرابے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ہمیں کل دوپہر یہ اڑتی اڑتی سی خبر ملی تھی کہ ''پونم پور'' کے مندر میں کوئی ہنگامہ ہوا ہے اور ایک عورت نے چھری چلا کر دو تین بندوں کو زخمی کر دیا ہے۔ ہم اسی بارے میں جاننے کے لیے اس علاقے میں آئے تھے کہ یہاں اس گاؤں میں بھی ہنگامے کا پتا چلا۔''

بھرت نے کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ سارا علاقہ بڑا شانتی والا تھا۔ کوئی ہلچل ناہیں تھی کیونکہ یہ نل پانی سے دور ہے اور زرگاں سے بھی۔ یہاں کسی کا بھی زیادہ اثر رسوخ ناہیں ہے لیکن زرگاں چونکہ ذرا کم دور ہے، اس لیے حکم کے سپاہی یہاں نظر آتے رہوت ہیں۔ گڑبڑ اس وقت سے ہوئی ہے جب سے زرگاں میں سامبر والا مقابلہ ہوا ہے۔ آپ لوگن کو بھی پتا ہووے گا، اس مقابلے کی گونج پورے راجواڑے میں سنائی دی ہے..... سلطانہ کے پاکستانی پتی سے جارج گورا کے ہارنے اور پھر مارے جانے کی اطلاع نے سب کو ہکا بکا کر ڈالا ہے۔ اب کچھ لوگن کا کہنا ہے کہ سلطانہ کا پتی اور اس کا پاکستانی ساتھی جیت تو گئے تھے مگر حکم جی وغیرہ انہیں چھوڑنا ناہیں چاہت تھے۔ صرف دھرم کی مانگ پوری کرنے کے لیے انہیں عارضی طور پر چھوڑا گیا تھا..... انہوں نے اس عارضی چھوٹ کا زبردست فائدہ اٹھایا اور چکما دے کر نکل بھاگے۔ اب زیادہ لوگن کا خیال یہی ہے کہ وہ ابھی نل پانی واپس ناہیں پہنچے اور اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ جیپ سوار فوجی ان کی تلاش میں بھاگ دوڑ کرتے رہوت ہیں۔ اب یہ دوسرا واقعہ مختار راجپوت کی بیٹی والا ہو گیا ہے۔ خون خرابا ہوا ہے اور ابھی لوگن کو اور زیادہ خون خرابے کی بُو آ رہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''بھرت! تمہاری کیا رائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے ..... اس معاملے کا انجام کیا ہونا چاہیے؟'' اب میں اور عمران پہلے کی طرح بھرت سے مقامی لہجے میں بات نہیں کررہے تھے۔

بھرت نے بےتکلفی سے عمران کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر اس کے دو کش لیے اور پھر پُرسوچ نظروں سے گاؤں کی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے مدھم خدوخال دیکھ سکتے تھے۔ اوس سے بھیگے ہوئے کھیت میں خنکی بہت بڑھ چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد بھرت نے کہا۔ ''میری تو بھگوان، اللہ اور واہگرو سے یہی پرارتھنا ہے کہ یہ معاملہ شانتی سے حل ہو جاوے۔ سلطانہ اور میم (ماریا) دونوں کا جیون بچ جاوے۔ حملہ آور جو بندہ مانگ رہے ہیں، انہیں دے دیا جاوے، اس طرح میم بھی مرنے سے بچ جاوے گی اور سلطانہ بھی زندہ سلامت یہاں سے نکل جاوے گی۔ پر پتا ناہیں کیوں لگت ہے کہ کچھ لوگن ایسا ناہیں ہونے دیویں گے۔ وہ چاہت ہیں کہ ایسا نہ ہو۔''

''وہ لوگ کون ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''حکم کے اردگرد کے کچھ لوگ ہی ہیں۔ اس کے چند فوجی افسر، کچھ مذہبی سوچ رکھنے والے رشتے دار، پنڈت مہاراج اور اس کے کچھ ساتھی..... اور ایک بڑی کڑک بڑھیا بھی۔''

بڑھیا کے ذکر پر میں اور عمران چونکے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا دھیان سیدھا مالا کی دادی ساس پر گیا۔ ''تم کس بڑھیا کی بات کررہے ہو؟'' میں نے بھرت سے پوچھا۔

''ہے ایک ..... اس نے آج کل بڑا اودھم مچایا ہوا ہے زرگاں میں۔ بےشمار بےوقوف اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ پتا ناہیں اسے کس کس دیوی کا نیا روپ قرار دے رہے ہیں۔ زرگاں میں اس بڑھیا کی ضد تھی کہ سلطانہ کے پاکستانی پتی کو جارج گورے سے مقابلے کی آ گیا نہ دی جاوے بلکہ اس سے ایک بڑے اپرادھی کا سلوک ہو اور اس کو مار پیٹ کر اس سے اس کی اپرادھن پتنی کا پتا ٹھکانا پوچھا جاوے۔ لیکن پنڈتوں نے کہا کہ سلطانہ کا پتی چونکہ جارج گورے کو سامبر کی دعوت دے چکا ہے، اس لیے اسے قید میں ناہیں رکھا جا سکتا۔ تقریباً سارے پنڈتوں کا خیال یہ تھا کہ سلطانہ کا پتی سامبر مقابلہ ہار جاوے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی پتنی کا کھوج دینے پر بھی مجبور ہو جاوے گا لیکن ہو گیا، اس کے الٹ۔ اس پر اس بڑھیا نے زبردست واویلا مچایا تھا اور مرن بھرت رکھ لیا تھا۔ اس مرن بھرت میں بھوک پیاس کی وجہ سے یہ بڑھیا دم پخت ہو گئی۔ لوگن نے سمجھا کہ یہ بھگوان کو پیاری ہو گئی ہے۔ انہوں نے مشتعل ہو کر خوفناک ہنگامہ کر دیا۔ اس ہنگامے میں قریباً تیس نردوش مسلمان زندہ جل گئے لیکن بعد میں اسپتال جا کر پتا چلا کہ فساد کی جڑ ابھی جوں کی توں موجود ہے۔ بڑھیا زندہ تھی۔ لوگن نے اس کو بھی چمتکار قرار دیا۔ اس کو چاندی میں تولا گیا اور اب اسے ''بڑی ماتا'' کا خطاب دے دیا گیا ہے۔ زرگاں کے ہزاروں لوگن اسے کسی سوامی کی سی عزت دے رہیں۔ یہ ہے ہم لوگن کی سمجھ بوجھ۔''

''یہ بڑی ماتا اب کیا فرماتی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس کی بس ایک ہی ہٹ ہے۔ کہتی ہے کہ میں نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو سزا دلوانے کے لیے اپنا پورا پریوار قربان کر دیا ہے۔ اس کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔ نہ ملے گی تو زرگاں پر تباہی اور بربادی آوے گی۔ یہاں کی گلیوں میں لوگن کی لاشوں پر کتے بلیاں منہ ماریں گے۔ بس اسی طرح کی پیش گوئیاں کرت ہے۔ یہ بڑی کٹر اور خرانٹ بڑھیا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانت ہوں۔ اس کی ایک قریبی رشتے دار ہمارے ہی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ وہ آج کل بھی یہاں ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بڑھیا کی بہو کی بہو۔ مالا نام ہے اس لڑکی کا۔ تھوڑا پڑھی لکھی بھی ہے۔ اچھے بُرے کی سمجھ بوجھ رکھتی ہے لیکن اس کی قسمت کہ بیاہ کر سخت کٹر گھرانے میں چلی گئی۔''

مالا کے نام نے مجھے اور عمران کو چونکایا۔ وہ اجلے چہرے والی روشن خیال لڑکی جو اپنے کٹر سسرالی گھرانے سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ جب فتح پور کے پرانے مندر میں بڑھیا کا ادھیڑ عمر بیٹا آزمائش میں ناکام ہوا اور اس کے دونوں ہاتھ تیل میں جھلس گئے تو وہاں زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ اس ہنگامے کے بعد سے مالا اور اس کا شوہر ستیش غائب تھے۔ آج اتنے دنوں بعد مالا کے بارے میں کوئی خبر ملی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم بھرت نامی اس نوجوان سے مالا کے بارے میں کچھ اور پوچھتے، ایک بار پھر اسپتال میں سیون ایم ایم رائفل گرجی اور اس کے ساتھ ہی گاؤں میں ہلچل نظر آئی.....

اب رات کا اندھیرا کافی حد تک اجالے میں ڈھل چکا تھا۔ اردگرد کے سارے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ فائر کے فوراً بعد اسپتال کے اردگرد موجود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سپاہیوں اور گارڈز نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا کہ یہ لوگ اسپتال پر ہلا بول دیں گے اور سب کچھ ختم ہو جائے گا مگر پھر ایک دم قدرے ٹھہراؤ محسوس ہوا۔ ہم نے دو تین انگلش فوجی افسروں کو دیکھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور مقامی فوجیوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ ان کے حکم پر مقامی فوجی اور گارڈز وغیرہ رک گئے۔ نہ صرف رک گئے بلکہ تھوڑا پیچھے بھی ہٹ گئے۔ کچھ دیر بعد پھر وہی منظر دہرایا گیا جو ہم اس سے پہلے دو بار دیکھ چکے تھے۔ عورتوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ چار پانچ افراد ایک چارپائی لے کر احاطے میں گئے اور ایک لاش اٹھا کر باہر لے آئے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ سرپھرے آفتاب خاں نے اپنی خوفناک دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک اور یرغمالی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

''کہیں ڈاکٹر لی وان ہی نہ ہو۔'' عمران نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''لیکن جس طرح مقامی عورتیں رو پیٹ رہی ہیں، شاید کوئی مقامی ہی مرا ہے۔'' میں نے کہا۔

میں نے بھرت کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظر کا انداز سمجھ کر بولا۔ ''اگر آپ کہو تو میں جا کر ٹھیک جانکاری لے آتا ہوں؟''

میری اور عمران کی نگاہیں ملیں۔ یقیناً ہم دونوں ہی بھرت کو بھروسے کے قابل سمجھ رہے تھے۔ وہ ہمیں اپنا ہم خیال لگ رہا تھا اور یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ عمران نے اس کا دیسی ریوالور بھی واپس کر دیا۔

اب اجالا پھیل گیا تھا۔ قرب و جوار کی ہر شے روشن تر تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں بہت سی جیپیں اور فوجی گھڑسوار نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اسپتال کے گرد مختلف جگہوں پر پوزیشنیں بھی لی ہوئی تھیں۔ عام لوگوں کو اسپتال کی عمارت سے بہت دور ہٹا کر راستوں کی ناکا بندی کر دی گئی تھی۔ اسپتال کے اردگرد کے تمام مکانات خالی کرا لیے گئے تھے۔ ان گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں دوربینوں کے شیشے چمک رہے تھے اور رائفلوں کے بیرل صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ سلطانہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ میں اب اسے کبھی اپنے سامنے زندہ سلامت نہیں دیکھ سکوں گا..... میرا وہ سپنا اب کبھی پورا نہیں ہوگا جس میں ایک خوش رنگ شام کو میں اور سلطانہ اکٹھے ہوتے اور سلطانہ کی بانہوں میں ہنستا مسکراتا بالو ہوتا۔

''وہ دیکھو تابی!'' عمران نے دور ایک طرف سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''میرے خیال میں گاؤں کا شمشان گھاٹ ہے۔ کوئی لاش جلائی جا رہی ہے۔''

شمشان گھاٹ سے اٹھتے ہوئے ارتھی کے دھوئیں نے ماحول کو کچھ اور بھی گمبھیر کر دیا۔ اسپتال سے کچھ فاصلے پر تازہ لاش کے گرد بین کرتی عورتوں کی دل خراش آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا کے دوش پر یہ آوازیں کبھی بلند اور کبھی دھیمی محسوس ہوتی تھیں۔

ہم نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جو آخری چیز ہم نے لی، وہ بے مزہ سی چائے کا ایک کپ تھا۔ یہ کپ ہم نے تب پیا تھا جب آفتاب خاں سائیکل مرمت کی دکان پر سائیکل ٹھیک کروا رہا تھا اور سلطانہ مندر میں جا چکی تھی۔ ہم نے چائے خانے میں بیٹھ کر آفتاب پر نگاہ رکھی تھی۔ ان واقعات کو اب چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ بہرحال، بھوک کی جتنی شدت محسوس ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بڑی وجہ موجودہ تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ یہ اور بات ہے کہ خالی پیٹ ہونے کے سبب ایک نقاہت سی رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم تناؤ محسوس کرنے لگے۔ بار بار ذہن میں خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہمارا بھروسا غلط تو نہیں۔ اس نے آدھ پون گھنٹے میں آنے کا کہا تھا مگر اب ڈیڑھ گھنٹا ہو چلا تھا۔ اس کی واپسی کے آثار کہیں نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ ''اگر یہ بھرت اکیلا آنے کے بجائے بیس پچیس مسلح سپاہیوں کو ساتھ لے آیا تو پھر؟''

''پھر میں تمہیں یرغمال بنا لوں گا اور کہوں گا کہ اگر ان میں سے کوئی آگے آیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' وہ بولا۔

''تو پھر کیا ہوگا؟ وہ کہیں گے کر دو شوٹ۔ تمہارا ہی ساتھی ہے۔''

''میں انہیں ساری حقیقت بتاؤں گا جگر! انہیں بتاؤں گا کہ اپنے اس ساتھی کے قیمتی مشوروں کی وجہ سے ان لوگوں کا کتنا فائدہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ نالائق دوست سے عقل مند دشمن کے بہتر ہونے والا مقولہ حکم کے سپاہیوں نے بھی سن رکھا ہوگا۔''

''میں نے کون سا بے عقلی کا مشورہ دیا ہے تمہیں؟''

''بہت سے ہیں۔ تازہ ترین مثال تو یہی ہے کہ تم نے گنّے کے کھیت میں گھسنے کا مشورہ دیا جبکہ میں مکئی کے کھیت میں گھسنا چاہتا تھا۔ مکئی کا کھیت ہوتا تو ہم بھوک سے یوں تو نہ بلکتے..... دو چار بھٹے توڑتے اور بھون کر کھا لیتے۔''

''بھٹے بھوننے کے لیے آگ درکار ہوتی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''آہ.....'' اس نے لمبی آہ بھری۔ ''آگ کی بات بھی تم نے خوب کہی ہے۔ آگ تو عاشق کے دل کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔ وہ سنا نہیں تم نے..... خداوند یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں..... میں نے تم سے ریما جی کا ذکر کیا تھا نا۔ انہوں نے سینے میں ایسی آگ بھڑکا دی ہے کہ دو چار بھٹے تو کیا دو چار بکرے بھی روسٹ ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ یک طرف معاملہ ہے۔ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔ تمہیں بتایا تھا نا کہ شوٹنگ میں موٹر سائیکل کا کرتب دکھاتے ہوئے میں اور ریما جی گر گئے تھے۔ بس اسی وقت سے یہ محبت شروع ہو گئی..... بلکہ میرے خیال میں موٹر سائیکل بعد میں گری، محبت پہلے شروع ہو گئی تھی..... اب تم پوچھو گے کہ اگر آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے تو پھر شادی میں اڑچن کیا ہے۔ پوچھو گے نا؟''

''نہیں پوچھوں گا۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''بڑے شرارتی ہو..... اصل میں اڑچن یہ ہے کہ ریما جی شادی کے بعد بھی فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ وہ شان اور معمر رانا جیسے گرم اور خطرناک ہیروز کے ساتھ ہیروئن آئیں۔ اس کا جواب وہ یہ دیتی ہیں کہ ان کی خاطر میں خود بھی فلم لائن میں آ جاؤں۔ انہیں پتا ہے کہ میں بنا بنایا ہیرو ہوں، فوراً ہٹ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ صرف ان فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائیں گی جن میں، میں ہیرو ہوں گا۔ اب یہاں پھر ایک مسئلہ ہے۔ میں اداکاری کر کر کے تنگ آ چکا ہوں بلکہ مجھے اس شعبے سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ اب یقیناً تم پوچھو گے کہ میں نے کہاں اداکاری کی ہے..... پوچھو گے نا؟''

''فرماؤ..... کہاں کی ہے؟''

''یہ بالکل بیکار سوال ہے اور اسی لیے تم نے کیا ہے۔ میرے بھائی! یہ نیوز کاسٹر اور اینکر پرسن ہونا اداکاری ہی تو ہے۔ خاص طور سے نیوز کاسٹری تو اداکاری کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں اداکاری کا جتنا مارجن ہے، دیوداس اور بجو باورا فلموں میں بھی نہیں ہے۔ تم دیکھنا، عنقریب [illegible] اور نصیرالدین شاہ جیسے لوگ خبریں پڑھا کریں گے [illegible]''

اس کی طولانی گفتگو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچتی مگر اسی دوران میں ہمیں دور سے بھرت کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہمارے اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے تھے..... کھیتوں کے قریب پہنچ کر بھرت نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی بھی تھی۔ دو منٹ بعد وہ کماد کے نہایت گھنے اور بلند کھیت کے اندر ہمارے سامنے تھا۔

''بڑی دیر لگا دی۔'' عمران نے کہا۔

''شما چاہت ہوں۔ میں پہلے گھر چلا گیا تھا۔ اصل میں مجھے لگ رہا تھا کہ آپ دونوں کو بھوک لگی ہووے گی۔ یہ کچھ بھوجن لایا ہوں آپ کے لیے۔'' اس نے پوٹلی کھولی۔ اس میں مکھن، روٹی سالن اور ایک بوتل میں چھاچھ تھی۔

''اس کے لیے بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے ہمیں گاؤں کی خبر دو۔ گولی کس کو ماری گئی ہے؟''

بھرت بولا۔ ''ڈاکٹر لی وان کے بارے میں آپ کا اندازہ غلط تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسپتال کی دوسری نرس مالتی کو مارا گیا ہے۔ میرے خیال میں مالتی کا چناؤ اس لیے ہوا ہے کہ اس نے بال تراشے ہوئے تھے، انگریزی بھی بول لیوت تھی اور کھلے ڈلے انداز میں بات کرت تھی۔ یہ زرگاں سے یہاں آئی ہوئی تھی۔''

یہ افسوس ناک صورتِ حال تھی۔ ہم نے کبھی مالتی کو دیکھا نہیں تھا، اس کے بارے میں کچھ جانتے نہیں تھے پھر بھی رنج ہوا۔ یقیناً یہ جو کچھ ہو رہا تھا، آفتاب ہی کر رہا تھا۔ اس میں سلطانہ کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔ میں نے بھرت سے پوچھا۔ ''اب اسپتال کی صورتِ حال کیا ہے؟''

بھرت نے کہا۔ ''مالتی کو گولی لگنے کے بعد ایک دم ہلچل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ سپاہی ایک دم اسپتال پر دھاوا بول دیویں گے مگر انگریز افسروں اور پانڈے صاحب وغیرہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔''

پانڈے کا نام سن کر ہم دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ عمران نے کہا۔ ''یہ پانڈے وہی..... رنجیت پانڈے ہے نا جو حکم کا خاص آدمی ہے؟''

بھرت نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب انگریز افسر اینڈرسن صاحب اور حملہ آوروں کے درمیان بات ہوئی ہے۔ اینڈرسن صاحب نے کل سہ پہر چار بجے تک کا سمے مانگا ہے اور کہا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا کر دیا جاوے گا۔“

”یعنی ہاشم کو یہاں پہنچا دیا جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ..... اور یہاں سے نل پانی جانے کے لیے ایک بڑی گھوڑا گاڑی اور چار گھوڑے بھی دے دیے جاویں گے۔ پٹھان حملہ آور نے یہ سمے دے دیا ہے اور کہا ہے کہ کل چار بجے تک وہ مزید کسی شخص کی ہتھیا ناہیں کریں گے۔ اس بات چیت کے بعد مسلح فوجی اسپتال کے پھاٹک سے کچھ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اینڈرسن صاحب نے باہر سے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی اندر بھیجا تھا لیکن حملہ آوروں نے وہ واپس کر دیا ہے۔ شاید ان کو اس بارے میں کوئی شک ہووے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے پاس کھانے پینے کو بہت کچھ ہے۔“

میں نے اور عمران نے دیکھا۔ بھرت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زرگاں کے مسلح کمانڈوز جو کچھ دیر پہلے اسپتال کے گیٹ کے عین سامنے پوزیشنیں سنبھال چکے تھے اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے، اب ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔

رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی اضافی تشویش کا باعث تھی۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین پولیس افسر تھا اور یہ جہاں بھی موجود ہوتا تھا، وہاں خطرات کے بادل منڈلانے لگتے تھے۔

بھرت نے بڑی اپنایت سے ہمیں ناشتا وغیرہ کرایا۔ وہ میرا لباس دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں سوئٹر یا کوٹ کے بغیر تھا۔ گرم چادر کی بھی خاص ضرورت مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بھرت نے کہا۔ ”بھائی جی! آپ کو گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں گھر سے آپ کے لیے کچھ لے آؤں؟“

”نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

عمران فوراً بولا۔ ”یہ انڈین فوج میں رہا ہے اور سیاچن پر ڈیوٹی دیتا رہا ہے۔ اس میں سردی محسوس کرنے کی حس ختم ہو چکی ہے۔ جون، جولائی میں تو اسے برف کے بلاک پر لیٹنا پڑتا ہے۔“

بھرت نے مسکرا کر سر ہلایا۔ پھر میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھنے لگا۔ مارشل آرٹ کی کڑی مشقوں اور سینڈ بیگ کے مسلسل استعمال سے ہاتھ پاؤں کی کھال موٹی ہو کر رنگ بدل چکی تھی۔

بھرت بولا۔ ”لگتا ہے فوج میں آپ نے لڑائی بھڑائی کی بھی خاصی ٹریننگ کی ہے؟“

”ہاں، ہمیں ایک خاص آپریشن کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ بڑی سخت ٹریننگ ہوئی تھی لیکن بعد میں ایک شرابی افسر سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ میں فوج سے بھاگ آیا ..... اور یہاں پہنچ گیا۔“ میں نے گول مول بات کی۔

عمران نے بھی بھرت کو اس سے ملتی جلتی کہانی سنائی۔ اس نے اپنا نام شیام اور میرا کرشن بتایا۔ ہم ایک دوسرے پر کافی حد تک بھروسا کرنے لگے تھے۔ ہم نے بھرت کو بتایا کہ اس سارے معاملے کے انجام تک ہم یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ فراخ دلی سے بولا۔ ”آپ میرے گھر پر آ جاویں۔ بڑے بھیا زرگاں گئے ہوئے ہیں۔ باپو کی طبیعت ٹھیک ناہیں، وہ اپنے کمرے تک ہی رہت ہیں۔ میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہراؤں گا۔ کوئی اس طرف ناہیں آوے گا..... میں ملازموں کو بھی منع کر دوں گا۔“

عمران نے کہا۔ ”اچھا اس بارے میں سوچ لیتے ہیں۔“ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”کیا خیال ہے، رات تک تو یہیں ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک تو ہے لیکن اگر کھیت کا مالک یا کام کرنے والے مزدور اس طرف آ نکلے تو پھر؟“

بھرت مسکرایا۔ ”ایسا کوئی خطرہ ناہیں۔ یہ کھیت میرا ہے۔ آپ دونوں بے فکر ہو کر بیٹھو اور من چاہے تو گنا وغیرہ بھی چوسو۔ جس مزدور نے اس کھیت کو دیکھنا تھا، میں اسے کسی دوسری طرف بھیج دوں گا۔“

”زبردست۔“ عمران نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم ستانے کے لیے لیٹ گئے۔ اب ہر طرف خوش گوار دھوپ پھیل گئی تھی۔ اوس تیزی کے ساتھ پتوں اور گھاس پر سے غائب ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈک کا احساس بھی کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی طرف اب سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ غالباً کل تک کی مہلت کے بعد دونوں فریق ہی کم تناؤ محسوس کر رہے تھے۔ ہم نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہی گزارا تھا۔ اب نرم دھوپ کا لمس محسوس ہوا تو اونگھ آنے لگی۔ رائفل بالکل تیار حالت میں عمران کے سینے پر دھری تھی۔

قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزرا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ عمران اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ میں بھی اٹھ بیٹھا۔ کسی خطرے کے وقت عمران کی تمام حسیں برق رفتاری سے بیدار ہو جاتی تھیں۔ اب بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ نہ صرف ہمہ تن گوش تھا بلکہ ہوا میں بھی کچھ سونگھ رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ میں نے مدھم سرگوشی کی۔

”کوئی آ رہا ہے۔“ اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

چند لمحے بعد مجھے بھی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ عمران نے رائفل ہاتھ میں لے لی۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ کوئی دشمن یا پھر کوئی عام دیہاتی جو اپنی ضرورت کے تحت کھیت میں گھسا تھا یا پھر کوئی جانور وغیرہ؟ یہ بھرت تو ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہ ہوتا تو سامنے سے آتا اور ہمیں دکھائی بھی دیتا۔

چند سیکنڈ سخت تناؤ میں گزرے۔ آواز قریب آتی گئی۔ آخر آنے والا سامنے آ گیا۔ یہ ایک بڑے سائز کا آوارہ کتا تھا۔ یہ عام حالت میں بھی بندے کو خوف زدہ کر سکتا تھا مگر اب وہ جس حالت میں تھا، وہ بڑی دہشت ناک تھی۔ اس کتے کی تھوتھنی پر ایک گہرا زخم تھا..... اس کے گلے میں ایک رسّی اس قدر کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کا منہ سوج کر اصل سائز سے تقریباً دگنا ہو گیا تھا۔ آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور ان کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ کتے کی آواز گمبھیر اور لرزا دینے والی تھی۔ یوں لگا کہ وہ کسی بھی لمحے ہم پر حملہ کر دے گا۔

عمران نے پہلے تو رائفل اس کی طرف سیدھی کی لیکن پھر اسے نیچے کر لیا۔ وہ گہری نظروں سے جانور کی طرف دیکھتا رہا، تب منہ سے پچ پچ کی آواز نکالی اور اسے پچکارا۔ میں نے دیکھا، حیران کن طور پر کتے کا اشتعال کم ہو گیا۔ عمران کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور بغیر کسی کراہت کے کتے کے سر کو ہاتھ سے سہلایا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاقو مانگ رہا ہے۔ میں نے چاقو اسے تھما دیا۔ کتا اضطراب کے عالم میں کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتا، کبھی ایک قدم آگے آتا تھا۔ رسّی اس کی گردن میں دھنسی ہوئی تھی۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے پہلے اس رسّی کو چاقو کی دھار سے کمزور کیا پھر توڑ دیا۔ گردن کا آزاد ہونا اس جانور کے لیے موت سے زندگی کی طرف آنے کی طرح تھا..... اس نے ہمارے گرد ایک چکر کاٹا پھر تیزی سے فصل میں گم ہو گیا۔

آج مجھے عمران میں اسی عمو کی جھلک نظر آئی تھی جو چند سال پہلے تک سرکس کے خطرناک جانوروں کو سدھاتا تھا اور شیر، بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پینے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ غالباً اس میں وہ پہلے جیسی صلاحیت تو موجود نہیں تھی لیکن اب بھی تھوڑے بہت اثرات اس میں پائے جاتے تھے۔

”زبردست۔“ میں نے تعریفی انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ ”لگتا ہے کہ جانوروں کے حوالے سے اب بھی کچھ نہ کچھ بات تم میں موجود ہے۔“

”وہ تو ظاہر ہے کیونکہ تم جیسے سرکش کو اپنے ساتھ لیے پھرتا ہوں۔“ اس نے فوراً چوٹ کی۔

میں نے کہا۔ ”فضول بحث شروع کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنے تعریفی الفاظ واپس لے لوں۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بس یہی سرکشی ہے تمہاری۔ فوراً جواب دینے لگے ہو۔ بڑوں کا احترام ختم ہوتا جا رہا ہے تمہارے اندر۔“

میں نے کہا۔ ”ایک طرف بزرگ بنتے ہو، دوسری طرف یہ بتاتے ہو کہ ریما سے تمہارا عشق زوروں پر ہے۔“

”عشق کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ پکی عمر کا عشق پرانی شراب کی طرح زیادہ نشے والا ہوتا ہے۔ لیکن میں یہاں عمر کی بات نہیں کر رہا۔ میں ”عقل“ کے لحاظ سے تمہارا بزرگ ہوں بلکہ اس لحاظ سے تم مجھے اپنا پڑدادا کہہ سکتے ہو۔“

”اگر ایسی بات ہے تو پھر اس عقل کو سات پردوں میں چھپا کر کیوں رکھتے ہو؟ میں نے تو کبھی اس کی جھلک نہیں دیکھی۔“ میں بھی بحث کے موڈ میں آ گیا۔

”ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اس عقل مندی کا مشاہدہ کرنا ہو تو کبھی ٹی وی پر میرا ٹاک شو دیکھنا..... چار چار گنجے دانشوروں کو اپنے سامنے بٹھا کر بات کرتا ہوں..... اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان چاروں کو ایک ساتھ بولنے پر مجبور کرتا ہوں۔ ایک گھنٹے کے شو میں اگر ان کی ایک بات بھی کسی کی سمجھ میں آ جائے تو میں اپنا نام بدل دوں۔“

”تو تمہارا مطلب ہے کہ ان کی بات کا سمجھ میں نہ آنا کوئی قابلِ تعریف چیز ہے؟“

”اوئے گھامڑ..... یہی تو قابلِ تعریف چیز ہے۔ ان کی بودی باتیں اور پیش گوئیاں سننے والوں کی سمجھ میں آ جائیں تو بھٹا بیٹھ گیا نا ٹاک شو کا۔ اینکر پرسن کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ ”دان شور“ بس بولتے ”نظر“ آئیں، سنائی نہ دیں۔ اور اگر سنائی دینے لگیں تو اینکر پرسن مزید شوروغوغے کے لیے خود بھی بحث میں کود پڑے.....“

میں نے کہا۔ ”دیکھو، تم ہر وقت طنزیہ انداز میں بات کرتے ہو اور تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتے ہو۔ میڈیا کی بہت سی اچھی باتیں بھی تو ہیں۔“

”بہت سی اچھی باتیں نہیں، میڈیا میں ہیں ہی اچھی باتیں۔ تم مجھے ورغلانے کی کوشش نہ کرو۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں کیا ورغلاؤں گا، تم پہلے ہی ورغل شدہ ہو بلکہ ورغل ہو۔ اب دیکھو..... میڈیا ریاست کا ایک اہم ستون بن کر سامنے آیا ہے۔ کیمرے کی آنکھ دور دور تک اور گہرائی تک دیکھ رہی ہے۔ غیر قانونی کاموں پر، حکومتی غفلتوں اور قدرتی آفتوں وغیرہ پر اتنا شور مچایا جاتا ہے کہ بچہ بچہ باخبر ہو جاتا ہے۔ نقب زن جس طرح روشنی سے ڈرتا ہے، اسی طرح قانون شکن میڈیا سے ڈر رہا ہے۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہماری قدر کرو۔ وہ کیا شعر ہے، ڈھونڈو گے ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم۔"

"مگر تم یہ سب کچھ طنز کے انداز میں کہتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کی شرارت سو میل دور سے نظر آتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے، میں اپنے ہی ساتھ شرارت کرتا ہوں۔ یعنی ہاتھ پیچھے کر کے خود کو ہی پتھر مارتا ہوں اور خود ہی حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہوں۔"

"ایسا ہی کرتے ہو..... تمہیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ لوگ مشکل ترین حالات میں کام کر رہے ہیں۔ خطرناک ترین جگہوں پر رپورٹنگ کرتے ہیں۔ بدترین لوگوں کی دشمنیاں مول لیتے ہیں۔ بے شک ان سے بھی غلطیاں کوتاہیاں ہوتی ہیں، پر غلطیاں کوتاہیاں تو ہر شعبے میں ہیں۔"

"تو پھر سلام کرو نا مجھے۔"

"میرا ابھی جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں سلام کروں لیکن دور ہی سے۔"

"یعنی تم اپنا راستہ الگ کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں سچ مچ زبان لگ گئی ہے..... اب تم ہر بات پر پیچ ڈالنے کے موڈ میں آتے جا رہے ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ملاؤ ہاتھ۔" اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اس میں بھی شرارت کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔ "یہی ہاتھ تم نے پانچ منٹ پہلے بدبودار کتے کو لگایا ہے۔ ویری سوری۔"

"بڑے کھوچل ہو گئے ہو تم۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ہاتھ پیچھے کر لیا۔

دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہو گئی۔ کماد کا یہ کھیت ایک بار پھر تاریکی اور سردی میں ڈوبتا چلا گیا۔ گاؤں کے اندر گاڑیوں، اسلحے اور گارڈز کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بڑا جنریٹر بھی یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس جنریٹر کی گھوں گھوں مسلسل ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ جنریٹر کی مدد سے چلنے والی روشنیوں نے اسپتال اور اس کے تین اطراف کی گلیوں کو پوری طرح روشن کر دیا تھا۔ یقیناً یہ معاملہ زرگاں کے لیے بے حد اہمیت اختیار کر چکا تھا اور اس کی وجہ ماریا اور سلطانہ کا ایک اسپتال کے اندر موجود ہونا تھا۔

بھرت نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد ہمیں لینے آئے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم یہاں سخت سردی میں کھلے آسمان تلے رات گزارنے کے بجائے اس کی آرام دہ حویلی میں قیام کریں۔ وہ ہمیں ہر طرح کی سہولت اور حفاظت کا یقین دلا رہا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ آیا نہیں تھا۔ شاید پھر کسی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ اچانک میں نے عمران کو پھر چونکا ہوا محسوس کیا۔ ایک بار پھر اس کی غیر معمولی حسیات اسے کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ جلد ہی مجھے بھی یہ احساس ہو گیا۔ ہمارے آس پاس کھیت کے اندر یا ساتھ والے کھیت میں کوئی موجود تھا۔ عمران نے سگریٹ فوراً بجھا دیا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور جھکے جھکے انداز میں اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ دفعتاً ہمیں ساتھ والے کھیت میں کچھ سائے نظر آئے۔ مکئی کے اس کھیت میں پراسرار انداز میں حرکت کرنے والے سایوں کی تعداد سات کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھاپا مار کارروائی کرنے والے سپاہیوں کی طرح جھک کر چلتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ ذہن میں پہلا سوال یہی آیا کہ کیا بھرت کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط نکلا ہے؟ عمران نے رائفل تیار حالت میں کر لی۔ میں نے بھی اپنا ریوالور تہ بند کی ڈب سے نکال لیا اور بالکل چوکس ہو گیا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ اپنی پوزیشن پر رہیں اور اگر وہ ہم پر فائر کھولیں تو ہم جوابی فائر کر کے انہیں مارنے یا بھگانے کی کوشش کریں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہم اپنی یہ پوزیشن چھوڑ کر بھاگ نکلیں اور روپوش ہونے کی کوشش کریں۔ دونوں صورتوں میں خطرات موجود تھے۔ ان لمحوں میں عمران کی اعصابی مضبوطی اور ان معاملوں میں اس کی مہارت کا اندازہ ہوا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید ان لوگوں کے قریب آنے پر فائر کرتا یا پھر بھاگ کر دوسرے کھیت میں گھسنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کی آنکھ وہ دیکھ چکی تھی جو میری آنکھ نہیں دیکھ پائی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری کلائی پر رکھ کر مجھے یہ اشارہ دیا کہ میں فائر وغیرہ کرنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اپنی جگہ بالکل بے حرکت اور جامد بیٹھا تھا۔ آنے والے ہماری طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہمیں ان کے قدموں کی چاپ چند میٹر کی دوری پر محسوس ہوئی۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ہماری طرف نہیں

آ رہے۔ وہ ہم سے قریباً دس قدم کے فاصلے سے اور بالکل سامنے سے گزرے۔ ہم نے اپنے سانس تک روک لیے تھے۔ رنجیت پانڈے کی منحوس آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

"اور کتنی دور ہے؟" اس نے کہا۔

"بس پہنچ گئے جی۔ وہ سامنے کیکر کے پیڑوں کے پاس۔" ایک دوسری آواز سنائی دی۔

وہ ہمارے پاس سے گزر کر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ وہ اندھیرے میں بغیر کسی لالٹین یا ٹارچ کے جا رہے تھے۔ انداز سخت محتاط تھا۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

"دیکھنا پڑے گا۔" عمران نے کہا۔ "وہ کتا پانڈے بھی ساتھ ہے۔"

ہم نے دیکھا، درختوں کے قریب جا کر وہ سائے رک گئے پھر غائب ہو گئے۔ وہ نشیب میں اتر گئے تھے۔ "تم ادھر رکو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔" عمران نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ساتھ چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

عمران پہلے تو انکار کے موڈ میں نظر آیا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے ہر موقع پر وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے خطرے سے بچانا بھی چاہتا تھا، دوسری طرف خطروں کا خوگر بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنی جگہ چھوڑی اور بے حد احتیاط سے اس نشیب کی طرف بڑھے جہاں رنجیت اور اس کے ساتھ اوجھل ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر ہم اوندھے لیٹ گئے اور سن گن لینے لگے۔ اندازہ ہوا کہ رنجیت اور اس کے ساتھی جھنڈ کے بالکل قریب نشیبی جگہ پر موجود ہیں۔ ان کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

اب زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہم رینگتے ہوئے آگے گئے۔ ہماری انگلیاں اپنے ہتھیاروں کے ٹریگرز پر تھیں اور ہم کسی بھی صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھے۔ درختوں کی طویل قطار کے آگے زمین کا کٹاؤ نظر آیا۔ یہاں ایک وسیع جوہڑ کی سی شکل بن گئی تھی مگر یہ جوہڑ تقریباً خشک تھا۔ متحرک سائے اس نشیب میں موجود تھے۔ اب انہوں نے دو ٹارچیں روشن کر لی تھیں اور کسی خاص چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رنجیت کی مدھم لیکن کرخت آواز ابھری۔ "پائپ تو یہی لگتا ہے لیکن پتا نا ہیں کب سے بند پڑا ہے۔ پہلے اسے کھولنا پڑے گا۔"

"بس مٹی وغیرہ سے بند ہو گیا ہے۔ ابھی کھل جاوت

مجبوری

پاگل خانے کے دورے پر آئی ہوئی ایک خاتون سوشل ورکر وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہداری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئیں۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے نیچی اور خوفزدہ سی آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔ "خدا کی پناہ! کیسی خوفناک صورت تھی۔ کیا یہ خطرناک ہے؟"

"کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"پھر آپ لوگ اسے کوٹھری میں بند کیوں نہیں رکھتے۔ کیا یہ آپ لوگوں کے قابو میں نہیں آتی؟" خاتون نے تشویش سے پوچھا۔

"مجبوری ہے کہ اسے کسی کوٹھری میں بند نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل وہ میری بیوی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

ذکاء اللہ کا تعاون حیدرآباد سے

ہے جی۔" دوسری آواز ابھری۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں کدال چلنا شروع ہو گئی۔ کدال چلانے والا کوئی مزدور ٹائپ شخص تھا۔ وہ وردی کے بجائے ہماری طرح دھوتی اور پگڑی میں نظر آ رہا تھا۔ رنجیت پانڈے نے کرخت لہجے میں کہا۔ "اوئے بہن کے چھنکنے! دھیان سے کدال چلا۔ کہیں پائپ پر نہ مارنا۔"

ایک دو منٹ بعد کدال واقعی پائپ پر لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز سناٹے میں دور تک گئی۔ پانڈے پھنکارا۔ "تجھے کہا بھی تھا کہ اس ماں کو دھیان سے چلا۔" اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز آئی۔ یقیناً شعلہ مزاج پانڈے نے مزدور کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ پھر وہ پھنکارتی آواز میں کسی سپاہی سے بولا۔ "راموں! تو پکڑ کدال..... اور خبردار آواز پیدا نا ہیں ہونی چاہیے۔"

دوسرا شخص کدال چلانے لگا۔ ایک ٹارچ کا روشن دائرہ مسلسل کھدائی والی جگہ پر مرکوز تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک پرانے سیوریج پائپ کا دہانہ نظر آنے لگا۔ سیمنٹ کا یہ پائپ قریباً تین فٹ قطر کا ہوگا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ بھانڈیل اسٹیٹ کا خطرناک ترین کمانڈو رنجیت پانڈے اپنے ایک سفید فام ساتھی کے ہمراہ پائپ میں داخل ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ سفید فام بھی کوئی تربیت یافتہ کمانڈو ہی تھا۔ یہ دونوں افراد پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ ہمیں یہ شک بھی پڑا کہ یہ شاید دو کے بجائے تین افراد ہیں۔ یہ بڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنگین صورتِ حال تھی۔ سب کچھ تقریباً واضح ہو چکا تھا۔ یہ پرانا سیوریج پائپ اسپتال کی عمارت کے اندر تک جا رہا تھا۔ اسپتال میں موجود آفتاب خاں اور سلطانہ کو زبردست قسم کا ''شاک'' پہنچنے والا تھا۔

عمران نے میرا بازو دبایا۔ ہم تیزی سے واپس مڑے۔ رینگتے ہوئے بیس پچیس میٹر کی دوری تک گئے۔ .... کھیت میں داخل ہوتے ہی ہم کھڑے ہو گئے اور جھک کر بھاگتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھے۔ آفتاب یہاں اسپتال میں جو کچھ کر رہا تھا، ہم ہرگز اس کے حق میں نہیں تھے لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اور سلطانہ ..... پانڈے جیسے شخص کے ہاتھوں بے موت مارے جائیں۔

گنے کے کھیت میں اپنے ٹھکانے تک پہنچتے ہی عمران نے واکی ٹاکی اٹھایا اور اس پر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بار بار بیپ دینے والا بٹن دبایا۔ انٹینا کو گھمایا۔ پاور کو آن آف کیا لیکن حسبِ معمول رابطہ نہیں ہو سکا۔ واکی ٹاکی بے جان پڑا تھا۔ دو تین منٹ کی سرتوڑ کوشش کے بعد عمران نے سخت جھلاہٹ میں واکی ٹاکی کو ایک طرف پٹخ دیا۔ وہ جاگ اٹھا۔ سبز اور سرخ روشنیاں جل اٹھیں۔ بیپ کی مدھم آواز پیدا ہونے لگی۔ یہ بیپ دوسری طرف آفتاب والے سیٹ پر جا رہی تھی۔ ہم ہمہ تن گوش تھے۔ چند سیکنڈ بعد دوسری طرف سے آفتاب کی بھاری آواز ابھری۔ ''ہیلو۔''

عمران بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''آفتاب! تم پر حملہ ہو رہا ہے۔ پانڈے اور اس کے ساتھی کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' آفتاب کی چونکی ہوئی آواز ابھری۔

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔ سوال نہ کرنا۔ ابھی چار پانچ منٹ پہلے ہم نے پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو کھیتوں میں دیکھا ہے۔ یہاں ایک پرانا سیوریج پائپ ہے۔ یقیناً اس کا دوسرا سرا اسپتال کے احاطے یا پھر پچھلے صحن میں کہیں ہو گا۔ ان لوگوں نے اس پائپ کو کھولا ہے۔ پانڈے اور اس کا ایک انگریز ساتھی اس پائپ میں گھسے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت عمارت کے اندر پہنچ جائیں گے۔ ان کے پاس جدید رائفلیں ہیں۔ تم دیکھ لو، تم نے اپنا بچاؤ کیسے کرنا ہے .....''

''ٹھیک ہے۔ ام دیکھتا ہے۔'' آفتاب نے جلدی سے کہا اور واکی ٹاکی آف کر دیا۔

ہم جو کچھ کر سکتے تھے، ہم نے کر دیا تھا۔ اب آگے آفتاب اور سلطانہ کی قسمت تھی۔

پندرہ بیس منٹ سخت بے چینی کے عالم میں گزرے، تب اسپتال کی عمارت کی طرف ہلچل محسوس ہوئی۔ پہلے یکے بعد دیگرے رائفل کے تین فائر ہوئے۔ پھر ایک برسٹ چلا۔ عمران نے بتایا کہ یہ ایل ایم جی کا برسٹ ہے۔ اس برسٹ کے بعد دو طرفہ گولیاں چلیں۔ یہ سلسلہ بمشکل ایک منٹ جاری رہا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ عمارت کے اردگرد درجنوں ٹارچیں گردش کر رہی تھیں۔ جیپوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں۔ ایک چھکڑا ایمبولینس کی گول گھومتی سرخ بتی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ بہت سے امکانات ذہن پر یورش کر رہے تھے۔ کیا آفتاب اور سلطانہ مارے گئے ہیں؟ کیا پانڈے اور اس کا ساتھی ناکام ہوئے ہیں؟ کیا وہ اب بھی اندر موجود ہیں؟ اس طرح کے اَن گنت سوالات تھے۔ دس پندرہ منٹ اسی شدید کشمکش میں گزرے پھر ہمیں درختوں کے جھنڈ کی طرف حرکت کے آثار نظر آئے۔ نشیب میں سے دو ٹارچوں کے روشن دائرے اوپر آئے اور گنے کے کھیتوں کی طرف آنے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''اور ان کے ساتھ کوئی زخمی بھی ہے۔'' عمران نے اپنی تیز نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دو منٹ بعد پانڈے اور اس کے ساتھی ہمارے قریب سے گزرے۔ پانڈے کا انگریز ساتھی زخمی ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر لا رہے تھے۔ اس کی کرب ناک کراہیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ تب پانڈے کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جلدی کرو۔ خون ہیجی (تیزی) سے بہہ رہا ہے۔'' وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ اس کے بعد اس نے کسی کو گالی دی اور کہا کہ وہ زخمی کی ٹانگیں اوپر اٹھا کر رکھے۔ پچیس تیس سیکنڈ میں وہ لوگ تیزی سے چلتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

اطمینان کی ایک طویل سانس عمران کے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ بولا۔ ''لگتا ہے پانڈے کا آپریشن پی جی ناکام ہوا ہے۔''

''آپریشن پی جی کیا مطلب؟''

''آپریشن براستہ پائپ اور گٹر۔'' اس نے روانی سے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، عمارت کے اندر سے پھر سیون ایم ایم کا گونج دار فائر سنائی دیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے سرپھرے آفتاب نے پھر کسی کو لڑھکا دیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یرغمالی کو؟''

عمران نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ صورتِ حال بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر عمارت کے اردگرد شدید اضطراب نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے درجنوں فوجی اور مشتعل دیہاتی اپنی برداشت کھو کر عمارت کے اندر گھس جائیں گے اور اس ڈرامے کا خونی ڈراپ سین سامنے آ جائے گا۔ مگر انگریز افسروں کو پتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ماریا بھی ماری جائے گی اور یہ انہیں کسی طور قبول نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں لالٹینوں اور ٹارچوں کی روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ تین چار افراد ایک چارپائی کے ساتھ اندر گئے ہیں اور تازہ لاش لے کر باہر آ گئے ہیں۔ ایک بار پھر رونے پیٹنے کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ ایک بار ٹارچ کی ایک روشنی اسپتال کی چھت پر پانی والی گول ٹینکی کے قریب بھی نظر آئی۔ یقیناً یہ آفتاب خاں ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چھت پر سے حکم کے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ بھی رہا ہو مگر فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ہم کچھ سن نہیں سکتے تھے۔

عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ آفتاب نے ''پاور آف'' کر رکھا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ہماری بائیں طرف سے ایک ہیولا کھیتوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چال ڈھال سے اندازہ ہو گیا کہ یہ بھرت ہی ہے۔ بھرت محتاط انداز سے کھیت میں داخل ہوا اور ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ بولا۔ ''شما چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر ہو گئی۔ وہاں اسپتال کے اندر کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فائرنگ کی آواز تو آپ دونوں نے بھی سنی ہووے گی۔''

''ہاں، آواز تو سنی ہے، پر ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے گھر پہنچتے ہیں پھر میں سب کچھ بتاوت ہوں۔'' بھرت نے کہا۔

ہم بھرت کے ساتھ چلنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ یخ بستہ ٹھنڈ نے ہڈیوں میں اترنا شروع کر دیا تھا۔ منہ سے بھاپ خارج ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے گرم چادروں کی بکلیں ماریں، پگڑیاں اس طرح لپیٹیں کہ چہرے بھی کافی حد تک چھپ گئے۔ ہمارا واحد سامان کسیاں ہی تھیں۔ یہ ''کسیاں'' ہم نے کھیت مزدوروں کی طرح کندھوں پر رکھیں اور بھرت کے ساتھ گاؤں کی روشنیوں کی طرف چل دیے۔

بھرت کا حویلی نما مکان گاؤں کی شمالی جانب تھا۔ یہ جگہ اسپتال کی عمارت سے قریباً آدھا فرلانگ کے فاصلے پر ہو گی۔ ہم دو بڑی گھوڑا گاڑیوں کے قریب سے گزرے۔ یہ دونوں گاڑیاں باوردی سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔ مسلح پہرے دار بھی نظر آئے۔ چونکہ بھرت ہمارے ساتھ تھا، اس لیے کسی نے ہمیں شک کی نظروں سے نہیں دیکھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی جانور کھیتوں میں سے نکل کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ یہ وہی بڑے سائز کا کتا تھا جس کے گلے میں دھنسی ہوئی رسی عمران نے کاٹی تھی۔ وہ یقیناً ابھی تک ہمارے اردگرد ہی موجود تھا۔ اس کا ہمارے پیچھے پیچھے آنا ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عمران کے اچھے سلوک کی وجہ سے اسے ہمارے ساتھ وابستگی پیدا ہو گئی ہو۔ عموماً جانور اس طرح کے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس کی ایک تیسری وجہ بھی ہو سکتی تھی اور یہ زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ عمران کی طویل روداد میں، میں نے اس کی اس خاص صلاحیت کے بارے میں جانا تھا جو وہ جانوروں کے حوالے سے رکھتا تھا..... یہ بظاہر ناقابلِ یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ عمران کے حوالے سے کچھ بھی ناقابلِ یقین نہیں ہو سکتا۔ وہ بے پناہ مقناطیسی کشش کا مالک تھا۔ یہ کشش انسانوں پر اثر کرتی تھی تو دیگر جانداروں کو بھی متاثر کر سکتی تھی۔

عمران نے بھی کتے کو اپنے ساتھ ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ کتے کے چہرے کی غیر معمولی سوجن اب بہت کم رہ گئی تھی۔ وہ ذرا لنگڑاتا ہوا ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ بھرت نے ایک دو بار اسے شُشکارا۔ وہ ٹھٹکا ضرور لیکن ہم سے دور نہیں گیا۔

ہم جلد ہی بھرت کے نیم پختہ مکان میں پہنچ گئے۔ بھرت نے ہمیں مکان کے بیرونی حصے میں ٹھہرایا۔ یہ ایک لمبا برآمدہ تھا جس کے ساتھ دو تین بیٹھک نما کمرے تھے۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی کھاتے پیتے ہندو زمیندار کی رہائش گاہ ہے۔ بھرت کا بڑا بھائی زرگاں میں تھا۔ والد دمے کی تکلیف کی وجہ سے اپنے کمرے تک محدود تھے۔ گھر میں کئی نوکر چاکر تھے۔ ان میں گندمی رنگت والی وہ لڑکی بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شامل تھی جس کا نام ہمیں چمپی معلوم ہوا تھا اور جس نے گنے کے کھیت میں بھرت سے محبت بھری ملاقات کی تھی۔ چمپی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی اسی گھر میں خدمت گار تھی۔ مکان کے وسیع احاطے میں ایک طرف بھینسوں اور بکریوں وغیرہ کا باڑا تھا۔

یخ بستہ کھیت میں سے اس آرام دہ گھر میں منتقل ہونا ہمیں کافی اچھا لگا۔ بھرت نے دیسی مرغی کے سالن، تندوری روٹی اور حلوے سے ہماری تواضع کی۔ ہندو گھرانوں میں عام طور پر گوشت نہیں پکتا لیکن بھرت نے ہمارے لیے پکوا لیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ہمیں رازداری کے انداز میں بتایا کہ اسپتال میں سخت گڑبڑ ہوئی ہے۔ حملہ آوروں نے طیش میں آکر چھوٹے ڈاکٹر راج کو مار ڈالا ہے اور لاش اسپتال کے احاطے میں پھینک دی ہے۔

طیش کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”مجھے ٹھیک سے معلوم تو ناہیں بھیّا لیکن لگت ہے کہ حکم کے سپاہیوں نے خفیہ طور پر اسپتال کے اندر گھسنے کی کوئی کوشش کی ہے۔ اس خیال کا ایک کارن یہ بھی ہے کہ پانڈے صاحب یہاں موجود ہے اور جہاں پانڈے صاحب موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی ہلچل والا کام تو ہوتا ہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اسپتال میں گھسنے کی یہ کوشش ناکام ہوگئی ہے اور ایک گورے افسر پیٹر صاحب کو ٹانگوں پر گولیاں بھی لگی ہیں۔ اس واقعے کے فوراً بعد ہی اندر موجود پٹھان حملہ آور نے بے دردی سے چھوٹے ڈاکٹر صاحب کو گولی سے اڑا دیا..... اور چھت پر چڑھ کر دھمکی دی کہ اگر سپاہیوں کی طرف سے کوئی اور چال چلی گئی تو وہ سب کچھ ختم کر ڈالیں گے۔“

”اب کیا صورتِ حال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”چھوٹے ڈاکٹر صاحب کی ہتھیا کے بعد تو ایسا لگت تھا کہ لوگن اسپتال پر چڑھ دوڑیں گے مگر انگریز افسر مسٹر اینڈرسن نے لوگن کو روکا۔ اب مجھے لگت ہے کہ گورے افسروں نے حملہ آوروں کی ”مانگیں“ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہوسکت ہے کہ مہلت کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ہاشم رازی رہا ہوکر یہاں پہنچ جائے۔“

”کیا ہندو برادری کو اس کی رہائی قبول ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”بھیّا! یہ ہے تو بڑا مشکل۔ سنا ہے کہ سب سے زیادہ شور وہی بڑی بی مچا رہی ہے۔ زرگاں کا بہت سا لوگن اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ وہ نئی نئی بھِیشن گوئیاں کر رہی ہے۔ دوسرے شبدوں میں اس نے حکم جی کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ حکم کے لیے ممکن ہی ناہیں کہ وہ اپنے انگریز دوستوں کے خلاف چل سکے۔ اسے ہر حال میں وہی کرنا ہووے گا جو انگریز افسر اور مسٹر اسٹیل وغیرہ کہیں گے۔ چاہے اس کے لیے اسے بڑی بی اور اس کے خاص حمایتیوں کو جیل میں ڈالنا یا انہیں سورگ باشی کرنا پڑے۔“

وہ رات ہم نے بھرت کے آرام دہ گھر میں گزاری۔ اگلا سارا دن بھی سخت تناؤ میں گزرا۔ ہم بھرت کے مکان کی چھت سے اسپتال اور اس کے اردگرد کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہوچکی تھی۔ اسپتال گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے وسیع احاطے اور برآمدوں میں کسی طرح کی کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔

رات قریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ ہم بھرت کے ہمراہ اس کے گھر کی چھت پر تھے، اچانک گاڑیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ گاؤں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ کُل تین جیپیں تھیں۔ یہ اسپتال کے عین سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ ہر طرف ہلچل نظر آنے لگی۔ بھرت نے کہا۔ ”میں دیکھ کر آوت ہوں کہ کیا معاملہ ہے۔“

وہ گیا اور دس پندرہ منٹ بعد اس نے آکر بتایا کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا ہوگیا ہے۔ ہاشم رازی زرگاں سے رہا ہوکر یہاں پہنچ گیا ہے۔ بھرت نے بتایا۔ ”حملہ آوروں کو ایک گھوڑا گاڑی دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے تاکہ وہ یہاں سے روانہ ہوسکیں۔“

”اور ماریا کا کیا بنے گا؟“ عمران نے پوچھا۔

”جب ہاشم رازی کو اندر بھیج دیا جاوے گا تو ماریا باہر آجاوے گی۔ ماریا کے ساتھ ہی اندر موجود کچھ عورتوں اور بچوں کو بھی چھوڑ دیا جاوے گا۔ باقی لوگن یرغمالی کے طور پر حملہ آوروں کے پاس رہیں گے۔ ان میں ایک انگریز بھی شامل ہے۔ یہ لوگن گھوڑا گاڑی پر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ نل پانی کی حد پر پہنچ کر جب حملہ آوروں کو پورا وشواس ہو جاوے گا کہ اب وہ محفوظ ہیں تو باقی یرغمالیوں کو چھوڑ دیا جاوے گا۔“

”یرغمالیوں میں انگریز کون ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اصل میں پانڈے کے ساتھ ایک ناہیں دو گورے کمانڈو اندر گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی ٹانگوں میں تو گولیاں لگی ہیں لیکن دوسرے کو زخمی حالت میں قیدی بنا لیا گیا ہے۔“

ہمارا یہ شک درست نکلا تھا کہ پانڈے کے ساتھ دو گورے پائپ لائن میں گھسے تھے.... عمران نے بھرت سے پوچھا۔ ”ماریا اور ہاشم رازی کا تبادلہ کب ہوگا؟“

”آج رات ہی کسی وقت ہو جاوے گا۔ اس سلسلے میں زرگاں کی بڑی جامع مسجد کے امام قادر بخش صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ اصل میں یہ سارا معاملہ انہوں نے ہی طے کروایا ہے۔ انہوں نے دونوں طرف سے وعدے کی پاسداری کی ضمانت دی ہے۔ حکم کے افسروں کی طرف سے بھی وچن دیا گیا ہے کہ وہ نل پانی کے راستے میں کسی طرح کی کوئی کارروائی ناہیں کریں گے اور حملہ آوروں کو ہاشم رازی سمیت نل پانی میں داخل ہونے دیویں گے۔“

آدھ پون گھنٹے بعد بھرت دوبارہ سن گن لینے کے لیے اسپتال کی طرف چلا گیا۔ ہمارے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ کمرے میں گھس کر ہم نے واکی ٹاکی آن کیا اور ایک بار پھر آفتاب سے رابطے کی کوششیں شروع کردیں۔ خوش قسمتی سے رابطہ ہوگیا۔ آفتاب خاں اب قدرے پُرسکون محسوس ہوتا تھا۔ اسے پتا چل چکا تھا کہ ہاشم رازی یہاں آچکا ہے اور اب کسی بھی وقت ماریا کے ساتھ اس کا تبادلہ ہوجائے گا۔ اس کے فوراً بعد ان لوگوں کو ڈاکٹر لی وان اور دیگر یرغمالیوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوجانا تھا۔ میرے کہنے پر وہ نیچے گیا اور اس نے سلطانہ سے بھی میری بات کروائی۔ سلطانہ کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے حد تھکی ہوئی ہے تاہم اس کا اعصابی تناؤ اب کم محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”سلطانہ! تم لوگ کب تک یہاں سے نکلو گے؟“

”آفتاب کہہ رہا ہے، ابھی دو ڈھائی گھنٹے تو لگیں گے۔ شاید .... ہم کل شام تک نل پانی پہنچ سکیں .... اگر سب کچھ ٹھیخ (ٹھیک) رہا تو۔“ اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ مت .... اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ کل رات ہم نل پانی کے دیوان میں ملیں گے۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

”بالو، وہیں ہے نا؟“ میں نے اس کی بات کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”میں اسے بہت پیار کرنا چاہتی ہوں مہروج۔ میں نے اس معصوم کو بہت دکھ دیا ہے۔ بڑا انجار کرایا ہے اسے۔ میں بہت اِچ بری ماں ہوں مہروج۔ میرا اللہ مجھے ماف کردے گا نا؟“

”اگر سچے دل سے مافی مانگی جائے تو وہ ضرور معاف کرتا ہے۔“

”اور .... آپ .... بھی کردیں گے نا؟“

”مجھے کوئی گلہ نہیں ہے سلطانہ۔“

”لیکن میں نے آپ کو رنج تو دیے ہیں نا۔ اگر آپ.....“ وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ واکی ٹاکی پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کچھ فاصلے پر دو افراد بلند آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ سلطانہ نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے ہاشم صاحب اندر آگئے ہیں..... ہاں، یہ ہاشم صاحب ہی ہیں۔ امام صاحب بھی ان کے ساتھ ہیں۔ آفتاب انہیں لے کر اندر آگیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اب ہمیں یہاں سے نکلنے میں جیادہ سے ناہیں لگے گا۔ لیکن آپ کہاں ہیں مہروج؟“

”میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔ بےفکر رہو۔“

”مجھے یخین ناہیں ہو رہا مہروج کہ سب کچھ ٹھیخ ہوتا جا رہا ہے۔ میں تو اپنی آشا بس ختم اِچ کرچکی تھی۔ اچھا اب میں بند کرتی ہوں۔ آفتاب اور ہاشم صاحب اس طرف آرہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔“ میں نے کہا۔

سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بھرت ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلے گئے اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے دیکھا، وہ زخمی کتا ابھی تک گلی میں گھوم رہا تھا جس سے کماد کے کھیت میں ملاقات ہوئی تھی۔ عمران نے بھی اسے دیکھا مگر تبصرہ نہیں کیا۔ تبصرے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

بھرت کے بوڑھے پتاجی صحن میں گھوم رہے تھے اور مسلسل کھانس رہے تھے۔ بھرت نے ابھی تک انہیں ہماری موجودگی سے بےخبر رکھا ہوا تھا۔ ہم چھت کی تاریکی میں سے انہیں دیکھتے رہے۔ وہ بمشکل چل پا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتے ہوئے کسی کمرے میں چلے گئے..... تاہم ان کی کھانسی کی آواز آتی رہی۔ ہمیں ابھی تک یہ اندیشہ تھا کہ یہاں کوئی ہمیں پہچان نہ لے۔ خاص طور سے بھرت کے بڑے بھائی کی فکر تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گھومنے پھرنے والا شخص ہے۔ وہ اب بھی زرگاں میں تھا۔ اگر اس نے زرگاں میں ہمیں دیکھا ہوتا تو اس کی واپسی کے فوراً بعد ہمارے لیے مصیبت کھڑی ہوسکتی تھی۔

بھرت کی واپسی میں دیر ہوئی تو ایک بار پھر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں پھر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی تھی؟ بھرت نے واپس آنے میں آدھ گھنٹا مزید لگا دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی واضح نظر آرہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر گڑبڑ ہوگئی..... اور اس دفعہ بڑی سخت ہوئی ہے۔ پتا ناہیں بھگوان کو کیا منظور ہے۔''

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ہمارے پوچھنے پر بھرت نے بتایا۔ ''ہاشم رازی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ بہت ہی سخت اور کٹر بندہ ہے..... بلکہ کچھ لوگن اس کو جنونی کہوت ہیں۔ آج یہ بات ثابت ہوگئی ہے۔ اس نے اندر پہنچ کر صاف کہا ہے کہ وہ ابھی ماریا کو ناہیں چھوڑے گا۔ ماریا کو اس سے رہائی ملے گی جب وہ نل پانی کی حد تک پہنچ جاویں گے۔ اس کی وجہ سے امام قادر بخش سخت مصیبت میں آگئے ہیں۔ وہ اس سمجھوتے کے ضامن تھے اور وہی ہاشم رازی کو اندر لے گئے تھے۔ انگریز افسروں اور پانڈے وغیرہ نے امام صاحب کو دھمکی دی ہے کہ اگر ماریا کو کچھ ہوا تو وہ بھی برابر کے جرم وار ٹھہریں گے۔ ان بے چاروں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔''

یہ سب کچھ قطعی غیر متوقع تھا۔ اس ہاشم رازی کے بارے میں پہلے بھی ہمارے خیالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ہم نے حکم کے دربار میں اسے جنونیوں کی طرح چنگھاڑتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے دیکھا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگتا تھا جو اپنے قریبی ساتھیوں اور ہم خیالوں کے سوا ہر شخص کو کافر یا منافق قرار دیتے ہیں اور انہیں ہر طرح کا نقصان پہنچانا جائز سمجھتے ہیں۔ حکم کے دربار میں ہی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ہاشم نے اپنے ہیجانی خیالات کے زیرِ اثر کئی مسلمانوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ ''جب سب کچھ طے تھا تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

بھرت بولا۔ ''میرا اوچار ہے کہ اندر جا کر ہاشم کو کل رات والے واقعے کی جانکاری ملی ہے۔''

''کون سا واقعہ؟''

''وہی پانڈے اور دو گورے چھاپا ماروں کے اندر گھسنے والا واقعہ۔ اس کے بعد ہی وہ بپھرا ہے اور اس نے کہا ہے کہ یہ لوگن پھر دھوکا دیں گے۔ حالانکہ میری سمجھ کے مطابق اس کا یہ وچار بالکل غلط ہے۔ اس کو کسی اور پر ناہیں تو بڑے امام صاحب پر تو وشواس کرنا چاہیے۔ اور پھر اتنے یرغمالی بھی ہیں اس کے پاس جن میں ڈاکٹر لی وان کے علاوہ وہ زخمی انگریز افسر بھی ہے۔''

اسی دوران میں اسپتال کی چھت کی جانب سے کسی کے غصیلے انداز میں دہاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بھرت بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ یہ ہاشم بول رہا ہے۔ انگریز افسر اینڈرسن صاحب نے اسے بات چیت کرنے کے لیے بیٹری سے چلنے والا لاؤڈ اسپیکر بھجوایا ہے۔''

ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آئے۔ یہ واقعی ہاشم رازی تھا۔ وہ اسپتال کی چھت پر موجود تھا مگر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ میگا فون کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر تیر کر اس کی مشتعل آواز ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''..... بکواس مت کرو۔ تم لوگن خود دغا باز ہو، فریبی ہو۔ اب ہم تمہارا فریب ناہیں چلنے دیں گے۔ وہی کچھ ہووے گا جو ہم چاہیں گے۔ میم تب چھوٹے گی جب ہم نل پانی پہنچ جاویں گے۔''

ایک قریبی گھر کی چھت سے ایک دوسری آواز آئی۔ یہ بھی میگا فون کے ذریعے آئی تھی۔ بولنے والا حکم کا کوئی افسر تھا۔ اس نے انگریز افسر اینڈرسن کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب کہوت ہیں، تم زبان دے کر پھر رہے ہو۔ کیا تمہارا دھرم تمہیں اس کی اجازت دیوت ہے؟ یہ سراسر جھوٹ اور مکاری ہے۔ اس کے بعد تمہاری اور کس بات پر وشواس کیا جاسکتا ہے؟''

''یہ جھوٹ اور مکاری ناہیں۔'' ہاشم دہاڑا۔ ''یہ سب کچھ لڑائی کا حصہ ہے اور تم لوگن خود کہوت ہو کہ محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہووت ہے.....''

حکم کے افسر نے کہا۔ ''اچھا..... یہ ایک منٹ، امام صاحب سے بات کرو۔''

چند سیکنڈ بعد میگا فون پر امام قادر بخش صاحب کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''ہاشم! تم نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس طرح وعدے سے پھرنا ٹھیک ناہیں۔ اس سے فساد ہوگا..... اور اس فساد میں اگر کچھ جانیں گئیں تو اس کا بوجھ بھی تم پر آئے گا۔ میں نے تمہیں ضمانت دی ہے اور ایک بار پھر پوری ذمے داری کے ساتھ یہ ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت نل پانی جانے کی اجازت دی جائے گی.....''

''میں آپ کی عزت کرتا ہوں امام صاحب! لیکن آپ ایک سیدھے سادے شخص ہو۔ آپ کی دوڑ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک ہے۔ آپ ان گوروں کے چلتر ناہیں جانتے۔ جب ہم ان کے نشانے پر آگئے تو یہ طوطے کی طرح آپ کی طرف سے آنکھیں پھیریں گے۔ ایک ناہیں سنیں گے آپ کی۔ آپ اس معاملے سے ایک طرف ہو جائیں۔''

''میں کس طرح ایک طرف ہو جاؤں ہاشم؟ میں ضامن ہوں تمہارا۔ یہ مجھے بھی تمہارا ساتھی کہنے لگے ہیں۔ یہ مجھے اور میرے سارے خاندان کو جیل میں سڑا دیں گے۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو؟''

''ایسا کچھ ناہیں ہوگا مولانا! یہ حرامجادے آپ پر صرف دباؤ ڈال رہے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہو بھی تو آپ کی طرف سے اس کارِ خیر میں حصہ ڈلے گا۔ یہ سچ اور جھوٹ کی لڑائی ہے۔''

''لیکن اس لڑائی میں بے گناہوں کا خون بہے گا ہاشم۔ ان بیمار بچوں اور عورتوں کا کیا قصور ہے جنہیں تم لوگوں نے قیدی بنایا ہوا ہے؟ ان کا لہو کس کی گردن پر ہوگا؟''

''یہ کھلی جنگ ہے مولانا..... اور جنگوں میں فوجیوں کے ساتھ شہری بھی مرتے ہیں۔ لیکن جو بے گناہ مریں گے، ان کو صلہ ملے گا۔ ان کی بخشش ہووے گی.....'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر دہاڑتی آواز میں بولا۔ ''اور میں ایک بار پھر سب کو وارننگ دیوت ہوں۔ اگر کل سویرے ہمیں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہ دی گئی تو ہم ناپاک لوگن کی لاشوں کو صحن میں پھینکنا شروع کر دیویں گے اور سب سے پہلے مرے گا یہ بڈھا لی وان.....''

بڈھا لی وان..... اس کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی محسوس ہوئی۔

ڈاکٹر لی وان وہ شخص تھا جو اپنی خداداد قابلیت کے ساتھ مقامی لوگوں کی بے لوث خدمت کر رہا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے جسم کو گھسیٹتا ہوا اس دور دراز علاقے میں اپنے کسی ذاتی مطلب سے نہیں پہنچا تھا۔ اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی تھی۔ ایک موقع پر آفتاب نے اسے اسپتال سے بحفاظت نکال دینے کی آفر کی تھی لیکن اس نے اپنے عملے اور اپنے مریضوں کو چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اکثر قابل ترین لوگوں کی طرح کچھ سنکی اور موڈی تھا مگر اس کی ان کیفیات میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی تھی۔ اور اب چھوٹے ڈاکٹر راج کی طرح ڈاکٹر لی وان بھی موت کے دہانے پر تھا۔ صورتِ حال ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ گمبھیر ہوچکی تھی۔

میگا فون پر ہونے والی بات چیت ختم ہوچکی تھی۔ ہم بھی چھت سے نیچے آگئے۔ گھر کے اندر خوش گوار حرارت موجود تھی۔ چمپی نے ہمارے بستر لگا دیے تھے اور انگیٹھی وغیرہ دہکا دی تھی۔ وہ پُرکشش صورت اور جسم کی مالک تھی۔ بھرت کے اردگرد وہ یوں رہتی تھی جیسے کوئی داسی، دیوتا کے گرد پروانہ وار منڈلاتی ہے..... اس کی نگاہیں جیسے ہر وقت اپنے دیوتا کے چرن چھوتی رہتی ہیں۔ بھرت نے ہمیں بتایا تھا کہ اپنے پتا کی طرح وہ بھی چکنی مٹی اور چونے وغیرہ سے بڑے خوب صورت مجسمے بنا لیتی ہے۔ اس کا پتا ان مجسموں کو بیچ دیتا ہے اور اس رقم سے چمپی کا جہیز بناتا ہے۔

مجسموں کی بات چلی تو بھرت نے ہمیں چمپی کے بنائے ہوئے چند STATUE دکھائے۔ جوتیاں گانٹھتا ہوا موچی، کھیت میں ہل چلاتا ہوا کسان، پن گھٹ سے پانی لاتی ہوئی عورت..... یہ واقعی خوب صورت کام تھا۔ بھرت نے یہ مجسمے ایک چوبی الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ عمران کی عقابی نظر نے دیکھ لیا کہ الماری میں ایک چور خانہ بھی ہے اور غالباً اس میں بھی مجسمے رکھے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بھرت بھیا! کیا وہاں کچھ خاص نمونے ہیں؟''

بھرت نے دو لمحے توقف کیا پھر مسکرا کر بولا۔ ''اب آپ دونوں سب کچھ جان ہی چکے ہیں تو یہ بھی دیکھ لیں۔''

اس نے ایک چابی سے چور خانہ کھولا۔ اس میں وہ مجسمے تھے جو غالباً چمپی نے جذبات میں ڈوب کر بنائے تھے۔ یہ ایک دیوتا کے لیے ایک داسی کی بے مثال محبت اور خودسپردگی کی تصویر پیش کرتے تھے۔ شاید یہ مجسمے بناتے ہوئے چمپی خود بھی شرمائی تھی اور اس کی یہ شرم داسی کے خوب صورت چہرے پر بھی نقش ہوگئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھرت نے اصرار کر کے چمپی سے یہ مجسمے بنوائے ہوں۔ تین چار مجسمے COUPLE STATUES کی شکل میں تھے۔ ان میں داسی قریباً عریاں نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دیوتا کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی۔ کہیں اسے اپنے پُرکشش جسم کی نذر پیش کر رہی تھی۔ کہیں اس کی آغوش میں تھی۔

غالباً ایسے ہی خیالات عملی زندگی میں بھی چمپی کے رہے ہوں گے۔ ہم اس کی ایک جھلک رات کے وقت گنّے کے کھیت میں دیکھ چکے تھے۔ وہ اپنی ماں کی نگاہ بچا کر وہاں پہنچی تھی اور بھرت سے ہم آغوش ہوئی تھی۔ ان دونوں کے تعلقات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر بھرت چاہے تو وہ اپنی اس شودر خادمہ کو کسی بھی وقت اپنی ''بھرپور خدمت'' پر آمادہ کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا چاہتا نہیں تھا۔ وہ اس سے پیار کرتا تھا اور اسے پوری عزت کے ساتھ بیاہ کر ایک اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔

کچھ اور مجسمے بھی چور خانے میں موجود تھے لیکن یہ جذبات انگیز مجسمے نہیں تھے۔ یہ تو سیدھے سادے دیوی دیوتاؤں کے STATUE تھے۔ درگا دیوی، لکشمی دیوی، کرشن، لکشمن، ہنومان وغیرہ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ”ان بے ضرر مجسموں کو کیوں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟“

بھرت بولا۔ ”اس لیے کہ یہ چھپی نے بنائے ہیں۔ وہ نچلی ذات کی ہے۔ دھرم کے ٹھیکے دارا سے یہ آ گیا نا ہیں دیتے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو ہاتھ لگائے۔ وہ شوق پورا کرنے کے لیے چوری چھپے ایسا کام کرت ہے۔“

باہر کسی تاریک گلی سے کتّے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ وہی کتا تھا۔ عمران نے بھرت سے کہا۔ ”یار! یہ کتا زخمی ہے۔ اس کے گلے میں شاید شرارتی لڑکوں نے بہت کس کر رسّی باندھ دی تھی۔ یہ مرنے کے قریب تھا۔ ہم نے کھیت میں اس کی رسّی کھولی تھی۔ اگر ہو سکے تو کسی نوکر کو بھیج کر اسے اندر باندھ دو اور اس کی مرہم پٹی کرا دو۔ یہ بڑا پُن کا کام ہے۔“

بھرت نے کہا۔ ”ہاں، میں نے بھی کل اسے دیکھا تھا۔ چلو میں کسی نوکر سے کہوت ہوں۔ ویسے لگت ہے کہ تم کو جانوروں سے کافی پریم ہے؟“

”ہاں .... کچھ ایسا ہی ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہ بے پر کی بھی اڑاتے ہیں کہ میں پہلے ایک جانور تھا یعنی بندر..... پھر ڈھائی تین کروڑ سال میں آہستہ آہستہ بندہ بن گیا۔ یعنی بندر کی ”ر“ اڑ گئی اور ”ہ“ لگ گئی۔ غور کریں تو اب بھی بندے کے لفظ میں تین چوتھائی حصہ بندر کا ہی ہے ..... اور کچھ لوگوں میں تین چوتھائی صفتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔“ اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا، شاید بحث کے موڈ میں تھا۔ بہرحال میں نے اسے نظر انداز کیا۔

بھرت مسکرایا۔ ”تمہاری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں شیام بھائی۔“

بھرت کے باہر جانے کے بعد میں اور عمران ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ جو کچھ اسپتال میں ہو رہا تھا، بہت تکلیف دہ تھا۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک سلطانہ مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید تین رات پہلے فتح پور کے پرانے مندر سے سنگین واقعات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ اب رک جائے گا اور وہ موت کے گھیرے سے نکل کر پھر آزاد فضاؤں میں پہنچ سکے گی۔ اس ہٹ دھرم ہاشم عرف ہاشو نے ایک بار پھر صورتِ حال کو ریورس گیئر لگا دیا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا اندازہ ہے؟ کیا مسٹر اینڈرسن اور پانڈے وغیرہ ہاشم کی یہ بات مان لیں گے کہ وہ ماریا سمیت یہاں سے نکل جائے؟“

”نہیں..... لگتا ہے کہ وہ نہیں مانیں گے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر ہاشم رازی اتنے سخت گھیرے میں بھی ان کی بات نہیں مان رہا تو پھر وہ نل پانی کی سرحد پر پہنچ کر بھی نہیں مانے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ خون خرابا ہوگا؟“ میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

”آثار تو ایسے ہی ہیں۔“

”اس کو روکنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں عمران؟ کیا ہم خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟“

”نہیں، کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔“

ہم رات کو بہت تھوڑی دیر کے لیے سوئے۔ صبح سویرے بھرت کی زبانی ایک خبر ملی جو بڑی اندوہناک تھی۔ معلوم ہوا کہ شعلہ صفت ہاشم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا ہے اور ڈاکٹر لی وان کے سر میں دو گولیاں اتار کر اس کی لاش چھت پر سے صحن میں پھینک دی ہے۔ وہ شخص اپنی جان کی بازی ہار گیا تھا جس نے بے لوث جذبے کے ساتھ اس راجواڑے کے بے شمار لوگوں کی جانیں بچائی تھیں۔ ہمارے دل غم سے لبریز ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے وہ مناظر گھومنے لگے جب عمران ڈاکٹر کو نل پانی سے زبردستی فتح پور لے کر آیا تھا تاکہ وہ میری گردن میں سے الیکٹرانک چپ نکال سکے۔ شروع میں ڈاکٹر بے حد بیخ پا رہا تھا اور اس نے کمرے سے چیزیں اٹھا اٹھا کر عمران کو مارنا شروع کر دی تھیں۔ مگر جب عمران نے بڑے اسٹائل سے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لی تھی تو وہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور پھر اس نے اپنی تمام توجہ اور مہارت میری گردن کے آپریشن پر صرف کر دی تھی۔

ہم کتنی ہی دیر خاموش اور آزردہ بیٹھے رہے۔ یہ کیفیت اس بوڑھے ناتواں شخص کے لیے تھی جس نے دلیری سے موت کو گلے لگایا تھا۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کے کپتان کی طرح اس نے شدید خطرے کے وقت اپنا اسپتال اور اپنے مریض چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور موت کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ بھرت کے مطابق وہ پورے دو دن سے بھوکا پیاسا اپنے مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں اس نے فوزیہ نامی ایک کم سن بچی کے گلے کا آپریشن اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ اب وہ ہم میں نہیں تھا۔ اس کی لاش گاؤں کے مکھیا بلرام کی حویلی میں پڑی تھی اور سیکڑوں لوگ اس کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔

بھرت نے ہمیں چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بارے

میں بھی تفصیل بتائی۔ چھوٹے ڈاکٹر راج سنہا کو کل رات مارا گیا تھا۔ بھرت نے بتایا کہ اب بہت سی باتیں کھل گئی ہیں۔ میم ماریا یہاں ڈاکٹر لی وان پر ڈورے ڈالنے آئی تھی۔ وہ اس سے کوئی خاص کام لینا چاہتی تھی لیکن لی وان کی طرف سے ناکام ہو کر اس نے چھوٹے ڈاکٹر راج کو اس کام کے لیے چنا۔

میں نے پوچھا۔ ”تم کس خاص کام کی بات کر رہے ہو؟“

بھرت گہری سانس لے کر بولا۔ ”ٹھیک سے تو پتا ناہیں۔ لیکن جو لوگن اندر کی بات جانت ہیں، وہ کہوت ہیں کہ ڈاکٹر لی وان کو سلطانہ کے پتی کے ٹھکانے کے بارے میں پتا تھا اور شاید چھوٹا ڈاکٹر راج بھی جانتا تھا۔ میم ماریا بھی اس کا ٹھکانا ہی جاننا چاہت تھی۔ سامبر مقابلے میں اپنے سوتیلے بھائی جارج کی موت کے بعد سے وہ دیوانوں کی طرح سلطانہ کے پتی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ یہاں آ کر ماریا کو جلد ہی پتا چل گیا ہوگا کہ ڈاکٹر لی وان اور طرز کا بندہ ہے اور اس کے ڈھب پر ناہیں آوے گا۔ اس نے نوجوان ڈاکٹر راج پر اپنے حسن کا جال پھینکا اور کسی حد تک اسے گھیرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اسپتال کے ایک ملازم نے جانکاری دی ہے کہ یہ میم صاحب ڈیڑھ دو گھنٹے تک چھوٹے ڈاکٹر راج کے کمرے میں رہی تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ مگر پھر اور ہی چکر چل گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا جو آپ کے اور میرے سامنے ہے۔ چھاپا ماروں نے اسپتال کو یرغمال بنا لیا۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت شاید اسی کارن ہوئی کہ وہ میم ماریا کے حسن کا شکار ہو گیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ عمران نے پوچھا۔

”چھوٹے ڈاکٹر نے ماریا کی مدد کرنے کے لیے احمقانہ بہادری دکھائی اور رات پٹھان چھاپا مار سے رائفل چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ سب کو وشواس ہے کہ اسی ناکام کوشش کی وجہ سے کل اسے گولی مارنے کے لیے چنا گیا تھا۔“

بھرت کی بات ختم ہوئی تو عمران نے کُرتے کی جیب سے ایک چھوٹا سا رقعہ نکال کر بھرت کو دیا۔ ”بھرت! یہ ایک بہت ضروری کام کرو۔ کسی طرح یہ پیغام انگریز افسر مسٹر اینڈرسن تک پہنچا دو۔“

”مسٹر اینڈرسن؟ کیا وہ تم کو جانت ہے؟“ بھرت نے پوچھا۔

”نہیں لیکن اس رقعے کو وہ ضرور اہمیت دے گا۔“ عمران نے کہا۔

”اس میں کیا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ بھرت بھی کچھ ٹھٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

عمران بھرت کو ایک طرف لے گیا۔ دھیمی آواز میں اسے کچھ سمجھایا۔ بھرت کی تشویش قدرے کم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

”یہ سب کیا ہے عمران؟ تم کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے کندھے اچکائے۔

”رقعے میں کیا لکھا ہے تم نے؟“

”کچھ خاص نہیں۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ وہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دے۔ میں اس کا داماد بن جاؤں گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ یہاں کے ہندوؤں سے تو پہلے ہی گوروں کی بنتی ہے، زیادہ دشمنی تو مسلمانوں سے ہی ہے۔ اس رشتے داری سے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے گی اور میری یہ دیرینہ تمنا بھی پوری ہو جائے گی کہ کسی گوری چمڑی والی حسینہ کو .... سمجھ گئے ہو نا تم؟“ اس نے ایک آنکھ میچی۔

میں نے کہا۔ ”عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم مسخرے ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بے حس بھی ہو۔ وہاں اسپتال میں لاشیں گر رہی ہیں اور تم اوٹ پٹانگ بول رہے ہو۔“

”تم بھی تو سوال پر سوال کرتے ہو۔ کبھی اپنا دماغ بھی استعمال کیا کرو ..... بلکہ میرے خیال میں تو یہ بات تمہارے دماغ شریف میں بھی آنی چاہیے تھی کہ اینڈرسن سے رابطہ کیا جائے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا عمران! کہیں ہم کسی مصیبت کو دعوت نہ دے لیں۔ کیا تم نے اینڈرسن کو یہاں اپنی موجودگی کے بارے میں بتایا ہے؟“

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”میں نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں بتا بھی دیتا تو کوئی زیادہ خطرے والی بات نہیں تھی۔ تم ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”حکم اور اس کے انگریز دوستوں میں بڑا بھائی چارہ ہے لیکن فی الوقت دونوں کی سوچ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ ہندو افسر اور سپاہی ہر صورت دھرم دشمن سلطانہ کو پکڑنا یا قتل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف انگریزوں اور انگریز افسروں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نزدیک سب سے اہم بات ماریا کی زندگی بچانا ہے۔ اور میں نے اینڈرسن کو جو رقعہ لکھا ہے، وہ اسی حوالے سے ہے اور اس کی تحریر اینڈرسن کے دل کو ضرور لگے گی۔"

"کیا کہا ہے تم نے؟"

"فی الحال بس اتنا بتایا ہے کہ وہ کسی بھی ہندو فوجی افسر یا سپاہی کو بتائے بغیر مجھ سے ملاقات کرے۔ میرے پاس اس کے لیے ایک بہت اہم اطلاع ہے اور اس اطلاع کا تعلق سلطانہ کے پتی تابش اور اس کے ساتھی عمران سے ہے۔"

"اوہ گاڈ...... یہ کیا کر رہے ہو تم۔ یہ تو بڑا رسک والا کام کر دیا ہے تم نے۔" میں کراہا۔

"رسک والا کام ہی تو ہم کرتے ہیں۔ پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھولے سے دوسرے پر بغیر جال کے چھلانگ لگانا، سر پر سیب رکھ کر چاقو سے نشانہ لینا، ریوالور کے چیمبر کو گھما کر تین چھ کا کھیل کھیلنا ..... یہ سب کچھ رسک ہی تو ہے جگر! اور رسک ہی اپنی زندگی ہے۔ کیونکہ رسک سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔" اس نے عجیب کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وہ خطروں کا کھلاڑی تھا اور اس کھیل میں اس کی خوش قسمتی اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلتی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کس موڈ میں تھا کہ انچارج انگریز افسر کو خط لکھ مارا تھا۔

عمران نے جو کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ میری توقع کے خلاف اور عمران کی توقع کے عین مطابق نکلا۔ قریباً پینتالیس منٹ بعد بھرت ہانپا ہوا نمودار ہوا اور اس نے عمران سے کہا کہ مسٹر اینڈرسن اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

حویلی کی ڈیوڑھی کے پاس بھرت کی ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ بھرت نے خود کوچبان کی نشست سنبھالی اور گھوڑا گاڑی حویلی نما مکان کے پھاٹک سے نکل کر ایک طرف روانہ ہو گئی۔ دن چڑھ آیا تھا مگر ابھی گلیوں میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکا دکا افراد خالی ہاتھ یا لوٹے وغیرہ لیے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ مویشیوں کے ایک دو ریوڑ بھی کھیتوں کی جانب جاتے دکھائی دیے۔ ان کی گھنٹیاں اس ٹھٹھری ہوئی دھند آلود صبح میں ارتعاش پیدا کرتی تھیں..... کہیں کہیں حکم کا کوئی باوردی فوجی بھی ٹہلتا نظر آ جاتا تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک چھوٹے سیم نالے کے ساتھ چلتی چلتی کوئی نصف میل باہر آ گئی۔ کماد کی ایک فصل کے پیچھے جوار کے کٹے ہوئے کھیت میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ یہ چاروں طرف سے بند تھی۔ اس کو لوڈر نما گاڑی کہا جا سکتا تھا..... ترپال کے ذریعے اسے چاروں طرف سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سفید فام ڈرائیور بیٹھا تھا۔ بھرت ہم دونوں کو اس کیچڑ آلود گاڑی میں لے گیا۔ ہم اندر چلے گئے اور وہ باہر کھڑا رہا۔ اس لوڈر کے اندر ایک چھوٹا سا آرام دہ صوفہ پڑا تھا۔ دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ صوفے پر پینتالیس اڑتالیس سال کا ایک بارعب فوجی افسر بیٹھا تھا۔ اس کے ہولسٹر میں چمک دار پستول لگا ہوا تھا اور منہ میں سگار تھا۔

اس نے ہمیں دھیان سے دیکھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں تحیر کے آثار ابھرے۔ اس نے یقیناً ہم دونوں کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "ہیلو مسٹر آمران اور ہیلو مسٹر تابش۔" اس نے ہم دونوں کے نام بگاڑتے ہوئے کہا۔

"ہیلو مسٹر اینڈرسن۔" عمران نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔ "ویل ڈن .... ویل ڈن .... بہت آچھا کیا کہ تم نے ام سے رابتا (رابطہ) کر لیا۔ اور اس سے بھی زیادہ آچھا یہ کیا کہ ہام کو اکیلے میں بلایا۔ آئی ایم ریئلی امپریسڈ۔"

"اس میں خطرہ موجود تھا مسٹر اینڈرسن .... لیکن ہمیں آپ کی فہم و فراست پر یقین بھی تھا۔ ہمیں امید تھی کہ آپ کا رویہ ہمارے لیے نرم ہوگا اور ہم اس سنگین سچویشن میں ایک دوسرے کے کام آ سکیں گے۔"

"وائی ناٹ ..... وائی ناٹ۔ ہام کو خوشی ہوا کہ تم نے ایسا دلیری کا فیصلہ بنایا..... اور ہام کا خیال ہے کہ ہام تینوں انگلش میں بھی بات کر سکتا ہوئیں گا۔"

"بالکل جی! اس میں ہم تینوں کو آسانی رہے گی۔" عمران نے انگلش میں کہا۔

اب گفتگو انگریزی میں ہونے لگی۔ عمران نے کہا۔ "جناب! زرگاں کے سامبر مقابلے میں جو کچھ ہوا، وہ کھیل کا حصہ تھا۔ اس خونی کھیل میں کسی ایک کو تو ہارنا تھا۔ پھر بھی ان واقعات کا رنج ہے۔"

"چھوڑ دو..... ان باتوں کو اب چھوڑ دو۔ وہ سب ماضی کا حصہ ہے۔" اینڈرسن نے تیزی سے کہا۔ "اب ہمیں موجودہ صورتِ حال کو دیکھنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس میں سے کیسے بحفاظت نکل سکتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "آپ نے ہندوؤں کا رویہ تو ملاحظہ فرما لیا ہوگا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو ہر صورت سلطانہ کی موت چاہتے ہیں، چاہے اس کے لیے کچھ قیمت بھی دینی پڑے۔ یہاں آ کر ہمارا اور آپ کا مفاد ایک ہو گیا ہے۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے ہیں اور آپ مس ماریا کو..... اور انگلش آفیسر کو۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس معاملے کو ہینڈل کرنے کا موقع دیں۔"

"تم کس طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتے ہو؟"

"بات چیت کے ذریعے۔ اور اگر یہ طریقہ کام نہ آیا تو پھر کسی بھی طریقے سے .... تابش کا خیال ہے کہ سلطانہ اب شاید خود بھی وہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ اگر اسے کسی طرح پتا چل جائے کہ تابش یہاں موجود ہے اور اس معاملے کے حل کی کوشش کر رہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اندر سے کوئی ایسی کوشش کرے جس سے بازی ہمارے حق میں پلٹ جائے۔"

"تم اندر کے لوگوں سے کس طرح رابطہ کرو گے؟" اینڈرسن نے اپنی بارعب آواز میں دریافت کیا۔

"آپ ہمیں اسپتال کے آس پاس کی کسی قریبی چھت تک رسائی دلا دیں۔ باقی ہم خود سنبھال لیں گے۔" عمران نے کہا۔ اس نے اینڈرسن کو یہ بات نہیں بتائی کہ اسپتال کے اندر رابطہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک واکی ٹاکی کا بُرا بھلا سہارا ابھی موجود ہے۔ ہمارے اور مسٹر اینڈرسن کے درمیان یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اس دوران میں بھرت اور انگریز ڈرائیور باہر دھوپ میں بیٹھے رہے۔ اگر کوئی اس طرف آ بھی جاتا تو شاید یہی سمجھتا کہ کوئی صاحب بہادر رفع حاجت فرمانے کے لیے اس طرف آیا ہوا ہے۔

مسٹر اینڈرسن یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ ہم جو کچھ بھی کریں گے، اس میں ماریا کی زندگی کے لیے کسی طرح کا خطرہ موجود نہیں ہوگا۔ عمران نے اپنی بے مثال مدلل گفتگو کے ذریعے اینڈرسن کا یہ اندیشہ کافی حد تک کم کر دیا۔ دوسری طرف ہمیں اس یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ مسٹر اینڈرسن یا اس کے دو چار قریبی انگریز ساتھیوں کے سوا کسی کو ہماری یہاں موجودگی کا علم نہیں ہوگا۔ اینڈرسن نے ہمیں یقین دہانی کرا دی۔ اس کے ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا کہ اگر یہ معاملہ خیریت کے ساتھ طے ہو جاتا ہے اور ماریا باہر آ جاتی ہے تو وہ ہماری اور سلطانہ کی بحفاظت واپسی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالے گا بلکہ کسی اور کو بھی نہیں ڈالنے دے گا۔ دراصل سلطانہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اصل خبط تو کٹر ہندوؤں پر ہی سوار تھا۔

گفتگو کے انجام تک اینڈرسن اچھے موڈ میں آ چکا تھا۔ اس نے مجھے اور عمران کو سگار پیش کیے۔ عمران نے شکریے کے ساتھ سگار قبول کر لیا۔ اینڈرسن پاٹ دار آواز میں بولا۔ "ہمارے دور میں برصغیر کے اندر جو کچھ بھی ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے وعدہ خلافیاں نہیں کیں۔ ہم نے کسی کو دوست بنایا تو اس کا ساتھ نبھایا۔ کسی کو جان کی امان دی تو اس کی حفاظت کی۔ اس کی ایک مثال آخری تاج دار بدر شے ظافر (بہادر شاہ ظفر) بھی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ وہ اپنے جرنیل بخت کے بلند بانگ دعوؤں سے متاثر ہو گیا اور اس کے ساتھ مل کر برٹش فوج کو دلی سے دور رکھنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ لیکن ہم نے چونکہ اس کی بیوی زیناٹ کل (زینت محل) اور بچے کو جان کی امان دی ہوئی تھی، اس لیے سخت مشکلوں کے باوجود ان کی حفاظت کی اور انہیں ہندوستان کے بھڑکتے شعلوں سے نکال کر رنگون پہنچایا..... اور برادرز! یہ تو بس ایک مثال ہے....."

"ہم جانتے ہیں جی، آپ ایسی بہت سی مثالیں دے سکتے ہیں۔" عمران نے نیازمندی سے کہا۔ "آپ پر ہمارا یہ بھروسا ہی ہے جس نے ہمیں اپنی جان خطرے میں ڈالنے اور آپ سے رابطہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔"

اینڈرسن نے عمران کو گہری نظروں سے دیکھا..... جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کے لہجے کی تہ میں کوئی طنز وغیرہ تو نہیں۔ لیکن وہ عمران ہی کیا تھا جس کے اندر جھانکا جا سکتا۔ ہمارے اور اینڈرسن کے درمیان کئی تفصیلات طے ہوئیں۔ آخر یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ میں نے اس گفتگو میں بہت تھوڑا حصہ لیا تھا۔ اینڈرسن ہم دونوں سے تھوڑا تھوڑا متاثر ہوا تھا۔ عمران کی گفتگو اور حاضر جوابی نے اسے متاثر کیا تھا جبکہ میرے کریڈٹ میں میری جسمانی فٹنس تھی اور وہ تاریخی مقابلہ تھا جس نے جارج جیسے فائٹر کو خاک چٹوائی تھی۔ بہرحال، ہمارے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو کے دوران میں اینڈرسن کی آنکھوں میں احساسِ برتری کی وہی چمک نظر آئی تھی جو ہمارے جیسے محکوم ملکوں میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں کی نگاہوں میں سما جاتی ہے۔

..... شام سے پہلے ہی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ پھر بادل چھا گئے اور سردی میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم نے بھرت کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا..... یہ جان کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں کہ میں ہی وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمران نے انگریز افسر غیارڈ سے انگریزی میں کہا۔
''یہ بہت اچھا کام ہے۔ ہم کافی نزدیک آ گئے ہیں۔''
''لیکن بہت احتیاط بھی کرنا ہوگی۔'' غیارڈ نے کہا۔
''یہ دیکھو۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں کھڑکی میں گولیوں کے تین چار سوراخ نظر آئے۔ غیارڈ نے بتایا کہ پرسوں ذرا سے شک کی بنیاد پر پٹھان حملہ آور نے اس طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ شاید کوئی اس طرف حرکت کر رہا ہے۔

''وہ اب بھی چھت پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ایک بندہ تو ہر وقت چھت پر رہتا ہے۔ وہ گول ٹینکی دیکھ رہے ہو نا؟ اس کے پیچھے پوزیشن ہے اس کی۔ چاروں طرف نظر رکھتا ہے۔ اس کے پاس سیون ایم ایم رائفل ہے اور زبردست نشانہ ہے باسٹرڈ کا۔''

غیارڈ اپنے ساتھ جو سامان لایا تھا، اس میں دو رائفلیں، ایک ٹیلی اسکوپ، ایک بڑی ٹارچ اور ایمونیشن وغیرہ تھا۔ غیارڈ دو منٹ کے لیے نیچے گیا تو ہمیں آپس میں بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ''حیرت ہے یہاں ڈھائی تین سو فوجی موجود ہیں لیکن وہ دو دن تک اکیلے آفتاب کے خلاف کچھ کر نہیں پائے؟''

عمران نے کہا۔ ''اس کی بڑی وجہ تو مار یا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے آفتاب کی ہوا باندھ دی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ اندر آفتاب کے ساتھی موجود ہیں اور انہوں نے دھماکا خیز مواد نصب کر رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ..... یہ سب کچھ یہاں نہیں ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں پتا ہے اور دوسروں کو نہیں۔ آفتاب کے پاس کوئی دھماکا خیز مواد تھا ہی نہیں اور یہی حقیقت ہمارے لیے آسانیاں پیدا کر سکتی ہے۔''

اچانک مجھے اور عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ کام اتنی جلدی شروع ہو جائے گا۔ یکایک پانی کی گول ٹینکی کے پیچھے سے کسی لڑکے یا جوان لڑکی کے رونے سسکنے کی صدا آئی۔ اس کے ساتھ ہی ہاشم کی چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی۔ ''نو بج گئے ہیں۔ ایک اور بکرے کی قربانی کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اس بکرے کا کھوپڑا توڑ کر نیچے پھینک رہا ہوں۔ تم اپنی ضد نا ہیں چھوڑو گے تو ایسے ہی اپنے چہیتوں کی لاشیں گنو گے۔'' وہ میگافون پر بول رہا تھا..... اسپتال کے اردگرد ہر طرف ہلچل نظر آئی۔

شخص ہوں جو سلطانہ کا شوہر کہلاتا ہوں اور میں نے ہی زرگاں کے مقابلے میں راجواڑے کے شکتی دیوتا کو خاک و خون میں لوٹایا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اس آگاہی کے بعد وہ ہم دونوں سے اور خصوصاً مجھ سے بہت مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سیدھا سچا شخص تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر معذرت کے انداز میں کہا۔ ''اگر میں نے بے خبری میں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی ہو تو مجھے شما کیجیے۔ مجھے ہرگز معلوم نا ہیں تھا کہ اتنا بڑا شخص ہمارے گھر میں موجود ہے۔ ہمارا مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ راجواڑے کے ہزاروں لوگن ہوں گے جو آپ کی صرف ایک جھلک دیکھنا چاہت ہوں گے۔''

میں نے بھرت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ میں کچھ خاص نہیں بھرت۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ یہاں کے لوگوں کی بددعائیں اور آہیں تھیں جو جارج کو لے ڈوبی ہیں۔''

''کچھ بھی ہے تابش صاحب! آپ نے ایک مہان کام کیا ہے۔ یہ راجواڑہ آپ کی اس جیت کو مدتوں یاد رکھے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''یار! تعریف کے دو بول میری طرف بھی پھینک دو۔ آخر میں نے بھی کچھ کردار ادا کیا ہے۔''

جواب میں بھرت نے کہا کہ آپ دونوں ہی تعریف کے قابل ہیں۔ عمران بولا۔ ''ہاں اب کچھ بیلنس ہوا ہے۔''

پروگرام کے مطابق ہم نے شام سات بجے تک تیاری کر لی۔ ہم نے اپنے کپڑے بدل لیے تھے۔ بھرت نے ہمارے لیے اپنے دو جوڑے فراہم کر دیے۔ سائزوں میں تھوڑا بہت فرق تھا لیکن گزارہ ہو گیا۔ ان شلواروں قمیصوں کے ساتھ جوتوں کا انتظام بھی بھرت کو کرنا پڑا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ایک بند گھوڑا گاڑی بڑی خاموشی کے ساتھ آئی اور ہمیں لے کر ایک جانب روانہ ہو گئی۔ اس میں ایک انگریز فوجی افسر موجود تھا۔ ہم رات کی تاریکی میں ایک مکان کے پچھواڑے رکے اور گاڑی سے اتر گئے۔ مکان کے عقبی دروازے کے ذریعے ہم گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دو تین روز پہلے ہی مکینوں سے خالی کرا لیا گیا تھا۔ گرد آلود سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر پہنچے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہم اسپتال کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اسپتال کی چھت اور اس گھر کی چھت کے درمیان محض ایک پچیس تیس فٹ چوڑا راستہ ہی تھا۔ ہم ایک برساتی نما کمرے میں آ گئے۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے شیلا سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔ میں مسٹر ولیم ایڈگر کے ساتھ ان کے گھر میں داخل ہوا تو شیلا ایڈگر سامنے ہی کھیل رہی تھی۔ اس نے اپنے سائز سے کچھ ہی چھوٹی گڑیا اٹھا رکھی تھی اور اس سے باتیں کر رہی تھی۔ شیلا کے ساتھ وہی مسئلہ تھا جو اکیلے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے یعنی جن کے بہن بھائی یا قریبی کزن وغیرہ نہیں ہوتے، وہ گڈے گڑیوں اور کھلونوں سے دل بہلاتے ہیں۔ غالباً اسی کی تنہائی دور کرنے کے لیے مسٹر ولیم مجھے گھر لائے تھے۔

مسٹر ولیم کاروباری آدمی تھے۔ بنیادی طور وہ اور مسز ولیم دونوں سادہ طبیعت اور دوسروں کا خیال رکھنے والے

ایک کتے کی وفاداری جو اپنے مالکان کی محبتوں کا حق ادا کرنا چاہتا تھا

مریم کے خان

وفادار

محبت... انسیت... لطافت... وضع داری و وفاداری... یہ تمام لفظ گوکہ ایک ہی جذبے کی مختلف کیفیات کے نام ہیں... لیکن لمحہ بہ لمحہ کروٹ لیتے وقت کے ساتھ ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی جا رہی ہے... حتیٰ کہ اب ہر شخص کے جذبات کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی مفاد مخفی ہوتا ہے... بے درد... و بے حس معاشرے سے تعلق رکھنے والے... انسانوں میں ختم ہوتی الفتوں اور چاہتوں کی یاد تازہ کر دینے والی اس شمارے کی شاہکار کہانی...

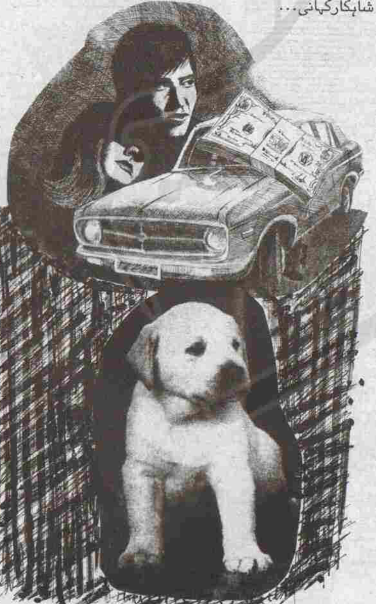

تھے۔ شیلا اس وقت دس سال کی تھی جب میں اس گھر میں آیا۔ مجھے اس سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی لیکن میں بھی اسے پسند آیا تھا کیونکہ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی گڑیا کو لان میں لٹا کر دوڑتی ہوئی آئی اور مجھے گلے لگا لیا اور پیار کرنے لگی۔ مجھے اس کے نرم و نازک گلابی ہونٹوں کا لمس بہت اچھا لگا تھا۔ اس کے پاس سے بہت اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کا والہانہ پن دیکھ کر مسٹر ولیم مسکرانے لگے اور پھر میرا تعارف کرایا۔

''شیلا، یہ موبی ہے۔''

شیلا نے منہ بنایا اور بولی۔ ''ڈیڈی! یہ اتنا پیارا ہے، اس کا نام موبی نہیں، رومیو ہونا چاہیے۔''

میں نے فوراً یہ نام قبول کر لیا اور اپنی دُم ہلا کر پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ جی ہاں، میں ایک کتا ہوں اور کتا اپنے جذبات کا اظہار زیادہ تر اپنی دُم سے کرتا ہے۔ ساتھ ہی میں نے زبان سے شیلا کا رخسار چاٹا۔ وہ خوشی سے چلّائی۔

''دیکھا ڈیڈی، اس نے میرا دیا ہوا نام قبول کر لیا ہے۔ اسے پسند آیا ہے۔ کم آن رومیو! میں تمہیں جینا سے ملاتی ہوں۔''

میں اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر لڑھکتا ہوا شیلا کے پیچھے بھاگا۔ شیلا نے مجھے جینا سے ملوایا، یہ اس کی گڑیا کا نام تھا اور میں نے جینا کے رخسار پر بھی پیار کر کے ایک طرح سے شیلا کا دل جیت لیا۔ وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس نے فوراً مجھے اپنی فیملی میں شامل کر لیا۔ شیلا کے کھلونے اس کی فیملی تھی جس میں مجھے بھی شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ شیلا کے کھلونوں کے لیے ایک پورا کمرا وقف تھا جس میں یہ کھلونے ترتیب اور سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ صرف جینا اس کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں ہوتی تھی اور پہلے ہی دن یہ اعزاز مجھے بھی حاصل ہو گیا تھا۔ مسٹر ولیم نے جس دکان سے مجھے خریدا تھا وہاں سے میرا دوسرا سامان بھی لیا تھا جس میں ایک چھوٹا سا اور خوب صورت کتّا گھر بھی شامل تھا۔ مسٹر ولیم چاہتے تھے کہ یہ گھر ان کے بیڈ رومز کے ساتھ گیلری میں رکھا جائے کیونکہ صرف ایک سال کا ہونے کے باوجود میں ایک تربیت یافتہ کتّا تھا اور مجھے سکھایا گیا تھا کہ خود صاف ستھرا رہنا ہے اور جہاں رہتا ہوں، وہاں بھی کوئی گندگی نہیں کرنی ہے۔ اس لیے مسٹر ولیم اور مسز ولیم کو میری طرف سے ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ میں ان کے شان دار اور سجے سجائے گھر کو گندا کروں گا۔ اس کے باوجود مسز ولیم کے خیال میں میرا گھر ولا کی داخلی گیلری میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ دونوں مجھے ولا کے لان میں رکھنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ مونٹانا کے اس پہاڑی علاقے میں اکتوبر کا موسم نہایت سرد ہوتا ہے اور رات کو تو یہ صفر درجے پر چلا جاتا ہے۔ رات کو شیلا اپنے کمرے میں جانے لگی تو اس نے مسٹر ولیم سے کہا۔

''ڈیڈی! رومیو کا گھر میرے کمرے میں رکھوا دیں۔''

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مسٹر اور مسز ولیم نے شیلا کی فرمائش پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ مسٹر ولیم بولے۔ ''کیوں نہیں ڈیئر... آخر میں رومیو کو تمہارے لیے ہی تو لایا ہوں۔''

مسز ولیم نے پیار سے شیلا کے سنہری بالوں کو سہلایا۔

''ہمیں تمہاری خوشی سب سے زیادہ عزیز ہے، جیسا تم کہو۔''

مسٹر ولیم کے بٹلر جوزف نے میرا گھر اٹھا کر شیلا کے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس گھر میں وہ واحد فرد تھا جس نے مجھے خوشی سے قبول نہیں کیا تھا۔ جب وہ میرا گھر لے کر شیلا کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، تب بھی اس کے چہرے پر اچھے تاثرات نہیں تھے۔ اس نے میرا گھر شیلا کے کمرے کے سب سے دور دراز حصے میں رکھ دیا اور شیلا سے بولا۔ ''بے بی! کتّوں کو اپنے کمرے میں رکھنا حفظانِ صحت کے اصولوں کے خلاف ہے۔''

لیکن شیلا نے اس کی بات سنی نہیں، اس نے کہا۔ ''تم نے گھر اتنا کونے میں کیوں رکھا ہے؟ اسے یہاں آتش دان کے پاس رکھو، وہاں رومیو کو گرمی نہیں لگے گی۔''

''کتّوں کو گرمی نہیں لگتی۔'' جوزف نے کہا۔

''تمہیں جو کہا ہے، وہ کرو اور یہاں سے جاؤ۔'' شیلا کا موڈ خراب ہو گیا۔ ورنہ میں نے دیکھا تھا، وہ بڑے پیار اور نرم لہجے میں گفتگو کرتی تھی۔ اس بار جوزف نے بادلِ ناخواستہ اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے میرا گھر اس جگہ لا کر رکھ دیا جہاں شیلا نے کہا تھا۔ شیلا کا کمرا بہت بڑا اور بہترین فرنیچر اور چیزوں سے آراستہ تھا۔ کمرے کی ایک طرف کی پوری دیوار شیشے کی تھی جس سے باہر پہاڑوں کا منظر دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ کمرا دوسری منزل پر تھا اس لیے منظر اور بھی واضح دکھائی دیتا تھا۔ شیلا نے مجھ سے پوچھا۔

''رومیو! تمہیں میرا کمرا کیسا لگا؟''

میں نے دُم ہلا کر اور ہلکی آواز میں بھونک کر اپنی پسند کا اظہار کیا۔ شیلا خوش ہو گئی۔ ''مجھے معلوم تھا تمہیں اچھا لگے گا، تم بہت اچھی نسل کے کتّے ہو۔ تمہارا گھر ٹھیک جگہ ہے نا؟''

میں نے گھر کے آس پاس گھوم کر خوشی کے انداز میں بھونک کر اسے اشارہ کیا کہ مجھے یہ جگہ بھی اچھی لگی ہے۔ شیلا نے میرا سر سہلایا۔ ''گڈ بوائے۔''

یوں میں شیلا کے کمرے میں رہنے لگا اور میں نے اس

بات کا پورا خیال رکھا کہ میری وجہ سے شیلا کی کوئی چیز خراب نہ ہو اور نہ ہی اسے میری وجہ سے کوئی تکلیف ہو۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اسے تکلیف دینا پسند نہیں کرتا... میں کتا ہوں لیکن اس معاملے میں میرے خیالات انسانوں سے مختلف نہیں ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ذات سے شیلا کو ذرا سی بھی تکلیف ہو۔ شیلا بھی مجھ سے کم محبت نہیں کرتی تھی۔ میرا پورا خیال رکھتی تھی۔ مسٹر ولیم اور مسز ولیم بھی مجھے پسند کرنے لگے تھے۔ میری تمیز اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ان کی پسند مزید بڑھ گئی۔ صرف ایک جوزف تھا جو نہ جانے کیوں مجھے پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ جب مجھے دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی محسوس ہوتی۔ نہ جانے یہ ناپسندیدگی صرف مجھے محسوس ہوتی تھی یا دوسرے بھی اسے محسوس کرتے تھے کیونکہ کبھی کسی نے اسے اس معاملے میں ٹوکا نہیں تھا۔

جوزف ایک جسیم اور گنجے سر والا شخص تھا۔ اس کی عمر پچاس سے زیادہ تھی۔ وہ گھر کے کاموں کے ساتھ مسز ولیم کے ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ مسٹر ولیم اپنی کار خود ڈرائیو کرتے تھے لیکن خطرناک پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے مسز ولیم کو ڈرائیونگ کی اجازت نہیں تھی اور انہیں جب کہیں جانا ہوتا جوزف کار ڈرائیو کرتا۔ وہی شیلا کو اسکول لے جاتا اور لاتا تھا۔ صبح جب شیلا اسکول جانے لگتی تو میں اسے کار تک چھوڑنے آتا۔ جوزف کو میرا پورچ تک آنا بھی ناگوار گزرتا تھا۔ ایک دن جب میں شیلا کو رخصت کرنے آیا تو اس نے جان بوجھ کر دروازہ اس طرح بند کیا کہ میں اس کی زد میں آ گیا اور میرے منہ پر اچھی خاصی چوٹ آ گئی۔ میری چیاؤں چیاؤں سن کر شیلا تڑپ کر کار سے باہر آئی اور مجھے بانہوں میں اٹھا لیا۔ میرے منہ سے خون نکلتے دیکھ کر وہ جوزف پر برس پڑی۔

''اندھے ہو تم..... دیکھا نہیں رومیو پاس کھڑا ہے۔''

''سوری بے بی! میں نے واقعی نہیں دیکھا تھا۔'' جوزف نے بغیر کسی افسوس کے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میری چیخیں اور شیلا کی آواز سن کر مسز ولیم بھی دوڑی آئیں۔ انہوں نے مجھے زخمی دیکھا تو خود بھی کار میں آ گئیں اور جوزف کو پہلے جانوروں کے کلینک کی طرف چلنے کو کہا۔ انہوں نے اپنے رومال سے میرا منہ دبا لیا تھا تاکہ خون نہ نکلے۔ وہ کلینک پر اتر گئیں اور شیلا کو اسکول لے جانے کا حکم دیا۔ شیلا جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن مسز ولیم نے اسے پیار سے سمجھایا۔ ''ڈیئر! میں رومیو کی دیکھ بھال کے لیے ہوں اور ابھی اسے ڈاکٹر دیکھے گا۔ جب تم واپس آؤ گی تو یہ بالکل ٹھیک ہو گا۔''

شیلا کے جانے کے بعد مسز ولیم مجھے کلینک کے ایمرجنسی روم میں لائیں جہاں ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور حیرت سے کہا۔ ''میرے خدا! کس نے اس معصوم کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟''

''میرے بٹلر نے کار کا دروازہ بند کیا تو رومیو کا منہ اس کی زد میں آ گیا، پلیز اسے دیکھیں۔''

''اگر یہ غلطی ہے تو بہت سنگین ہے، اس آدمی کو سزا ملنی چاہیے۔'' ڈاکٹر نے غصے سے کہا اور میرے منہ کا معائنہ کرنے لگی پھر اس نے میرا علاج شروع کر دیا۔ اس نے مجھے ایک عدد انجکشن لگایا اور میرے منہ کا زخم صاف کرنے لگی۔ ٹانکوں کی ضرورت نہیں تھی، اس نے صرف دوا لگا دی۔ کیونکہ زخم منہ کے اندر تک گیا تھا اس لیے اس نے مجھے دو دن تک کوئی ٹھوس غذا دینے سے منع کیا۔ مسز ولیم اس کی فیس ادا کر کے مجھے باہر لائی۔ بٹلر جوزف آ چکا تھا اور ہمارا منتظر تھا۔ راستے میں مسز ولیم نے اسے بتایا کہ اس کی وجہ سے میں کتنا زخمی ہوا ہوں۔ اس نے مکّاری سے فوراً معذرت کر لی۔

''میڈم! مجھے رومیو پسند ہے۔ آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔''

لیکن مجھے معلوم تھا، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت بدستور موجود تھی۔ مسز ولیم مجھے گھر لائیں اور انہوں نے دودھ میں ایک طاقت ور غذا ڈال کر مجھے کھانے کے لیے دی۔ علاج کے لیے مجھے دو دن تک کلینک جانا تھا۔ مسز ولیم کا رویّہ بہت اچھا تھا لیکن دوپہر میں جب شیلا اسکول سے آئی اور اس نے جس طرح بے تابی سے مجھے گود میں لیا، اس سے میں اندر تک سرشار ہو گیا۔ مسز ولیم نے بتایا کہ ڈاکٹر نے کس طرح میرا علاج کیا اور مجھے اب دو دن تک کلینک جانا پڑے گا۔ شیلا نے غصے سے کہا۔

''ماما! یہ سب جوزف کا قصور ہے۔ اسے کہیں آئندہ اس کی وجہ سے رومیو کو ذرا بھی تکلیف ہوئی تو یہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔''

جوزف وہاں موجود تھا اور اس نے جن کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا، مجھے اسی وقت محسوس ہو گیا کہ موقع ملنے پر وہ مجھے نقصان پہنچانے سے نہیں چوکے گا... بلکہ عین ممکن ہے وہ مجھے مار دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اسے نہ تو پولیس گرفتار کرے گی اور نہ ہی اسے کوئی سزا ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ اسے ملازمت سے نکال دیا جائے گا تو یہ بھی اس کے لیے کوئی بڑی سزا نہیں تھی کیونکہ اسے کہیں نہ کہیں دوسری ملازمت مل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاتی۔ یہ میرا نقصان تھا کہ اگر مجھے کوئی انسان مار دیتا تو اسے کوئی سزا نہیں ہوتی۔ شاید جرمانہ ہو جاتا لیکن یہ کوئی خاص سزا نہیں تھی۔ جلد مجھے ثبوت بھی مل گیا کہ جوزف میری جان کے درپے ہو گیا ہے۔

مجھے اس ولا میں آئے ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے اور اس دوران میں میں خاصا سمجھ دار ہو گیا تھا، خاص طور سے انسانوں کا رویہ میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی کا ایک سال ایک اچھی نسل کے کتے کے لیے پانچ سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے میں کوئی چھ سات سال کا ہو چکا تھا اور آپ جانتے ہیں، آج کل چھ سات سال کا بچہ خاصا ذہین ہوتا ہے۔ آپ مجھے پانچ سال کے بچے جتنا ذہین سمجھ سکتے ہیں۔ پھر جوزف کی آنکھوں میں نظر آنے والے عزائم نے مجھے مزید ہوشیار کر دیا تھا۔ جوزف کے فرائض میں ولا کی تینوں گاڑیوں کی دیکھ بھال بھی شامل تھی۔ وہ موٹر مکینک بھی تھا اور فارغ اوقات میں گاڑیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی مسٹر ولیم کی تھی جس پر وہ روز دفتر آتے جاتے تھے۔ دوسری مسز ولیم کے استعمال کے لیے مخصوص تھی اور تیسری فیملی وین تھی۔ جب پوری فیملی کو مع سامان کے کہیں جانا ہوتا تو اس وین کو استعمال کرتے تھے۔

ایک دن میں لان میں آیا تو پورچ میں جوزف فیملی وین نکال کر اس کے انجن کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس نے ٹائروں کے سامنے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پیس رکھے ہوئے تھے۔ یہ پیس اگلے ٹائروں کے ساتھ رکھے تھے جبکہ پچھلے ٹائروں کے ساتھ نہیں تھے۔ شاید ان کا مقصد وین کو پورچ کی ڈھلان پر پیچھے جانے سے روکنا تھا۔ میں وین کے پیچھے کی طرف آ کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ جوزف نے مجھے نہیں دیکھا۔ لان کی گھاس کے مقابلے میں پورچ میں ماربل کا فرش دھوپ سے کسی قدر گرم ہو گیا تھا۔ اس کی گرمائش مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ میرا رخ دوسری طرف تھا اس لیے میں وین کو نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں بے ساختہ اچھل کر اس جگہ سے ہٹا تو اگلے ہی لمحے وین کا پچھلا ٹائر اس جگہ سے گزرا جہاں ایک لمحے پہلے میں تھا۔ اگر میں اچھل کر نہ ہٹتا تو ٹائر مجھ پر سے گزر جاتا اور یقیناً میرا قیمہ بن جاتا۔ ٹائر سائز میں مجھ سے کچھ ہی بڑا تھا۔ میرے ہٹتے ہی وین رک گئی اور تب میں نے دیکھا جوزف لکڑی کے پیس دوبارہ اگلے ٹائروں تلے رکھ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ”بچ گئے... خیر اگلی بار صحیح۔“

اس کی بات سن کر میرا رہا سہا شک بھی دور ہو گیا۔ جوزف نے مجھے مارنے کی دانستہ کوشش کی تھی۔ خوف سے میرا بُرا حال ہو گیا اور میں لرزاں ترساں لڑھکتا بھاگتا ہوا ولا کے اندر پہنچ گیا اور شیلا کے کمرے میں جاتے ہی اپنے گھر میں گھس کر لیٹ گیا۔ میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ شیلا اس وقت اسکول گئی ہوئی تھی اور مسز ولیم کہیں مصروف تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی جوزف آئے گا اور مجھے پکڑ کر لے جا کر وین کے ٹائر تلے کچل دے گا۔ میں کسی کو بتا نہیں سکتا تھا اور نہ ہی فریاد کر سکتا تھا کہ ایک انسان بلاوجہ میرا دشمن ہو رہا ہے جبکہ میں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ دوپہر میں شیلا آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”رومیو! کیا ہوا تمہیں... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

میں گھر سے نکلا اور اس کے پیروں سے لگ کر بیٹھ گیا، اس وقت بھی میرا جسم لرز رہا تھا۔ وہ فکر مند ہو کر مجھے مسز ولیم کے پاس لائی۔ اس نے مجھے ان کو دکھایا۔ ”دیکھیں ماما! رومیو کو کیا ہو رہا ہے؟“

مسز ولیم نے میرا معائنہ کیا اور بولیں۔ ”شاید اسے سردی لگ رہی ہے۔ اسے آتش دان کے پاس بٹھاؤ۔“

شیلا مجھے آتش دان کے پاس لے آئی۔ اس سے میری کپکپاہٹ واقعی کم ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شیلا یا اس کے ماں باپ کو کس طرح بتاؤں کہ جوزف نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی اور یہ میری خوش قسمتی اور پھرتی تھی کہ وہ ناکام رہا تھا۔ اگلے چند دن میں ڈر کے مارے ولا سے باہر ہی نہیں آیا حالانکہ میرا دل مچلتا تھا کہ باہر دھوپ میں جاؤں لیکن باہر جوزف موجود ہوتا تھا۔ جب شیلا اسکول گئی ہوتی تو میں اس کے کمرے سے بھی کم ہی نکلتا تھا کیونکہ جوزف کو ولا میں کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جب وہ باہر مجھے مارنے کی کوشش کر سکتا تھا تو اندر بھی ایسی کوئی کوشش کر سکتا تھا۔ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے محتاط رہنا لازمی تھا۔

جب شیلا ولا میں ہوتی تو میں پوری طرح بے فکر ہو جاتا کیونکہ وہ مجھے ہر دم اپنے ساتھ رکھتی تھی اور میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا تو اسے فکر لاحق ہو جاتی۔ ایک اتوار کو جب مسٹر اور مسز ولیم لان میں چائے اور دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے، شیلا میرے ساتھ فٹ بال کھیل رہی تھی۔ مسٹر ولیم نے جوزف کو طلب کیا۔

”جوزف! کل واپس آتے ہوئے میری کار کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بریک کچھ مسئلہ کر رہے تھے، ذرا ان کو دیکھ لینا۔“

”میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔“ جوزف نے مستعدی سے کہا۔ جوزف نے مسٹر ولیم کی کار گیراج سے باہر نکالی اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک بار شیلا نے زور سے فٹ بال کو کک ماری تو وہ لڑھکتی ہوئی کار تک چلی گئی۔ شیلا نے چلّا کر کہا۔ ”رومیو! بال لاؤ۔“

مجھے کار اور جوزف کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا لیکن شیلا کا حکم تھا اس لیے میں بادل ناخواستہ بال کی طرف بڑھا۔ دوسرے مجھے اطمینان تھا کہ سب یہاں موجود ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے جوزف میرے خلاف کچھ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بال کار کے نیچے چلی گئی تھی جہاں جوزف لیٹا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا، وہ کار کے نیچے سے گزرنے والے ایک پتلے فولادی پائپ کے ساتھ لگا نٹ ٹائٹ کر رہا تھا۔ بال اس کے پاس تھی۔ میں ہلکے سے بھونکا تو اس نے چونک کر مجھے اور پھر فٹ بال کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اس سے ڈر رہا ہوں۔ وہ مسکرایا۔ ”لے لو بوائے... میرے ہاتھ گندے ہیں۔ ان پر بریک آئل لگ گیا ہے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا، اس کے ہاتھ آئل سے چکنے ہو رہے تھے۔ مجبوراً میں نیچے گھسا اور منہ سے بال لڑھکا کر باہر لانے لگا۔ جوزف اور کار سے دور ہو کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں بال لڑھکاتا ہوا شیلا کے پاس لے آیا۔ اس نے میرا سر سہلایا۔ ”گڈ بوائے۔“

کچھ دیر بعد جوزف ہاتھ صاف کر کے اور اپنا کوٹ پہن کر مسٹر ولیم کے پاس آیا۔ ”جناب! بریک آئل لائن میں ہلکا سا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے بریک پر پورا دباؤ نہیں آ رہا تھا۔ اب بریک بالکل ٹھیک ہے۔“

”ڈیئر! تم ان چیزوں کا خاص خیال رکھا کرو۔“ مسز ولیم نے پریشان ہو کر کہا۔ ”ان راستوں پر بریک میں معمولی سی خرابی بھی نہیں ہونی چاہیے ورنہ کار کو حادثہ پیش آ سکتا ہے۔“

یہ ساری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن میں اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ کار کے نیچے اس ننھے سے دھاتی پائپ کو کوئی نقصان ہو جائے تو اس سے کار کو حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جوزف سے میرا خوف کم ہوتا جا رہا تھا کیونکہ اس نے دوبارہ مجھے نقصان پہنچانے والی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے موجود سرد مہری اور ناپسندیدگی میں کوئی کمی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ کئی مہینے بعد جب موسم سرما اپنے خاتمے پر تھا، برف پگھل رہی تھی اور درختوں پر نئے پتے آ رہے تھے، ایسے میں مسز ولیم اور شیلا نے دو دن کے لیے ہیلینا جانے کا پروگرام بنایا.... انہیں وہاں کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گیا کہ دو دن مجھے ولا میں جوزف کے ساتھ رہنا ہو گا۔ میں نے شیلا پر ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں ولا میں جوزف کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا، وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلے۔ وہ کسی حد تک میری بات سمجھ گئی کہ میں اس کے ساتھ جانا چاہتا ہوں لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ میں جوزف کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ وہ مجھے نہیں لے جا سکتی تھی اس لیے مجھے بہت تسلی دے کر اور جوزف کو میرا پورا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے مسز ولیم کے ساتھ چلی گئی۔

میں پہلے کے مقابلے میں پُراعتماد ہو گیا تھا۔ میرا وزن اور سائز بھی بڑھ گیا تھا لیکن ابھی میں اتنا پُراعتماد بھی نہیں ہوا تھا کہ جوزف کے ساتھ اکیلے سکون سے رہ سکتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے دل میں اب میرے لیے کس حد تک ناپسندیدگی ہے اور وہ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے کس حد تک جا سکتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ اب وہ مجھے جان سے مارنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جیسے ہی مسٹر ولیم، مسز ولیم اور شیلا رخصت ہوئے، جوزف نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”برخوردار! اب آئے ہو ہاتھ... دیکھنا میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“

یہ سن کر میں لرز اٹھا۔ اس کے معاندانہ جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان دو دنوں میں اس نے میرے ساتھ کیا کیا، یہ میں آپ کو لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ بس اس نے مجھے کوئی جسمانی نقصان پہنچانے سے گریز کیا، اس کے علاوہ اس نے مجھے ہر ممکن اذیت دی تھی۔ اس نے میرے ساتھ کیا کیا، اس کے لیے دو مثالیں کافی ہیں۔ ایک تو وہ مجھے دُم سے پکڑ کر ولا کی سب سے اوپر والی منزل کی بالکونی سے باہر نکال کر ہوا میں جھلاتا تھا اور مجھے لگتا کہ اب تب میں وہ مجھے چھوڑ دے گا اور اتنی بلندی سے گر کر بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کبھی وہ مجھے آتش دان کے بالکل پاس لٹا کر اپنے جوتے تلے دبا لیتا تھا اور اس موسم میں آتش دان کے بالکل پاس لیٹنے سے میرا اُبرا حال ہو جاتا۔ ایک بار اس نے مجھے رسیوں سے جکڑ کر گاڑی کے آگے لٹا دیا اور بار بار گاڑی کو پیچھے لے جا کر اس کا ٹائر بالکل میرے پاس لا کر روکتا۔ کئی بار تو ٹائر مجھے چھو گیا تھا۔

دو دن بعد شیلا اور اس کے ماما اور ڈیڈی واپس آئے تو میں بہ ظاہر ٹھیک تھا لیکن اندر سے میں آدھ مرا ہو گیا تھا۔ جوزف نہایت محبت آمیز انداز میں مجھے گود میں لے کر

پورچ میں کھڑا تھا۔ شیلا نے گاڑی سے اترتے ہی لپک کر مجھے اٹھایا اور جوزف سے کہا۔ ”اس کا وزن کم لگ رہا ہے، کیا تم اس کے کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتے تھے؟“

”نہیں بے بی! میں پورا خیال رکھتا تھا لیکن شاید تم سے دور ہونے کی وجہ سے اس کا کھانے پینے میں دل نہیں لگتا تھا۔ بہرحال، یہ خوش رہا ہے، میں اس کے ساتھ کھیلتا رہا ہوں۔“

یہ بات اس نے درست کہی تھی، وہ میرے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ میں نے اس پر بھونک کر واضح کیا کہ میں اس سے بالکل خوش نہیں تھا۔ شیلا مجھے اندر لے گئی۔ وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میرے منہ میں زبان ہوتی تو میں اسے بتاتا کہ جوزف نے میرے ساتھ ان دو دنوں میں کیا کیا ہے لیکن یہاں میں مار کھا جاتا تھا۔ مجھے جانور ہونے کا نقصان تھا، میں کسی ظلم کی فریاد نہیں کر سکتا تھا اور اگر کر بھی دیتا تو مجھے انصاف کی امید نہیں تھی۔ کسی انسان کے مقابلے میں میرے حقوق بہت کم ہیں۔ جوزف مجھے ذہنی اذیت دینے کے ساتھ بار بار یہ بھی بتاتا تھا کہ ابھی وہ مجھے کوئی جسمانی اذیت نہیں دے سکتا کیونکہ اس طرح ذمے داری براہِ راست اس پر آئے گی۔ بعد میں وہ موقع نکال کر مجھے بتائے گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی میرے درپے تھا اور موقع ملنے پر مجھے جان سے مارنے سے گریز نہیں کرے گا۔

لیکن اس کا موقع ہی نہیں آیا۔ ایک دن وہ شیلا کو اسکول سے لینے کے لیے روانہ ہوا تو کچھ ہی دیر بعد وہ گاڑی سمیت کھائی میں جا گرا۔ پانچ سو فٹ گہری کھائی میں گرنے کے بعد جوزف کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیس کی تفتیش کرنے والے افسر نے بعد میں مسٹر ولیم کو بتایا کہ گاڑی اتنی بری طرح تباہ ہوئی ہے کہ حادثے کی درست وجہ کا تعین نہیں ہو سکا لیکن امکان تھا کہ حادثہ تیز رفتاری یا بریک فیل ہونے کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ مسٹر ولیم کا کہنا تھا کہ جوزف بہت محتاط ڈرائیور تھا۔ بہرحال غلطی انسان سے ہوتی ہے، ممکن ہے وہ جلدی اسکول پہنچنے کی فکر میں ارتکاز کھو بیٹھا ہو اور اس وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔ مجھے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ پولیس والے حادثے کی وجہ کا تعین کر پاتے ہیں یا نہیں۔ مجھے تو اس بات کی خوشی تھی کہ جوزف سے میری جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی تھی۔

عام طور سے فاکس نسل کے کتّوں کا قد اور وزن زیادہ نہیں ہوتا لیکن جوزف سے جان چھوٹنے کی خوشی میں میری بڑھوتری تیزی سے ہوئی تھی اور جب مجھے شیلا کے پاس آئے دو سال مکمل ہوئے تو میں پوری طرح بڑا اور مضبوط کتا بن چکا تھا۔ شیلا اس وقت بارہ سال کی بہت خوب صورت نوخیز لڑکی تھی۔ کچھ عرصے پہلے تک اس کا وزن کسی قدر زیادہ تھا لیکن اب یہ زائد وزن کم ہو چکا تھا اور وہ چھریری اور ہلکی ہو گئی تھی۔ جوزف کے بعد مسٹر ولیم نے ایک نیا بٹلر رکھ لیا۔ چارلس نامی یہ بٹلر بھی انگریز نسل سے تھا اور اس میں وہی رکھ رکھاؤ تھا جو ایک خاندانی بٹلر میں ہونا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اخلاق کا بہت اچھا تھا۔ مجھ سے ہمیشہ مہذبانہ انداز میں پیش آتا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ تنہائی میں ہوتا، تب بھی اسی طرح پیش آتا۔ جب شیلا اور مسز ولیم کہیں گئے ہوتے تھے، تب بھی وہ میرا مکمل خیال رکھتا۔

وقت گزرتا رہا اور میرے لیے تو بہت اچھا گزرتا رہا کیونکہ میں شیلا کے ساتھ تھا۔ شیلا نے ہائی اسکول پاس کر لیا تھا اور اب کالج میں پڑھ رہی تھی۔ مسٹر ولیم نے اس کے بہت اصرار پر اسے کار دلوا دی تھی لیکن اس تنبیہ کے ساتھ کہ وہ پہاڑی راستوں پر تیز ڈرائیونگ بالکل نہیں کرے گی۔ شیلا نے وعدہ کیا کہ وہ بہت احتیاط سے ڈرائیونگ کرے گی لیکن دو تین مواقع پر جب میں نے اس کے ساتھ سفر کیا تو مجھے پتا چلا کہ وہ بہت تیز ڈرائیونگ کرتی ہے اور بعض اوقات تو وہ خطرناک ڈرائیونگ کرتی تھی۔ میرا دم خشک ہو گیا اور میں نے بھونک بھونک کر اسے تیز رفتاری سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ شیلا میرا خوف جان جاتی تھی اور جان بوجھ کر مزید تیز ڈرائیونگ کرتی تھی۔ دو تین بار کے بعد میں اس کے ساتھ ... از خود جانے سے گریز کرنے لگا۔ جب وہ کہیں باہر جانے کا ارادہ کرتی تو میں موقع سے کھسک جاتا اور جان کر کہیں چھپ جاتا۔ اس وسیع و عریض ولا میں چھپنے کی بہت جگہیں تھیں۔ جب میں غائب ہوتا تو شیلا سمجھ جاتی کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہ رہا ہوں۔ اس لیے کبھی کبھی وہ چالاکی سے کام لیتی اور اچانک ہی مجھے پکڑ کر گیراج میں لے آتی اور پچھلی نشست پر بٹھا کر روانہ ہو جاتی۔

اٹھارہ سال کی شیلا بہت حسین اور دل کش لڑکی بن گئی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں کیونکہ میرے سامنے اپنے بیڈروم میں وہ بے تکلفی سے رہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لڑکوں کے دل اسے دیکھ کر بے قابو ہو جاتے ہوں گے۔ اس کی طرف آنے والے بھی بہت سے ہوں گے لیکن ابھی تک اس نے کسی کو گھاس نہیں ڈالی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے لازمی پتا چل جاتا کیونکہ وہ میرے سامنے اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرینڈز سے فون پر بے تکلفانہ گفتگو کرتی تھی اور بعض اوقات تو یہ گفتگو سینسر کی حدود میں چلی جاتی تھی اس لیے اگر اس کا کوئی بوائے فرینڈ ہوتا تو مجھے یقیناً پتا چل جاتا۔ مجھے خوشی تھی کہ شیلا نے اب تک کوئی بوائے فرینڈ نہیں بنایا تھا۔ نہ جانے کیوں شیلا کے کسی ممکنہ بوائے فرینڈ کا سوچ کر میرے اندر آگ سی لگ جاتی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شیلا اب جوان ہوچکی ہے اور وہ زیادہ دیر کسی بوائے فرینڈ کے بغیر نہیں رہے گی۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ایک دن جب میں اور شیلا دونوں صبح کے وقت سو رہے تھے، اس کے موبائل فون نے بیل دی۔ میں نے اپنے گھر سے سر نکال کر دیکھا۔ شیلا آنکھیں بند کیے کیے کال ریسیو کر رہی تھی پھر وہ چونکی۔ ”جونز تم... ہاں، فارغ ہوں... اوکے، میں شام کو بتاتی ہوں۔“ اس نے چہک کر کہا اور موبائل رکھ دیا۔ اس کے لہجے کی خوشی، چہکار اور جونز کے نام نے مجھے چوکنا کر دیا کیونکہ یہ سب چیزیں نئی تھیں۔ میں نے ہلکی سی آواز نکالی لیکن شیلا توجہ دیے بغیر دوبارہ سو چکی تھی۔ وہ دیر سے اٹھی اور اس نے کاہلی سے لنچ کے وقت ناشتا کیا۔ لیکن شام ہوتے ہی وہ چاق و چوبند نظر آنے لگی۔ اس نے موبائل سے کال کی۔ ”جونز! میں شیلا بات کر رہی ہوں۔ ہاں، میں آرہی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے میں آئی اور معمول سے زیادہ توجہ سے تیاری کرنے لگی۔ اس نے اپنے لیے خاص سوٹ نکالا اور مکمل میک اَپ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ جونز اس کے بوائے فرینڈ کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور مجھے جونز کو دیکھے بغیر اس سے... نفرت ہوگئی۔ مسز ولیم اور مسٹر ولیم جونز کی شخصیت سے بے خبر تھے کیونکہ شیلا نے گھر سے جاتے ہوئے جھوٹ بولا تھا کہ وہ اپنی فرینڈز کی پارٹی میں جارہی ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ شیلا ماں باپ کی لاعلمی میں جونز سے پینگیں بڑھا رہی تھی لیکن یہ معاملہ چھپا نہیں رہا۔ ایک رات جب شیلا باہر سے اب تک نہیں آئی تھی، مسٹر اور مسز ولیم ولا کی نشست گاہ میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے پاس لیٹا تھا اور بہ ظاہر اونگھ رہا تھا لیکن میرے کان ان کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ مسٹر ولیم کہہ رہے تھے۔

”یہ لڑکا نچلے طبقے سے ہے اور موقع شناس ہے۔“

مسز ولیم نے فکرمندی سے کہا۔ ”وہ شیلا کی دولت کی وجہ سے اس کی طرف بڑھا ہے۔“

”سو فیصد یہی بات ہے۔“ مسٹر ولیم نے حقارت سے کہا۔ ”وہ نچلے طبقے کا لڑکا ہے اور اسے شیلا کی صورت میں اپنا مستقبل نظر آرہا ہے۔“

”کیا شیلا اس سے قطع تعلق کرنے پر تیار ہو جائے گی؟“ مسز ولیم نے دبے لہجے میں کہا۔ ”تم جانتے ہو، وہ اچھی لڑکی ہے لیکن کبھی کبھی ضد میں آجاتی ہے۔“

”ہم اسے سمجھائیں گے۔“ مسٹر ولیم نے پُرامید لہجے میں کہا۔ ”امکان ہے وہ مان جائے گی۔“

لیکن شیلا نے ماننے سے بالکل انکار کر دیا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی، مسٹر اور مسز ولیم نے اسے گھیر لیا۔ لیکن شیلا ان کی بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اس نے سخت لہجے میں ان سے کہا۔ ”برائے کرم، آپ دونوں میرے معاملے میں دخل نہ دیں۔“

”شیلا! وہ ایک لالچی لڑکا ہے.....“ مسٹر ولیم نے کہنا چاہا۔

”آپ فکر نہ کریں، اگر وہ لالچی ہے تب بھی آپ سے کچھ نہیں مانگے گا۔“ شیلا نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”کم آن رومیو۔“ یہ کہہ کر وہ ماں باپ کی طرف دیکھے بغیر اپنی سینڈل کی ایڑیاں بجاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے مسٹر اور مسز ولیم کی طرف دیکھا اور شیلا کے پیچھے چل پڑا۔ شیلا غصے میں تھی اور اس نے کمرے میں آتے ہی جونز کو کال کی۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس کے ماں باپ نے اس سے کیا بات کی ہے۔ جونز اسے کچھ سمجھاتا رہا۔ آہستہ آہستہ شیلا کا غصہ سرد پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اس معاملے کو لڑائی جھگڑے سے حل نہیں کیا جاسکتا۔“

میں شیلا کی یک طرفہ باتیں سنتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان دونوں میں کیا طے پا رہا ہے۔ اس کے بعد ولا کا ماحول کشیدہ سا ہوگیا۔ اگرچہ اس رات کے بعد کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا لیکن شیلا اور اس کے ماں باپ میں زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ ان دنوں شیلا کے کالج کے امتحانات قریب تھے اس لیے وہ باہر جانے کے بجائے اپنا زیادہ وقت پڑھنے میں گزارتی تھی۔ سرما شدید ہوگیا تھا اور ہم لوگ زیادہ تر کمرے تک محدود رہتے تھے۔ کبھی کبھی شیلا جونز کو کال کرتی یا اس کی کال آتی تھی لیکن زیادہ دیر بات نہیں ہوتی تھی۔ شیلا کے امتحانات ہوگئے اور سرما بھی گزر گیا۔ چھٹیاں آئیں تو شیلا نے میامی جانے کا پروگرام بنایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے لے کر جائے گی لیکن اس نے جونز کے ساتھ پروگرام بنایا تھا اور یہ بات سب سے چھپائی تھی لیکن مجھے پتا چل گیا۔ یہاں بھی شیلا جھوٹ بول کر جا رہی تھی۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ اس پر نہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کو دھوکا دے کر

جا رہی تھی۔ **مجھے اس لیے غصہ آرہا تھا**' اس سے پہلے وہ جب کسی لمبے سفر پر یا کہیں چھٹیاں گزارنے گئی تو مجھے ضرور لے کر گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مجھے اس طرح نظر انداز کیا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ شیلا اور جونز کا تعلق برقرار رہا۔ مسز اور مسٹر ولیم کی ہر کوشش ناکام گئی۔ وہ اس تعلق کو توڑ نہیں سکے۔ شیلا نے کالج کے آخری امتحان سے پہلے اعلان کر دیا تھا کہ وہ تعلیم مکمل کرتے ہی جونز سے شادی کر لے گی۔ اس اعلان پر میں نے پہلی بار مسٹر ولیم کو شدید غصے میں دیکھا۔ انہوں نے شیلا سے کہا۔ ”اگر تم نے جونز سے شادی کی تو میں تمہیں اپنی دولت اور بزنس سے ہمیشہ کے لیے عاق کر دوں گا۔“

”مجھے اور جونز کو اس کی پروا نہیں ہے۔“ شیلا نے روایتی محبت کرنے والی لڑکی کی طرح کہا۔ ”ہم اپنی زندگی خود بنا سکتے ہیں۔“

”بہتر بھی یہی ہوگا۔“ مسٹر ولیم ناشتے کی میز سے اٹھ گئے۔ ”امید ہے تم پھر مجھے اور اپنی ماں کو پریشان نہیں کرو گی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ مسز ولیم نے پریشان ہو کر کہا لیکن مسٹر ولیم ان کی بات سنے بغیر چلے گئے۔ مسز ولیم نے برہمی سے شیلا کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو، ہماری محبتوں کا یہ صلہ دے رہی ہو؟“

”آپ نے محبت کر کے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔“ شیلا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”ماں باپ کی حیثیت سے یہ آپ کا فرض تھا۔“

مسز ولیم نے ہاتھ اٹھایا لیکن پھر نیچے کر لیا۔ ”تم واقعی عاقبت نااندیش لڑکی ہو۔ تمہارے باپ نے تمہارے بارے میں ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔“

”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں دولت اور آسائشوں کے بغیر نہیں رہ سکتی تو میں آپ کی یہ غلط فہمی بھی دور کر سکتی ہوں۔“ شیلا نے بدتمیزی سے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مسز ولیم دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگیں۔ مجھے افسوس ہوا۔ شیلا سچ مچ زیادتی کر رہی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اسے واقعی بہت محبت دی تھی اور وہ اس کا غلط صلہ دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ معاملہ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک ہفتے بعد شیلا نے اپنا بیگ اٹھایا اور مسٹر اور مسز ولیم کو صرف اطلاع دے کر گھر سے رخصت ہوگئی۔ سب سناٹے میں رہ گئے۔ شیلا نے مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس پر اس نے برہمی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم رہو یہاں۔“

اس کے جانے کے بعد مسز ولیم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں اور مسٹر ولیم نڈھال سے ہو کر بیٹھ گئے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ ان دونوں نے شیلا کو بہت محبت سے پالا تھا اور آج وہ ان کی محبت ان کے منہ پر مار کر چلی گئی تھی۔ مسٹر ولیم نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اب ہمارا شیلا سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔“

”ہاں لیکن اس نے حماقت کی ہے اور اب اسے اس کا خمیازہ بھگتنے دو۔“ مسٹر ولیم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

شیلا کا کچھ پتا نہیں چلا۔ مسٹر ولیم کا تو پتا نہیں تھا لیکن مسز ولیم میری طرح بے قرار تھیں۔ جب مسٹر ولیم دفتر چلے جاتے تو ہم ایک جگہ بیٹھ کر شیلا کو یاد کرتے تھے۔ وہ مجھ سے شیلا کی باتیں کرتی تھیں... اس کے بچپن کی باتیں۔ یہ کوئی چھ مہینے بعد کی بات تھی' ایک صبح جب مسز ولیم مجھ سے شیلا کی باتیں کر رہی تھیں تو فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے فون ریسیو کیا اور پھر بے تابی سے بولیں۔ ”شیلا میری بچی... تم کہاں ہو؟ اتنے دن بعد کال کی؟“ مسز ولیم کہتے ہوئے رونے لگی تھیں۔ ”نہیں، تمہارے ڈیڈی کا وہی رویّہ ہے۔ تم جانتی ہو وہ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں لیکن جب سے تم گئی ہو، انہوں نے ایک بار بھی تمہارا نام نہیں لیا ہے... نہیں' وہ دکھی ہیں... ٹھیک ہے میں کچھ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں بھیج رہی ہوں لیکن تمہارے ڈیڈی سے چھپ کر۔“

مسز ولیم کے انداز سے لگ رہا تھا کہ شیلا مشکل میں تھی اور اسے رقم کی ضرورت تھی۔ مسز ولیم نے اسی وقت کمپیوٹر آن کیا اور کچھ کرنے لگیں۔ پھر انہوں نے شیلا کو فون کر کے اطلاع دی۔ ”میں نے رقم ٹرانسفر کر دی ہے، تم نکلوا سکتی ہو... ہاں رومیو ٹھیک ہے، تمہارے لیے اداس رہتا ہے۔“

اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ شیلا ہر دوسرے تیسرے ہفتے مسز ولیم کو فون کر کے ان سے رقم منگواتی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے شیلا کے حالات خراب ہیں۔ شروع میں مسٹر ولیم کو اس معاملے کا پتا نہیں چلا لیکن ایک دن انہوں نے دفتر سے آنے کے بعد مسز ولیم سے پوچھا۔ ”کیا شیلا سے تمہارا رابطہ ہے؟“

مسز ولیم ہچکچائیں پھر انہوں نے اقرار کر لیا۔ ”ہاں، وہ کبھی کبھی مجھے کال کرتی ہے۔“

مسٹر ولیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ”اور تم اسے رقم بھی بھیجتی ہو؟“

مسز ولیم چونک گئیں۔ ”تمہیں کیسے پتا؟“

”اس کا بینک اکاؤنٹ میں نے کھلوایا تھا اور اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سالانہ اسٹیٹمنٹ میرے پاس بھی آتا ہے۔''

''وہ ضرورت مند ہے۔'' مسز ولیم نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''وہ اس گھر سے ہر رشتہ توڑ کر گئی تھی اور اسے میری دولت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' مسٹر ولیم نے تند لہجے میں کہا۔ ''یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے اور اسے بھگتنے دو۔''

اس بار مسز ولیم کو غصہ آ گیا۔ ''ٹھیک ہے، تم اس سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتے تو مت رکھو لیکن میں اس کی ماں ہوں، میں اس سے رابطہ رکھوں گی اور اس کی مدد بھی کروں گی۔''

اس کے بعد مسٹر اور مسز ولیم میں بھی بات چیت بند ہو گئی۔ گھر کا ماحول ایسا ہو گیا کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک اس گھر میں خوشیاں ہوتی تھیں۔ صرف ایک شخص نے آ کر سب برباد کر دیا تھا۔ میں نے جونز کو دیکھا نہیں تھا لیکن میں دنیا میں سب سے زیادہ نفرت اسی شخص سے کرنے لگا تھا۔ شیلا کے جانے کے بعد میں مسٹر اور مسز ولیم کے کمرے میں سونے لگا۔ ایک رات میں لیٹا ہوا تھا کہ مجھے ولا سے باہر آہٹ محسوس ہوئی۔ کتوں کے کان تیز ہوتے ہیں اور فاکس نسل کے کتوں کے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے اگلے پنجے ٹکا کر باہر جھانکا تو مجھے گیراج کے ساتھ ہی ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ اس کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں زور سے بھونکا۔ میرا مقصد مسٹر ولیم کو خبردار کرنا تھا لیکن اس شخص نے بھی میری آواز سن لی۔ اس نے ایک لمحے کو کھڑکی کی طرف دیکھا تو مجھے اس کا چہرہ نظر آیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھاگا اور گیراج کی دیوار کے پیچھے غائب ہو گیا۔ مسٹر ولیم بیدار ہو کر کھڑکی تک آئے۔ میں مسلسل خبردار کرنے والے انداز میں بھونک رہا تھا۔

''کیا ہوا رومیو؟'' مسٹر ولیم نے باہر جھانکا اور پھر چارلس کو کال کی۔ ''باہر دیکھو، رومیو نے کسی کو دیکھا ہے۔''

کچھ دیر بعد چارلس نے باہر جا کر چیک کیا اور مسٹر ولیم کو اطلاع دی کہ باہر کوئی نہیں ہے اور نہ کسی کی آمد کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن مسٹر ولیم کو مجھ پر اعتماد تھا کہ میں بلاوجہ نہیں بھونک سکتا۔ وہ خود باہر گئے اور انہوں نے گیراج بھی دیکھا۔ لیکن آنے والا شخص اتنا چالاک تھا کہ اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا اس لیے مسٹر ولیم آ کر میرا سر تھپک کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ مسز ولیم گہری نیند سوتی تھیں اس لیے انہیں علم ہی نہیں ہوا۔ اگلی صبح مسٹر ولیم معمول کے مطابق دفتر روانہ ہوئے لیکن وہ دفتر نہیں پہنچ سکے کیونکہ راستے میں ان کی گاڑی ایک کھائی میں جا گری۔ کھائی بہت گہری تھی اور مسٹر ولیم موقع پر ہی ختم ہو گئے۔ مسز ولیم کو اطلاع ملی تو وہ بے ہوش ہو گئیں اور چارلس نے ان کو سنبھالا اور ڈاکٹر کو کال کی۔

دوپہر تک شیلا بھی آ گئی۔ اس کے ساتھ جونز بھی تھا اور جب میں نے جونز کو دیکھا تو مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے رات کو گیراج کے دروازے کے پاس دیکھا تھا۔ میں ایک شریف اور مہذب کتا ہوں۔ مجھے کسی پر حملہ کرنے کی تربیت نہیں دی گئی تھی لیکن بھونکنے سے تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے جونز کی طرف منہ کر کے بھونکنا شروع کر دیا۔ اس پر شیلا نے مجھے ڈانٹا۔ ''رومیو! چپ کر جاؤ۔''

میں حکم کی تعمیل کا عادی تھا اس لیے مجبوراً چپ کر گیا۔ لیکن جونز کو دیکھ کر دانت نکالتا رہا۔ مسز ولیم اپنے کمرے میں تھیں اور انہیں ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن لگا دیا تھا۔ جونز نے شیلا سے کہا۔ ''لگتا ہے تمہارے گھر کا کتا بھی مجھے ناپسند کرتا ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' شیلا نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''رومیو بہت اچھا کتا ہے۔''

''اچھا۔'' جونز نے میری طرح دانت نکوسے۔ ''تب شاید میں ہی برا ہوں۔''

''پلیز جونز۔'' شیلا نے بیزاری سے کہا۔ ''میرا گھر اس وقت بہت بڑے سانحے سے گزر رہا ہے۔''

جونز سچ مچ برا آدمی تھا۔ اس نے طنزیہ رویہ برقرار رکھا۔ ''تمہارا گھر؟... تم شاید بھول رہی ہو مسٹر ولیم نے تمہیں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیا تھا۔''

شیلا غصے میں اٹھی اور مسز ولیم کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی جونز نے تیور بدل کر میری طرف دیکھا۔ ''برخوردار! آئندہ مجھ پر بھونکنے سے پہلے سوچ لینا۔ میں آدمی کی جان لے سکتا ہوں، تم تو صرف ایک کتے ہو۔ ابھی میں تمہاری گردن دبا دوں تو دنیا کی کوئی عدالت مجھے سزا نہیں دے سکے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس خبیث نے اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر سچ مچ میری گردن پکڑ لی اور مجھے ہوا میں لٹکا لیا۔ یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع تھی اس لیے میں مدافعت بھی نہ کر سکا اور میری سانس رک گئی۔ جب میں مرنے والا ہو رہا تھا، تب اس نے میری گردن چھوڑ دی اور میں گرتا پڑتا وہاں سے بھاگ نکلا۔ مجھے لگا کہ جوزف جیسے پھر سے زندہ ہو کر آ گیا ہو۔

مسز ولیم بیٹی کو سامنے دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ شیلا بھی رو رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر جونز بھی... مگرمچھ کے آنسو بہا رہا تھا۔ کم سے کم میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ مصنوعی انداز میں رو رہا ہے۔

مسٹر ولیم کی موت کی وجہ بننے والا حادثہ کار کے اگلے دائیں پہیے کے اچانک نکل جانے کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ پولیس کے مطابق پہیے کے نٹ بولٹ لوز تھے۔ اچانک پہیا نکل جانے سے کار بے قابو ہو کر کھائی میں جا گری تھی۔ مسٹر ولیم کے جنازے تک جونز اور شیلا وہیں رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس کے بعد چلے جائیں گے۔ اگرچہ شیلا کی وجہ سے میری خواہش تھی کہ وہ رک جائے لیکن جب جونز کا رویہ یاد آتا تو میں ڈر جاتا۔ شیلا اور جونز مسٹر ولیم کی تدفین کے بعد بھی وہیں رہے..... شیلا تو مسز ولیم کی دل جوئی میں لگی تھی لیکن جونز نے ولا میں مالکانہ اور حاکمانہ انداز میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ مسز ولیم کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ ولا میں رہیں۔ مسٹر ولیم کی تدفین کے ایک ہفتے بعد ان کا وکیل ان کی وصیت لے کر آیا اور اس نے بتایا کہ مسٹر ولیم نے اپنی تمام دولت، جائداد اور کاروبار مسز ولیم کے نام کر دیا تھا اور شیلا کو ان کی طرف سے ماہانہ تین ہزار ڈالرز کا وظیفہ ملتا رہے گا۔ یہ سن کر جونز کا چہرہ بگڑ گیا کیونکہ وہ اس امید میں تھا کہ مسٹر ولیم کی وارث شیلا ہو گی۔ اسی وجہ سے اس نے مسٹر ولیم کی کار میں گڑبڑ کر کے ان کی موت کا سامان کیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ شیلا کو بیڈ روم میں لے گیا اور وہاں ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سن لیا، جونز کہہ رہا تھا کہ مسٹر ولیم نے شیلا کو وارث نہ بنا کر ناانصافی کی ہے۔ شیلا اسے دبے لفظوں میں سمجھا رہی تھی کہ وہ اس قسم کی باتیں نہ کرے۔ آخر اس کی ماں سے یہ سب اسے ہی ملے گا۔

میں شیلا کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے صرف ایک لالچی اور گھٹیا شخص سے نہیں بلکہ ایک قاتل سے شادی کر لی ہے اور اس نے قتل بھی کس کا کیا ہے؟ اس کے باپ کا... لیکن میں اسے یہ سب نہیں بتا سکتا تھا۔ مسز ولیم نے بھی جونز کو پسند نہیں کیا تھا، وہ صرف بیٹی کی وجہ سے اسے برداشت کر رہی تھیں۔ جب جونز نے ولا میں زیادہ ہی ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کیے تو ایک دن مسز ولیم نے شیلا سے کہا۔ ''اپنے شوہر سے کہو کہ وہ اپنے کمرے تک محدود رہا کرے۔ میں ولا کے ہر حصے میں اس کا دخل پسند نہیں کرتی ہوں۔''

''ماما! وہ اس گھر کا ایک فرد ہے۔'' شیلا نے احتجاج کیا۔

''ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر جگہ گھستا پھرے۔ کل وہ تمہارے ڈیڈی کی اسٹڈی میں تھا اور ان کی میز کی مقفل درازیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' مسز ولیم نے غصیلے لہجے میں کہا۔ بدقسمتی سے اسی وقت جونز وہاں آ گیا اور اس نے مسز ولیم کی بات سن لی۔

''آہا... تو عزت مآب مسز ولیم اپنے داماد کو چور قرار دے رہی ہیں۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ مسز ولیم اسے سامنے دیکھ کر گھبرا گئیں اور انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مسٹر ولیم خود اپنی اسٹڈی میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔''

''مسٹر ولیم مر چکے ہیں اور میں زندہ ہوں۔'' جونز نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ کو ان سے زیادہ میری خوشنودی کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں آپ کا داماد بھی ہوں۔''

''ماما! جونز ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' شیلا نے بھی اپنے شوہر کی تائید کی تو مسز ولیم دانت پیس کر رہ گئیں۔ ابھی ان کا غم تازہ تھا اس لیے انہوں نے معاملے کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ جب جونز ان کے کمرے سے نکل رہا تھا تو میں نے اسے زیرلب کہتے سنا۔

''تجھ سے بھی نمٹ لوں گا بڑھیا... پھر یہ سب میرا ہو گا۔''

میں فکرمند ہو گیا۔ مسٹر ولیم کے بعد یہ موذی شخص اب مسز ولیم کے بھی درپے تھا۔ اگر وہ ان کو راہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو جاتا تو یقیناً اس ولا اور مسٹر ولیم کی ساری دولت پر وہی قابض ہو جاتا اور مجھے اسی کے ساتھ رہنا پڑتا۔ یہ سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کبھی میرا مالک جونز بھی ہو سکتا ہے۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں کسی صورت ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ جونز کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ بدستور ولا میں آزادانہ گھومتا پھرتا اور یہاں موجود تمام چیزیں دھڑلے سے استعمال کرتا تھا۔ ان میں ولا کی گاڑیاں بھی تھیں۔ ولا کی تمام گاڑیاں انشورڈ تھیں اس لیے جوزف اور مسٹر ولیم دونوں کی تباہ شدہ گاڑیوں کے بدلے دوسری گاڑیاں آ گئی تھیں۔ جونز کو مسٹر ولیم کی کیڈی لاک پسند آئی تھی اور وہ اسے بغیر مسز ولیم کی اجازت کے استعمال کر رہا تھا۔ اکثر وہ اور شیلا ایک ساتھ کہیں آتے جاتے تھے۔ پھر ایک دن شیلا کی طبیعت خراب تھی تو جونز نے اکیلے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت میں اتفاق سے ان کے کمرے کے باہر موجود تھا۔

☆☆☆

پولیس افسر نے شیلا اور مسز ولیم کی طرف دیکھا۔ ''یہ اس ولا سے تعلق رکھنے والا تیسرا حادثہ ہے اور تینوں بار کار چلانے والے کی جان گئی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسز ولیم نے اپنی آنکھوں کو رومال سے صاف کیا، یقیناً انہیں مسٹر ولیم کی یاد آگئی تھی۔ ورنہ جونز کی موت پر ان کے رونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ شیلا کی آنکھیں متورم تھیں۔ ”آفیسر! اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے۔“

”مسلسل تیسرا حادثہ۔“ پولیس افسر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے لیے اسے تسلیم کرنا مشکل ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ کوئی سازش ہے؟“ مسز ولیم کا لہجہ خشک ہوگیا۔ ”مرنے والوں میں ایک بٹلر تھا جو ہمارا ملازم تھا۔ دوسرا میرا شوہر اور تیسرا میری بیٹی کا شوہر ہے۔“

”میں آپ کے جذبات سمجھ رہا ہوں۔“ پولیس افسر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے آپ کے بٹلر کے حادثے کی رپورٹ دیکھی ہے۔ اس میں درست طریقے سے حادثے کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی گئی اور صرف اتنا لکھا گیا کہ بریک فیل ہوگئے تھے۔ آپ کے شوہر کے بارے میں شبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی سازش تھی کیونکہ صرف ایک ٹائر کے نٹ ڈھیلے کیسے ہوئے اور باقی ٹائروں کے نٹ اپنی جگہ موجود تھے۔ آپ کے داماد کے ساتھ بھی بریک فیل ہونے کا واقعہ پیش آیا۔ اس حادثے میں پولیس ماہرین نے کار کو مکمل چیک کیا ہے اور اس کی بریک آئل لائن ایک جگہ سے ٹوٹی پائی گئی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے اسے دبا کر توڑا ہو۔“

”آفیسر! میں اور میری بیٹی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں گاڑیوں کی ان چیزوں کے بارے میں علم ہی نہیں ہے۔ گاڑیوں کی دیکھ بھال پہلے ہمارا پرانا بٹلر کرتا تھا اور اب ایک مکینک ہفتے میں ایک بار آکر گاڑیاں چیک کر جاتا ہے۔“

”میں نے اس سے بھی بیان لیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس نے آخری بار گزشتہ اتوار کو آپ کی گاڑیوں کا معائنہ کیا تھا اور سب ٹھیک تھا۔“

”وہ درست کہہ رہا ہے کیونکہ جونز نے اس کے بعد کار تین بار استعمال کی اور تیسری بار یہ حادثہ پیش آگیا۔“ شیلا نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

مسز ولیم نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”آفیسر! میرا خیال ہے تم نے تمام ضروری سوالات کرلیے ہیں؟“

”اوہ... ہاں بالکل۔“ اس نے اپنی نوٹ بک بند کی۔ ”لیکن شاید مجھے پھر کچھ پوچھنا پڑے۔“

”اس صورت میں تمہیں کم سے کم ایک دن پہلے مطلع کرنا ہوگا تاکہ ہم اپنے وکیل کو کال کرلیں۔ تم سے دوسری ملاقات صرف وکیل کے سامنے ہی ممکن ہے۔“

پولیس آفیسر سمجھ گیا اور کھڑا ہوگیا۔ ”امید ہے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”مجھے بھی یہی امید ہے۔“ مسز ولیم نے کہا اور چارلس کو اشارہ کیا کہ وہ پولیس افسر کو باہر تک چھوڑ آئے۔ ان کے جانے کے بعد شیلا نے کہا۔

”ماما! کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے، ہمارے گھر میں یہ تیسرا حادثہ ہوا ہے؟“

”میری بچی... ہم اسے سوائے اتفاق کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔“ مسز ولیم نے نرمی سے کہا۔ ”تم اپنے ذہن کو اس معاملے میں مت الجھاؤ۔“

شیلا نے سر ہلایا اور کھڑی ہوگئی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، یہ سب حادثے ہیں۔“

شیلا کے جانے کے بعد مسز ولیم نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”رومیو! یہ سب حادثے ہی تو ہیں... اس پولیس والے کا دماغ خراب ہے جو سازش کا شبہ کررہا ہے۔“

میں نے صرف سر ہلایا کیونکہ میرا جبڑا بُری طرح دکھ رہا تھا اور میں منہ کھولتا، تب بھی تکلیف ہوتی تھی۔ مسز ولیم کی تائید کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ اس دنیا میں صرف میں ہی جانتا تھا کہ تینوں میں سے کوئی حادثہ نہیں تھا۔ جوزف جس گاڑی میں گیا تھا اس کا بریک آئل پائپ اتنا مضبوط نہیں تھا اور اسے میں نے آسانی سے چبالیا تھا لیکن جونز والی کیڈی لاک کا بریک آئل پائپ بہت مضبوط تھا اور اسے توڑنے کی کوشش میں میرے دانت تقریباً ٹوٹ گئے تھے اور اب مجھے کھاتے ہوئے بہت تکلیف ہورہی تھی۔ باقی مسٹر ولیم والے حادثے کے بارے میں تو آپ جان گئے ہیں کہ اس کا ذمے دار کون تھا۔ جوزف اور جونز دونوں میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر انہوں نے مجھے ماردیا تو اس پر انہیں سزا نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ میں محض ایک کتا ہوں... لیکن وہ یہ بتاتے ہوئے بھول گئے تھے کہ اگر میں کسی طرح سے انہیں قتل کردیتا، تب مجھے بھی کوئی سزا نہیں دی جاسکتی تھی کیونکہ میں محض ایک کتّا ہوں۔

مجھے خوشی ہے کہ اب میں شیلا کے ساتھ ہوں اور ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ پرانا دور لوٹ آیا ہے۔ اگرچہ اس میں مسٹر ولیم نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں تو ہیں اور سب سے بڑھ کر اب ولا میں سکون ہے۔

●●●

انتقام

مختار آزاد

حال کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو... عمر کی کتنی ہی بہاریں بیت جائیں ... گزرے ہوئے وقت کی نشانیاں کہیں نہ کہیں موجود رہتی ہیں ... جو حال سے ماضی تک کا سفر چند ساعتوں میں عبور کرلتی ہیں... ایسے ہی افراد کا ماجرا جو اپنے حال میں مست تھے ... اور انہیں یقین تھا کہ وہ اپنا ماضی بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ...

نئے راستے پر گامزن ایک بھٹکے ہوئے انسان کی عبرت ساماں کہانی

گزشتہ پندرہ سال سے ایک ٹی وی چینل سے بطور رپورٹر وابستہ ہوں۔ موقع کوئی بھی ہو، اگر اس کی خبری اہمیت ہے تو میں سب کچھ بھول بھال کر فوراً ویڈیو بنانا شروع کردیتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے اب تک بیسٹ رپورٹر کے چار ایوارڈ مل چکے ہیں۔ اب اسے عادت کہہ لیں یا احساسِ ذمے داری... میں ڈیوٹی پر موجود ہوں یا نہیں مگر میرے کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ میں ہمیشہ ایک چھوٹا ویڈیو کیمرا ضرور رہتا ہے۔

وہ خزاں کی ایک اداس شام تھی۔ اُس روز ہم ڈیوٹی پر تھے۔ میں اور میری ساتھی رپورٹر اسٹیفنی ہاک ایک ریسٹوران کی افتتاحی تقریب کی رپورٹنگ پر مامور تھے۔ ریسٹوران خاصا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دور تھا۔ ویسے بھی ہمیں وہاں آنے والے مہمانوں کی آمد کی کوریج کرنی تھی۔ اس لیے طے یہ ہوا تھا کہ سرِ شام پہنچ جائیں گے تاکہ کیمرا لگانے کے لیے مناسب زاویہ تلاش کرنے کا وقت مل جائے۔

سورج ڈھلنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ ہم ہائی وے پر سفر کررہے تھے۔ میری نظریں سامنے کی طرف تھیں۔ ہم اس بات کا جائزہ لے رہے تھے کہ کوریج کو کس کس زاویے سے ناظرین کے لیے دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ ہائی وے پر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہم آتی جاتی گاڑیوں میں نظریں الجھانے کے بجائے سامنے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کرتے جارہے تھے۔ اچانک ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مخالف سمت سے آنے والی سیاہ سیڈان کار سڑک پر چلتے چلتے اچھلی اور چشمِ زدن میں الٹی اور کئی قلابازیاں کھاتی ہوئی نشیب کی طرف جاگری۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم دونوں کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس وقت کیمرا میری گود میں رکھا ہوا تھا۔ ہم جائے حادثہ سے بہت زیادہ دور نہیں تھے۔

اسٹیفنی نے جائے حادثہ کے قریب پہنچ کر گاڑی روکی۔ اس وقت تک میں کیمرے کو ریکارڈنگ کے لیے تیار کرچکا تھا۔ گاڑی رکتے ہی چھلانگ مار کر باہر نکلا۔ اسٹیفنی بھی برق رفتاری سے باہر آئی۔ ”کیمرا مجھے دو اور تم گاڑی کی طرف جاؤ۔“ اس نے چلّاتے ہوئے کہا۔ میں نے کیمرا اسے تھمایا اور نشیب میں اترنے لگا۔ ہائی وے سطحِ زمین سے چند فٹ اوپر، زمین کی بھرائی کرکے تیار کیا گیا تھا۔ اس لیے سڑک کے برابر میں چند فٹ کی ڈھلوانی سطح تھی اور اس کے بعد ہموار میدان۔ جب میں حادثے کا شکار بدقسمت گاڑی کے قریب پہنچا، اس وقت تک اپنے موبائل فون سے ریسکیو 911 کو فون کرچکا تھا۔ ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اسٹیفنی کو اچھے شاٹس مل جائیں۔ اس وقت اندھیرا پوری طرح نہیں چھایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شاٹس لینے کے لیے روشنی بہت زیادہ بُری ثابت نہیں ہوگی۔

جب میں گاڑی کے سامنے پہنچا اور جو کچھ دیکھا، اس نے میرے حواس سلب کردیے۔ گاڑی بُری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اس کے انجر پنجر اردگرد بکھرے پڑے تھے۔ گاڑی کا ڈھانچا بُری طرح پچک چکا تھا۔ اس کی چھت زمین پر اور پہیے آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ جو کچھ میں نے دیکھا، اس کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جتنے لوگ اندر ہوں گے، اب تک مرچکے ہوں گے یا عالمِ جاں کنی سے گزر رہے ہوں گے۔

”دیکھو... کوئی زندہ بھی بچا ہے یا نہیں۔“ اسٹیفنی نے چلّا کر کہا اور میں زمین پر لیٹ کر اندر جھانکنے لگا۔ اس وقت میں ڈرائیونگ والے حصے کی طرف تھا۔ گاڑی اُلٹنے سے اس کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اسی لیے مجھے گاڑی کے اندر سر ڈال کر جھانکنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ گاڑی کوئی عورت چلارہی تھی جو اس وقت بالکل ساکت اور مُڑی تڑی حالت میں ڈیش بورڈ، اسٹیئرنگ اور ڈرائیونگ سیٹ کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے سر پر بھی گہرے زخم آئے ہوں گے، تبھی اس کا چہرہ اور بال بھی خون آلود تھے۔ میں نے دروازہ کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ بُری طرح جام ہوچکا تھا۔ بدقت تمام میں نے اس عورت کو کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کا پورا جسم خون میں لت پت تھا۔ میں نے اسے باہر نکال کر زمین پر لٹایا اور ایک بار پھر اندر جھانکا۔ خوش قسمتی سے گاڑی میں کوئی اور شخص نہیں تھا۔ میں واپس پلٹا، اس کی نبض ٹٹولی مگر وہ ڈوب چکی تھی۔ دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی لیکن کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اس کے دل کو دبا کر اور منہ کے ذریعے سانس دے کر اس کی دھڑکنوں کو بحال کرنے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کافی دیر کی تگ ودو کے بعد میں نے ہار مان لی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بند کیا۔ ہاتھ پیر سیدھے کیے اور پھر اس کے خون آلودہ چہرے کو اس امید پر غور سے دیکھنے لگا کہ شاید میں نے اسے کبھی کہیں دیکھا ہو۔ وہ چوبیس پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس کے بال سنہری اور قد لمبا تھا۔ وہ جدید تراش خراش کا لباس پہنے ہوئے تھی جو اب خون میں لت پت ہوچکا تھا۔

اچانک مجھے زوردار جھٹکا لگا، میں اسے پہچان چکا تھا۔ یہ نورین برکر تھی اور ایڈی کے ریستوران میں بطور ویٹرس کام کرتی تھی۔ کئی ماہ پیشتر اس کے ریستوران میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس روز وہ جتنا چہک رہی تھی، اسے دیکھ کر یہ گمان کرنا بھی ناممکن تھا کہ وہ موت سے صرف چند روز کے فاصلے پر تھی۔ اسے پہچانتے ہی میرے ذہن میں اس کے وہ قہقہے گونجنے لگے جو دو روز پہلے اس نے کھانا پیش کرتے ہوئے میرے ایک لطیفے کو سُن کر لگائے تھے۔

اسٹیفنی بدستور ریکارڈنگ کررہی تھی۔ میں یہ بھول چکا تھا کہ ہم کہاں جانے کے لیے نکلے تھے۔ کم از کم اُس بدنصیب کو پہچاننے کے بعد میرے اعصاب پر شدید تناؤ طاری ہوگیا تھا۔ میں نے ریسکیو کو تو فوراً ہی اطلاع کردی تھی۔ امید تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ پہنچ جاتے۔ اچانک فضا میں پولیس کار اور ایمبولینس کے سائرن گونجنے لگے۔ چند لمحوں کے اندر اندر

پولیس نے جائے حادثہ کو پیلے رنگ کی مخصوص ڈوریاں باندھ کر محفوظ کردیا۔ لاش اسٹریچر پر منتقل کی جارہی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ آیا۔

فضا سرمئی ہورہی تھی لیکن اس دھندلکے میں بھی جو چیز صاف نظر آرہی تھی، وہ دور دور تک بکھرے ہوئے نوٹ تھے۔ گاڑی الٹتے ہوئے اس میں سے ایک بیگ نکل کر باہر آگرا تھا اور یہ نوٹ اسی سے نکل کر اطراف میں پھیل گئے تھے۔ بیگ کے قریب ہی نوٹوں کے ڈھیر میں دبی ہوئی ایک آٹومیٹک رائفل بھی نظر آرہی تھی۔ پولیس والے زمین پر بکھرے نوٹ جمع کررہے تھے۔ ”یہ کیا؟“ نوٹ دیکھ کر میرے منہ سے حیرت سے نکلا۔ اسی دوران میں ایک پولیس والے نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے دھکّا دیتے ہوئے جائے حادثہ سے باہر نکل جانے کو کہا۔

میں اپنی گاڑی کے قریب آیا، اس وقت اسٹیفنی حادثے کی ویڈیو ریکارڈنگ میں مصروف تھی۔ میں نے اپنا فون نکالا اور روڈ ہاؤس ریستوران کا نمبر ملانے لگا۔ یہ ایڈی کی ملکیت تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

”نو واک... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ایڈی کے فون اٹھاتے ہی جب میں نے اسے نورین برکر کے حادثے میں ہلاکت کی خبر دی تو وہ چلّا اٹھا۔

”دیکھو... میرے پاس تفصیل بتانے کے لیے وقت نہیں ہے۔“ میں نے اس کے ساتھ باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے جواب کا انتظار کیے بغیر فون رکھ دیا۔

اسٹیفنی اور میں کئی برسوں سے ساتھ کام کررہے تھے۔ وہ ایکشن ٹی وی کی ابھرتی ہوئی نیوز رپورٹر تھی۔ ہم پہلے اچھے دوست تھے پھر وہ میری محبوبہ بن گئی۔ کئی مہینوں پہلے جب کسی اور شخص سے اسے محبت ہوگئی تو ہم ایک بار پھر اچھے دوست بن گئے۔ ”وہ نوٹوں کا چکر کیا ہے؟“ جب میں نے ایڈی کو اطلاع دینے کے بعد موبائل فون بند کرکے جیب میں رکھا تو اس نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے بیزاری کے عالم میں کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

”تم نے اسے پہچانا کیسے؟“ اس نے حسبِ توقع پھر سوال کیا۔

”وہ ایسے کہ میں اس سے اپنے دوست کے ریستوران میں مل چکا تھا۔ یہ وہ دوست ہے جس کے ریستوران میں وہ ملازمت کرتی تھی۔“

”ایک ویٹر اور اتنے سارے نوٹ؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے وہی پرانا سوال نئے انداز میں کیا۔ ”کوئی تو چکر ضرور ہے۔“ اس نے آنکھیں گھماتے اور سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک اور گرما گرم خبر ضرور ہوگی۔“

”ہوسکتا ہے۔“ میں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں پر حادثہ پیش آیا تھا۔ بدقسمت نورین برکر کی لاش اسپتال منتقل کی جاچکی تھی اور پولیس ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھی۔

”چلو...“ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اب کہاں چلیں؟“

”وہیں جہاں جانے لیے ہم دفتر سے نکلے تھے۔“ میں نے اپنے لہجے اور اعصاب کو پُرسکون بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کارروائی کے دوران میں میرا لباس بُری طرح خراب ہوچکا تھا۔ گاڑی میں ایک سوٹ موجود تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ریستوران پہنچتے ہی سب سے پہلے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کروں گا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دوران میں اسٹیفنی کیمرا اور ساؤنڈ وغیرہ سیٹ کرلے گی۔

کچھ دیر بعد ہم ایک بار پھر ہائی وے پر سفر کررہے تھے۔ ماحول پر تاریکی چھا چکی تھی۔ اسٹیفنی گاڑی خاصی تیز چلارہی تھی۔ اس کا خیال ہوگا کہ جو وقت ضائع ہوچکا ہے، وقت کے اس نقصان کو پورا کرلیا جائے۔

میں نے اس دوران میں حادثے کی ویڈیو اپنے چینل کو بذریعہ نیٹ بھیج دی تھی۔

میں نے گاڑی میں لگا ہوا ٹی وی آن کیا۔ نورین برکر والے حادثے کی خبر ہمارے ٹی وی چینل پر لیڈ اسٹوری کے طور پر چل رہی تھی۔ اسٹیفنی نے نہایت اچھے انداز میں ...... شاٹس لیے تھے۔ ”ویل ڈن اسٹیفنی...“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ مسکرادی۔

میں نے اپنی زندگی میں صرف تین بار ٹریفک حادثات دیکھے تھے۔ پہلا واقعہ اس وقت پیش آیا جب میں بہت چھوٹا تھا، تب میرا ایک دوست گاڑی تلے آکر کچل گیا۔ دوسرا واقعہ میرے ہاں اخبار ڈالنے والے لڑکے کا تھا جس کی تیز رفتار موٹر سائیکل سیلن زدہ روڈ پر پھسلی اور وہ چل بسا۔ یہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا، جب وہ میرے ہاں اخبار ڈال کر پلٹا۔ تیسرا حادثہ چار سال پہلے اس وقت دیکھا جب میں ایک ریستوران سے کھانا کھا کر باہر نکل رہا تھا۔ ہجوم کو چیر کر آگے بڑھا تو ایک کار درخت سے ٹکرا چکی تھی۔ مرنے والا ایک سیاہ فام نوجوان تھا۔ ان تینوں حادثات میں مرنے والے صرف دو لوگوں کو میں ذاتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طور پر جانتا تھا لیکن یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے تیز رفتار گاڑی اُلٹی اور میں صرف ایک منٹ کے اندر اندر حادثے کا شکار کار کے قریب پہنچ کر مرنے والی عورت کو باہر نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہی تھا کہ مرنے والی میری شناسا نکلی۔

میں خاموش تھا اور نفسیاتی طور پر اب تک اس حادثے کے زیرِ اثر تھا۔ میں بدستور نورین برکر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بار بار اس کا قہقہہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے ایک بار گردن موڑ کر اسٹیفنی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خاموش تھی اور ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے پوری توجہ سے گاڑی چلانے میں مصروف تھی۔ میں نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں موندلیں۔ اس وقت میرے ذہن پر نورین۔۔ کا تصور چھایا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے اِردگرد کہیں موجود ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن میں حسبِ معمول دفتر پہنچا اور اسائمنٹ بورڈ کا جائزہ لیا۔ میرے لیے کوئی ڈیوٹی نہیں تھی۔ میں پلٹ کر نیوز روم کی طرف چل دیا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اس وقت وہاں دو چار رپورٹر ہی موجود تھے۔

''وہ تم سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' مجھے اندر آتا دیکھ کر میرے ساتھی رابرٹ نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہال کی ایک جانب شیشے کا پارٹیشن بنا کر رپورٹرز سے ملنے کے لیے آنے والوں کی انتظار گاہ بنی ہوئی تھی۔ رابرٹ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اندر دو افراد موجود تھے۔ اُن میں سے ایک مرد تھا اور دوسری عورت۔ مرد نفیس سوٹ میں ملبوس تھا اور اُس وقت کافی ڈیسک کے پاس کھڑا کافی بنا رہا تھا۔ میں فوراً اس طرف چل دیا۔ ''میں نوواک ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' میں نے اندر داخل ہوکر کہا۔

''میں سارجنٹ آرتھر ہوں۔'' سوٹ میں ملبوس شخص آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروانے لگا۔ ''اور یہ میری ساتھی سارجنٹ مورلیوز۔'' اس نے صوفے پر بیٹھی ہوئی عورت کا تعارف کروایا۔ وہ کہیں سے بھی پولیس والی نہیں لگتی تھی۔ اس نے جینز اور سیاہ رنگ کے گول گلے کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

''بہت خوشی ہوئی آپ دونوں سے مل کر۔'' میں نے رسمی کلمات کے بعد صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سارجنٹ بھی اپنی ساتھی کے برابر میں بیٹھ چکا تھا۔ کافی کا مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''کہیے... میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' میں نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کل رات جس ٹریفک حادثے کی فلم آپ کے چینل پر چلی تھی، ہم اسی حوالے سے آئے ہیں۔ آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں اس بارے میں۔'' سارجنٹ نے نرم لہجے میں کہا۔

''آپ نے ہی اس مرنے والی لڑکی کو گاڑی سے باہر نکالا تھا؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں...'' میں نے جواب میں کہا۔ ''اس وقت ہم جائے حادثہ کے قریب تھے۔ ہمارے علاوہ بھی اگر وہاں کوئی دوسرا شخص موجود ہوتا تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔'' میں نے اسے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ ایک رپورٹر صرف خبر کے پیچھے ہی نہیں رہتا، اس کے اندر ایک نیک انسان بھی پوشیدہ ہوسکتا ہے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ویسے میں شہر کے کئی پولیس افسران کو جانتا ہوں لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پہلے آپ کو کہیں دیکھا ہو۔'' میں نے انہیں پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی جہاں تک میری معلومات ہیں، ٹریفک حادثات کی تفتیش ٹریفک پولیس ڈپارٹمنٹ کرتا ہے، سارجنٹ کا کیا واسطہ اس کام سے؟'' میں نے اپنی بات مکمل کرکے ان کی طرف دیکھا۔

''بہت خوب!'' مورلیوز نے یہ سن کر کہا۔ ''آپ کی بات کسی حد تک درست ہے۔''

''تو پھر آپ لوگ...؟'' میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''سارجنٹ آرتھر صرف اہم ترین نوعیت کے معاملات کی تفتیش کرتے ہیں اور میں یو ایس مارشلز سے ہوں۔'' آرتھر کے بجائے اس کی ساتھی عورت نے جواب دیا۔

''اوہ... لگتا ہے معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔'' میں نے زیرِلب کہا۔

یو ایس مارشلز اور اہم نوعیت کے کیس کا سن کر میری چھٹی حس پہلے ہی بیدار ہوچکی تھی۔ اب جب مورلیوز نے یہ کہا کہ انہیں اس مقدمے کی تفتیش سونپی گئی ہے تو میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ''اس کیس میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟ یہ تو سیدھا سادہ ٹریفک حادثے کا کیس ہے۔'' اگرچہ یہ بات میں نے کہہ تو دی تھی لیکن میرا صحافتی تجربہ کہہ رہا تھا کہ نورین کی کار کے قریب بکھرے نوٹ، آٹومیٹک رائفل اور اب خصوصی تفتیش کے لیے متعین یہ ٹیم... بات کچھ اور ہی ہے۔

''ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ جائے حادثہ پر پہنچنے والی پولیس ٹیم سے بات چیت کیے بغیر ہی چلے گئے تھے۔'' آرتھر نے کہا۔

''جی ہاں... ہمارے پاس وقت کم تھا اور ہمیں کوریج کے لیے کہیں اور بھی پہنچنا تھا۔'' میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''اس حادثے کے سبب ہم پہلے ہی بہت تاخیر کا شکار ہوچکے تھے۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی۔

''ہماری تحقیقات کے مطابق آپ مرنے والی خاتون نورین برکر کو پہچانتے ہیں؟'' مورلیوز نے کہنا شروع کیا۔ ''ہمارے لیے یہ بات باعثِ حیرت تھی کہ ایک شخص جو حادثے کا شکار بننے والی گاڑی سے مرنے والی لڑکی کو باہر نکال سکتا ہے، اسے پہچان سکتا ہے مگر پھر بھی وہ جائے حادثہ پر پولیس کو چھوڑ کر چل دیا... بغیر کچھ بتائے؟''

''بات یہ ہے کہ میں ایک صحافی ہوں اور اس وقت اپنی ڈیوٹی پر جارہا تھا۔ مجھے اپنی ڈیوٹی عزیز ہے۔'' میں نے مورلیوز کا کاٹ دار جملہ سُن کر تلخ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں اس وقت جس کام سے جارہا تھا، مجھے اس کی تنخواہ ادا کی جاتی ہے۔ ویسے بھی ہزاروں لوگ مجھے جانتے ہیں، پہچانتے ہیں۔ میں بھی سیکڑوں کو پہچانتا ہوں تو... پھر کیا ہوا۔ بطور انسان اس حادثے کے بعد موقع پر ہونے کی وجہ سے میں جو کچھ کرسکتا تھا، وہ میں نے کیا۔'' وہ دونوں ...خاموشی سے میری بات سن رہے تھے۔ لگتا تھا کہ انہوں نے میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کرلیا تھا۔

''اگر آپ کو میری بات بُری لگی ہے تو معذرت چاہتی ہوں۔ میرا مطلب آپ کی دل آزاری کرنا ہرگز نہیں تھا۔'' چند لمحے تک ماحول پر سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد ایک بار پھر مورلیوز نے اپنی بات شروع کی۔ ''میں تو صرف یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ آپ اسے کیسے جانتے تھے؟''

''وہ....... ایک مقامی ریستوران میں کام کرتی تھی۔ میں وہاں کبھی کبھار لنچ کے لیے جاتا رہتا ہوں۔'' میں نے اسے بتانا شروع کیا۔ ''بس یہی ایک وجہ تھی اس سے شناسائی کی۔''

''مجھے اب بھی حیرت ہے کہ تم جائے واردات پر کیوں موجود تھے؟'' ایک بار پھر مورلیوز کا لہجہ جارحانہ ہوچکا تھا۔

''جائے واردات...؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ''وہ تو ایک حادثہ تھا۔ اسے تو جائے حادثہ کہنا چاہیے۔ شاید تم کچھ غلط کہہ گئی ہو۔'' مجھے اس کی بات سن کر ایسا لگا ۔۔۔ جیسے مجھ سے باقاعدہ تفتیش کی جارہی ہے۔

''عجیب اتفاق ہے کہ ایک تو تم جائے واردات پر موجود تھے اور دوسرے یہ کہ تم نے اس بدمعاش ایڈی کو فون کرکے یہ اطلاع بھی دی کہ کیا کچھ ہوچکا ہے۔'' اس نے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' یہ سنتے ہی میں نے زچ ہوکر کہا۔ ''اپنی معلومات درست کرلیں۔ میں نے ایڈی کو نہیں، روڈ ہاؤس ریستوران کو فون کیا تھا جہاں وہ کام کرتی تھی۔ اب اگر فون ایڈی نے اٹھایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' میرا لہجہ خاصا تلخ ہوچکا تھا۔ میں اسے یہ باور کروانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ جو گفتگو کررہی ہے، وہ درست نہیں۔

''ہم پر برہم ہونے کی کوشش مت کیجیے۔'' مورلیوز کا لہجہ پاٹ دار تھا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ ایڈی اور تمہارے درمیان بہت پرانا تعلق ہے۔''

مورلیوز کی یہ بات سن کر میں ششدر رہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ''جی ہاں... یہ بات درست ہے لیکن ضروری نہیں کہ کافی عرصے پہلے سے جن لوگوں سے آپ کی دعا سلام ہو، وہ بعد کے برسوں میں بھی قائم رہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میں برسوں پہلے جس یتیم خانے میں رہتا تھا، وہ بھی وہیں پرورش پارہا تھا۔ اس کے بعد مدتوں ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ دو تین سال پہلے ہی ہماری ملاقات ہوئی تھی، وہ بھی اس کے ریستوران میں کھانا کھاتے وقت۔ اتفاق سے، اس نے مجھے پہچان لیا۔ یوں کبھی کبھار دعا سلام ہوجاتی ہے اور بس... اسے آپ دوستی نہیں کہہ سکتے۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہوکر اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''شکریہ یہ سب کچھ کہنے کا۔'' مورلیوز نے مسکراتے ہوئے۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں ان کی باتیں سُن سُن کر واقعی پریشان ہوگیا تھا۔

''پوچھے گئے ہر سوال کا سیدھا سیدھا جواب۔'' مورلیوز کا لہجہ اس بار قدرے نرم تھا۔ ''مگر ہمیں افسوس ہے کہ تم بات کو خوامخواہ اِدھر سے اُدھر گھما رہے ہو۔ ہمیں پتا ہے کہ نورین برکر تمہارے لیے ایک ویٹریس سے بڑھ کر تھی۔ اس کی اور تمہاری جان پہچان صرف اس حد تک نہیں تھی جتنا کہ تم بتا چکے ہو۔''

''مجھے معلوم نہیں کہ تم یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہی ہو؟''

''تم اسے اپنی گاڑی میں بھی بٹھاتے رہے ہو۔'' مورلیوز نے کہا۔

''اوہو...'' یہ سن کر میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ایسا صرف ایک بار ہوا تھا، وہ بھی اس وقت جب اس کی گاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خراب تھی اور اس نے مجھے ریستوران سے باہر آتا دیکھ لیا تھا۔ اور میں نے اسے لفٹ دے دی تھی۔"

"کیا تم نے اسے گھر تک چھوڑا تھا؟" مورلیوز نے سوال کیا۔

"نہیں... وہ بیچ راستے میں اتر گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں یاد ہے اسے کس جگہ اتارا تھا؟" مورلیوز نے پھر سوال۔

"وہ شیڈی کورٹ کے داخلی دروازے کے قریب اتری تھی۔" میں نے کچھ دیر تک ذہن پر زور ڈال کر یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے وہ وہاں کیوں اتری ہوگی؟" مورلیوز بدستور بال کی کھال اتارنے پر بضد تھی۔

"یہ تو مجھے پتا نہیں کہ وہ وہاں کیوں اتری تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص وہاں پر اس کا منتظر ہو۔"

"اگر ایسا تھا تو جب وہ تمہاری گاڑی سے اتری تو اس کی لپ اسٹک کیوں پھیلی ہوئی تھی؟" مورلیوز نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے عجیب سا سوال کرڈالا۔

"دیکھیے... میں نہ تو کوئی آوارہ مزاج شخص ہوں اور نہ ہی میرا اس سے کوئی رومانوی تعلق تھا۔ میں اسے صرف اتنی حد تک جانتا ہوں کہ وہ اس ریستوران میں ویٹریس تھی جہاں میں اکثر لنچ کے لیے جایا کرتا تھا۔ اسی حد تک میں ایڈی کو جانتا ہوں... اور بس!" مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ انہیں مرنے والی سے متعلق اس قدر معلومات کس طرح حاصل ہوئی ہیں۔

"میں ایک بار پھر آگاہ کررہی ہوں کہ تم نورین کو اس سے زیادہ جانتے ہو، جتنا کہ بتا رہے ہو۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "دیکھو... جو پوچھ رہے ہیں، وہ سچ سچ بتادو ورنہ ہمیں تمہارے اسٹیشن منیجر سے ملنا پڑے گا۔ یاد رکھو، تمہاری نوکری کچے دھاگے سے بندھی ہوئی ہے۔ اگر ہم نے تمہارے اسٹیشن منیجر کے سامنے اپنے منہ سے چند الفاظ ادا کردیے تو تمہاری نوکری ہی نہیں، پورا کیریئر ہی ختم ہوجائے گا۔" اس بار اس کا لہجہ خاصا دھمکی آمیز تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"نیکی کرکے پھنس گیا۔" میں نے غصے سے کہا۔ "اگر آئندہ کبھی ایسا ہوا تو میں پولیس کو اطلاع اور بدنصیب شخص کی مدد کرنے کے بجائے وہاں سے نظریں پھیر کر گزرنا زیادہ مناسب سمجھوں گا۔"

"جائے وقوعہ سے تم کہاں گئے تھے؟" مورلیوز نے ایک دم بات پلٹ دی۔ اس کا لہجہ بدستور سخت تھا۔

"ایسٹ پوائنٹ ریستوران۔"

"سیدھے یا بیچ میں نورین کے گھر ہوتے ہوئے؟" مورلیوز نے ایک بار پھر مجھے بھڑکا دینے والا سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس بار میرا لہجہ بھی خاصا جارحانہ تھا۔ "میں سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں وہاں اپنی ڈیوٹی کررہا تھا۔"

"تم نے دیکھا تھا کہ اس کی کار کے اندر اور اردگرد کتنے نوٹ بکھرے ہوئے تھے؟ ہوسکتا ہے کہ تم نے سوچا ہو کہ چلو اس کے گھر چل کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کتنی نقدی ہوسکتی ہے؟" اس نے نہایت پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سب ...... سے پہلے جائے حادثہ پر سے رقم غائب کرتا۔" اس بار میرا لہجہ صفائی پیش کرنے والے ملزموں جیسا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر وہ مجھ سے کیا سننا چاہ رہی ہے۔

"اس کی کار کے پاس سے پچیس ہزار ڈالرز کی نقدی اور آٹومیٹک رائفل ملی ہے۔ اب کوئی شخص کسی ویٹریس کو اتنی بڑی رقم ٹِپ میں تو دینے سے رہا اور اوپر سے رائفل۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا کوئی اور چکر بھی ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے گھورا۔ "ممکن ہے کہ وہ منشیات کے دھندے میں ملوث ہو۔ ویسے منشیات کے حوالے سے تو خود تمہارا پولیس ریکارڈ بھی موجود ہے۔" یہ سُن کر میں دنگ رہ گیا۔ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیوں مسٹر نوواک کیسلر... کیا ایسی بات نہیں ہے؟"

مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بند تھا۔ "یہ سچ ہے۔" میں نے مری مری آواز میں کہا۔ "لیکن وہ کئی سال پرانی بات ہے۔ میرا تین ماہ تک علاج ہوا تھا۔ اب میرا نہ تو منشیات سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی اس کا دھندا کرنے والوں سے۔" میں نے لاچارگی سے جواب دیا۔ میری نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ بات تمہارا اسٹیشن منیجر جانتا ہے؟" مورلیوز نے سوال کیا۔

"کون سی بات؟"

"یہی کہ تم منشیات..." اس نے چبھتے لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں..." میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"یہ لو..." اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ میری طرف بڑھایا۔ "اس سے پہلے کہ ہم کچھ کریں، اگر تم چاہو تو سب کچھ سچ سچ بیان کرسکتے ہو۔ اب بھی تمہارے پاس وقت ہے۔ اگر چاہو تو اپنے بیان میں تصحیح، ترمیم اور اضافہ کرواسکتے ہو۔"

"میں جو کچھ جانتا تھا، وہ سب کچھ سچ سچ بتا چکا ہوں۔" میں نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "صرف تھوڑا سا... مگر ہم سب کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھتے ہی سارجنٹ بھی کھڑا ہوگیا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم فون ضرور کروگے۔" اس نے باہر نکلتے ہوئے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کے جاتے ہی میں صوفے پر ڈھیر ہوگیا اور گہری گہری سانسیں لے کر اپنے حواس درست کرنے لگا۔ مورلیوز کی جرح نے تو میرے اعصاب شل کردیے تھے۔

دونوں پولیس والوں کے جانے کے کافی دیر بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اسٹیفنی کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ یہ مستطیل شکل کا ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ "ہائے اسٹیفنی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہائے۔" اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلانا بند کیں اور میری طرف دیکھتے ہوئے گرم جوشی سے کہا۔

"ابھی دو پولیس والے مجھ سے تفتیش کرنے آئے تھے، کل رات والے واقعے پر۔" میں نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے بھی بہت حیرت ہے۔ انہیں نہ جانے کس طرح پتا چل گیا ہے کہ میں نے ریستوران فون کرکے ایڈی کو حادثے کی اطلاع دی تھی۔ کہیں تم نے تو..." میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا بک رہے ہو تم؟" اس نے بگڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔

"ایک تم ہی تھیں جس کے سامنے میں نے فون کیا تھا۔"

"مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ بدستور ناراض نظر آرہی تھی۔ "ویسے وہ پولیس والے مجھ سے مل کر نہیں گئے تھے جو وہ بات میں انہیں بتاتی۔"

"تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میرا لہجہ بدستور سپاٹ تھا۔

"دیکھو نوواک... تم مجھ پر شک کررہے ہو۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اس وقت میں کام میں مصروف ہوں۔ کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم بعد میں بیٹھ کر اس موضوع پر بات کرلیں۔'' اسٹیفنی کا لہجہ مفاہمانہ تھا۔

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے نرمی سے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف پلٹا۔

''تم کہاں جارہے ہو؟'' اسٹیفنی نے جلدی سے پوچھا۔

''گھر... تم چاہو تو وہاں آسکتی ہو۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا اور وہاں سے نکل گیا۔

راستے میں میں نے گیارھویں اسٹریٹ کی پارکنگ میں گاڑی روکی۔ میں پبلک فون بوتھ سے ایڈی کو فون کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر سکے ڈالے اور اس کے ریستوران کا نمبر ملانے لگا۔ ہیلو کہتے ہی ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ یہ ریستوران کی ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ ''ربنی... میں بول رہا ہوں۔'' میں نے نام بتائے بغیر کہا۔ ویسے وہ میری آواز پہچانتی تھی۔ ''سنو... میرا نام مت لو۔ بس ایڈی تک یہ پیغام پہنچادو کہ میں اس سے چرچ میں ملنا چاہتا ہوں، ایک گھنٹے بعد۔'' میں نے رسمی تکلفات میں پڑے بغیر فوراً کام کی بات کی۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' ربنی نے یہ سنتے ہی پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''شاید نہیں۔ بس تم اس تک میرا پیغام پہنچادو... بائے۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

مجھے معلوم نہیں کہ میرے والدین کون تھے۔ میں نے اپنا بچپن چرچ کے یتیم خانوں میں گزارا تھا۔ لڑکپن تک میں مختلف چرچ کے یتیم خانوں میں زندگی بسر کرتا ہوا بالآخر وارسا ہائٹس کے سینٹ اسٹینلے کیتھیڈرل پہنچا جس نے میری زندگی کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔

وہ چرچ قدیم گوتھک طرز تعمیر کا شاہکار نمونہ تھا۔ ساٹھ کی دہائی میں بے گھر اور بے سہارا بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے یہاں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل ایک بلاک تعمیر کیا گیا تھا۔ بے سہارا بچوں کے اخراجات ایک خیراتی ادارہ فراہم کرتا تھا تاہم نوّے کی دہائی میں وہ ادارہ بند کردیا گیا۔ یوں چرچ کا یہ بلاک بھی بند ہوگیا۔ اب وہ بلاک جہاں کبھی مجھ جیسے بے سہارا بچے رہتے تھے، ویران اور سنسان پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایڈی کو اسی جگہ پہنچنے کا پیغام دیا تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اگر میں نے اسے چرچ میں ملنے کے لیے بلایا ہے تو اس سے میری مراد سینٹ اسٹینلے چرچ کا یہی ویران بلاک ہوگا۔ یہاں چہار سو ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس جگہ سے میرے لڑکپن کی تلخ و شیریں یادیں وابستہ تھیں۔ یہیں سے ایک رات میری زندگی کا نیا سفر شروع ہوا تھا۔

میں اور ایڈی پہلی بار اسی چرچ کے یتیم خانے میں ملے تھے۔ ایڈی سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ جب میں یہاں پہنچا تو ایڈی پہلے سے ہی یہاں پر رہ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ہم چار لڑکوں کا ایک گروپ بن گیا۔ اس گروپ کا سربراہ پولش لڑکا پال تھا۔ وہ دراز قد اور عمر میں ہم سے بڑا تھا۔ ایڈی کی ذمے داری تھی کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے لانڈری میں جاکر کپڑے دھوئے۔ اسے کپڑے دھونے کے کام سے نفرت تھی لیکن مجبوری کی حالت میں اسے یہ کام کرنا پڑ رہا تھا۔ میں، پال، ایڈی اور ایک اور کم عمر لڑکا جان... چاروں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ پال کے ذمے صفائی ستھرائی تھی لیکن وہ ہمیں دھونس دھمکی دے کر اپنا کام کروالیتا تھا۔ رفتہ رفتہ پال ہمارا لیڈر بن گیا۔ آہستہ آہستہ اس نے ہمیں یہ باور کروانا شروع کیا کہ زندگی کے اصل رنگ اور حقیقی لطف اس چرچ کے باہر ہے۔ یہ زندگی نہیں غلامی ہے جس سے جتنا جلد ہوسکے ہمیں اپنی جان چھڑا لینا چاہیے۔ سب سے پہلے ایڈی اس کے خیالات سے متفق ہوا۔ اس کے بعد اکثر پال اور ایڈی رات کو چھپ چھپا کر چرچ سے باہر جانے لگے۔ وہ کہاں جاتے تھے، یہ بات نہ تو مجھے معلوم تھی اور نہ ہی جان جانتا تھا۔ ویسے ان دونوں نے کئی بار پوچھنے کے باوجود بھی یہ بات مجھے نہیں بتائی۔ ایک رات جب ایڈی اور پال لوٹے تو میں جاگ رہا تھا۔

''اے سنو... نوواک! جاگ رہے ہو؟'' میں کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا اور ایڈی میرے سرہانے کھڑا ہوا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے کمبل سے منہ نکال کر کہا۔

کمرے میں دیوار پر لگے زرد بلب کی ہلکی ہلکی روشنی میں دیوار پر اس کی پرچھائیں خوفناک شکل بنارہی تھی۔ پال بھی اس کے برابر کھڑا ہوا تھا۔

''ہم یہاں سے فرار ہورہے ہیں۔ کیا تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے؟'' ایڈی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا؟'' یہ سنتے ہی میں نے کمبل پھینکا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کون کون جارہا ہے؟''

''یہ بات چھوڑو۔ چلنا ہے تو بس بستر چھوڑو اور باہر نکلو جلدی سے۔'' وہ بدستور سرگوشی میں بات کررہا تھا۔

''چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں بستر سے اٹھا اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اس وقت میری عمر تیرہ برس تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جان کو جگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پال، ایڈی، جان اور میں رات کی تاریکی میں چرچ کے عقبی حصے سے باہر نکل رہے تھے۔

پال اور ایڈی کی دوستی اسمتھ نامی ایک شخص سے تھی۔ ہم پال کی سربراہی میں چلتے ہوئے مرکزی بازار تک پہنچے۔ وہاں اسمتھ اپنی کار میں ہمارا منتظر تھا۔ ہم چاروں اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے اور پھر تقریباً پوری رات سفر کرنے کے بعد ڈیٹرائٹ پہنچے۔

ہم جس گھر میں ٹھہرے تھے، وہ نہایت ویران جگہ پر بنا ہوا ایک فارم ہاؤس تھا۔ گھر کی اندرونی حالت ایسی تھی کہ جیسے وہاں کوئی مدتوں سے نہیں رہ رہا ہو۔ دراصل یہ جگہ جارج کی ملکیت تھی اور اسمتھ اس کے لیے کام کرتا تھا۔ یہ نہایت ہی ویران علاقہ تھا۔ دور دور تک کوئی گھر نہیں تھا۔ جارج منشیات فروشی کا دھندا کرتا تھا۔ اسمتھ اس کا کارندہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے تمام کارندے پولیس کی نظروں میں آچکے تھے اس لیے اسمتھ اور جارج نے ایک منصوبہ بنایا جس کے تحت وہ دوسرے شہر سے کم عمر بچوں کو ورغلا کر ڈیٹرائٹ لانے لگے اور ان کے ذریعے کوکین، چرس اور افیون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کام کروانے لگے۔ اس کے بدلے ہمیں نقدی بھی ملتی اور عیش و آرام کے علاوہ تفریح کے ہر ممکن ذرائع فراہم کیے جاتے۔ اسمتھ ہمارا باس تھا۔ وہ ہمارا خاص خیال رکھتا تھا۔

ہم نے دو برس تک جارج کے لیے کام کیا۔ ایک دن جب میں، جان، ایڈی اور پال بھاری مقدار میں کوکین کو اسکول کے بستوں میں بھر کر پیدل چلتے ہوئے اسمتھ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچانے کے لیے جارہے تھے تو پولیس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ ہم بستے پھینک کر برابر والے جنگل کی طرف بھاگے۔ پولیس ہمارے پیچھے تھی۔ آخر انہوں نے ہمیں دھمکانے کے لیے گولی چلائی۔ جان سب سے پیچھے تھا۔ اب یہ اتفاق تھا یا قدرت کی طرف سے جرم کی سزا کہ ایک گولی جان کی پیٹھ پر لگی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ میں اس کے قریب تھا۔ اسے گرتا دیکھ کر میں رکا اور اس کے برابر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی جان بچانے کے لیے کچھ کرتا، اس نے دو تین ہچکیاں لیں اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اسی دوران میں پولیس سر پر پہنچ گئی۔ انہوں نے مجھے گرفتار کرلیا۔ ایڈی اور پال فرار ہوچکے تھے۔

پولیس نے مجھے گرفتار کرکے سب کچھ اگلوالیا لیکن وہ پال، ایڈی اور اسمتھ کو گرفتار نہ کرسکے۔ جارج کو میں نے کبھی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا تھا۔ بس اس کا نام ہی سنا تھا۔ یہ بات بھی پولیس کو بتادی۔ وہ بھی گرفتار نہ ہوسکا۔ میں نے پولیس سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ ویسے بھی میں کمزور فطرت کا بچہ تھا۔ میرے اوسان خطا کردینے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ میں تنہا تھا اور پولیس کی تحویل میں تھا۔

منشیات کے دھندے میں ہونے کے باعث مجھے کوکین پینے کی عادت پڑگئی۔ جس وقت مجھے پولیس نے گرفتار کیا، اس وقت میں سولہویں سال میں تھا۔ مجھے بچوں کی جیل میں رکھا گیا۔ عدالت نے مجھے سزا دینے کے بجائے منشیات سے چھٹکارے کے لیے ایک فلاحی ادارے کے سپرد کردیا۔ وہاں نہ صرف مجھے منشیات کی لت سے چھٹکارا ملا بلکہ میری درخواست پر انہوں نے میری تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کروادیا۔ ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مجھے ادارے کے ذریعے ایک چھوٹی سی ملازمت مل گئی اور میں ایک ہوسٹل میں رہنے لگا۔ میں نے اپنی پڑھائی بدستور جاری رکھی اور صحافت میں امتیازی نمبروں سے گریجویشن کرکے ایک ٹی وی چینل میں ٹرینی رپورٹر نوکری کرلی۔ بعد ازاں میں نے ایکشن ٹی وی چینل جوائن کرلیا۔ رپورٹنگ میں میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے چینل کے ہیڈکوارٹر وارسا ہائٹس بھجوادیا گیا۔ یہ وہی شہر تھا جس کے اسٹینلے چرچ سے میں ایڈی، پال اور جان کے ساتھ فرار ہوا تھا۔

وارسا ہائٹس میں میرا بچپن گزرا تھا۔ مجھے یہاں آکر بہت خوشی حاصل ہوئی۔ ایک دن میں لنچ کے لیے "ایڈیز ریستوران" گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس کی ملکیت ہے۔ اچانک وہاں میں نے ایڈی کو دیکھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ یوں ہماری دوستی کا ٹوٹا ہوا رشتہ ایک بار پھر بحال ہوگیا۔ ایڈی نے مجھے بتایا کہ وہ اب تک منشیات کے دھندے میں ملوث ہے البتہ خود کو پولیس کی نظروں سے بچانے کے لیے اس نے ریستوران کھول لیا ہے۔ اس سے ہی مجھے پتا چلا کہ پال بھی اسی شہر میں رہتا ہے اور سیاست میں حصہ لیتا ہے۔ اس نے سیاست کے میدان میں بظاہر نہایت سرگرمی دکھائی۔ افغانستان کے کئی دورے کیے لیکن درپردہ اس نے وہاں ہیروئن کے کئی بڑے بڑے اسمگلروں سے ذاتی روابط قائم کرلیے تھے۔ اب وہ افغانستان سے امریکا اسمگل ہونے والی منشیات کا ایک بڑا ڈیلر اور مافیا کا ایک اہم رکن تھا۔ اگرچہ پولیس یہ بات جانتی تھی تاہم اتنے بڑے آدمی پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ان کو اب تک ٹھوس شواہد نہیں مل سکے تھے جس کی بنا پر وہ بدستور بے خوفی سے دھندا کررہا تھا۔ ایڈی نے ہی یہ دلچسپ بات بتائی کہ پال اب جارج ہیری مین کے نام سے مشہور ہے۔ شاید میں اور ایڈی دنیا کے وہ دو آدمی تھے جو اس کے اصل نام سے واقف تھے۔

ایڈی اس بات سے خوش تھا کہ میں نے جرم کی دنیا چھوڑ کر صحافت میں نام پیدا کرلیا ہے تاہم وہ چاہتا تھا کہ ہماری دوستی برقرار رہے۔ ویسے بھی سچ یہ تھا کہ مجھے بھی ایڈی کے دھندوں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ میں اپنی دنیا میں مگن تھا اور وہ اپنی دنیا میں خوش۔

ایڈی کے ریستوران میں ہی کئی ماہ پہلے میری نورین برکر سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اسٹیفنی میرا گھر چھوڑ کر اپنے نئے بوائے فرینڈ کے ہاں منتقل ہوگئی تھی۔ بقول اسٹیفنی کے اس کا بوائے فرینڈ نہایت مال دار آدمی تھا۔ ان کی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی جس کے کچھ دنوں کے بعد اسٹیفنی نے مجھے چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

اُس دن میں نہایت اداس تھا۔ صبح سویرے اسٹیفنی اپنا سامان سمیٹ کر میرے گھر سے اپنے نئے بوائے فرینڈ کے ہاں چلی گئی تھی۔ میں اسے چاہنے کے باوجود نہیں روک سکا البتہ اس کے جانے کے بعد گھنٹوں بستر پر پڑا اس کو یاد کرتا رہا۔ میں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ جب میں نے گھڑی دیکھی تو دوپہر کے پونے ایک بج رہے تھے۔ بھوک محسوس ہورہی تھی، میں لنچ کے لیے ایڈی کے ریستوران میں آگیا۔ میں میز پر بیٹھا ہی تھا کہ ایڈی نورین برکر کو ساتھ لے کر میرے پاس آیا۔ "ان کا خاص خیال رکھنا اور جب بھی یہ یہاں آئیں، ان کی خدمت کرنا تمہاری خاص ذمے داری ہے۔" اس نے مجھ سے نورین برکر کا تعارف کروانے کے بعد اُسے ہدایت کی۔

نورین برکر نہایت خوب صورت، حاضر جواب اور شوخ لڑکی تھی۔ اس سے ملنے کے بعد اسٹیفنی کی جدائی کا دکھ کم ہونے لگا تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد میں تقریباً ہر روز وہاں جانے لگا۔ بظاہر تو میں لنچ یا ڈنر کے لیے جاتا تھا لیکن سچ یہ تھا کہ اصل وجہ نورین سے باتیں کرنا ہوتا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھتے ہی سب کچھ بھول بھال کر صرف میری خدمت پر لگ جاتی تھی۔ میں اس کے بے حد قریب ہونا چاہتا تھا۔ بظاہر وہ بھی مجھ سے متاثر لگتی تھی لیکن اب بھی ہمارے درمیان اتنی قربت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ریستوران کے باہر ملتے۔

"کیا ہوا؟" ایک دن لنچ کے بعد میں ریستوران سے باہر آیا اور جب پارکنگ سے گاڑی نکال کر سڑک پر آنے والا تھا تو میں نے ایک گاڑی کے قریب نورین کو کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر گاڑی روکی اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"میری گاڑی اسٹارٹ نہیں ہورہی۔" اس نے جواب دیا۔

"تو آؤ... میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے کار کا دروازہ کھولا۔

"شکریہ..." یہ کہتے ہوئے وہ اندر بیٹھ گئی۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں ریستوران سے باہر اکٹھے موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ آج اسے دوستی کی پیشکش کروں گا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ جب میں اپنے دل کی بات زباں پر لایا تو وہ بھی میری ہم خیال نکلی۔

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟" کچھ دیر بعد میں نے اسے پیشکش کی۔ "میں چاہتا ہوں کہ اب شادی کرلوں۔ تم ساتھ رہوگی تو شاید مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ آسانی ہو۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہوگی مگر ابھی نہیں۔ کچھ اور وقت گزرنے دو پھر میں یقیناً ایسا ہی کروں گی۔" اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بس مجھے شیڈی کورٹ اتار دو۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر گاڑی روکی۔ اس کا طویل بوسہ لیا، پھر وہ گاڑی سے اتر کر چلی گئی اور میں دفتر آگیا۔ اب اس کی موت کے بعد مجھے یہ بھی شدید حیرت تھی کہ مورلیوز نے آج اس بوسے تک کا ذکر کردیا تھا۔ یہ بات میں نہیں جان سکا کہ اسے اتنی ذاتی نوعیت کی بات کا کس طرح علم ہوگیا تھا؟

☆☆☆

"ہائے نوواک!" اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ سامنے ایڈی کھڑا تھا۔

"کیا ہوا... مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس نے میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی خاص بات؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا اور کچھ سوچنے لگا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"آج دو پولیس والے میرے دفتر آئے تھے مجھ سے ملنے..."

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے اپنی بات شروع کی لیکن اس نے قطع کلامی کی۔ ایڈی نے یہ بات ایسے کہی کہ جیسے یہ معمولی سی بات ہو۔

"تم غلط فہمی کا شکار ہو۔" میں نے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ عام پولیس والے نہیں بلکہ بہت خاص تھے۔"

"کیا؟" پہلی بار اس کے چہرے پر پریشانی نظر آئی۔

"بات اتنی معمولی نہیں، جتنی کہ اب تک تم سمجھ رہے ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے پوری رُوداد سنانا شروع کردی۔

"اس کا مطلب ہے کہ میرا شک درست تھا۔" اس نے میرے خاموش ہونے پر داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

"کیسا شک؟" میں نے چونک کر کہا۔

"جس طرح باریک بینی سے وہ تمام باتیں جانتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ نورین کے متعلق میں اور پال جو سمجھ رہے تھے، حقیقت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔" اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوچکی تھیں۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تمہیں نورین پر کیسا شک تھا؟" میں نے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا۔

"وہ ویٹریس نہیں کچھ اور تھی۔"

"کیا تھی؟" میں نے چونک کر کہا۔

"وہ ہمیں ڈبل کراس کررہی تھی۔ شاید اسے ہمارے پیچھے لگایا گیا تھا۔"

"یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے ایسے کہا جیسے اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔

"جرم کی دنیا میں قیافہ شناسی کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ ظاہر سے باطن کو نہ سمجھا تو پھر کامیابی نہیں ملتی۔" اس نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ویسے نورین کو اس طرح نہیں مارنا چاہیے تھا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے کئی اور بھی راستے ہوسکتے تھے۔"

"لگتا ہے کہ تمہیں اس کی موت سے شدید دکھ پہنچا ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کیا کچھ خاص تعلق ہوگیا تھا اس سے؟" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"ایسا نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "وہ جوان تھی۔ ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔" میں نے یہ بات اس انداز میں کہی جیسے اس سے مجھے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، بس ویسے ہی اس کی موت سے دکھ ہوا ہے۔

"ہماری دنیا میں چھٹکارے کا ایک ہی مطلب ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس نے ہمیں دھوکا دے کر پھنسوانے کی کوشش کی۔ ہم بھانپ گئے اور اسے اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑی۔" اس کا لہجہ سفاک اور سپاٹ تھا۔

"ویسے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم نے ایک دوست ہونے کے ناتے میری درخواست قبول کی۔ اگر تم مدد نہ کرتے تو یہ بات ثابت کرنا بہت مشکل تھا کہ اسے پہلے قتل کیا گیا ہے یا پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حادثہ ہوا ہے۔ شکر ہے کہ اب اس کی موت میرے گلے نہیں پڑے گی۔"

"میرے خیال میں تمہاری گلو خلاصی اتنی آسان نہیں ہوگی۔" اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ "پولیس والے جس طرح بات کر رہے تھے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ نہ تو وہ اسے حادثہ ماننے کو تیار ہیں اور نہ ہی نورین کی موت کو حادثاتی موت۔ وہ اسے قتل قرار دے رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں، وہ مجھے بھی اس میں ملوث کر رہے ہیں۔"

"جو کہتے ہیں، کہتے پھریں۔ عدالت میں اسے قتل ثابت کرنا آسان کام نہیں ہوگا۔" ایڈی نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اگر جرم کے بعد ثبوت چھوڑتا تو اب تک کب کا زمین کے اندر پہنچ چکا ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر خباثت بھری مسکراہٹ آگئی۔

"میرے خیال میں تم اپنے بچاؤ کا انتظام کرلو۔ ان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ وہ سارجنٹ مورلیوز تو مجھے بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجنا چاہتی ہے۔" میرے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔ "یہ تو چھوڑو، وہ تو میری نوکری کے پیچھے بھی پڑی ہوئی ہے۔ ملازمت سے برطرف کروانے کی دھمکیاں دے رہی تھی۔"

"فکر مت کرو۔ وہ کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب پولیس کی گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ تمہیں ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔" اس نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "کوئی اور بات ہے تو کہو، ورنہ میں چلتا ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایڈی کے جانے کے بعد کافی دیر تک میں وہیں بیٹھا رہا۔ میں اب تک پریشان تھا کہ خوامخواہ اس چکر میں پھنس گیا۔ میرے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ میں بُری طرح تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ دفتر سے نکلتے ہوئے میں نے ایک دن کی اتفاقیہ رخصت کی درخواست دے دی تھی۔ اس لیے ایڈی کے جانے کے کافی دیر بعد میں وہاں سے اٹھا اور گھر چلا آیا۔ میں اپنے منتشر اعصاب کو پُرسکون کرنے کے لیے آرام کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

میں بستر پر لیٹا کافی دیر تک اس معاملے پر سوچ بچار کرتا رہا۔ اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کب نیند آگئی۔ ڈور بیل سے آنکھ کھلی تو گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ دروازہ کھولا تو سامنے اسٹیفنی کھڑی تھی۔ اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے پیچھے دھکیلا اور اندر چلی آئی۔ "تم نے گھر کی کیا حالت بنادی ہے؟" اس نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے کہا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک بڑا سا بیگ بھی تھام رکھا تھا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازہ بند کر کے خاموشی سے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیسے آنا ہوا؟" میں نے... سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔" اس نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ "میں پہلے بھی یہاں رہتی تھی اور پھر واپس چلی آئی ہوں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھی۔ وہ میرے قریب آئی اور جھک کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں جانتی تھی کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن کیا میں تمہارے بغیر رہ سکتی ہوں؟ بس یہی جاننے کے لیے گھر چھوڑا تھا۔ جب یقین ہوگیا کہ نہیں تو پھر واپس آگئی۔" اس نے آہستہ سے کہا اور برابر بیٹھ کر میری گردن کے گرد اپنی بانہیں حمائل کردیں۔ میں نے بھی اسے بانہوں میں تھام لیا۔

"اور وہ تمہارا بوائے فرینڈ... جس کا میں نہ تو نام جانتا ہوں اور نہ ہی اسے کبھی دیکھا۔ اب اُس بے چارے کا کیا ہوگا؟" میں نے شرارتی لہجے میں کہا۔

"وہ تو ایک فرضی تصور تھا تمہیں جلانے کے لیے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں شادی کرلینی چاہیے۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ہم ایک ساتھ بوڑھے ہونے کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں۔"

"تم نے بہت دیر کردی۔" میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "پولیس مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نورین برکر کے قتل میں ملوث ہوں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ چونک گئی۔ "یہ کیا چکر ہے؟ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔" جواب میں، میں نے اسے سارا قصہ سنا ڈالا۔

"اوہ میرے خدا... تو کیا وہ ایک قتل تھا جس کی ہم نے بطور حادثہ کوریج کی تھی؟" اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ پریشان نظر آنے لگی۔

"بقول پولیس والوں کے یہ ایسا ہی تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے؟" اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں کافی دیر تک بیٹھے ہوئے یہی باتیں کرتے رہے کہ اس معاملے سے کیسے جان چھڑائی جائے۔ وہ اس لیے

بھی بہت فکر مند تھی کہ اس معاملے میں میری نوکری بھی جا سکتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ جانے مجھے کتنا عرصہ بیروزگاری میں بسر کرنا پڑتا۔ وہ اگلے ہفتے شادی کرنے کا سوچ کر آئی تھی لیکن اب وہ فکر مند تھی کہ پولیس کے اس چکر سے کیسے نکلا جائے۔ گوکہ پولیس نے اب تک اس سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں کیا تھا مگر وہ سوچ رہی تھی کہ حادثے کے وقت ساتھ ہونے کے باعث اگر وہ بھی اس معاملے میں ملوث کردی گئی تو ہم دونوں کو نہ صرف بیروزگاری کا بلکہ جیل کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ ڈنر ہم نے گھر پر ہی کیا۔ اسٹیفنی نے میری پسند کا کھانا تیار کیا تھا۔ کھانے کے بعد بھی ہم دونوں یہی باتیں کرتے رہے کہ اب جان کیسے چھڑائی جائے۔

اسٹیفنی یہ بات جانتی تھی کہ اوائلِ عمری میں پولیس نے مجھے منشیات کے الزام میں گرفتار کیا تھا اور میں منشیات کا عادی بھی تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے بحالی کے مرکز میں رکھا گیا تھا مگر میں نے یہ بات ٹی وی انتظامیہ سے چھپائی تھی حالانکہ یہ بات بتانا ضروری تھی۔

"دیکھو، تم پولیس کی مدد کرو اور جو کچھ جانتے ہو، وہ انہیں سچ سچ بتادو۔ ممکن ہے کہ اس کے نتیجے میں وہ ٹی وی انتظامیہ کو یہ بات نہ بتائیں۔" آخر اس نے مجھے ایک مشورہ دیا۔

"مورلیوز بھی شاید یہی چاہتی ہے۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیتے ہوئے بھی ایسی ہی بات کی تھی۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"بہتر ہے کہ اب تم اسے فون کرو اور اُس کے دفتر میں ملنے کی درخواست کرو۔ اپنے دفتر میں ملو گے تو پولیس والوں کے روز روز آنے کے باعث تمہارے لیے مشکلات پیش آسکتی ہیں۔" اس نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ لگتا تھا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ اس جنجال سے نکلنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت میں بہت پریشان تھا۔ اسٹیفنی کی وجہ سے مجھے ہمت ملی۔ میں اس کے مشورے کو مناسب سمجھ رہا تھا۔

"کیا میں مورلیوز سے بات کر سکتا ہوں؟" رات کے دس بجے تھے جب میں نے اس کا نمبر ملایا۔ اس نے وزیٹنگ کارڈ پر اپنے ہاتھ سے موبائل فون کا نمبر بھی لکھ دیا تھا۔

"جی ہاں۔ میں بول رہی ہوں۔"

"میں نوواک کیسلر بول رہا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کو ممکنہ حد تک پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

"کہیے... کیسے فون کیا؟" اس نے پوچھا۔

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہتر ہے کہ یہ ملاقات میرے آفس میں نہ ہو۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب... مجھے تم سے یہی امید تھی۔ کہو کب مل سکتے ہو؟"

"کل صبح دس بجے یا اس کے بعد۔"

"میرے کارڈ پر دفتر کا پتا بھی لکھا ہوا ہے۔ کل صبح دس بجے میں تمہارا انتظار کروں گی۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے تو کل صبح ملتے ہیں... بائے۔" فون بند کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے ذہن پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

اسٹیفنی میرے برابر میں کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "بس! سب کچھ سچ سچ کہہ دو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر بستر کی طرف بڑھنے لگی۔

"میں نے بھی سب کچھ سچ سچ بتانے کا تہیہ کیا ہے۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ یہ اور بات تھی کہ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ صرف اتنا ہی سچ کہوں گا جتنا جاننا پولیس کے لیے ضروری ہے۔ اس وقت ایک بار پھر میری نگاہوں میں نورین برکر کا معصوم چہرہ ابھر آیا۔ میرے دل سے ہُوک نکلی۔ اس وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ جب میں نے اُس دن اسے لفٹ دینے کے بعد ڈھکے چھپے لفظوں میں ساتھ رہنے اور شادی کر لینے کا عندیہ دیا تھا تو اس نے کچھ عرصہ انتظار کرنے کا کیوں کہا تھا۔ حالانکہ اس کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید ایسا کرنا اس کے لیے خوشی کا سبب ہوگا۔

"کھڑے کیوں ہو؟ لائٹ بند کر کے بستر پر آجاؤ۔" اسٹیفنی نے کہا تو میں چونک گیا۔ وہ بستر پر لیٹ چکی تھی اور میں اب تک کھڑا ہوا تھا۔ "اب سوچنا بند کرو۔ کل سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں... بس ذرا یونہی۔" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "اس معاملے نے تو آج مجھے بہت ہی پریشان کیا ہے۔" اگلے ہی لمحے میں لائٹ بند کر کے بستر پر لیٹ چکا تھا۔

☆☆☆

"آپ نے بہت درست فیصلہ کیا ہے۔" دوسرے دن میں مورلیوز کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میری آمادگی کا سن کر اس نے مسکرا کر کہا۔ سارجنٹ آرتھر بھی وہاں موجود تھا۔ کمرے میں ہم صرف تین افراد تھے اور دروازہ بند تھا۔ مورلیوز اس بات سے خوش تھی کہ میں نے نورین کے کیس میں پولیس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ "میں گواہوں کو تحفظ دینے کا پروگرام بھی دیکھتی ہوں۔ اگر آپ نے ہماری مدد کی اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس سے آپ کی زندگی کو آج یا مستقبل میں کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو آپ کے تحفظ کا انتظام بھی ہوجائے گا۔" اس نے میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تسلی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ شاید آپ کو ایسا کرنا پڑے گا۔" میں نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ "صرف میں ہی نہیں، میری گرل فرینڈ اسٹیفنی کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ویسے بھی ہم بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔"

"اس بات کی فکر نہ کریں۔" مورلیوز نے میری تشویش کو بھانپ لیا۔ "شاید آپ کو علم نہیں کہ یہ صرف حادثہ نہیں، یہ ایک نہایت سنگین کیس کا صرف ایک باب ہے جس کو پورا کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم اس کیس میں نہایت اہم موڑ پر پہنچ چکے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ مجھے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ نورین کے پیچھے آخر ایسا کون سا معاملہ ہے جس کا وہ صرف ایک باب تھی۔

"وقت آنے پر آپ سب کچھ جان جائیں گے۔" سارجنٹ آرتھر نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ "فی الحال تو آپ وہ کہیے جس کے لیے یہاں آئے ہیں۔" وہ سیدھے کام کی بات پر آ گیا۔

"بات یہ ہے کہ میں اور ایڈی بچپن کے دوست ہیں۔" میں نے انہیں وہ بتانا شروع کیا جو وہ سننے کے منتظر تھے۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ جارج ہیری مین دراصل پال ہے۔" میری بات ختم ہونے کے بعد وہ کافی دیر تک خاموش رہ کر کچھ سوچتی رہی اور پھر اس نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔" میں نے تائید کی۔

"بڑی حیرت کی بات ہے۔" سارجنٹ آرتھر نے لقمہ دیا۔ "بڑی اطلاع ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم درست خطوط پر کام کر رہے تھے۔" اس نے مورلیوز کو معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے تمہیں یہ پختہ یقین ہے کہ جارج ہیری مین ہی وہ پال ہے جو تمہیں ساتھ لے کر یتیم خانے سے فرار ہوا تھا اور پھر تم لوگ ڈیٹرائٹ میں منشیات پہنچانے کا کام کرتے رہے؟" مورلیوز نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اس بات کی تصدیق چاہی۔

"دراصل ہمارا سرغنہ تو وہی تھا۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے بات شروع کی۔ "ایڈی تو اس کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ جہاں تک میں ایڈی کو جانتا ہوں، وہ بے خوف اور بہادر ضرور ہے لیکن اس کا دماغ اتنا نہیں کہ وہ منشیات کا نیٹ ورک چلا سکے، وہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر۔ ویسے بھی ایک روز ایڈی نے ہی مجھے یہ بات بتائی تھی کہ پال..." یہ کہہ کر میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رُک گیا۔ "معاف کیجیے... میں غلط کہہ گیا، دراصل جارج ہیری مین امریکا کے بڑے حصے میں ہیروئن کی سپلائی کرتا ہے۔ اس کے کارندوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے لیکن اپنی احتیاط پسندی کے باعث ہی وہ اب تک پولیس کی دسترس سے باہر ہے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب نہیں رہے گا۔" میری بات سن کر مورلیوز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک بات اور بتاؤ۔ کیا تم یہ جانتے تھے کہ نورین کا قتل ہونے والا ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "جائے حادثہ پر اس دن میں اتفاق سے پہنچا تھا۔ جب تک میں نے اسے باہر نہیں نکالا، تب تک میں یہ بات نہیں جانتا تھا کہ اُلٹنے والی گاڑی میں نورین ہوگی۔" میں نے آدھا سچ کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ میرا خیال تھا کہ مکمل سچ مجھے پھنسوا بھی سکتا ہے۔

"تمہارے یہاں آنے کے بارے میں اور کون کون جانتا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"سوچ کر بتاؤ۔"

"صرف اسٹیفنی کو معلوم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس وقت وہ کہاں ہے؟" مورلیوز نے پوچھا۔

"گھر پر۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے چکی ہے۔ لیکن یہ بات آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" میں اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔

"مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے۔ تم نے قانون کی مدد کی ہے لیکن کیا کریں، مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری..." میں نے قطع کلامی کی۔

"میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ہم بہت اہم موڑ پر ہیں اور ایسے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ جب تک مجرم گرفتار نہیں ہو جاتے، تم دونوں کو ہماری حفاظتی تحویل میں کسی خفیہ مقام پر رکھا جائے گا۔"

"اور میری نوکری؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔ سب ٹھیک کر لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ سارجنٹ آرتھر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"فی الحال تم یہیں ٹھہرو۔" مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کر مورلیوز نے کہا اور پھر وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

دو گھنٹے کے بعد جب میری آنکھوں پر سے پٹی کھولی گئی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس وقت میں ایک گھر کے اندر تھا۔ "میں کہاں ہوں؟" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اس پولیس والے سے پوچھا جس نے میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھولی تھی۔

"سوری... یہ میں نہیں بتا سکتا۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ کچھ دیر بعد ایک پولیس والا اسٹیفنی کو بھی لے کر آ گیا۔ اس کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" کچھ دیر بعد وہ میرے برابر میں بیٹھی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ اس پر میں نے اسے مورلیوز سے کی گئی ملاقات کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

"اوہ میرے خدا... یہ ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں؟" وہ سادہ مزاج عورت تھی۔ اب جو حالات درپیش تھے، اس سے وہ اور پریشان ہو گئی۔

"فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

گھر کے اندر کھانے پینے اور روزمرہ ضروریات کی تمام اشیا موجود تھیں تاہم ہمیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

اس گھر میں ہمیں دوسرا دن تھا، جب دو پولیس والے اندر آئے۔ انہوں نے ہماری آنکھوں پر ایک بار پھر پٹیاں باندھیں اور دو گھنٹے بعد جب یہ پٹیاں کھولی گئیں تو کمرے میں ہمارے علاوہ مورلیوز اور آرتھر بھی موجود تھے۔

"تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔" مورلیوز میری طرف بڑھی اور مسکرا کر کہا۔ "آؤ..." اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ہم ایک راہداری سے گزر کر ایک کمرے میں پہنچے۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ وہاں صرف ایک میز اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بٹن دبایا تو سامنے کی دیوار پر سے ایک پردہ سمٹتا چلا گیا۔ پردے کے پیچھے شیشے کی دیوار تھی۔ "اس طرف دیکھو۔ یہی ہیں وہ؟" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

میں نے سامنے نظر ڈالی اور ششدر رہ گیا۔ شیشے کے پار ایڈی اور پال موجود تھے۔ وہی پال جو جارج ہیری مین کہلانے لگا تھا۔ "یہ پکڑے گئے؟" میں نے تائید چاہی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ گرفتار ہو چکے ہیں۔

"بس... اب چلو۔" اس نے ایک بار پھر بٹن دبایا۔ شیشے کی دیوار پر پردہ پھیلتا چلا گیا۔ "ہمیں صرف تصدیق چاہیے تھی۔ ویسے ہمیں بڑی حیرت ہے کہ یہ شخص لڑکپن سے ہی اس دھندے میں ملوث ہو چکا تھا۔" وہ پال کی بات کر رہی تھی۔ "ویسے ہمیں اس کے بچپن کا ریکارڈ بھی مل گیا ہے۔ اب یہ بچ نہیں سکتا۔ اگر تم نہ بتاتے تو ہم اس کا اصل نام اور اس کے لڑکپن کے مجرمانہ کردار کے بارے میں کبھی نہیں جان سکتے تھے۔" مورلیوز نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کو مزید چند روز تک ہماری تحویل میں رہنا ہوگا۔ جج کے سامنے بیان دینے اور پال کو پہچان لینے کے بعد تم آزاد ہو۔"

"وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔" میں نے قطع کلامی کی۔ ہم دونوں واپس اس کمرے کی طرف جا رہے تھے جہاں اسٹیفنی موجود تھی۔

"فکر نہ کرو۔ اس کے بعد تمہیں نئے نام سے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔ ویسے اسے منشیات ہی نہیں قتل کے مقدمے کا سامنا بھی ہے۔"

"نورین..." میں نے بے اختیار کہا۔

"ہاں... حادثاتی موت کے پردے میں پال نے ہی اس کو قتل کروایا تھا۔" اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

"کیا مطلب... ایڈی کا کوئی تعلق نہیں تھا اس قتل سے۔"

"تھا... مگر قتل کا حکم پال نے ہی دیا تھا۔"

"مگر کیوں؟"

"جلدی نہ کرو۔ کمرے میں چلو۔ کافی پیتے ہوئے میں سب کچھ بتا دوں گی۔" مورلیوز نے مسکرا کر کہا۔

مورلیوز نے جو کچھ بتایا، اس کا کچھ حصہ تو میں جانتا ہی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کئی سالوں سے پال کا پیچھا کیا جا رہا تھا لیکن وہ ہر بار بچ کر نکل جاتا تھا۔ اسی وجہ سے نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ کی ذہین اور خوب صورت ترین پولیس افسر مارگریٹ کو منتخب کیا گیا جس نے نورین برکر کے روپ میں پہلے پال کے دستِ راست ایڈی کے ریستوران میں ملازمت حاصل کی اور پھر وہ پال سے متعارف ہوئی۔ پال بہت عیاش آدمی ہے۔ خوب صورت اور جوان لڑکی کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آخر اپنے جسم کی قربانی دے کر وہ اس کے بہت قریب ہو گئی۔ چند ماہ کے اندر اندر وہ اس کے تمام راز جان گئی۔

پال اپنے سیاسی کردار کی وجہ سے احتیاط برتتا اور کھلے عام اس سے ملنے سے کتراتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر بار کسی نئی جگہ پر اسے بلواتا تھا۔ جس دن میں نے نورین کو شیڈی کورٹ چھوڑا، اس دن بھی دراصل وہ اس سے ملنے ہی گئی تھی۔ وہ اسے صرف اپنی عیاشی کے لیے مخصوص رکھنا چاہتا تھا لیکن جس دن میں نے اسے شیڈی کورٹ چھوڑا، اس دن اسے یہ شک ہو گیا کہ نورین اسے ڈبل کراس کر رہی ہے۔ وہ ٹی وی رپورٹر کے ساتھ مل کر اسے پھنسوانا چاہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے عشق میں بھی مبتلا ہو گئی ہو۔ بس اسی وجہ سے اس نے اس کا پتا صاف کرنے کا سوچا۔

جس دن مارگریٹ یعنی نورین کو قتل کیا گیا، اس روز اسے پچیس ہزار ڈالرز اور ایک آٹومیٹک رائفل کسی کو پہنچانے کے لیے کہا گیا۔ پتا فرضی تھا۔ پال جانتا تھا کہ وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کی شوقین ہے۔ اسی لیے جب وہ کمرے میں اس کے ساتھ تھی، ایڈی کے آدمیوں نے کار کے اگلے اور پچھلے پہیّوں کے ساتھ دو کم طاقت کے ٹائم بم لگادیے۔ جب یہ بم پھٹے تو تیز رفتار کار بے قابو ہو کر اُلٹ گئی اور وہ ماری گئی۔ فرانزک ٹیسٹ سے بم کا پھٹنا ثابت ہوگیا تھا۔ پال چاہتا تھا کہ وہ پولیس کو اُلجھا دے۔ ایک ویٹریس کی حادثاتی موت اور اس کے پاس سے اتنی بڑی رقم اور آٹومیٹک رائفل کی برآمدگی... کیس واقعی اُلجھ سکتا تھا۔ تاہم وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ مقتولہ خود پولیس والی تھی ورنہ شاید وہ ایسا نہ کرتا۔ دوسرا یہ کہ ہم موقع پر جا پہنچے اور یوں میڈیا میں یہ قتل حادثے کے طور پر مشہور ہوگیا لیکن جو مقتولہ کا مشن تھا، وہ پورا ہوا۔ امریکا کا ایک بہت بڑا منشیات کا اسمگلر نہ صرف بے نقاب ہوا بلکہ اپنے کئی اہم ساتھیوں سمیت گرفتار بھی کرلیا گیا۔

دو دن بعد پال اور ایڈی کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ میرا چہرہ چھپا کر بیان دینے کے لیے سامنے لایا گیا۔ حیرت انگیز طور پر اُن دونوں نے اپنے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ پولیس نے ان کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرلیے تھے۔ اس لیے اقرار کے سوا ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے اس بات پر سخت حیرت تھی کہ ایڈی نے کہیں پر بھی میرا نام نہیں لیا حالانکہ وہ چاہتا تو ایسا کرسکتا تھا۔

عدالت میں بیان دینے کے بعد ہمیں پولیس کی مدد کے عوض نئی شناخت، رہائش، رقم اور ملازمت دی جانی تھی۔ میں اور اسٹیفنی پولیس ہیڈ کوارٹر میں مورلیوز کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ باہر گئی ہوئی تھی۔ ہمیں نیویارک بھجوایا جا رہا تھا۔ ہمیں اس کے آنے کا انتظار تھا۔

”یہ لیجیے... آپ کی نئی شناخت اور جہاز کے ٹکٹ۔“ میں آنکھیں موندے ہوئے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات پر غور کررہا تھا کہ اچانک مورلیوز کی آواز سے میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ ”اس میں وہ سب کچھ ہے جس کا آپ سے وعدہ کیا تھا۔“

”شکریہ۔“ میں نے مسکرا کر بریف کیس تھام لیا۔

”اٹھیے... باہر گاڑی تیار کھڑی ہے، آپ دونوں کو ائرپورٹ تک پہنچانے کے لیے۔“

تھوڑی دیر بعد اسٹیفنی کار میں بیٹھ چکی تھی اور میں دوسری طرف سے کار کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھنے والا تھا کہ اچانک مورلیوز نے پکارا۔ ”ذرا ایک منٹ... اِدھر آیئے۔“

”خیریت؟“ مجھے حیرت تھی کہ اب کیا بات ہوگئی۔

”مارگریٹ تم سے پیار کرنے لگی تھی۔“

”جانتا ہوں۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس سے پیار کا اعتراف کررہا تھا۔

”وہ مجھے رپورٹ کرتی تھی۔ مجھے اس کے پل پل کی خبر تھی۔ وہ تمہارا بہت ذکر کرتی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو آج تم اس کے ساتھ نیویارک جارہے ہوتے۔“ اس نے اسٹیفنی کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”پر یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔“ اس کے لہجے سے افسردگی جھلک رہی تھی۔

”ویسے تم نے ایڈی کی مدد کرکے اچھا نہیں کیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونک گیا۔

”یہ بات چھوڑو۔ یہ بات اب اتنی اہم نہیں رہی ہے۔ تم نے پولیس کی مدد کی۔ یہی تمہارا کفارہ ہے۔“ مورلیوز کے الفاظ سے میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میری نگاہیں اور پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ ”جاؤ... تمہیں دیر ہورہی ہے۔“ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا اور میں اس کی طرف دیکھے بنا کار کی طرف بڑھ گیا۔

حادثے کے وقت جائے وقوعہ پر ہماری موجودگی اتفاقی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور میں ایڈی کی مدد کررہا تھا۔ اس کام کے عوض اس نے مجھے ایک لاکھ ڈالرز دیے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ قتل حادثے کے طور پر مشہور ہوجائے۔

میں یہ سمجھتا تھا کہ پولیس اس بات سے لاعلم ہے۔ اسی لیے میں نے انہیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ البتہ ایک بات میں بھی نہیں جانتا تھا۔ ایڈی نے صرف ایک لڑکی کی بات کی تھی مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے۔ جب میں نے لاش کار سے باہر نکالی تب مجھے یہ جان کر شدید جھٹکا لگا کہ مرنے والی وہ لڑکی تھی جسے شاید میں سچے دل سے چاہنے لگا تھا۔ پال اور ایڈی کو اس انجام تک پہنچانے کی وجہ بھی یہی تھی۔ اگر مرنے والی کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید میں پولیس کی ہرگز مدد نہیں کرتا۔ میں نے مارگریٹ سے تنہائی میں پہلی اور آخری ملاقات کی قیمت اس کے قاتلوں کو گرفتار کروا کر ادا کردی تھی۔

سفر نہ صرف نئی جگہوں کی دریافت کا موجب بنتا ہے... بلکہ مختلف انسانوں کی فطرت... اور نفسیات کے پہلوئوں پر بھی جامع روشنی پڑتی ہے... استاد صاحب نے بھی اس دفعہ تہیہ کرلیا تھا کہ وہ سفر کریں گے... اور ضرور کریں گے...

استاد کی مخصوص و دلفریب زبان میں مزہ دوبالا کرتا دل پذیر قصہ سفرنامہ

نامۂ سفر نامہ

منظر امام

یہ وہ زمانہ تھا جب استاد پر سفر نامہ لکھنے کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ میں نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو مسکرا کر فرمایا۔ ”یہ بر بنائے داخلِ آدمیت سے رہزن ہے۔“

”اب اس کا ترجمہ بھی عنایت فرمادیں تو نوازش ہوگی۔“

”سفر بہ حاتمِ دوراں سے فلک خورشید مارکوپولو ہوتا ہے۔“ استاد نے کہا۔

”خدا کے لیے استاد کچھ آسان کریں ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔“ استاد نے آسان کرنے کے چکر میں ایک اور تقریر کر ڈالی جو پہلے والی سے کہیں زیادہ مشکل تھی۔ بہرحال خدا خدا کرکے یہ سمجھ میں آیا کہ سفر نامہ شہرت کا سبب بنتا ہے۔ اس سے رعب بھی پڑتا ہے کہ فلاں آدمی نے اتنے ملکوں کی سیر کی ہے۔

”یہ تو ٹھیک ہے استاد لیکن سفرنامے کے لیے سفر بھی شرط ہے اور آپ تو کبھی اپنے محلے سے باہر ہی نہیں گئے پھر سفرنامہ کس طرح کا لکھیں گے۔“

استاد معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ ”برخوردار چشمِ حیرت کو اِس جا بہ رسید کرکے داش آب و رنگ کردیا ہے میں نے کیونکہ سفر خطر ہے۔“

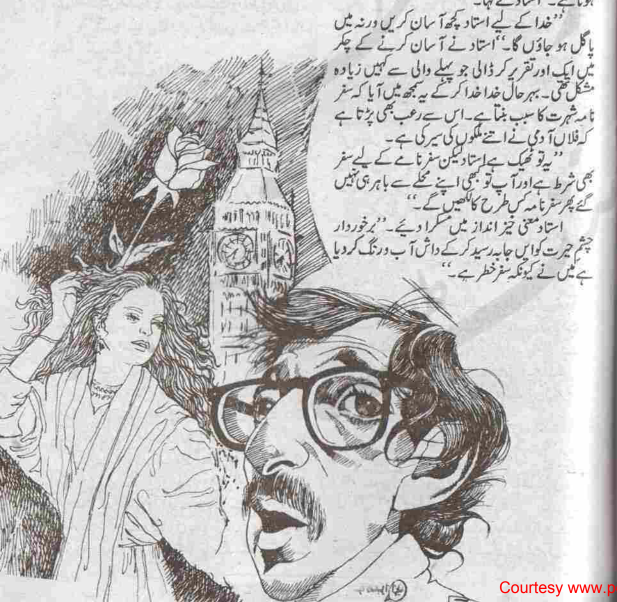

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن سوال پھر وہی ہے۔"

"جامِ افراسیاب میں قلقلِ مینا کے پچھلے پانچ برسوں سے فروتنی کر رہا ہوں۔" استاد نے فرمایا۔ "ماحضر تناول کرتے کرتے بہ یک گوش و ہوش ہوتا جا رہا ہوں کہ دلیلِ فرصت کا مدار یہی ہے۔"

پتا نہیں اس دن استاد کس موڈ میں تھے کہ میری ہر بات کا جواب اسی انداز میں دے رہے تھے۔ بہر حال اندازہ ہو گیا کہ استاد سفر کے لیے پچھلے پانچ برسوں سے پیسے جمع کرتے پھر رہے ہیں۔

اس زمانے میں زندگی بہت آسان تھی۔ ویزے اور پاسپورٹ میں اتنی دشواریاں نہیں تھیں۔ مختلف قوموں کو ایک دوسرے پر اعتماد تھا اسی لیے بہ آسانی ویزے مل جاتے بلکہ بہت سے ممالک میں تو ویزوں کا بھی تکلف نہیں تھا۔ بس ائرپورٹ پہنچے اور انٹری مل گئی۔

"چلیں اب یہ بتا دیں کہ کہاں کے سفر کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چشمِ فلک نے انٹارکٹیکا سا آہو بدن جزیرۂ بے سامان نہیں دیکھا ہوگا۔" استاد نے فرمایا۔

"کیا ہو گیا ہے استاد آپ کو۔ انٹارکٹیکا ایک براعظم تھا جو ڈوب چکا ہے۔"

"اچھا......!" استاد نے حیرت ظاہر کی۔ "یہ ماجرائے دل پذیر پچھلے ہفتے تک تو رونما نہیں ہوا تھا۔"

"اس کو ہزاروں سال ہو چکے ہیں استاد پرابلم یہ ہے کہ آپ تک خبریں دیر سے پہنچتی ہیں۔"

استاد انٹارکٹیکا کے ڈوب جانے کی خبر پر بہت دیر تک اسی طرح خاموش رہے تھے جیسے ان کا پورا خاندان اسی پر ہو اور وہ سب ڈوب چکا ہو۔ بہر حال استاد نے کچھ دیر بعد ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر عقدِ ثانی افریقا ہے۔" مطلب یہ تھا کہ پھر دوسرا انتخاب افریقا ہے۔

"استاد آپ افریقا کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ بستی دلیر و مردگاں ہے۔" استاد نے پُرجوش ہو کر کہا۔ "وہاں طاؤس و رباب آخر ہوا کرتے ہیں۔ غزالان بے دھڑک سیر حاصل کرتے ہیں اور جنگل پکارتے ہیں، جانور آہیں بھرتے ہیں اور فطرت غریقِ سحاب و آفتاب ہو جاتی ہے۔" یعنی استاد کو فطری مناظر سے دلچسپی تھی۔ وہ جانوروں کو جنگل میں اچھل کود کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے افریقا کے سفر کا ارادہ کیا تھا۔

"استاد چلیں مان لیا کہ آپ افریقا پہنچ جائیں گے۔ وہاں کی سیر بھی کر لیں گے لیکن سفرنامے کا کیا ہوگا۔ کون سمجھے گا آپ کا سفرنامہ؟"

استاد ہنس پڑے۔ "میاں در زبان اردو بر زبان ریختہ ہوگا۔" استاد نے فرمایا۔

"چلیں جناب، یہ بھی ہو گیا لیکن آپ اکیلے ہی سیر کریں گے؟"

"اکیلا کیوں...... تم بھی تو ہمراہ گوشہ بدست ہو گے۔" استاد نے فرمایا۔ "میں نے اندوختہ کو سوختہ کر رکھا ہے کیونکہ میں واقفِ آگہی ہوں کہ قرابت دارانِ سلسلۂ مفلساں ہو اور بدنیم درشت اطمینان ہو۔" اس بیان میں کام کی بات یہی تھی کہ بقول استاد کے انہوں نے میرے اخراجات بھی جمع کر لیے تھے کیونکہ میں ایک مفلس انسان تھا۔ اسی لیے استاد نے یہ کرم فرمائی کی تھی۔

"اب پروانۂ آمد و رفتِ خوباں کی سوچو۔" استاد نے کہا۔ "کل جمع رخصت اظہار کو سمند پاک کرنا ہے۔" مطلب یہ تھا کہ اب پاسپورٹ کی فکر کرو۔ کل صبح اس مقصد کے لیے روانہ ہونا ہے۔ استاد نے اس بار حیران ہی کر دیا تھا۔ وہ واقعی بہت سنجیدہ ہو رہے تھے۔ نہ جانے افریقا ان کے سر پر کیوں سوار ہو گیا تھا۔

بہر حال تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ہم دونوں کے پاسپورٹ تیار ہو گئے۔ استاد نے اس کے بعد سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کی تیاری بھی بہت عجیب و غریب سی۔

ایک عدد پاندان اور ایک چھ نال کی نقلی بندوق۔ میں نے جب اس کے بارے میں استاد سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔ "میاں سفر پُرخطر اور پُرحشر ہے۔ ہر قدم پر اسفنجِ بلا اور اموات بے جا ہیں۔ دنیا بھر کے جانورِ نا تمام مثلِ مکمل گشت برافروز رہتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بندوق لازم و ملزوم ہے۔"

"لیکن استاد یہ تو نقلی بندوق ہے؟"

"میاں جانوروں کو کیا معلوم کہ یہ نقلی ہے۔"

استاد نے یہ جملہ آسان اردو میں ادا کیا تھا۔ میں استاد کی اس منطق کو سراہے بغیر نہیں رہ سکا۔

اس زمانے میں استاد نے نہ جانے کہاں سے تیس ہزار روپے جمع کر لیے تھے۔ آپ حیران نہ ہوں۔ اس

زمانے کے تیس ہزار بہت ہوا کرتے تھے۔ اتنے پیسوں میں پوری دنیا کی سیر ہو سکتی تھی۔

میں استاد کی باتوں کو اب تک مذاق ہی سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے پاسپورٹ بنوا لینے کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم واقعی افریقا کی سیر کو جا سکتے ہیں اور مقصد بھی کیا تھا ایک عدد سفرنامہ لکھنا۔ خود اندازہ کر لیں استاد کے سفرنامے کی کیا بات ہوتی۔

کئی دن گزر گئے۔ استاد سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ جانے ان کی تیاریاں کس مرحلے میں تھیں۔ بہر حال میں خود ہی استاد کے پاس پہنچ گیا۔ استاد اپنے محل میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ استاد نامہ پڑھنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ استاد محل کسے کہا کرتے تھے۔ ان کی جھونپڑی ان کے لیے محل تھی۔

بہر حال استاد اپنے محل میں نہیں تھے۔ ان کے محلے والوں سے پتا چلا کہ استاد پچھلے تین دن سے غائب ہیں۔

یہ ایک نئی بات تھی۔ ورنہ استاد مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جاتے تھے۔ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ ان کا کوئی دوسرا ٹھکانا بھی نہیں تھا جہاں سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتیں۔

مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ مختصر یہ کہ وہ ٹھیک ایک مہینے کے بعد دکھائی دیے تھے۔ اس دوران میرے سر سے افریقا کا بھوت مکمل طور پر اتر چکا تھا بلکہ استاد پر غصہ آ رہا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی استاد۔ آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں عندلیبان سفر جاہ و حشم ہو گیا تھا۔" استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ آپ کیا کہہ گئے ہیں لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"اب تم ابتدائے سفرنامۂ محبوب عالم کا آغاز شروعات کرو۔" استاد نے فرمایا۔

"کیا مطلب؟"

"میں سیر حاصل، دعا کامل ہو چکا ہوں۔"

"خدا کے لیے آسان کر کے بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا مصیبت ہو گئی تھی؟"

"میرا سفر ختم از مکان بالا ہو گیا ہے۔" استاد نے کہا۔ "میں سیرِ تغافل کر کے واپس کی امید ہو گیا ہوں۔"

جواز

افسر: "تم اس مہینے میں چار چھٹیاں لے چکے ہو۔ ایک مرتبہ تم اپنی بیوی کو ٹرین میں سوار کرنے گئے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ساس کے جنازے میں گئے تھے۔ ایک مرتبہ تمہاری بیٹی کی سالگرہ تھی اور ایک مرتبہ تمہارا لڑکا بیمار ہو گیا تھا، آج پھر چھٹی کی درخواست لے آئے ہو...... یہ کس لیے؟"

ملازم نے کہا۔ "سر آج میری شادی ہے۔"

گپ

ایک گپی اپنے دوست کے گھر گیا اور کہنے لگا۔ "ہمارے شہر میں پاؤ بھر کے جامن ہوتے ہیں۔"

دوست نے کہا۔ "یار ہوتے ہوں گے فی الحال تو آپ ہمارے گھر کے انگور کھائیں اور وہ جا کر اندر سے دو تربوز لے آیا۔"

اب سمجھ میں آیا کہ استاد یہ فرما رہے ہیں کہ وہ سیر کر کے واپس آ چکے ہیں۔ "حد ہو گئی۔ آپ اکیلے اکیلے افریقا کی سیر سے واپس بھی آ گئے؟"

"افریقا نہیں بلکہ دراندمان کھارادر اور میٹھادر۔" استاد نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب، کیا آپ کھارادر اور میٹھادر کی سیر کے لیے گئے تھے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اور اب سفرنامہ کھارادر اور میٹھادر کو ستم ایجاد کرنا ہے۔" استاد نے فرمایا۔

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے استاد۔"

"اب کل صبح سے سراسر کاغذی ہو جاؤ۔" استاد نے کہا۔ "پھر ماجرائے کل بہ عندلیب افشا ہو جائے گا۔" اتنا تو آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کل سے لکھنا شروع کر دوں پھر سارے حالات خود بخود ظاہر ہو جائیں گے۔ مجھ پر جھنجھلاہٹ تو سوار تھی لیکن ساری بات جاننے کے لیے استاد کا حکم ماننا ضروری تھا لہٰذا میں اگلی صبح کاغذ قلم لے کر استاد کے پاس پہنچ گیا۔ استاد نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالائی والی چائے اور بسکٹ کا انتظام کر رکھا تھا۔
‘‘چلو لکھو بہ عنوان سفر کھارادر اور میٹھادر۔’’ استاد نے فرمایا۔ ‘‘یہ دنیا پابہ دوش وجۂ زنجیرِ کلاں ہے۔ گوسفند ہے خور سند ہے۔’’
‘‘خدا کے لیے استاد یہ تو سوچیں آپ کا یہ سفر نامہ کون سمجھے گا۔’’ پھر استاد نے فرمایا کہ وہ یہ سفر نامہ کسی کے سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی تسکین کے لیے لکھوانا چاہتے ہیں۔
‘‘خیر... چلیں بتائیں کیا لکھنا ہے؟’’ میں نے گہری سانس لی۔
‘‘میں مناظر ہائے صہبا میں مبتلا ہوں۔’’ استاد نے بولنا شروع کیا۔ ‘‘دونوں جانب آرامیدۂ حسینانِ کھارادر ہیں کہ آواز ہائے جن کی کرخت اور چال بھونڈی ہے کہ جو خرید رہی ہیں آلو چھولے اور دہی بڑے۔ فکرِ معاش دانہ رسیدہ مبتلائے شاہ عالم ہوتا جا رہا ہے۔ دکانیں گوسفل اور مور چھل ہیں۔’’
‘‘استاد یہ دکانیں گوسفل اور مور چھل کیسے ہو گئیں؟’’ میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے پوچھا۔ اس پر استاد ناراض ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس طرح ٹوک ٹوک کر ان کے خیالات کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہوں۔
‘‘ایک صراطِ مستقیم اس علاقے سے بہ محلہ ٹاور کو جاتا ہے۔’’ استاد نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ‘‘یہاں کے افراد چیدہ شنیدہ بہت ہی نازک انداز ہیں۔ چائے اس کی بہت اچھی تھی پھر نظر آئی ایک دوشیزہ خوب رو پیوندِ اصفہان اور گورِ غریبان ہو رہی تھی۔’’
خدا کی پناہ یہ میرا ہی جگرا تھا کہ میں اس قسم کی تقریر لکھ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ استاد کیا فرما رہے ہیں اور یہ کیسا سفر نامہ ہے۔ بہرحال یہاں تک بات سمجھ آ گئی تھی کہ استاد کو بقول ان کے ایک دوشیزہ دکھائی دے گئی تھی اور استاد نے اس دوشیزہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔
استاد نے اس کے آنسوؤں کی شان میں فرمایا۔ ‘‘وہ آنسو نہیں در فتنی تھے۔ ظلم الابدان تھے، خاک دان تھے ایسا گوہر یکہ دانہ و دلفریب ساکنانِ کوچۂ شیخ اور ملک ہوا کرتا ہے۔’’
مطلب یہ تھا کہ اس دوشیزہ کے آنسو ایسے تھے کہ شیخ اور ملک اپنی جانیں قربان کر دیں۔ (کم از کم میں تو یہی سمجھا تھا) پھر استاد اس دوشیزہ کے پاس پہنچ گئے اور اس سے دریافت کیا۔
‘‘اے چشمک افروز کیا افتادِ دلبراں ہے تیرے ناوک پر۔’’
اس لڑکی یا عورت نے حیران ہو کر استاد کی طرف دیکھا۔ ظاہر ہے استاد کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی ہوگی۔
استاد نے کہا۔ ‘‘مانع ترکِ نظارہ ہے تیری آنکھیں کہ جن میں قطرۂ گوہر شاہی رواں ہے۔’’
‘‘آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں؟’’ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔
اس وقت استاد کو احساس ہوا کہ ان کی زبان کچھ زیادہ ہی جناتی ہو گئی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بات آسان کی۔ ‘‘ان آنسوؤں کا سبب کیا ہے۔ کیا ماجرائے دلِ فگار ہے۔’’ اس لڑکی یا عورت کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ اس نے کہا تو کچھ بھی نہیں بس ایک آہ بھر کر آگے بڑھ گئی۔ اس آہ نے استاد کو بے قرار کر دیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔
استاد کا کہنا تھا۔ ‘‘اس طرح میں واقفِ رموز میٹھادر ہو گیا کہ گلیاں اور چوبارے بہ حشمت کم خواب ہوتے جا رہے تھے۔’’ یعنی اس لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے انہیں میٹھادر کی گلیاں یاد ہوتی چلی گئیں پھر وہ لڑکی ایک خستہ مکان کے پاس پہنچ کر رک گئی اور اس نے استاد سے پوچھا۔ ‘‘اے مردِ نیم افرز۔ تیرا یہ پیچھا بر ہمدردی خاچکائے سگاں ہے کہ میرا سینہ اشکبار اور بے قرار ہو گیا ہے۔’’ سمجھ گئے ہوں گے کہ استاد کیا فرما رہے تھے۔ اس لڑکی نے استاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
‘‘بڑے میاں تمہاری یہ جناتی زبان سمجھ میں نہیں آ رہی ہے لیکن اتنا ضرور احساس ہو رہا ہے کہ تم ہمدرد انسان ہو۔’’
اس پر استاد لہک کر بولے۔ ‘‘میں ماورائے پری پیکر ہوں اولادِ آدم سے نسبت برخواست ہوں میں۔ مجھے اندازۂ تلاطم مت کرا اور ماجرائے دل پذیر کو سرفراز کر۔’’ مختصر یہ کہ وہ عورت استاد کو اپنے گھر میں لے گئی۔ اس گھر میں اس عورت کے چار بچے تھے۔ چھوٹے چھوٹے اور وہ سب بھوکے تھے۔
کہانی کچھ یوں تھی اس عورت کے خاوند کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ دوائیں پیک کرنے والی ایک فیکٹری میں

کام کرتی تھی۔ وہ دکان کے پاس کھڑی ہو کر اس لیے آنسو بہا رہی تھی کہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کھلونے خرید سکے۔ کھلونے تو بہت دور کی بات ہے وہ انہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھلا سکتی تھی۔
اس عورت کی یہ کہانی استاد کے دل کو لگ گئی۔ انہوں نے اس عورت کے ساتھ خود بھی آنسو بہانے شروع کر دیے۔ ‘‘صبر کرو کہ قدرت فرہنگ آمیغیہ ہوتی ہے۔’’ استاد نے کہا۔ ‘‘پیکرِ قلزم کو جان نثار کرو۔’’ بہرحال اس عورت کی سمجھ میں استاد کی بات آئی ہو یا نہ آئی لیکن جب استاد نے اسے دو ہزار روپے نکال کر دیے تو حیرت سے اس کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ‘‘دو ہزار یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ یہ آپ مجھے کیوں دے رہے ہیں؟’’
‘‘طفلانِ خواہش شد کے لیے۔’’ استاد نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔
اس عورت کی آنکھوں میں خوشیوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے اسی وقت کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا اور استاد سرشار وہاں سے واپس آ گئے۔
اس کے بعد استاد نے یہ وتیرہ بنا لیا تھا کہ وہ روزانہ اس کے پاس جانے لگے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس عورت کے لیے اسی علاقے میں ایک چھوٹے سے مکان کا بندوبست کر دیا تھا جس پر استاد کے تیس ہزار روپے خرچ ہو گئے۔
‘‘خدا کی پناہ استاد۔’’ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ‘‘یعنی آپ نے افریقا کے سفر کے لیے جو پیسے جمع کیے تھے وہ اس عورت کو دے دیے؟’’
‘‘ہاں بھائی۔’’ استاد مسکرا دیے۔ سفرِ بخیر تمام شد۔ باری کو دکان میٹھادر کھارادر۔’’
‘‘اس عورت نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے استاد۔’’
استاد نے بے نیازی سے کہا۔ ‘‘تم مقدارِ آنسوؤں کی بے بسی سے واقفِ طالوت نہیں ہو۔’’ یعنی میں لوگوں کی بے بسی اور ان کے آنسوؤں سے ابھی واقف نہیں تھا اور وہ عورت مظلوم تھی۔ استاد یہ سب کہتے رہے اور میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔
میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس عورت کا پول ضرور کھولوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے استاد سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"استاد آپ مجھے بھی اس کے پاس لے چلیں میں بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم ضرور کوئی آسیان خود کلام کرو گے۔" استاد نے کہا۔

"نہیں میں کچھ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صرف اس سے ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر رختِ بے آبرو کرو۔" استاد نے فرمایا۔ "یعنی میرے ساتھ چلو۔"

وہ ایک موٹی کالی سی عورت ثابت ہوئی تھی جس کی آنکھوں سے چالاکی ظاہر ہو رہی تھی۔ استاد نے اس کے لیے جس مکان کا بندوبست کیا تھا وہ سلیقے کا کوارٹر نما مکان تھا۔ استاد نے تو اس کے حسن کی تعریف میں قلابے ملا دیے تھے جب کہ وہ ایک انتہائی بدصورت عورت تھی۔

"استاد کیا یہی ہے وہ...... آپ نے جس کے حسن کی تعریف کی تھی؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"ہاں تم اندرون دل کو غائر کرو۔" استاد نے فرمایا۔ "حسن سطح آب پر رداں نہیں رہتا۔" مطلب یہ کہ میں اس کے دل کو دیکھوں اس کی صورت پر توجہ نہ دوں۔

ظاہر ہے اب استاد سے کیا بحث کر سکتا تھا۔ اسی لیے دانت پیس کر رہ گیا۔ استاد نے بڑے سلیقے سے ---- میرا تعارف کروایا۔ وہ ہماری خاطر تواضع میں بچھی جا رہی تھی۔ اس کی ہر بات سے مکاری اور چالاکی کا اظہار ہو رہا تھا۔

بہرحال اس دن میں صرف اس عورت کو دیکھ کر اور اس سے ملاقات کر کے واپس آ گیا۔ دوسرے دن میں استاد کو بتائے بغیر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ "آج وہ نہیں آئے آپ کے ساتھ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں میں اکیلا آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک بے وقوف آدمی ہیں۔ ان کے سامنے ہم کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔"

"جی!" اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

"دیکھو...... میں بھی اس لائن کا ہوں۔" میں نے کہا۔ "فرق یہ ہے کہ تم عورت ہو اور میں مرد ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"صاف بات یہ ہے کہ استاد بہت دولت مند آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "سیکڑوں ایکڑ زمینیں ہیں ان کے پاس۔ حیدرآباد میں اپنی کئی دکانیں ہیں جن کا ہر مہینے کرایہ آتا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"لیکن انہوں نے تو یہ سب نہیں بتایا۔"

"چالاک آدمی ہے۔ وہ یہ سب کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ تو میں جانتا ہوں دو سال سے اس کے ساتھ ہوں۔ میرے سارے خرچے وہی اٹھاتا ہے۔ ہر مہینے پانچ ہزار وصول کرتا ہوں اس سے۔"

"اچھا۔" اس کی آنکھیں اور بھی چمک اٹھیں۔

"اسی لیے میں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ تم اگر میرا ساتھ دو تو ہم دونوں مل کر اس سے دو تین لاکھ روپے اینٹھ سکتے ہیں۔"

"دو تین لاکھ۔" اس کا جیسے دم ہی نکل گیا۔

"ہاں لیکن آدھا آدھا ہوگا۔ فرض کرو ڈیڑھ لاکھ بھی مل گئے تو تمہارے لیے بہت ہیں ساری زندگی گزار لو گی۔ اپنے مکان کے آگے کوئی دکان کھلوا لینا۔ آرام سے کھاتی رہنا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ فوراً ہی ساتھ دینے تیار ہو گئی۔ "یہ بتاؤ کہ اس سے پیسے کیسے نکلواؤں گی؟"

"میٹھی میٹھی باتیں کر کے۔" میں نے کہا۔ "وہ تمہارے جال میں تو پھنس ہی چکا ہے۔ تھوڑی سی اور محنت کر لو۔ اس پر اپنی محبت نچھاور کر دو۔ ویسے بھی وہ عورت کے پیار کا بھوکا ہے بلکہ ہو سکے تو اس سے شادی کی بات کر لو پھر وہ اپنا سب کچھ تمہارے قدموں پر لا کر ڈھیر کر دے گا۔"

"ڈیڑھ لاکھ کے لیے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"بس تو پھر تیار رہو۔ میں اس بے وقوف کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔"

میں نے استاد کو پکڑا۔ "استاد میں نے کہا تھا نا کہ وہ عورت تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ تمہارے سارے پیسے اس نے اپنی مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر تم سے وصول کر لیے ہیں۔"

"نہیں یہ الزام بے دھڑک ہے۔" استاد نے تردید کی۔ "وہ ایک خوش دامن عورت ہے۔" استاد شاید پاک دامن کہنا چاہتے ہوں گے۔ پھر میں نے استاد کو

اپنی ملاقات کا سارا احوال بتاتے ہوئے کہا۔

"استاد اب تم جاؤ گے نا تو وہ تم سے لگاوٹ کی بات کرے گی اور شادی کا مطالبہ کرے گی کیونکہ میں اسے یہ سکھا کر آیا ہوں۔ آزمانا چاہو تو ابھی چلے جاؤ۔" استاد کچھ دیر کے لیے بجھ کر رہ گئے پھر وہ اس عورت کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"ٹھیک ہے۔ میں درافشاں کر کے آتا ہوں۔ اگر اس ناہنجار نے بہ قیس التفات فرمایا اور عقد ثانی مذکورہ کی پیش قدر افزائی کی تو میں اس کا گریبان حشر تار تار کر دوں گا۔"

"ہاں استاد...... تمہیں یہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ جس نے چاہا تمہیں بے وقوف بنا کر تم سے پیسے اینٹھ لیے۔" استاد اس عورت سے نمٹنے کے لیے چلے گئے۔

ان کی واپسی بہت دیر کے بعد ہوئی تھی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کیا خبر لے کر آتے ہیں۔ استاد واپس آئے تو بہت اداس دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "تمہارا گمان اغلب اشک بار تھا۔ اس نے سمند ناز کو گنجینہ کر دیا۔ اس نے بہ نگاہِ لطف کرم مجھ سے شادی دل افروز کی باتیں کیں۔ جیسا تم نے کہا تھا۔"

مطلب یہ تھا کہ اس عورت نے استاد سے پیار کی باتیں کرنے کے بعد ان سے شادی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ استاد شدید صدمے میں تھے۔ انسان پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ وہ بار بار بولے چلے جا رہے تھے۔ "بس یہی افتاد بے لگام ہے۔ بس یہی تازیانہ ہے۔ میں تو برباد ہو گیا۔ دولت ہائے سخن دوراں سے محروم تمنا ہو گیا۔"

مراد یہ کہ وہ برباد ہو گئے۔ ان کے سارے پیسے دھوکے سے ہتھیا لیے گئے۔ استاد بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ اب وہ اس عورت کو نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے ان کو اور بھی شہ دی۔ "اور کیا استاد! اس دھوکے باز کو مت چھوڑنا پیسے حرام کے نہیں تھے۔ تم چلو میرے ساتھ۔ ہم دونوں مل کر اس کی ایسی کی تیسی کر دیں گے۔ ہو سکا تو پولیس کی مدد بھی لی جائے گی۔"

جس گلی میں استاد کا قیام تھا اس گلی میں راجا نام کا ایک غنڈا رہا کرتا تھا۔ راجا کو استاد سے بہت محبت تھی۔ وہ استاد کے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار تھا۔ استاد نے کئی مواقع پر اس کی بہت مدد کی تھی۔

میں نے اس عورت کے بارے میں راجا کو سب کچھ بتا دیا۔ یہ کہانی سنتے ہی راجا طیش میں آ گیا۔ "اس کی ایسی کی تیسی استاد جیسے آدمی کے ساتھ دھوکا۔ آپ لوگ چلیں۔ میں اس عورت کا سارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہوں۔ گھر سے نکال دوں گا اسے۔ صرف پانچ منٹ لگیں گے۔"

طے یہ پایا کہ اگلی صبح اس عورت کے گھر پر دھاوا بول دیا جائے گا۔ میں، استاد، راجا اور اس کے دو تین بندے اور ہوں گے لیکن دوسری صبح جب یہ پروگرام کے مطابق استاد کے پاس پہنچا تو استاد نے جانے سے انکار کر دیا۔

"نہیں بھائی یہ التزام نامناسب ہوگا۔ وہ شرمندہ دجال اور قتال ہے۔ اوج ثریا ہے، زہرہ بدن اور مادر پسران خورسند ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا بولے چلے جا رہے ہیں؟"

"اس عورت کو مباہلہ مت کرو۔" استاد نے کہا۔ "چہرۂ بے نور پر آتش فشانی شب سمند بے جا ہونا مجھے دختران مشرق سے اچھا نہیں لگے گا۔"

بہت دیر کی تقریر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ استاد میرے اور راجا کے ساتھ اس عورت کا فراڈ پکڑ لیتے لیکن اس وقت اس عورت کے چہرے پر جو شرمندگی ہوتی استاد وہ شرمندگی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اس عورت کو یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ اس عورت نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے بچوں کے لیے کیا ہے اور وہ اس کے بچوں کو بے گھر ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔

خدا کی پناہ۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس بغیر پڑھے لکھے انسان نے دو منٹ میں انسانیت کا سارا فلسفہ سمجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے عقیدت سے استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ "استاد تم بہت بڑے آدمی ہو۔"

"اچھا، اچھا۔" استاد ہنس دیے۔ "آج سے پھر لخت لخت کرنے والا ہوں تاکہ سفر نامۂ افریقا تکمیلِ انتظار کو پہنچ جائے۔"

"زندہ باد استاد۔" میں نے نعرہ لگایا۔ "تمہارا سفر نامہ ضرور مرتب ہوگا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسط 29

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں...... مختلف طبقات میں تقسیم اس نظامِ قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے. پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو. محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے...... نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے. دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے. زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے. بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے...... جرم افسر شاہی ،جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہر یار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلا ممبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہر یار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جکو کا سہارا لیتا ہے اور جکو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو آرمی کسٹڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہر یار ماہ بانو کو چھڑا کر کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ مہاگرو (ورما) کے لوگ ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ لیاقت رانا پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر شہر یار پریشان ہو جاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ادھر شہر یار اپنے قدم بہکنے پر خود کی اور ماریا کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریا کی طنزیہ گفتگو سن کر اس سے شادی کر لیتا ہے۔ اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ آفتاب شہر یار کو فون کر کے اسے را کے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کا بتاتا ہے۔ غلام محمد نامی ایجنٹ پکڑا جاتا ہے۔ شہر یار، مشابرم خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ کشور کی زندگی بچالی جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور میر پور خاص آجاتے ہیں۔ ادھر فریدہ چودھرائن کی سازش کا شکار ہو کر سیڑھیوں سے گر جاتی ہے اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے۔ راحیلہ کو ڈاکٹر طارق ہوٹل میں چھوڑ کر امریکا چلا جاتا ہے۔ راحیلہ واپس اپنے گھر آجاتی ہے۔ اس کی نگرانی پر مامور شہر یار کا آدمی اسے رپورٹ دیتا ہے۔ شہر یار جکو کو فون کر کے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالمنان شہر یار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہر یار مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہر یار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے، تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ چودھری چراغ پا ہو جاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ چھوٹی چودھرائن ناہید کو حویلی کی ذمے داریاں دے دیتا ہے جبکہ بڑی چودھرائن کو تہ خانے میں قید کروا دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی ان کی بات سن لیتی ہے اور زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ وہ بچی کو لے کر نکل رہے ہوتے ہیں کہ راستے میں ہتھیار بردار افراد انہیں دبوچ لیتے ہیں اور بچی کو ان سے لے لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی اور رودو ڈاکو اسلم اور جمرو بھی ہاتھ نہیں آتے۔ شہر یار اس صورت حال پر بہت افسردہ ہوتا ہے۔ ادھر آفتاب شبانہ کو فون کر کے اپنی بچی کے بارے میں دریافت کرتا ہے اور موجودہ صورت حال کا سن کر اسے افسوس ہوتا ہے۔ جکو کی زبانی شہر یار کو پتا چلتا ہے کہ آفتاب پر چودھری کے گرگے دھاوا بول دیتے ہیں تاہم جکو کے آدمی ان کی تمام کوششیں ناکام بنا کر آفتاب کی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ شہر یار اس خبر پر خوش ہوتا ہے۔ ادھر ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر چودھری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور للی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جمرو پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور جمرو کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ للی اس تصادم میں جمرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جمرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر شبانہ آفتاب کی مدد کرنے کے چکر میں پولیس کے ہاتھوں دھر لی جاتی ہے اور اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہے۔ وہ لوگ آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ آفتاب کو شہر یار کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اس کی بچی خیریت سے ہے۔ ماہ بانو اور اسلم پہاڑی سلسلے میں آرام کی غرض سے رک جاتے ہیں۔ رات میں ماہ بانو کسی جانور کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے اور ڈھلوان سے لڑھکتی جاتی ہے۔ تاہم لڑھکتے ہوئے اس کے ہاتھ میں جھاڑی آجاتی ہے اور وہ فی الحال کھائی میں گرنے سے بچ جاتی ہے۔ اسلم کسی نہ کسی طرح ماہ بانو کو بچا کر اوپر لے آتا ہے۔ وہاں ان کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ماہ بانو کو تھوڑا دور ایک مقام پر چھوڑ کر اس کے بہنوئی کے پاس پہنچتا ہے اور اسے شفقت کا حوالہ دے کر اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو کو لینے کے لیے اس مقام پر پہنچتے ہیں تو ماہ بانو کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ اسلم بے قراری سے اسے پکارتے ہوئے ادھر ادھر تلاش کرنے لگتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماہ بانو کو وہاں نہ پاکر اس پر قیامت سی گزر گئی تھی۔ ماہ بانو کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ دنیا کی سب سے قیمتی اور اہم لڑکی تھی جس کے بغیر وہ زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے نہ پاکر اسے یوں لگا تھا جیسے ہوا میں آکسیجن کا تناسب یک دم ہی کم ہونے لگا ہو اور اسی کمی سے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

”پریشان نہ ہو نوجوان! ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟“ اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھ کر حامد راؤ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی لیکن ماہ بانو کا غیاب ایسا معاملہ نہیں تھا کہ کسی کے تسلی دلاسوں سے اس کا اضطراب کم ہو جاتا۔ وہ بے چین سا ہو کر اس کی تلاش میں چل پڑا۔ حامد راؤ اور اس کا بیٹا مقصود بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے دو مختلف سمتوں میں بڑھ گئے۔ اسلم، ماہ بانو کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا اس لیے سب سے پہلے اسے قرب و جوار میں تلاش کرنا ضروری تھا۔ آس پاس دیکھنے پر اگر وہ نہ بھی ملتی تو کچھ نہ کچھ ایسی علامات ضرور نظر آجاتیں جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ اگر وہ خود اپنی مرضی سے کہیں گئی تھی تو لازمی بات ہے کہ وہاں کسی قسم کی گڑبڑ نظر نہیں آتی۔ کسی حادثے کا شکار ہونے کی دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ کوئی اتفاقاً اس طرف نکل آیا اور ایک جوان خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوگئی، دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ کسی آوارہ وحشی جانور کا نشانہ بن گئی ہوگی۔

خیال میں آنے والا ہر امکان اتنا خوف ناک تھا کہ برسوں ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر بے جگری سے زندگی گزارنے والا اسلم بھی اندر سے تھرا کر رہ گیا۔ ڈیرے کی تاریک زندگی میں اس نے عزتیں لٹتی بھی دیکھی تھیں اور بکتی بھی۔ وہ انسانی خون کی ارزانی سے بھی واقف تھا اور انسان کی بلبلے جیسی حیثیت سے بھی۔ اسے معلوم تھا کہ کسی چلتے پھرتے، ہنستے مسکراتے شخص کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہونے میں چند منٹ بھی نہیں لگتے، ہاں پیچھے رہ جانے والے ضرور زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے ماہ بانو نہ ملتی تو وہ خود بھی بے روح مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ اس کی زندگی تھی، سو وہ اپنی زندگی کی تلاش میں دیوانہ وار ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ اس دوڑ دھوپ میں اچانک ہی وہ ایک چٹان کی دوسری طرف گیا تو اس کے حلق سے عجیب لایعنی سی آواز نکل گئی۔ یہ ایک بے حد پریشان شخص کی خوشی کا اظہار تھا۔ ماہ بانو بالکل سامنے ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بلا ارادہ صرف نیند سے مغلوب ہو کر اچانک ہی سو گئی ہے ورنہ دانستہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایک نظر میں یہ سب کچھ جانچ لینے کے بعد اسلم کے وجود میں یک دم ہی غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ابھی اس کو سامنے پاکر جو خوشی محسوس ہوئی تھی، وہ بہت تیزی سے غصے میں تبدیل ہوگئی۔ یہ پریشانی کی انتہا پر پہنچ جانے والے شخص کا ایک فطری ردِعمل تھا ورنہ پتھر سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے ماہ بانو کا مخروطی انگلیوں والا ہاتھ جس طرح اس کے دائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا، اس انداز میں وہ سنگ مرمر سے تراشا ہوا حسین مجسمہ لگ رہی تھی جس پر ایک خاص رخ سے پڑتی سورج کی شعاعیں حسن میں مزید جگمگاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ غصے میں مبتلا اسلم اس حسین منظر سے متاثر ہوئے بغیر آگے بڑھا اور ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگی۔

”تم واپس آگئے۔ مجھے معلوم ہی نہیں چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔“ اسے سامنے پاکر وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔

”تم تو یوں آرام سے سو رہی تھیں جیسے شہزادی صاحبہ اپنے محل میں ہوں۔ ابھی میری جگہ کوئی اور یہاں پہنچ جاتا تو تمہارے ساتھ کیا کچھ ہوسکتا تھا، اس کا تم خود بھی اندازہ لگا سکتی ہو۔ مانا کہ کم عمر ہو لیکن جن حالات سے گزر رہی ہو، وہ انسان کو عقل سکھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اور یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی جگہ سے ہٹیں کیوں؟ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہیں وہاں نہ پاکر میرا کیا حال ہوا؟ قیامت گزر گئی تھی مجھ پر۔ آدمی کسی کی چاہت سے واقف ہو تو کیا اسے ستانا ضروری سمجھتا ہے؟“ وہ غصے میں بولتا چلا گیا۔ ماہ بانو اس کی اپنے لیے چاہت سے بھی واقف تھی اور موجودہ کیفیت کا بھی اندازہ کرسکتی تھی اس لیے اس کے غصے کا ذرا برا نہیں مانا اور نرمی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”سوری اسلم! میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ مجھے یاد تو تھا کہ تم نے اپنی جگہ سے ہٹنے سے منع کیا تھا لیکن مجھے اذان کی آواز سنائی دی تو میں رہ نہیں سکی۔ جہاں تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے، وہاں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں تھی اس لیے میں یہاں آگئی۔ یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس تو کوئی دوپٹا یا چادر ہی نہیں ہے جسے اوڑھ کر میں نماز ادا کرسکوں۔ اپنی اس بے بسی پر مجھے شدید رونا آیا۔ تم سوچو کہ میرے لیے کتنی بدقسمتی کا مقام تھا کہ رب نے پکارا تھا اور میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس پکار کے جواب میں اپنے رب کی بارگاہ میں جانے کی اہل نہیں تھی۔ تھوڑی دیر تک میں اس صورتِ حال پر روتی رہی پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں بے بس اور لاچار ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری نیت بھی جانتا ہے اور میری معذوری کو بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کے ہاں حالات کے تحت بہت سی رعایتیں دینے کا بھی اصول ہے۔ جیسے پانی دستیاب نہ ہونے یا کسی بیماری کی صورت میں تیمم کی اجازت ہے۔ حالتِ خوف میں نمازِ قصر کرنے کی اجازت ہے اسی طرح وہ میرے عذر کو بھی قبول کرلے گا۔ میں نے اپنے دل کی گواہی پر جس حال میں تھی، اسی حال میں نماز قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد میرے دل کو جو سکون ملا، اسے میں تمہارے سامنے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ میں نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور تسبیحات پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے جانے کب اور کیسے اتنی گہری نیند لگی کہ مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا اور اب تمہارے اٹھانے پر جاگی ہوں۔ یقین کرو، میں چند منٹ سے زیادہ نہیں سوئی ہوں گی لیکن اتنا سکون محسوس کررہی ہوں جیسے رات بھر کی نیند لے کر جاگی ہوں۔'' وہ جیسے جیسے اپنی بپتا سناتی گئی، اسلم کے چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔ اس نے پہلی بار ماہ بانو کا چہرہ غور سے دیکھ کر یہ بات نوٹ کی کہ اس کے رخساروں پر اب بھی آنسوؤں کے مٹے مٹے سے نشانات موجود ہیں جن سے اس کے بیان کی تصدیق ہورہی تھی۔

''آئی ایم ویری سوری۔ بس میں بہت زیادہ پریشان ہوگیا تھا اس لیے مجھے غصہ آگیا۔'' اس کی ماہ بانو کے لیے محبت میں کوئی کلام ہی نہیں تھا۔ بس وقتی طور پر غصے سے مغلوب ہوکر اسے چند سخت جملے کہہ بیٹھا تھا جن پر اب شرمندہ بھی ہورہا تھا۔

''تمہیں سوری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا غصہ فطری تھا۔ بہت زیادہ پریشانی میں انسان اس طرح ری ایکٹ کرجاتا ہے۔ تم میرے حالات سے واقف نہیں تھے اس لیے تھوڑا سخت بول گئے۔ فکر مت کرو، میں نے قطعی برا نہیں مانا۔'' وہ ویسے بھی عام طور پر نرمی سے ہی بات کرتی تھی اور اس وقت تو اس کے لہجے کی نرمی بہت ہی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سکون جو اس نے اپنی انوکھی نماز سے حاصل کیا تھا، اس کی آواز اور چہرے کے تاثرات سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ خاص طور پر گفتگو کے اختتام پر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ دوڑی تھی، اس نے تو اس کے چہرے کو بالکل ہی الوہی سا تاثر دے دیا تھا۔ اسلم مبہوت سا اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ اسے اس کیفیت سے مقصود کی آواز نے نکالا۔ وہ اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ اور اس کا باپ حامد راؤ ماہ بانو کی تلاش میں مخالف سمت میں گئے تھے اور شاید ناکام ہونے کے بعد واپس پلٹ آئے تھے۔ مقصود کی آواز سن کر وہ تیزی سے پلٹا۔

''کہو بھائی، تمہیں کامیابی ملی یا نہیں؟ میں اور ابا تو کافی دور تک دیکھ آئے ہیں۔ ابا جی تو اور بھی آگے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ہوسکتا ہے بھائی اسلم کو بھابی جی مل گئی ہوں اور وہ لوگ ہماری راہ دیکھ رہے ہوں اس لیے خوامخواہ اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ پہلے یہاں کا حال معلوم کرلیں۔'' اس سے سامنا ہوتے ہی مقصود نے بولنا شروع کردیا۔

''تم نے اچھا کیا۔ تمہاری بھابی جی مل گئی ہے۔ وہ اس طرف آڑ میں ہوکر بیٹھی ہوئی تھی۔ اتفاق سے آنکھ لگ گئی اسی لیے اسے ہم لوگوں کے آنے کا پتا نہیں چل سکا۔'' اسلم نے اسے اطلاع دی۔ ماہ بانو جان بوجھ کر اس کے ساتھ یہاں تک نہیں آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسلم اس کے لیے زنانہ لباس کا بندوبست کرنے گیا تھا اور اس کی کسی کے ساتھ وہاں آمد کا مطلب تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے اس لیے اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ چست جینز اور ٹی شرٹ میں کسی کے سامنے آئے۔ وہ اپنی جگہ رک کر کپڑوں کا انتظار کررہی تھی اسی لیے اسلم اور مقصود کے درمیان سوال و جواب کی یہ نوبت پیش آئی۔ بہ صورتِ دیگر مقصود خود اسے دیکھ لیتا تو کسی سوال کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

''چلو یہ تو اچھی خبر ہے۔ تم بھابی جی کو یہ جوڑا پہنچاؤ، تب تک میں ابا جی کو دیکھتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ ہی واپس پلٹے تھے لیکن یہاں تک سیدھے آنے کے بجائے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگئے اس لیے یہاں نظر نہیں آرہے۔'' اسلم کے ہاتھ میں اپنی بیوی کے لباس والا تھیلا تھما کر مقصود وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اسلم بھی اس طرف پلٹ گیا جہاں ماہ بانو موجود تھی۔ اسے تھیلا تھمانے کے بعد وہ خود اسی پہلے والی جگہ پر آکر مقصود اور حامد راؤ کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد وہ دونوں وہاں آتے نظر آئے۔ اسی وقت ماہ بانو بھی لباس تبدیل کرکے وہاں پہنچ گئی۔ مقصود کی بیوی انیلا کا لباس لمبائی کے اعتبار سے اسے بالکل ٹھیک آیا تھا البتہ چوڑائی زیادہ ہونے کی وجہ سے قمیص ڈھیلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہورہی تھی جس سے یہ بھی ثابت تھا کہ انیلا قدوقامت میں تقریباً ماہ بانو کے برابر ہی ہے لیکن اس کا جسم ذرا فربہ ہے۔

ماہ بانو نے لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ انیلا کی چادر بھی اوڑھ لی تھی۔ میرون رنگ کی رنگ برنگے دھاگوں سے کڑھی وہ چادر جس میں جابجا ننھے ننھے شیشے بھی ایک خاص ترتیب سے لگے ہوئے تھے، اس پر خوب جچ رہی تھی۔ اسلم نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ اگر مغربی لباس میں ماہ بانو کا حسن آنچ دے رہا تھا تو اس بڑی سی چادر کے ہالے نے اسے جو تقدس عطا کیا تھا، اس سے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ اس کا مغربی انداز اگر اسے شعلہ جوالہ بنا گیا تھا تو خالص مشرقی پن نے چاندنی کی سی ٹھنڈک اور سنہری پن عطا کردیا تھا۔

''السلام علیکم چاچا جی!'' حامد راؤ کو دیکھ کر وہ فوراً آگے بڑھی اور اسے سلام کرنے کے ساتھ ہی اس کے سامنے سر بھی جھکا دیا۔

''جیتی رہ دھی رانی!'' حامد راؤ نے فوراً ہی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی پھر مزید بولا۔ ''آج سے تو بھی میری دھی ہی ہے۔ میں نے تجھے اپنی بہو کی چادر صرف اوڑھنے کے لیے نہیں دی ہے بلکہ اس چادر کو اوڑھتے ہی تو بھی میری ذمّے داری ہوگئی ہے۔ زندگی میں جب بھی کوئی ضرورت پڑے اپنے چاچے کو آواز دے کر دیکھ لینا۔ ہاتھ پیروں سے سلامت ہوتے میں کبھی تیری مدد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

''شکریہ چاچا جی! آپ نے مجھے اپنا سمجھ کر بڑا مان دیا۔'' ماہ بانو کی آواز بھرّا گئی۔

''جھلی نہ ہو تو۔۔۔ ایک طرف مجھے چاچا جی بھی کہتی ہے اور پھر غیروں کی طرح شکریہ بھی ادا کرتی ہے۔ دھی کے منہ سے شکریے کا لفظ سننا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ الٹا تکلیف ہوتی ہے۔'' حامد راؤ نے اسے محبت سے جھڑکا جس پر وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گئی۔

''میرے خیال میں اب گھر چلتے ہیں ابا جی! باقی باتیں آپ لوگ وہاں پہنچ کر کرلیجیے گا۔'' مقصود نے انہیں ٹوک کر وقت کی نزاکت کا احساس دلایا تو ان کا مختصر سا قافلہ چل پڑا۔ وہاں سے روانہ ہوتے ہی ماہ بانو نے چادر کا پلو اس طرح منہ پر ڈال لیا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ پہاڑی سلسلے سے نکل کر گاؤں کے آباد حصے تک انہوں نے خاموشی سے سفر طے کیا۔ وہ گاؤں کی حدود میں پہنچے تو توقع کے مطابق وہاں معمول کی چہل پہل شروع ہوچکی تھی اور لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ کئی نظریں ان کی طرف بھی اٹھیں۔ ان نظروں میں حیرت و تجسس تھا۔ آخر ایک موڑ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

''کی حال ہے راؤ صاحب! سویرے سویرے کدھر سے آرہے ہو؟'' اس شخص نے ماہ بانو اور اسلم کے بارے میں براہِ راست سوال کرنے کے بجائے حامد راؤ سے بے تکلفانہ انداز میں خیریت دریافت کی البتہ اس کی نظریں مسلسل اپنے پنڈ میں نظر آنے والی دو اجنبی شکلوں کا طواف کررہی تھیں۔

''سب خیر ہے شریف صاحب! شہر سے یہ پروہنے آئے ہوئے تھے۔ انہیں پہاڑ دیکھنے کا شوق چڑھا تو میں اور پتر مقصود منہ اندھیرے انہیں ادھر لے گئے۔ انہیں سیر کرا کر ادھر ہی سے آرہے ہیں۔''

حامد راؤ نے ایک ایسا معقول جواب دیا جسے سن کر شریف کے نام سے مخاطب کیے جانے والے شخص کے پاس مزید سوال جواب کی گنجائش نہیں رہی ورنہ یقینی طور پر اسلم کا حلیہ جو ڈیرے سے فرار ہونے کے بعد پہاڑی سلسلے میں بھٹکتے رہنے کی وجہ سے بہت زیادہ خراب ہوگیا تھا، اس کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کررہا ہوگا۔ لیکن مہمان کے بارے میں اس قسم کا استفسار اس کی بے عزتی تصور کیا جاتا اس لیے اس نے تجسس کے باوجود کچھ پوچھنے سے گریز کیا اور ایک خوش دلانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اسلم کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تسی راؤ صاحب دے پروہنے ہو تو سمجھو سارے پنڈ دے پروہنے ہو۔ جی بھر کر ادھر کی سیریں کرو۔ کھاؤ پیو۔ میں راؤ صاحب نال درخواست کروں گا کہ اپنے پروہنوں نال ایک وقت کی روٹی میرے گھر پر بھی کھائیں۔'' اسلم جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر بس مسکراتا رہا۔ اس بندے سے حامد راؤ کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں، اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی دعوت کو قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کرسکتا۔ ویسے بھی وہ یہاں دعوتیں کھانے نہیں آیا تھا۔ یہ تو بس ایک اتفاق ہی تھا کہ قسمت اسے ٹاہلی والا لے آئی تھی اور یہاں کچھ مہربان میزبان میسر آگئے تھے لیکن وہ ان میزبانوں سے زیادہ خاطر مدارات کروانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اسے جلد از جلد یہاں سے نکل کر کسی دوسرے محفوظ مقام کی طرف جانا تھا جہاں وہ ماہ بانو کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرسکے۔

''مہلت ملی تو آپ کی دعوت ضرور قبول کریں گے شریف صاحب! ابھی آپ اجازت دیں۔ گھر پر ناشتا تیار ہو گا اور ہمارا انتظار ہو رہا ہو گا۔'' حامد راؤ نے بہت خوب صورتی سے اس کی دعوت ٹالنے کے ساتھ ساتھ فوری طور پر جان بھی چھڑانے کا بندوبست کیا۔ وہ یہ جان کر کہ ابھی ان لوگوں کو ناشتا کرنا ہے، فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

''یہ بندہ پیر سائیں کے عقیدت مندوں میں سے ایک ہے۔ اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی ہوتی کہ تم ایک ایسے شخص کی طرف سے بھیجے گئے ہو جو پیر سائیں کی خانقاہ میں آگ لگانے کا ذمّے دار ہے تو اس کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔'' شریف کی روانگی کے بعد ان لوگوں نے قدم آگے بڑھائے تو مقصود نے سرگوشی میں اسلم کو بتایا۔

''دیکھنے میں تو یہ خاصا معقول آدمی لگتا ہے پھر پیر سائیں جیسے جعلساز کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟'' اسلم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ان جعلی پیروں فقیروں کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ یہ اپنے داؤ پیچ سے معقول سے معقول آدمی کی عقل بھی ماؤف کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور پھر شریف صاحب کا ہی کیا ذکر، یہاں تو کبھی کسی نے پیر سائیں کو غلط آدمی نہیں سمجھا۔ خانقاہ کو آگ لگائے جانے کے واقعے پر تقریباً پورا پنڈ ہی سخت مشتعل ہے۔ سب ہی چاہتے ہیں کہ مجرم کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ خانقاہ کے جلنے کے بعد ہر ایک نے پیر سائیں کو اپنے گھر قیام کی دعوت دی تھی لیکن قسمت شریف صاحب کی جاگی۔ اب پیر سائیں انہی کے گھر پر رہ رہے ہیں اور یہ خانقاہ کی تعمیر و مرمت کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ کل اباجی کے پاس بھی آئے تھے اور دس ہزار کا چندہ وصول کر کے گئے ہیں۔'' مقصود نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ دیگر معلومات بھی فراہم کیں جنہیں سن کر اسے خیال آیا کہ شفقت راؤ کی ساری دوڑ دھوپ بیکار گئی۔ اس نے پیر سائیں کا قلع قمع کرنے کی نیت سے خانقاہ میں آگ لگائی تھی لیکن پیر سائیں زندہ تھا اور اس کی خانقاہ بھی دوبارہ تعمیر کی جانے والی تھی۔ ان خیالات میں کھو کے باقی کا راستہ بھی طے ہو گیا اور وہ حامد راؤ کے مکان پر پہنچ گئے۔ گھر کی فضا میں چکراتی پراٹھوں کی خوشبو نے انہیں بتایا کہ حامد راؤ نے ناشتے کی تیاری کے سلسلے میں شریف سے غلط بیانی نہیں کی تھی، وہاں واقعی ان کے ناشتے کا بندوبست ہو رہا تھا۔

''تم لوگ نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کر لو تو پھر ناشتا لگواتے ہیں۔'' حامد راؤ نے پہلے اس سے کہا اور پھر فوراً ہی مقصود کی طرف رخ کر لیا۔

''بہن کو اندر زنان خانے میں پہنچا دو پُتر۔۔۔ اور اسلم کے لیے اپنا کوئی جوڑا لے آؤ۔ تم دونوں کا ناپ الگ ہے لیکن اپنے کپڑے دھل کر سوکھنے تک اسلم کے لیے تمہارے کپڑوں پر گزارا کرنا مجبوری ہے۔'' مقصود نے باپ کے حکم پر فرماں برداری سے عمل کیا۔ ماہ بانو کو اندر زنان خانے میں پہنچا دیا گیا جبکہ اسلم کی مقصود نے شلوار قمیص پر مشتمل لباس سمیت ایک غسل خانے کی طرف راہنمائی کر دی۔ وہ دیہات میں موجود ایک گھر کا غسل خانہ تھا لیکن مکینوں کی خوش حالی اور شہر آمدورفت کی وجہ سے کسی شہری غسل خانے جیسی جدت لیے ہوئے تھا۔ اسلم کو بہت عرصے بعد اس قسم کی کسی جگہ پر غسل کرنے کی عیاشی میسر آئی تھی چنانچہ اس نے دل بھر کر غسل کیا۔

غسل کرنے سے اس کی آدھی تھکن کافور ہو گئی اور جسم ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ ایک فرحت بخش احساس کے ساتھ اس نے مقصود کا فراہم کردہ شلوار قمیص زیب تن کیا اور اپنے کپڑے وہیں ایک کھونٹی پر ٹنگے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کپڑوں کی تبدیلی کے ساتھ اس نے اپنے لباس میں موجود سامان بھی منتقل کر لیا تھا جس میں سب سے اہم اس کا پسٹل اور پنڈلی پر بندھا رہنے والا خنجر تھا۔ اگرچہ اپنے طور پر وہ مجرمانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ایک شریفانہ زندگی گزارنے جا رہا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ اس جیسے لوگوں کے لیے شریفانہ زندگی کا آغاز اتنا آسان ثابت نہیں ہوتا بلکہ قدم قدم پر مشکلوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے وہ مسلح رہنا ضروری سمجھتا تھا اس لیے اب تک مسلسل اپنے اسلحے کی حفاظت کا خیال رکھتا رہا تھا۔ ایک رائفل بھی ان کی تحویل میں تھی جسے وہ پہلی بار اکیلے حامد راؤ کے گھر کی طرف آتے ہوئے ماہ بانو کے پاس چھوڑ کر آیا تھا اور بعد میں ماہ بانو اسے اپنی بڑی سی چادر میں چھپا کر یہاں لے آئی تھی۔ وہ رائفل اب بھی ماہ بانو کے پاس موجود تھی۔

اس نے غسل خانے سے قدم باہر رکھا تو مقصود کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے اپنی معیت میں لے کر ایک بار پھر اس بیٹھک میں پہنچ گیا جہاں منہ اندھیرے پہنچنے پر اسے بٹھایا گیا تھا۔ وہاں میز پر ناشتے کے لوازمات چنے ہوئے تھے اور ان سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو صبر کا پیمانہ لبریز کر رہی تھی۔ اس نے باقاعدہ اپنے منہ میں پانی آتا ہوا محسوس کیا اور دل ہی دل میں ہنس دیا۔ مشکل سے چند گھنٹے ہی گزرے تھے جب اسی بیٹھک میں اس کے سامنے کھانے پینے کے لوازمات رکھے گئے تھے لیکن اس نے کسی شے کو چھونا تو درکنار نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت اسے اپنی ہر ضرورت سے بڑھ کر ماہ بانو کی فکر دامن گیر تھی۔ بیٹھک میں پہلے سے موجود حامد راؤ نے اسے دیکھ کر کھانا شروع کرنے کی دعوت دی تو اس بار وہ بلاتکلف کھانے پینے میں مصروف ہو گیا اور ایک ایک شے سے انصاف کرنے لگا۔ شہری اور دیہاتی امتزاج کا یہ ناشتا بے حد لذیذ تھا اور اسے اس لیے اور بھی زیادہ مزے کا لگا کہ وہ ایک طویل عرصے بعد کسی گھر کی فضا میں بیٹھ کر کھانے پینے کا شغل کر رہا تھا۔ شکم سیر ہو کر اس نے کھانے کی چیزوں سے ہاتھ کھینچا تو مقصود نے تھرماس سے گرماگرم چائے کا بڑا سا کپ لبالب بھر کر اسے تھما دیا۔ پیٹ بھرا ہوا ہونے کے باوجود وہ اس بھاپ اڑاتی، خوشبودار چائے کے کپ کے لیے ہاتھ بڑھنے سے نہ روک سکا۔ مقصود نے خود اپنے لیے بھی اسی طرح کا ایک کپ تیار کیا تھا البتہ حامد راؤ اس شغل میں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ وہ کافی سنجیدہ اور متفکر نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ کچھ چپ چپ سے ہیں؟'' اس نے چائے کا ایک گھونٹ اندر اتار کر ان سے دریافت کیا۔

''حالات ہی کچھ اس طرح سے سامنے آئے ہیں کہ دل و دماغ الجھ کر رہ گئے ہیں۔ تم نے مجھے شفقت کے بارے میں جو کچھ بتایا، اسے سن کر بھی یقین کرنے کا دل نہیں چاہ رہا لیکن یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ بس میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شفقت نے خانقاہ میں آگ لگا کر شدید حماقت اور جذباتیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم دونوں بھائی بھی ہیں، سمدھی بھی اور سب سے بڑھ کر بچپن کے دوست بھی۔ اگر اسے کسی طرح سن گن مل گئی تھی کہ صداقت کی موت کا تانابانا خانقاہ سے جڑا ہوا ہے اور پیر سائیں اس کا مجرم ہے تو اسے کسی بھی اقدام سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن مشورہ کرنا تو درکنار اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔'' حقائق سامنے آنے کے بعد سے اب تک کا وقت مصروفیت میں گزرا تھا اس لیے حامد راؤ کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا، اب موقع ملتے ہی اس نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے شکوے اور رنجیدگی کا اظہار کر دیا۔

''ممکن ہے کہ وہ اس معاملے میں آپ کو ملوث کر کے آپ لوگوں کو کسی مشکل میں نہ ڈالنا چاہتے ہوں پھر ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بھی تو سوچیے۔ جس شخص کا اکلوتا ہونہار بیٹا اس سے چھن گیا ہو، اس کے غم و غصے کی تو کوئی انتہا ہی نہ رہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے غصے میں انہیں آپ کی مدد لینے کا خیال ہی نہ آیا ہو۔۔۔ یا آیا ہو تو وہ یہ سوچ کر آپ سے ذکر کرنے سے گریزاں رہے ہوں کہ آپ انہیں ایسا کچھ کرنے سے روکنے کی کوشش کریں گے جبکہ وہ اپنے طور پر مجرم کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔'' اس نے حامد راؤ کی تسلی و تشفی کے لیے حالات کا ہر رخ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''لیکن افسوس تو یہی ہے کہ اس کی کارروائی کے نتیجے میں اصل مجرموں کا بال بھی بیکا نہیں ہوا اور کسی دوسرے پنڈ سے علاج کے لیے آیا ہوا ایک معذور شخص آگ میں جھلس کر مر گیا۔'' حامد راؤ کی افسردگی سے دی ہوئی یہ اطلاع سن کر خود اسے بھی دھچکا لگا۔

''وہ کیسے؟ شفقت صاحب کا تو یہی کہنا تھا کہ رات کے وقت خانقاہ پر پیر سائیں اور اس کے چیلوں چانٹوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔''

''اس نے درست کہا تھا لیکن اتفاق سے جو آدمی آگ میں جھلس کر مر گیا، اس کے یہاں موجود رشتے داروں نے اس کے ساتھ آئی ہوئی اس کی ماں کو تو اپنے گھر پر ٹھہرا لیا تھا لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے اسے رکھنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس آدمی کی ماں کی درخواست پر پیر سائیں نے اسے خانقاہ میں رکنے کی خصوصی اجازت دی تھی۔'' حامد راؤ نے بتایا۔

''اس واقعے میں پیر سائیں اور اس کے چیلوں کو کچھ نہیں ہوا؟'' اسلم نے دریافت کیا۔

''نہیں، وہ سب بہ خیریت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اصل میں آگ لگتے ہی ایک مجاور کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے شور مچایا تو سب جاگ گئے اور بہ حفاظت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے اس معذور آدمی کا افراتفری میں کسی کو خیال ہی نہیں آیا اور ظاہر ہے وہ بے چارہ خود تو وہاں سے نکلنے کا اہل نہیں تھا اس لیے اندر ہی پھنسے رہنے کی وجہ سے جھلس کر مر گیا۔'' حامد راؤ نے افسردگی سے بتایا۔ یقیناً وہ اس خیال سے رنجیدہ تھا کہ اس کے جگری دوست کے ہاتھوں ایک بے بس آدمی موت کا شکار ہو گیا اور اس نے جنہیں جہنم واصل کرنے کے لیے یہ سارا کھڑاگ کیا تھا وہ اب بھی دندناتے پھر رہے تھے۔

''آگ لگنے کے واقعے کے بعد پولیس نے اس معاملے کی تفتیش تو کی ہو گی۔ کیا انہیں خانقاہ کی جلی ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمارت کا جائزہ لینے کے دوران وہاں ایسی کوئی علامت نہیں ملی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ وہاں منشیات کا دھندا بھی کیا جاتا ہے؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' حامد راؤ نے شانے اچکائے۔ ''علاقے کا تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے اور اکثر خانقاہ میں حاضری دیتا رہتا ہے۔ اب معلوم نہیں یہ سچ مچ کی عقیدت مندی ہے یا وہ زبان بندی کے لیے پیر سائیں سے بھتا وصول کرتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پولیس کی تفتیش شروع ہونے سے قبل خود پیر سائیں کے آدمی خانقاہ میں داخل ہو گئے ہوں اور انہوں نے سارے شواہد مٹا ڈالے ہوں۔ فی الحال تو صورتِ حال یہ ہے کہ پیر سائیں اور اس کے مریدوں کے ساتھ پورے پنڈ کی ہمدردیاں موجود ہیں اور وہ دل و جان سے اس شخص کو سزا دینے کے خواہش مند ہیں جس نے ان کے خیال میں یہ گھناؤنی حرکت کی۔ حقیقت نہ تو کوئی جانتا ہے اور نہ ہی سننا پسند کرے گا۔ شفقت سے بے پناہ قربت اور انسیت کے باوجود میں خود اس کے اقدام کی مذمت کرتا ہوں۔ اسے چاہیے تھا کہ اس معاملے کو پولیس کے سامنے رکھتا اور پھر وہ لوگ قانون کے مطابق جو بھی کارروائی کرتے، وہ سب کے حق میں بہتر ہوتی۔'' حامد راؤ نے اس کے سوال کے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''لیکن ابھی آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے۔ شفقت صاحب بھی یہ بات جانتے ہوں گے اس لیے انہوں نے تھانے کا رخ ہی نہیں کیا۔'' اسلم نے فوراً اپنی رائے پیش کرتے ہوئے شفقت راؤ کی حمایت کی۔

''شاید یہی بات ہو لیکن میری اب یہی رائے ہے کہ شفقت کو انساتوں سمیت خانقاہ جلانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' حامد راؤ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا اور اس پوائنٹ پر مزید بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ گفتگو میں دخل دیے بغیر سب کچھ چپ چاپ سنتے مقصود کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے بولا۔

''دیکھ پتر! ابھی تک کوئی جھوٹے برتن اٹھانے کے لیے نہیں آیا۔ کہیں تیری ماں اور انیلا مہمان کو بھول تو نہیں گئے؟''

''جی اچھا ابا جی۔'' مقصود فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سعادت مندی قابلِ تعریف تھی۔ جوان اور شادی شدہ مرد ہوتے ہوئے بھی وہ باپ کے ساتھ کچھ اس طرح سے پیش آتا تھا کہ اس پر کسی نمک خوار ملازم کا گمان ہوتا تھا۔ باپ کا حکم ملنے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازے کے پٹ کھل گئے اور ایک دبلی پتلی، درمیانی قامت کی قبول صورت عورت اندر داخل ہوئی۔

''مجھے انیلا بی بی نے برتن لانے کے لیے بھیجا ہے۔''

اس نے مقصود کو بتایا تو وہ اس کا راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ عورت نے اندر آتے ہی تیزی سے برتن سمیٹنا شروع کر دیے۔ اس کام کو نمٹا کر جب اس نے چائے کا خالی کپ اسلم کے سامنے سے اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ عورت کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور وہ کچھ عجلت کا شکار نظر آتی ہے۔ فوری طور پر اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ وہ حامد راؤ کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میرے خیال میں اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ لمبی نیند لے کر اٹھو گے تو ساری تھکن اتر جائے گی۔'' حامد راؤ اس سے کہہ رہا تھا اور وہ اس کی رائے سے سو فیصد متفق تھا۔ طویل بھاگ دوڑ کے بعد میسر آنے والے غسل اور بھرپور ناشتے نے طبیعت پر گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے آمادہ پا کر مقصود اسے اپنے ہمراہ بیٹھک سے باہر لے گیا اور ایک آرام دہ کمرے تک پہنچا دیا۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ پڑا ہوا تھا جس پر خوب صورت پرنٹ والی صاف ستھری بیڈ شیٹ بچھی ہوئی تھی۔

''یہاں تم دل بھر کر بغیر ڈسٹرب ہوئے آرام کر سکتے ہو۔ پانی اور ضرورت کی دیگر چھوٹی موٹی چیزیں یہاں موجود ہیں۔ مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بھی مجھے بتا سکتے ہو۔'' اسے کمرا دکھا کر مقصود نے فراخ دلانہ پیشکش کی۔

''اس وقت تو نیند کے علاوہ کسی شے کی طلب نہیں۔''

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو مقصود بھی خوش دلی سے مسکرا دیا اور مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی اسلم نے بستر سنبھال لیا۔ نرم تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندتے ہی نیند نے اس کے دماغ پر یلغار کر دی۔ لیکن نیند کے ہاتھوں بے بس ہوتے ہوئے بھی اس کے ذہن کا ایک گوشہ اضطراب کا شکار تھا۔ کوئی بات ایسی تھی جو مسلسل اس کے دماغ میں کھٹک رہی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے اس احساس کا تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا چنانچہ منٹوں میں گہری نیند میں ڈوب کر اپنے اردگرد سے غافل ہو گیا۔

☆☆☆

''ہاں بھئی مشابرم خان! کل جو بندہ تم پیرآ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرلائے تھے اس نے اپنے اور اپنے پیر کے بارے میں کچھ اگلا یا نہیں؟'' دفتر پہنچ کر چند ضروری نوعیت کے کام نمٹاتے ہوئے اس نے مشابرم خان کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔

''بہت ڈھیٹ بندہ ہے سر! بڑی مار کھانے کے بعد اب تک صرف اپنا نام بتایا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا ہے لیکن اپنے علاقے یا پیر کا اتا پتا دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں نے بھی ضرورت سے زیادہ سختی اس لیے نہیں کی کہ آگے اگر آپ بندہ پولیس کے حوالے کرنا چاہو تو اس کے جسم پر ٹارچر کے نشان دیکھ کر مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔'' مشابرم خان نے جواب دیا۔

''ہوں۔۔۔'' شہر یار نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا۔ وہ مشابرم خان کی احتیاط پسندی کو سمجھتا تھا۔ بالے کی بیوی شہزادی اسپتال میں زیرِعلاج تھی اور اس کا کیس پولیس کے علم میں تھا۔ اصولاً تو اسے چاہیے تھا کہ پیر آباد سے پکڑے جانے والے بندے کو پولیس والوں کے حوالے کر کے خود بری الذمہ ہو جاتا لیکن اسے اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بہت ہی خاص معاملہ ہے جسے پولیس کی سرسری تفتیش کی نذر کر کے اطمینان سے نہیں بیٹھا جا سکتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ پولیس کو بھی اس معاملے میں شامل کر لیتا لیکن فی الحال یہ چاہتا تھا کہ خود بھی لاعلم نہ رہے کیونکہ اس کے باعلم ہونے کی صورت میں پولیس اپنی روایات کے مطابق کاہلی کا مظاہرہ کرنے یا مک مکا کی پالیسی پر عمل کرنے سے گریز کرتی۔ بہ صورتِ دیگر کوئی بہت ہی گھناؤنا دھندا جاری و ساری رہ سکتا تھا۔

''نام کیا بتایا ہے اس نے اپنا؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دریافت کیا۔

''کالے میاں نام بتاتا ہے اپنا۔ اس کے پاس سے ایک موبائل فون اور بٹوا ملا ہے۔ بٹوے میں صرف رقم ہے۔ شناختی کارڈ وغیرہ موجود نہیں ہے جس سے اس کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔''

''کل سے اب تک اس کے موبائل فون پر کوئی کال وصول ہوئی ہے یا نہیں؟'' کالے میاں کے پاس موبائل کی موجودگی کا سن کر وہ چونکا اور پوچھا۔

''نہیں، کوئی کال نہیں آئی اور اب تو اس کے موبائل کی بیٹری بھی ڈاؤن ہو گئی ہے۔ اگر کوئی کال کر بھی رہا ہوگا تو اسے کامیابی نہیں ہو رہی ہوگی۔'' مشابرم خان نے بتایا۔

''تم اس کے موبائل کی بیٹری چارج کرواؤ پھر آدھے گھنٹے بعد مجھ سے آ کر ملو۔ میں خود تمہارے ساتھ کالے میاں کی مزاج پرسی کے لیے چلوں گا۔'' اس نے حکم دیا جسے سن کر مشابرم خان فوراً ہی واپس پلٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی شہر یار نے بھی اپنی توجہ زیرِمطالعہ فائل کی طرف مبذول کر لی۔ اس کے لیے اس فائل کا فوری مطالعہ کرنا ضروری نہیں تھا اور وہ تھوڑا سا انتظار بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موبائل کی بیٹری چارج ہونے کے بعد اس پر کوئی نہ کوئی کال ضرور موصول ہوگی۔۔۔ کیونکہ اس کے پاس موبائل کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اسے جن لوگوں نے بھیجا ہے، وہ خود بھی اس سہولت سے لیس ہوں گے اور اپنے آدمی کی بروقت واپسی نہ ہونے پر تشویش میں مبتلا ہو کر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اپنے اس قیاس کی بنیاد پر وہ موبائل فون کے کارآمد ہونے کا منتظر تھا۔ آدھے گھنٹے کا وہ دورانیہ تیزی سے ختم ہو گیا اور مشابرم خان حسبِ ہدایت اس کے پاس آ موجود ہوا۔

''چلو چل کر اس سورما کو دیکھتے ہیں۔'' وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''کالے میاں کا موبائل کہاں ہے؟'' دفتر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''میرے پاس ہے سر۔'' مشابرم خان نے اپنی بائیں جانب کی جیب تھپتھپائی تو اس نے اظہارِ اطمینان کے لیے اپنا سر ہلا دیا۔ دفتر کی عمارت سے نکل کر وہ دونوں گاڑی میں سوار ہوئے اور مشابرم خان نے تین چار منٹ میں ہی اسے اس مکان تک پہنچا دیا جس میں قیدی کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا خالی مکان تھا جسے محکمے کے ملازمین کو الاٹ کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے سیوریج کی گڑبڑ اور بجلی کی خراب وائرنگ کی وجہ سے فی الحال یہ مکان کسی کے زیرِاستعمال نہیں تھا اور ان دونوں مسائل کے حل تک اسے خالی ہی رہنا تھا اس لیے اس نے پکڑے جانے والے شخص کو اس مکان میں رکھنے کی ہدایت دی تھی۔

مکان کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد مشابرم خان پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور شہر یار کے اترنے کے لیے عقبی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھولا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد دروازہ بند کر کے وہ مکان کی طرف دوڑا اور اس پر لگے تالے کو چابی کی مدد سے کھول دیا۔ اس کی یہ پھرتی اور چابک دستی قابلِ رشک تھی۔ غیر معمولی حالات ہونے کے باوجود وہ ڈیوٹی کو نہیں بھولا تھا ورنہ شہر یار سے اس کی جتنی ذہنی ہم آہنگی ہو چکی تھی اور وہ اس کا جس قدر ہم راز بن چکا تھا، وہ ان کے درمیان تکلف کی دیواریں گرانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن مشابرم خان خود ایک اصول پرست اور کھرا آدمی تھا جس نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اور افسر کو افسر ہی سمجھتا تھا۔ مکان کا دروازہ کھلنے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ مختصر سے دھول اڑاتے برآمدے کے بعد ایک دروازہ اور تھا جس پر بھی تالا لگا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے وہ تالا بھی کھول دیا اور اسے اپنی معیت میں ایک کمرے تک لے گیا۔ اس کمرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں چھت سے ذرا نیچے موجود ایک چھوٹے سے روشن دان کے سوا کوئی کھڑکی وغیرہ موجود نہیں تھی اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دینے کے بعد باہر نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے دیکھا کہ مشابرم خان نے کالے میاں کے ہاتھ پیر رسی کی مدد سے نہایت مضبوطی سے باندھ رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی بھی باندھ دی گئی تھی۔ یہ سارا بندوبست یقیناً اس لیے تھا کہ کہیں وہ شور مچا کر لوگوں کو اس طرف متوجہ نہ کر لے۔ مکان کے آبادی میں ہونے کی وجہ سے یہ ساری احتیاطی تدابیر ضروری بھی تھیں۔ شہر یار نے دیکھا کہ کمرے میں بیٹری سے چلنے والا ایک ٹیپ ریکارڈر بھی موجود ہے۔ دھول مٹی سے اٹے اس کمرے میں چمکتے دمکتے ٹیپ ریکارڈر کی موجودگی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس نے استفسار طلب نظروں سے مشابرم خان کو دیکھا۔

''اس سے پوچھ گچھ کرتے وقت ہم نے یہ ٹیپ ریکارڈر بلند آواز سے چلا دیا تھا تاکہ اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں باہر نہ جائیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور خالی گھر میں بلند آواز سے چلنے والے گانوں پر کسی کو کوئی تشویش نہیں ہوئی؟'' اس نے مشابرم خان کو گھورا۔

''ہوئی تھی۔ مجھ سے ایک آدمی نے پوچھا بھی تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں یہ مکان اپنے نام پر الاٹ کروانے والا ہوں اس لیے یہاں کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اب اے سی صاحب کو بھی اپنے ساتھ یہاں لاؤں گا تاکہ وہ اس جگہ کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور مرمت وغیرہ کا انتظام کروائیں۔'' اس نے فخر سے بتایا اور داد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''گڈ! یہ تم نے اچھا بہانہ بنایا۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی خفیہ ٹھکانا موجود نہیں ہے جسے ہم اس قسم کی کسی صورتِ حال میں استعمال کر سکیں۔ میں عبدالمنان سے کہوں گا کہ ایسی کوئی جگہ تلاش کرے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ہمیں اب اس طرح کے کسی ٹھکانے کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ قانون کی پاسداری اور احترام دل میں رکھنے کے باوجود مجھے شدت سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ جس طرح قانون کے محافظ مجرموں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں، میرے لیے مکمل طور پر قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرنا ممکن نہیں ہے۔'' وہ خاصا بے بس اور جھنجلایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بیوروکریسی کی الجھنوں سے واقف ہونے کے باوجود جب وہ خود اس میدان میں داخل ہوا تھا تو اس کے ذہن میں کچھ اس طرح کے خیالات تھے کہ وہ خود کو ہر طرح سے ایک ایمان دار، امن پسند اور قانون کی حدود میں رہنے والا افسر ثابت کرے گا لیکن مختصر سے عرصے میں اس نے اپنے خیالات کو بکھرتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں جس قدر گندگی پھیلی ہوئی ہے، اسے صاف کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میلے کیے بغیر کام چلنا ممکن نہیں ہے۔ بس اسے اگر کوئی اطمینان تھا تو یہ کہ وہ اپنے ہاتھ گندگی کو صاف کرنے کے لیے میلے کر رہا تھا، اس کا اس گندگی میں اضافہ کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔'' خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے خاموش کھڑے مشابرم خان کو حکم دیا تو اس نے بے ہوش کالے میاں کے دائیں رخسار پر ایک زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔ تھپڑ کھاتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ یقیناً گہری بے ہوشی میں نہیں تھا اس لیے آنکھ کھلتے ہی اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے لگا جس کا اندازہ اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت سے لگایا جا سکتا تھا۔

''کہو کالے میاں! تم اپنی زبان کھولنے کے لیے تیار ہو یا ہمیں اسے کھلوانے کا کچھ انتظام کرنا پڑے گا؟'' شہر یار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا جس کے جواب میں اس نے یوں گردن کو جھٹکا دے کر رخ موڑا جیسے اگر بس میں ہوتا تو اس دھمکی آمیز سوال کے جواب میں اس کے منہ پر تھوک دیتا۔

''اوکے۔۔۔ جیسا تم پسند کرو۔ میرے پاس ایسی بہت سی ترکیبیں ہیں جن کے استعمال سے تمہارے جسم پر ایک خراش تک نہیں آئے گی لیکن تم خود کو سچ بولنے پر مجبور پاؤ گے۔'' اس نے اپنے لہجے میں سفا کی سموتے ہوئے کہا اور پھر مشابرم خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''گاڑی کی ڈکی میں ایک آئرن راڈ اور رسی کا گچھا پڑا ہے، وہ یہاں لے آؤ۔'' اس نے حکم دیا تو مشابرم خان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دونوں مطلوبہ چیزیں موجود تھیں۔

''ذرا مجھے اس کا موبائل فون تو دینا۔'' کسی قسم کی کارروائی شروع کرنے سے قبل اسے کالے میاں کا موبائل یاد آیا تو وہ مشابرم خان سے بولا۔ اس نے فوراً ہی بائیں جیب سے موبائل نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی فون بک چیک کرنے لگا۔ فون بک میں چند ایک ہی نمبر موجود تھے جو مختلف ناموں سے فیڈ کیے گئے تھے اور ان میں ایک نام پیر سائیں کا بھی تھا۔ اس نے پہلے اس نمبر پر کال کرنے کا سوچا پھر ارادہ بدل کر ان کمنگ اور آؤٹ گوئنگ کالز کا ریکارڈ چیک کرنے لگا۔ کالے میاں کے موبائل پر آخری کال واجد کی آئی تھی اور اس کال کو آئے ہوئے بھی تقریباً بیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ خود اس نے چند گھنٹوں کے فرق سے آخری نمبر واجد کا ہی ملایا تھا لیکن ریکارڈ سے ظاہر تھا کہ اس کی واجد سے بات نہیں ہو سکی۔

یہ صورتِ حال ذرا معنی خیز تھی اور یوں لگتا تھا کہ واجد نامی وہ شخص کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے پیر سائیں سے پہلے اسے ہی ٹٹولنے کا فیصلہ کیا اور نمبر ری ڈائل کر دیا لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف خاموشی تھی اور سرے سے بیل ہی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دو بار مزید کوشش کی لیکن صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے پیر سائیں کا نمبر ڈائل کیا۔ ادھر بھی بالکل ویسی ہی صورتِ حال تھی۔ اسے شدید الجھن محسوس ہوئی۔ نہ جانے یہ کیا راز تھا کہ کسی سے رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو چھوڑ کر ''کاکا'' کے نام سے محفوظ کیا گیا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔ ریسیو کرنے والی کوئی عورت تھی جس نے شاید اپنی فون اسکرین پر آنے والا نام دیکھ کر براہِ راست ہی بے تکلفی سے گفتگو شروع کر دی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''ہاں کاکے دے پیو، سب چنگا ہے نا؟ خیر نال ڈیوٹی پر پہنچ گئے ہو؟'' عورت کے جملوں سے ظاہر تھا کہ وہ کالے میاں کی بیوی ہے اور اس نے بیوی کا نمبر اپنے بیٹے کے حوالے سے محفوظ کر رکھا ہے۔

''معاف کیجیے گا خاتون میں آپ کا خاوند نہیں ہوں۔'' اس نے یہ بات کہتے ہوئے سامنے موجود کالے میاں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا اٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ عملی طور پر اس کی کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا اہل نہیں تھا لیکن سب دیکھ اور سن سکتا تھا۔ شہر یار کو اپنی بیوی سے بات کرتا دیکھ کر اس کے چہرے پر تھوڑا سا اضطراب ظاہر ہوا تھا تاہم اس نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''فیر تسی کون بول رہے ہو؟'' عورت کی آواز میں حیرانی اتر آئی۔

''میں آپ کے لیے اجنبی ہوں اور آپ کو آپ کے خاوند کے متعلق ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے بہت نپے تلے انداز میں گفتگو کو آگے بڑھایا تھا اور جان بوجھ کر کالے میاں کا نام استعمال نہیں کیا تھا کہ مبادا اس کے سامنے بندشوں میں جکڑے شخص نے غلط بیانی سے کام لیا ہو اور اس کا نام کالے میاں نہ ہو۔

''کیہڑی اطلاع جی؟'' عورت واضح طور پر پریشان محسوس ہونے لگی۔

''مجھے افسوس ہے کہ اطلاع زیادہ اچھی نہیں ہے۔ یہاں نور کوٹ میں آپ کے خاوند کو ایک حادثہ پیش آ گیا ہے اور وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہیں۔''

''ہائے میرے ربا۔۔۔'' عورت نے پریشانی سے یہ کہتے ہوئے شاید اپنے سینے پر ہاتھ بھی رکھا ہوگا۔ ''پر وہ نور کوٹ کیسے پہنچ گئے؟ وہ تو چھٹی گزار کر اپنے سیٹھ کے پاس لاہور گئے تھے۔'' عورت کے وہ جملے خاصے غور طلب تھے۔ اس کی بات سے یہ ظاہر تھا کہ کالے میاں مستقل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نہیں رہتا چنانچہ اس بات کا بھی امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ پیر سائیں کا تعلق اس علاقے سے ہو جہاں اس کی بیوی موجود تھی کیونکہ وہ جس مقصد کے لیے پیر آباد آیا تھا، اس کی تکمیل کے بعد اسے واپس اپنے پیر صاحب کے پاس لوٹنا تھا اور اس کی بیوی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی اور جگہ نوکری کرنے کی وجہ سے گھر سے کافی کافی دنوں تک دور رہتا ہے۔

''دیکھیے خاتون، مجھے آپ کے سوالوں کے جواب نہیں معلوم۔ مجھے آپ کو جو اطلاع دینی تھی، وہ میں دے چکا ہوں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کو نور کوٹ پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا تاکہ آپ خود اپنے خاوند کی دیکھ بھال کر سکیں؟'' اس نے جان بوجھ کر ذرا بے رخی برتی۔

''میں ادھر فیصل آباد میں ہوں۔ ادھر سے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ ابھی تو میرے پیو ہور بھرا ابھی گھر میں نہیں ہیں۔ میں ان کی دکان پر فون کر کے انہیں گھر بلاتی ہوں، فیر آپ کو فون کرتی ہوں۔ مجھے خود تو نور کوٹ کے بارے میں کچھ ملوم نہیں ہے، آپ میرے بھرا کو اتا پتا سمجھا دینا کہ کالے میاں کس اسپتال میں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصر جواب دے کر سلسلہ منقطع کرنے کے ساتھ ہی فون بھی آف کر دیا۔ وہ دوبارہ کالے میاں کی بیوی یا اس کے بھائی سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا البتہ اس کی بیوی سے بات کرنے سے کالے میاں کے نام کی تصدیق ہو گئی تھی لیکن یہ بہرحال ظاہر نہیں ہو سکا تھا کہ کالے میاں کا پیر سائیں کہاں پایا جاتا ہے۔ اس گفتگو میں دو مقامات کے نام سامنے آئے تھے، ایک فیصل آباد اور دوسرا لاہور۔ فیصل آباد کو وہ اپنے اندازوں کی بنیاد پر پہلے ہی رد کر چکا تھا اور لاہور کے بارے میں بھی شک و شبہے کا شکار تھا کیونکہ شہزادی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ساس بالے کو علاج کے لیے اپنے کسی عزیز کے گاؤں لے گئی ہے۔ شہزادی کے بچے بھی وہ ساتھ لے گئی تھی چنانچہ یہ امر ذرا مشکل ہی نظر آتا تھا کہ ایک اکیلی عورت نے ایک معذور آدمی اور بچوں سمیت لاہور تک کا سفر کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ پھر بات تھی بھی کسی گاؤں جانے کی، اس لیے لاہور والی بات ذرا مشکل ہی تھی۔

''ہاں بھئی مشابرم خان! ایسا کرو کہ اپنے کالے میاں کے دونوں پیر رسی سے باندھ کر انہیں پنکھے کے ساتھ الٹا لٹکا دو۔ اس کے بعد میں تمہیں سکھاؤں گا کہ اس نے اپنے پیٹ میں جو باتیں چھپا رکھی ہیں وہ کیسے باہر نکلتی ہیں۔'' سارا حساب کتاب جوڑ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر مشابرم خان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی طرف سے اشارہ ملتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گیا اور چند منٹوں میں ہی کالے میاں پنکھے کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا نظر آنے لگا۔ اکیلے شخص کے لیے یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن مشابرم خان نے اسے اپنی زبردست جسمانی طاقت اور تکنیک کی بنیاد پر ممکن کر دکھایا تھا۔

''اب اس راڈ پر کپڑا لپیٹ لو اور اتنی قوت سے اس کے جسم پر ضربیں لگاؤ کہ اندر کے سارے اعضا ہل کر رہ جائیں۔'' ایک طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے مشابرم خان کو دوسری ہدایت دی اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر یوں اطمینان سے کھڑا ہو گیا جیسے کوئی دلچسپ تماشا شروع ہونے والا ہو۔ مشابرم خان نے اس کی دوسری ہدایت پر بھی من و عن عمل کیا اور آئرن راڈ پر کپڑا لپیٹ کر کالے میاں کے جسم کو نشانہ بنانے لگا۔ اس نے شہر یار کی ہدایت کو پوری طرح سمجھ لیا تھا چنانچہ بہت نپی تلی ضربات لگا رہا تھا۔ راڈ پر کپڑے کی تہ ہونے کی وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کالے میاں کے جسم پر کوئی زخم تو کجا خراش بھی آ سکے البتہ اندرونی طور پر اس کا حشر ہو جانا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ کام شروع ہو چکا ہے۔ وہ سخت اذیت میں محسوس ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ناک سے خون کی لکیر بہتی ہوئی نظر آئی۔ شہر یار نے اشارہ کر کے مشابرم خان کو مزید ضربات لگانے سے روکا اور کالے میاں کی طرف متوجہ ہوا۔

''پھر کیا خیال ہے؟ تم ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے لیے راضی ہو یا ابھی اندر کچھ دم خم باقی ہے اور میں اسے بھی نکلوانے کا بندوبست کر دوں؟'' اس کا لہجہ بے پناہ سرد تھا۔ مشابرم خان کو یاد نہیں تھا کہ اس نے اس سے قبل شہر یار کو کبھی ایسے خوفناک موڈ میں دیکھا ہو۔ لیکن شہر یار خود جانتا تھا کہ اس پر ایسا جنون ایک بار اس وقت بھی طاری ہوا تھا جب اس کی کراچی کے ایک فلیٹ میں را کے ایجنٹ ورما سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ورما کی زبان کھلوانے کے لیے غیر انسانی تشدد کا سہارا لیا تھا اور یہ اس لیے تھا کہ وہ ورما جیسے شخص کو جو ملک دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ بے شمار بے گناہوں کی زندگی ختم اور برباد کرنے کا ذمّے دار تھا اسی طرح کے سلوک کا حق دار سمجھتا تھا۔ اب کالے میاں کے ساتھ وہ اتنی سختی برت رہا تھا تو وہ بھی اس لیے کہ وہ ایک ایسے جعلی پیر کا چیلا تھا جس کا کردار شہزادی والے کیس سے ہی کافی حد تک کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ ایک طرف اس کی وجہ سے شہزادی اپنے بچوں سے دور ہوئی تھی تو دوسری طرف ایک معصوم بچے کی لاش کی بے حرمتی کے ارتکاب پر مجبور ہو گئی تھی۔ جس مردود آدمی نے بالے کے علاج کے لیے مردہ بچے کی ہڈیوں کا مطالبہ کیا تھا، وہ جانے اپنے مریدوں اور چیلوں سے کون کون سے گھناؤنے کام کرواتا ہوگا۔ کوئی دین دار اور نیک آدمی تو ہرگز بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً شیطان کا کوئی چیلا تھا جس نے پیر کے بہروپ میں اپنا شیطانی دھندا جاری رکھا ہوا تھا۔ وہ اس شیطان تک پہنچ کر اس کی بیخ کنی کرنا ضروری سمجھتا تھا ورنہ معلوم نہیں وہ شخص کتنوں کی دین و دنیا برباد کر ڈالتا۔

کالے میاں کی حالت کافی تباہ ہو گئی تھی۔ اس کے استفسار پر اس نے تیزی سے سر کو جنبش دیتے ہوئے اپنی رضامندی کا عندیہ دیا۔

''اس کے منہ سے کپڑا نکال دو۔'' اس نے مشابرم خان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل کیا۔ کپڑا نکلتے ہی کالے میاں کے منہ سے خون کا فوارہ سا نکلا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اسے نیچے اتارو۔'' اس نے فوراً ہی تیز آواز میں مشابرم خان کو حکم دیا۔ مشابرم خان کی لگائی گئی ضربیں اس کے اندازے سے زیادہ خوفناک ثابت ہوئی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ کالے میاں کے پھیپھڑے بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ کالے میاں کو پنکھے سے اتار کر فرش پر لٹایا گیا تو وہ خود بھی مشابرم خان کے ساتھ اس کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ ذرا دیر میں وہ اسے سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کی ناک اور منہ سے بہنے والا خون بند ہو گیا۔ اندرونی زخموں سے زیادہ خون کا وہ اخراج شاید الٹا لٹکے رہنے کی وجہ سے تھا جس پر انہوں نے قابو پالیا تھا اور اب کالے میاں کسی بے جان جسم کی طرح فرش پر پڑا ہولے ہولے ہانپ رہا تھا۔

''ہاں بھئی۔ اب بولنا شروع ہو جاؤ ورنہ یہ بات تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ اگر ایک بار پھر الٹے لٹکا دیے گئے تو تمہارا انجام کیا ہوگا۔ تم خون اگل اگل کر یہیں مر جاؤ گے اور باہر کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔ تمہارا پیر بھی ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جائے گا کہ اس کا چیلا کہاں گیا۔'' اس کے لہجے میں سفاکی نمایاں تھی جسے محسوس کر کے نڈھال کالے میاں کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ خاموش رہ کر وہ اپنی جان پر مزید تشدد سہنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر سکے گا چنانچہ زبان کھولنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کمزور سی آواز میں بولا۔

''میں تم لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔'' اس کی اس فرمائش پر شہریار نے زبان سے کچھ نہیں کہا البتہ مشابرم خان کو آنکھ سے اشارہ کر دیا۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے مشابرم خان نے کالے میاں کے منہ سے پانی کی بوتل لگا دی۔ پانی پی کر اس کی حالت میں کافی بہتری آ گئی اور وہ مشابرم خان کی مدد سے ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

''اب بتاؤ کہ تمہارا پیر سائیں کون ہے؟ کہاں رہتا ہے اور تم اس کے لیے کیا کام کرتے ہو؟'' اس کو جواب دینے کی پوزیشن میں پا کر شہریار نے پہلے سے کئی گنا زیادہ سخت لہجے میں سوال کیا۔

''پیر سائیں کا نام عبدالحق ہے لیکن کوئی بھی ان کا نام لینے کی جرأت نہیں کرتا اور سب انہیں پیر سائیں ہی کہتے ہیں۔ ان کی خانقاہ ٹاہلی والا پنڈ میں ہے۔ میں بھی وہیں رہتا ہوں ہور خانقاہ کا کام کاج دیکھتا ہوں یا فیر اگر پیر سائیں بھی کسی کام سے کہیں بھیج دیں تو وہاں چلا جاتا ہوں۔ ادھر پیر آباد بھی پیر سائیں کے کہنے پر ہی آیا تھا۔ ادھر خانقاہ پر ایک مریض بالا علاج کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس کے علاج کے لیے کسی چیز کی لوڑ تھی ہور بالے کی ماں کا کہنا تھا کہ وہ چیز اس کی نوں کے پاس سے ملے گی۔ میں ادھر وہی لینے آیا تھا۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے اپنا بیان دیا۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود کو اس بات سے لاعلم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے کے لیے آیا تھا۔

''بالے کی بیوی سے تمہیں کیا چیز لے جانی تھی؟'' شہریار بھی اسے بخشنے کو تیار نہیں تھا۔

''مینوں خبر نہیں جی۔'' اس نے نظریں کچھ اور بھی جھکاتے ہوئے پست لہجے میں جواب دیا۔

''سچ بول ورنہ دوبارہ الٹا لٹکا دوں گا۔'' مشابرم خان کا ہتھوڑے جیسا ہاتھ پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑا جس کے نتیجے میں اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور دہانے سے ایک بار پھر خون خارج ہونے لگا۔ اس بار کالے میاں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے فوراً ہی اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیوں کی وصولی کے لیے آیا تھا۔

''ان ہڈیوں سے تمہارا پیر سائیں کس طرح بالے کا علاج کرتا؟'' شہریار نے اس سے پوچھا۔

''ملوم نہیں جی۔ پیر سائیں وڈا پہنچا ہوا آدمی ہے۔ اس کے پاس وڈا علم ہے۔ جب وہ اپنے خاص حجرے میں ہوتا ہے تو وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہیں وہ اپنا عمل کرتا ہے۔ ہم سب نے دیکھا ہے کہ اس عمل کے بعد وہ جس کسی کو بھی دوا تیار کر کے دیتا ہے، وہ چنگا بھلا ہو جاتا ہے۔'' کالے میاں کے لہجے میں اعتقاد تھا۔ یقیناً اس نے خانقاہ پر اپنے قیام کے عرصے میں اس طرح کے کئی کرشمے دیکھے ہوں گے جبھی وہ پیر سائیں کا معتقد تھا۔ لیکن خود شہریار کو شک ہو رہا تھا کہ عبدالحق نامی وہ پیر حق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہوگا اور اس کے پاس جو بھی کرشمے موجود تھے، وہ کسی سفلی علم کی بدولت تھے کیونکہ حق کی راہ پر چلنے والے کسی شخص سے کسی طور یہ امید ہی نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ کسی کے علاج کے لیے ایسا کوئی طریقۂ کار استعمال کرے جس سے شرعی قوانین اور انسانیت کی نفی ہوتی ہو۔ مردہ بچے کے جسم کی ہڈیوں کا مطالبہ ایک ایسا ہی معاملہ تھا جس سے اس شخص کے کالے کرتوتوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے یہی بات کالے میاں سے بھی پوچھ ڈالی، جواباً وہ نہایت عالمانہ لہجے میں بولا۔

''پیر سائیں کا فرمان ہے کہ زندہ شخص کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر بالے کے علاج کے لیے وہ کسی مردہ بچے کی ہڈیاں استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اس سے اس

بچے کے مردے کی کوئی بے حرمتی نہیں ہوئی بلکہ ایک طرح سے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ مرنے کے بعد بھی کسی کے کام آ سکا اور اس کے اجر میں اللہ تعالیٰ اسے جنت کے باغوں کا سب سے خوش نما اور خوشبودار پھول بنا دیں گے۔'' کالے میاں کے جواب سے صاف عیاں تھا کہ پیر سائیں نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہنوں کو کس بری طرح اپنے قابو میں کر کے ان کے عقیدوں کو مسخ کر رکھا تھا۔ وہ نیکی اور بدی کی اصل روح کو بھول کر اپنے پیر سائیں کے فرمودات کی روشنی میں حق اور ناحق کے اپنے ذاتی اصول بنائے بیٹھے تھے جن سے انہیں ہٹانا شاید اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

''ابھی میں نے تمہاری بیوی سے فون پر بات کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تم لاہور میں کسی سیٹھ کے پاس نوکری کرتے ہو اور اس کے خیال کے مطابق اس وقت تمہیں لاہور میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا تم نے اپنی بیوی کو یہ بات نہیں بتائی کہ تم ٹاہلی والا میں رہ کر کسی پیر کی خدمت انجام دے رہے ہو؟ یا اس جھوٹ کے لیے بھی تمہارے پیر سائیں نے کوئی فرمان جاری کر رکھا ہے؟'' اس کا لہجہ خود بخود ہی طنز اور زہر میں ڈوب گیا۔

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ مجھے ہور دوسرے مجاوروں کو اپنے گھر والوں کو سچ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ پیر سائیں کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے بیوی بچوں کو خانقاہ کے بارے میں ملوم ہو گیا تو وہ وہاں بہانے بہانے سے آنا شروع ہو جائیں گے ہور پیر سائیں کے علاوہ ہم سارے مجاور بھی اپنے گھر والوں کے مسائل میں الجھ کر خدمتِ خلق کو بھول جائیں گے۔ پیر سائیں وڈے اللہ لوک آدمی ہیں جی۔ انہوں نے اللہ کے بندوں کے کام سنوارنے کے لیے خود بھی ویاہ نہیں کیا اور اپنی خانقاہ کے مجاوروں میں بھی یہ خوبی دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے بڑھ کر خدمت خلق میں دل لگائیں۔ ہم سب پیر سائیں کے نقشِ قدم پر چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ خانقاہ پر آنے سے پہلے جن لوگوں کا ویاہ نہیں ہوا تھا، انہوں نے پیر سائیں کی دیکھا دیکھی ساری حیاتی تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جو بال بچے والے ہیں، وہ بھی احتیاط کرتے ہیں ہور کبھی کبھار ہی چھٹی لے کر اپنے بال بچوں سے ملنے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے اپنی گھر والی کو طلاق دے کر اس جھنجٹ سے جان چھڑا لی ہے ہور اب آرام سے دن رات خانقاہ میں رہتا ہے۔ میں ذرا کمزور ایمان کا بندہ ہوں اس لیے اتنی ہمت نہیں کر سکا۔ فیر یہ گل بھی ہے کہ میری گھر والی کے بھرا سے میری بہن کا ویاہ ہوا ہے۔

اگر میں نے اپنی گھر والی کو چھوڑا تو میری بہن بھی اجڑ جائے گی اس لیے بھی میں خاموش ہوں۔'' ابتدائی مزاحمت کے بعد اب وہ رواں ہو چکا تھا اور ہر سوال کا جواب تفصیل سے دے رہا تھا۔ یہ تفصیل ایسی تھی کہ سن کر شہریار دنگ رہ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ انسان کی جہالت بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ اس دور میں جبکہ انسان خلاؤں میں سفر کر رہا تھا اور ستاروں پر کمند ڈال رہا تھا، اس کے ملک کے بعض دیہاتوں میں یہ حال تھا کہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے بھی محروم لوگ اندھے عقیدوں میں گھر کر سچائی اور حق کو سمجھنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے۔ پہلے اس نے شاہنواز نامی شخص کا کھوج لگایا تھا جو را کا ایجنٹ تھا بعد میں آفتاب کی مخبری پر غلام محمد نامی شخص جس کا اصل نام اشیش کمار تھا، کو قانون کی گرفت میں لیا تھا۔ ان دو کرداروں کے بعد اب اس کے سامنے پیر عبدالحق کا کردار آیا تھا جو ٹاہلی والا پنڈ میں اپنی خانقاہ بنائے بیٹھا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا وہاں کافی اثر رسوخ ہے۔ ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ ٹاہلی والا پنڈ شہریار کے زیرِ انتظام ضلع میں واقع نہیں تھا اس لیے اسے اپنی اے سی کی حیثیت کو استعمال کر کے وہاں کوئی براہِ راست کارروائی کرنے کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسے پیر عبدالحق کے خلاف جو بھی قدم اٹھانا تھا، وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا ورنہ اس کی مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا تھا۔

''تمہارا خاندان فیصل آباد میں رہتا ہے تو پھر تم ٹاہلی والا کیسے پہنچ گئے؟'' کالے میاں کی بیوی سے ہونے والی گفتگو یاد آئی تو اس نے چونک کر کالے میاں سے پوچھا۔

''یہ بھی بس ایک اتفاق ہی تھا۔ میری گردن پر ایک پھوڑا ہو گیا تھا جو کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں میں سچ مچ لاہور میں ایک سیٹھ کے پاس نوکری کرتا تھا۔ پھوڑے کی تکلیف کی وجہ سے میں نے تنگ آ کر سیٹھ سے چھٹی لی اور فیصل آباد کے لیے نکل گیا کہ گھر جا کر آرام کروں گا اور کسی پرانے حکیم سے علاج کرواؤں گا لیکن گڈی میں مجھے پیر سائیں کا ایک مجاور مل گیا۔ اس نے میرا پھوڑا دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھا۔ میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، اسے بتا دیا کہ کب سے اور کتنا پریشان ہوں۔ میری داستان سن کر وہ بولا کہ میرے ساتھ میرے پیر سائیں کی خانقاہ پر چلو، تمہارا شرطیہ علاج ہو جائے گا۔ میں پریشان تو تھا اس لیے فوراً ہی اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا۔ ہور بس فیر میری زندگی بدل گئی۔ پیر سائیں نے تین دن کے اندر اپنی کرامت سے میرے پھوڑے کا علاج کر دیا۔ علاج کے دنوں میں مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ لے جانے والے مجاور نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ تین دن میں اس نے میرا بہت خیال رکھا۔ وہ پیر سائیں کا وڈا ماننے والا تھا۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اسی کی طرح خانقاہ پر رہوں ہور دن رات پیر سائیں کی خدمت کروں۔ میں نے اپنی یہ خواہش پیر سائیں کے سامنے بیان کی تو انہوں نے وہاں رہنے کی شرائط بتا کر فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں نے ہر شرط مان لی۔ اب میں دن رات خانقاہ میں رہتا ہوں ہور بہت خوش ہوں۔ جب پیر صاحب حکم دیتے ہیں تو بال بچوں سے ملنے چلا جاتا ہوں ہور انہیں خرچہ پانی دے آتا ہوں۔''

وہ واقعی اتنا مطمئن لگ رہا تھا کہ ان کی طرف سے کیے گئے تشدد کے نتیجے میں بگڑ جانے والے چہرے پر بھی اس اطمینان کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ شہریار حیران تھا کہ یہ انسانی... نفسیات کا کون سا پہلو ہے کہ وہ نہایت مکاری کے ساتھ کسی کا آلۂ کار بنا لیا جاتا ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی اس کارروائی سے بے خبر، خوش اور مطمئن رہتا ہے۔

''بیوی بچوں کو خرچہ پانی دینے کے لیے رقم کہاں سے آتی ہے تمہارے پاس؟'' اس نے کالے میاں سے ایک اور چبھتا ہوا سوال کیا۔

''رقم پیر سائیں دیتے ہیں۔ ان پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ اللہ غیب کے خزانوں میں سے انہیں نوازتا ہے ہور وہ اس میں سے ہمیں عطا کرتے رہتے ہیں۔'' وہاں وہی جہالت بھری عقیدت تھی لیکن شہریار کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا کہ آخر پیر سائیں کیا شے ہے کہ اس کے پاس خفیہ طریقے سے دولت آتی رہتی ہے۔ ہوسکتا تھا کہ خانقاہ پر چڑھاووں وغیرہ کا بھی سلسلہ ہو جس سے آمدنی ہوتی ہو لیکن کالے میاں نے جس طرح غیب کے خزانوں کا ذکر کیا تھا، اس سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پیر سائیں کی آمدنی کے کچھ خفیہ ذرائع بھی ہیں۔ بہرحال اس نے اس سلسلے میں کالے میاں کو مزید کریدنے سے گریز کیا اور شہزادی کے کیس پر توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم تو چھٹی پر فیصل آباد گئے ہوئے تھے پھر تمہیں شہزادی سے ہڈیاں لانے کا کام کیسے سونپا گیا؟''

''بول بول کر میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔ پہلے مجھے تھوڑا سا پانی ہور پلوا دیں۔'' اپنے خون آلود ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے مطالبہ کیا۔ ہونٹ کو آلودہ کرنے والا یہ خون مشابرم خان کے تھپڑ کے نتیجے میں دانت ٹوٹنے سے نکلا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دو دانت اب بھی فرش پر پڑے صاف نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں پر ایک حسرت زدہ سی نظر ڈالی اور پھر مشابرم خان کا بڑھایا ہوا پانی منہ سے لگا لیا۔ پانی پی کر اس کی توانائی خاصی بحال ہو گئی تھی شاید اسی وجہ سے وہ مشابرم خان کو کینہ توز نظروں سے گھورنے کے قابل ہو سکا لیکن بہرحال اس سے آگے کچھ کرنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر زیردست ہو چکا تھا اور اسے اپنی اس پوزیشن کا احساس تھا اس لیے شہریار کے اشارے پر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

''مجھے واجد نے پیر سائیں کی طرف سے موبائل فون پر اس کام کا حکم دیا تھا۔ ان کا حکم ملنے پر میں فیصل آباد سے سیدھا پیر آباد پہنچا تھا لیکن وہاں ایک لڑکے کی زبانی مجھے بالے کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی یہ ملوم ہو گیا کہ بالے کی گھر والی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ میں الٹے قدموں واپس لوٹ گیا، پر اڈے پر گاؤں سے باہر جانے والی کوئی گڈی ہی نہیں تھی اس لیے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ فیر گڈی آنے سے پہلے ہی میں نے اس لڑکے کے ساتھ آپ کے ڈریور کو آتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا ہور میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ میری ہی تلاش میں آئے ہیں۔ میں چھپ گیا، فیر اس سے آگے جو کچھ ہوا وہ تو آپ کو ملوم ہی ہو گیا ہوگا۔'' کالے میاں نے اپنا بیان مکمل کر کے خاموشی اختیار کر لی۔ ویسے اس کا نام بھی خوب تھا۔ اس کی افریقیوں کو شرماتی کالی رنگت کی وجہ سے یہ نام جانے اس کے ماں باپ نے ہی رکھا تھا یا پھر یہ لوگوں کا کارنامہ تھا۔

''تمہارے موبائل پر آنے والی واجد نامی شخص کی کال میں نے بھی نوٹ کی ہے لیکن اس نمبر پر کوشش کرنے پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ نمبر کسی کے استعمال میں ہی نہیں ہے۔ تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' اس نے ذہن میں چبھتا ہوا سوال کالے میاں سے کر ڈالا۔

''میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آرہا۔ پیر آباد سے میں نے خود بھی اسے حالات بتانے کے لیے فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ملوم نہیں کیوں نمبر ہی نہیں ملا۔ بعد میں آپ کے ساتھی نے میرا موبائل چھین لیا تو میں کوشش بھی نہیں کر سکا۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ واجد کا موبائل خراب ہو گیا ہو یا پھر کوئی دوسرا مسئلہ ہو تو اس سے رابطہ نہ ہو سکنے کی صورت میں تم کس سے بات کر سکتے ہو؟'' اس نے کالے میاں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کرنے کو تو میں پیر سائیں سے بھی گل کر سکتا ہوں لیکن ان کی عبادت میں حرج نہ ہو، اس خیال سے ہم میں سے کوئی بھی انہیں فون نہیں کرتا۔ ہم میں سے واجد ہی سب سے زیادہ ان کے قریب ہے اس لیے ہم اسی سے رابطہ کرتے ہیں۔'' اس نے بتایا پھر گویا اچانک خیال آنے پر بولا۔

''واجد کا چھوٹا بھرا خالد بھی پیر سائیں کے اعتماد کا بندہ ہے۔ میں اسے بھی فون کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر اسی کو فون کر کے دیکھتے ہیں بلکہ ایسا کرو کہ تم فون پر خالد سے بات کرو۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ تمہارے واپس نہ لوٹنے پر ان لوگوں کے ذہن میں کس قسم کے خیالات گردش کر رہے ہیں۔ لیکن خبردار اسے اصل حالات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ اسے بھی تم وہی کچھ بتانا جو میں نے تمہاری بیوی کو بتایا ہے۔'' کالے میاں کو ہدایات دیتے ہوئے اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ کالے میاں نے جس طرح کا تشدد سہا تھا، اس نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے چنانچہ وہ مسلسل تعاون کر رہا تھا۔ اب بھی شہریار کی دھمکی کو محسوس کر کے اس کے چہرے پر تیمی برسنے لگی۔ درحقیقت وہ ایک عام سا آدمی تھا جو اپنی اندھی عقیدت کے ہاتھوں پیر سائیں کے چنگل میں پھنس گیا تھا، ورنہ اس میں پیشہ ور مجرموں جیسا دم خم نہیں تھا کہ سخت تشدد سہہ کر بھی ڈھٹائی پر قائم رہیں اور زبان پر پڑا قفل کھولنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ شہریار نے موبائل آن کر کے اسے تھمایا تو اس نے بڑی فرماں برداری سے تھام کر خالد کا نمبر ملا دیا۔ ایک طرح سے وہ یکسر مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شاید اس نے اپنے دل میں یہ بھی سوچ لیا ہو کہ پیر سائیں اپنی کرامات کے سہارے خود ہی اس ناہنجار اے سی سے نمٹ لیں گے چنانچہ خود مکمل طور پر ہتھیار ڈال چکا تھا اور شہریار کے لیے یقیناً کسی ناگہانی آفت کا منتظر تھا۔

''کیا بات ہے، کیا خالد سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا؟'' وہ کئی بار نمبر ڈائل کرنے کے باوجود بھی دوسری طرف کسی سے بات نہیں کر سکا تو اس کے الجھن زدہ تاثرات دیکھ کر شہریار نے پوچھا۔

''خالد کے نمبر پر بھی واجد کے نمبر جیسی ہی خاموشی ہے۔ لگتا ہے ان کے گھر کوئی پریشانی پڑ گئی ہے۔'' اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ اپنے پیر سائیں سے ہی رابطہ کرو۔ یہ کوئی نماز کا وقت تو ہے نہیں کہ تمہارے پیر سائیں کی عبادت میں خلل پڑے گا۔'' اس نے سرد لہجے میں حکم صادر کیا۔ حقیقتاً کالے میاں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد اسے پیر سائیں یا اس کے کسی کارندے سے بات کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی وہ وہاں والوں سے رابطہ کرنے پر مصر تھا۔ جانے یہ اس کی دماغی رو بھٹکنے کا نتیجہ تھا یا چھٹی حس جاگ کر کسی غیر معمولی صورتِ حال کا احساس دلا رہی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا لیکن بے چارے کالے میاں کو تو حکم کی تعمیل کرنی تھی، سو وہ ایک بار پھر موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اس کے نمبر ملانے سے قبل ہی کوئی کال آنے لگی۔

''لائن کاٹ دو۔'' وہ اس کے عین سر پر سوار تھا اس لیے اسکرین پر نمودار ہونے والے ''کاکا'' کے الفاظ دیکھ کر سمجھ گیا کہ کالے میاں کی بیوی فون کر رہی ہے۔ وہ شاید اپنے شوہر کے ساتھ حادثہ پیش آنے کی خبر ملنے کے بعد مسلسل ہی اس کے نمبر پر ٹرائی کرتی رہی تھی لیکن پہلے موبائل بند ہونے اور بعد میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کی کوششیں بارآور نہیں ہو سکی تھیں۔ اب جو ذرا سا وقفہ آیا تو وہ موبائل کی گھنٹیاں بجانے کی حد تک کامیاب ہو گئی لیکن شہریار کی طرف سے لائن کاٹ دینے کا حکم ملنے کے بعد کالے میاں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کال ریسیو کر کے بیوی کی تشفی تسلی کا کام کرے چنانچہ اس نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیوی کی کال منقطع کر کے پیر سائیں کا نمبر ملا لیا۔ اس بار بھی اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات نظر آئے۔ ان تاثرات میں مایوسی کے ساتھ ساتھ کچھ حیرانی اور پریشانی بھی شامل تھی۔ اپنے دو قریبی ساتھیوں سمیت پیر سائیں سے بھی رابطہ نہ ہو سکنے کی صورت میں یقیناً اس کے اندر بھی یہی احساس جاگا ہوگا کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہے جب ہی ایک ساتھ اس کا سب لوگوں سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔

''او کے۔ لاؤ یہ موبائل مجھے دے دو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے پیر سائیں کے ہاں کیا مسئلہ ہو گیا ہے کہ تمہارا کسی سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا۔'' اس کے چہرے کے تاثرات سے صورتِ حال کا اندازہ لگاتے ہوئے شہریار نے پُرسوچ لہجے میں حکم دیا تو کالے میاں نے موبائل اس کے حوالے کر دیا۔ حکم عدولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ مشابرم خان نامی شخص ایک اشارے کا منتظر بالکل تیار کھڑا تھا۔ اب بھی شہریار نے موبائل اپنے قبضے میں لیتے ہوئے اسے کوئی خفیف سا اشارہ کر دیا تھا جس کے نتیجے میں کالے میاں ایک بار پھر بندشوں میں جکڑا گیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر وہ زبان بھی بند کر دی گئی جسے کچھ دیر قبل بصد اصرار کافی جدوجہد کے بعد کھلوایا گیا تھا۔

☆☆☆

اسلم کی آنکھ کھلی تو گھڑی کی سوئیاں چار بجنے کا اعلان کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھیں۔ یعنی وہ کافی طویل نیند لینے کے بعد جاگا تھا۔ کئی دن کی بھاگ دوڑ کے بعد میسر آنے والے آرام دہ بستر نے اسے اس طرح بے سدھ کیا تھا کہ درمیان میں ایک بار بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ اب بھی وہ آنکھ کھل جانے کے باوجود کچھ دیر کسلمندی سے بستر پر ہی پڑا رہا لیکن پھر خیال آیا کہ وہ اس گھر میں مہمان ہے اور مستقل ڈیرا ڈالنے کے لیے یہاں نہیں آیا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اب حامد راؤ اور اس کے بیٹے سے رخصت کی اجازت لی جائے۔ یہاں سے نکل کر کسی شہر تک پہنچنے میں انہیں اچھا خاصا وقت لگ جاتا پھر یہ سفر بھی ایسا نہیں تھا جس کی منزل پہلے سے طے شدہ ہو۔ وہ لوگ ٹاہلی والا سے نکل کر جہاں بھی پہنچتے، بے گھر ہی ہوتے اور قیام کے لیے کسی نہ کسی ہوٹل کا رخ کرنا پڑتا چنانچہ اس کی خواہش تھی کہ بہت زیادہ رات نہ ہو کیونکہ رات گئے ہوٹلوں میں پہنچنے والے جوڑے عموماً مشکوک قرار پاتے ہیں۔ اس نے حامد راؤ کے سامنے ماہ بانو کو اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ماہ بانو اس کی بیوی نہیں بلکہ ہونے والی بیوی تھی اور یہ رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جو انہیں قانونی تحفظ فراہم کر سکتا۔ ہوٹلوں میں اگرچہ کسی جوڑے کو کمرا دیتے وقت نکاح نامہ دکھانے کی شرط نہیں رکھی جاتی تھی لیکن بات وہی تھی کہ ناموزوں وقت پر کسی ہوٹل میں پہنچ کر وہ خوانخواہ کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ آدمی کو کب کہیں کوئی سر پھرا ٹکرا جائے، اس بات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا اور وہ اپنے موجودہ حالات میں کسی نئے مسئلے سے نمٹنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ان کے ڈیرے سے فرار ہونے کے بعد وہاں سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں پولیس ریڈ کا نتیجہ تھیں۔ اس ریڈ میں اس کے جانے کتنے ساتھی مارے گئے تھے اور کتنے زخمی یا مفرور تھے۔ البتہ یہ بات طے تھی کہ پولیس نے گرفتار شدگان کی مدد سے مفروروں کی فہرست ضرور تیار کی ہوگی اور اب ان کی راہ پر لگی ہوگی۔ ایسے حالات میں وہ کسی بھی طرح پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی خواہش میں اتنا محتاط تھا کہ کسی معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب بھی ذہن میں آنے والے خیال نے اس کی ساری کسلمندی اور سستی کو سیکنڈوں میں اڑن چھو کر دیا اور وہ مزید سونے کی ترغیب دیتے آرام دہ بستر کو چھوڑ کر ایک چھلانگ میں غسل خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو مقصود کو کمرے میں اپنا منتظر پایا۔

''میں پہلے بھی دو بار آپ کے کمرے کا چکر لگا کر جا چکا ہوں لیکن آپ اتنی گہری نیند میں تھے کہ مجھے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگا۔'' اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے... بولا۔

''بس تھکن ہی ایسی تھی لیکن اگر کوئی کام تھا تو تم مجھے جگا سکتے تھے۔'' مقصود کے پہلے بھی دو بار آنے کا سن کر اسے یہی لگا کہ وہ کسی کام سے یہاں آیا ہوگا اس لیے کچھ تفکر اور گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''ارے نہیں۔'' مقصود اس کے تاثرات بھانپ کر دھیرے سے ہنسا۔ ''میں تو بس یہ دیکھنے آیا تھا کہ اگر آپ جاگ رہے ہوں تو دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھ لوں لیکن آپ نے تو اٹھنے میں تقریباً شام ہی کر دی۔ ڈھائی تین گھنٹوں میں یہاں رات کے کھانے کا وقت ہو جائے گا اور آپ ابھی تک دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھا سکے جس پر میری والدہ کو سخت تشویش ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مہمان نے دوپہر کا کھانا ابھی تک نہیں کھایا تو پھر رات کا کھانا کب کھائے گا۔''

مقصود کے ہلکے پھلکے انداز میں سنائی گئی تفصیل نے اسے بے ساختہ ہی اپنی ماں کی یاد دلا دی۔ دورانِ تعلیم کراچی میں رہائش کے عرصے میں اس کے کھانے پینے کے معمولات بہت زیادہ تبدیل ہو گئے تھے۔ عموماً یونیورسٹی سے واپس آنے میں ہی تین سے اوپر کا وقت ہو جاتا تھا اور وہ دوپہر کا کھانا دیر سے کھانے کے باعث رات کا کھانا بھی تاخیر سے کھانے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس معمول کی وجہ سے جب وہ ملاقات کے لیے گاؤں جاتا تو وہاں ماں اور بہن کے معمول کا ساتھ نہ دے پاتا اور ماں تشویش میں مبتلا رہتی کہ اس کے بیٹے نے کس قسم کی عادات اپنا لی ہیں۔ جلدی سونے اور جلدی جاگنے والے گاؤں دیہاتوں کے رہائشیوں کے لیے اس طرزِ زندگی کا تصور ہی محال تھا جو کراچی جیسے بڑے شہر میں رائج تھا۔

''آپ کس سوچ میں ڈوب گئے؟ کہیں میری بات کا برا تو نہیں مان گئے؟ میں نے تو صرف آپ کو اپنی والدہ کے خیالات سے آگاہ کیا تھا۔ اس بات کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ہمارے گھر میں آپ پر کوئی زبردستی کی جائے گی۔ آپ اپنے سونے جاگنے اور کھانے پینے کے معمولات کے لیے بالکل آزاد ہیں۔ اب بھی مجھے صرف آپ کے جاگنے کا انتظار تھا۔ آپ چند منٹ کے لیے انتظار کریں تو میں کھانا لگوا دیتا ہوں۔ رات کا کھانا آپ جب خواہش محسوس کریں گے، تب فراہم کر دیا جائے گا۔'' اس کی خاموشی سے کچھ اور ہی معنی

اخذ کرتے ہوئے مقصود تھوڑا سا گھبرا گیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔ ایک تو مہمان داری ان کی روایت تھی اور وہ مہمان کو ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، دوسرے وہ جتنا برخوردار قسم کا لڑکا تھا، اسے فوراً ہی یہ فکر لاحق ہو گئی ہوگی کہ اسلم کے ماتھے پر پڑنے والی کوئی شکن کہیں اس کے والد ماجد کا مزاج برہم نہ کر دے اس لیے فوراً صفائیاں پیش کرنے پر اتر آیا۔

اس کی کیفیت کو محسوس کر کے اسلم کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ سی شوخ مسکراہٹ دوڑ گئی پھر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اتنا کند ذہن نہیں ہوں کہ مذاق نہ سمجھ سکوں۔ مجھے بس یہ خیال آ گیا تھا کہ تمہاری والدہ بہت دور کی سوچ رہی ہیں۔ رات کا کھانا ہم کب اور کہاں کھائیں گے، یہ تو میں خود بھی ابھی طے نہیں کر سکا ہوں۔ البتہ یہ طے کر لیا ہے کہ تھوڑی دیر میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ تم مجھے یہاں سے شہر کی طرف جانے والی گاڑیوں کے روٹ اور اوقات وغیرہ بتا دو اور ساتھ ہی اندر زنان خانے میں میری بیوی کو بھی یہ پیغام بھیج دو کہ وہ سفر کے لیے تیار ہو جائے تاکہ ہم شام کے سائے گہرے ہونے سے پہلے یہاں سے نکل سکیں۔''

اس کا پروگرام سن کر مقصود ہکا بکا رہ گیا۔

''اب کیا ہوا بھائی؟ یقین کرو میں نے کسی ناراضی کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں سنایا بلکہ تمہارے یہاں اس کمرے میں آنے سے پہلے ہی میں اپنا پروگرام طے کر چکا تھا۔'' اس نے فوراً ہی مقصود کی دل جوئی کے لیے وضاحت پیش کی۔

''لیکن ابا جی نے تو کچھ اور ہی سوچا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ کی طرف سے روانگی کا کوئی عندیہ ملے گا تو وہ اپنی پیشکش آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔''

''کیسی پیشکش؟'' وہ حیران ہوا۔

''اصل میں آپ نے شفقت چاچا کے بارے میں جو تفصیلات بتائی ہیں انہیں سن کر ابا جی تشویش میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کا اندازہ ہے کہ چاچا جی کا کافی دنوں تک منظر پر آنا ممکن نہیں ہوگا۔ ان حالات میں ان کا محنت سے جمایا ہوا کاروبار ٹھپ ہونے کا خدشہ ہے اس لیے ابا جی کی خواہش ہے کہ میں شہر جا کر ان کا دفتر سنبھال لوں۔ وہاں سب لوگ مجھے پہچانتے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ میں چاچا جی کا بھتیجا ہونے کے علاوہ ان کا داماد بھی ہوں اس لیے مجھے وہاں کا کام سنبھالنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ میں کل صبح شہر کے لیے روانہ ہوں گا اور ابا جی کا خیال تھا کہ اگر آپ بھی چاہیں تو میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ جا سکتے ہیں۔ اس طرح آپ بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھانے سے بھی بچ جائیں گے۔'' مقصود نے اپنا پورا پروگرام اس کے سامنے رکھ دیا جسے سن کر وہ خوش ہوگیا۔ وہ تو اپنے میزبانوں پر بوجھ نہ بننے کے خیال سے یہاں سے روانگی میں اتنی جلدی دکھا رہا تھا لیکن اگر صرف ایک رات کی تاخیر سے وہ لوگ زیادہ سہولت سے سفر کر سکتے تو تھوڑا سا انتظار کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا چنانچہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری تجویز کافی اچھی اور قابلِ عمل ہے ورنہ سچ پوچھو تو میں یہ سوچ کر کہ تمہیں اپنے یہ بن بلائے مہمان وبالِ جان نہ لگیں، یہاں سے جلد از جلد روانہ ہونا چاہتا تھا۔''

''ہم مہمان کو وبالِ جان نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سمجھنے والے لوگ ہیں۔ آپ چاہیں تو غیر معینہ مدت کے لیے بھی یہاں رک سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔'' مقصود کے لہجے اور الفاظ میں خلوص کی جھلک تھی جسے محسوس کر کے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ فی زمانہ جس قدر نفسا نفسی کا عالم تھا اس میں حامد راؤ کے گھرانے جیسے وضع دار گھرانے بس انگلیوں پر گنے چنے ہی باقی رہ گئے ہوں گے۔ اس طرح کے لوگ قابلِ قدر بھی تھے اور قابلِ ستائش بھی چنانچہ اس نے کسی بھی قسم کی کنجوسی سے کام لیے بغیر مقصود کے سامنے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ اس کی تعریفیں سن کر مقصود کے چہرے پر خفت بھرے تاثرات ابھر آئے۔ اس جیسے روایت پرست گھرانے کے لڑکے کے لیے وہ تعریفیں یقیناً کھسیاہٹ کا سبب بن رہی تھیں چنانچہ اسے درمیان میں ہی روک کر شرمیلے پن سے بولا۔

''آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے لیے ایسی کون سی زحمت اٹھائی ہے۔ بس جیسے خود کھاتے پیتے اور رہتے سہتے ہیں، اس میں آپ کو بھی شامل کر لیا۔'' مقصود کے لہجے میں وہی روایتی عاجزی تھی جو اس جیسے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ پھر اس نے تیزی سے موضوعِ سخن تبدیل کر لیا اور کچھ عجلت سے بولا۔

''باتوں میں لگ کر اصل کام تو رہ ہی گیا۔ آپ بس دو منٹ انتظار کریں، میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔''

''میرے خیال میں اب کھانے کو رہنے ہی دو۔ اس وقت کھانا کھا لیا تو پھر رات کے کھانے پر تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ بہتر ہے کہ میں ابھی چائے پر گزارہ کر لوں تاکہ رات کا کھانا صحیح وقت پر کھا سکوں۔'' اس نے مقصود کو کھانے کے لیے منع کر کے بے تکلفی سے چائے کی فرمائش کر دی۔ جب مہمان اتنا مخلص ہو تو پھر میزبان کے لیے بھی غیر ضروری تکلف بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے البتہ مقصود اس کے ایک وقت کا کھانا گول کر دینے کے خیال سے تذبذب میں پڑ گیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اعتراض نہیں کیا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''ذرا میری بیگم تک بھی کل صبح روانگی کا پیغام پہنچا دینا۔'' اس نے ماہ بانو کے بروقت تیار رہنے کے خیال سے اس کے لیے پیغام نوٹ کروایا۔

''جی بہتر ہے۔ ویسے اگر آپ کہیں تو میں بھابی جی کو یہاں بھجوا دوں؟ اماں اور انیلا نے تو دوپہر میں بھی انہیں پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو آپ والے کمرے میں سونے کے لیے جا سکتی ہیں لیکن انہوں نے سونے کے مقابلے میں خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنا زیادہ پسند کیا۔'' فرماں برداری کے مظاہرے کے ساتھ ہی ماہ بانو کو بھیجنے کی پیشکش کے علاوہ اس نے باقی تفصیلات بھی فراہم کر دیں۔

''میرے خیال میں اب بھی وہ خواتین کے ساتھ گپ شپ کو انجوائے کر رہی ہوگی۔ اسے ڈسٹرب کرنے کے بجائے صرف پیغام بھجوانے پر اکتفا کر لیا جائے تو یہ بھی مناسب ہی رہے گا۔'' وہ سمجھ سکتا تھا کہ ماہ بانو تنہا اس کے ساتھ اس کمرے میں سونے سے گریزاں ہوگی اس لیے ہلکے پھلکے انداز میں مقصود کی پیشکش مسترد کر دی جس پر وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے واپس آنے تک اسلم فارغ تھا چنانچہ اپنے ہتھیاروں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور پہلے اپنی ٹانگ کے ساتھ بندھا دھاردار خنجر نکال کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ خنجر کے چند منٹ کے معائنے میں ہی وہ اس کی طرف سے مطمئن ہوگیا۔ خنجر کے بعد پسٹل کی باری آئی۔ سونے سے پہلے اس نے اپنا پسٹل تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا تاکہ وقت ضرورت کام آ سکے۔ پسٹل بھی بالکل صحیح حالت میں تھا اور ایمرجنسی میں بس سیفٹی کیچ ہٹا کر لبلبی دبانے کی کسر باقی تھی۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے پسٹل واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس وقت وہ ایک محفوظ اور معزز گھرانے میں موجود تھا اور یہاں ان ہتھیاروں کی اسے چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن اپنے ہتھیاروں کی روزانہ دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کرنے کی برسوں سے ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ اس معمول کو ترک کرنا ذرا مشکل تھا۔ وہ تو اس کی رائفل اس کے بجائے ماہ بانو کے پاس تھی ورنہ وہ اسے بھی ضرور چیک کرتا۔ پہاڑوں پر سے آبادی میں داخل ہوتے وقت ماہ بانو

نے رائفل اپنی چادر میں چھپا کر ساتھ لے لی تھی اور وہ ابھی تک اسی کے قبضے میں تھی۔ اسلم کو اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل کے بارے میں اس نے حامد راؤ کے گھر کی خواتین کو کیا بتایا تھا اور کس طرح مطمئن کیا تھا کیونکہ بہرحال یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ رائفل ان لوگوں کی نظر میں نہ آ سکی ہو۔ بہت کارآمد ہتھیار ہونے کے ساتھ رائفل میں یہی خرابی تھی کہ اسے چھپانا آسان نہیں تھا۔

مقصود کی واپسی تقریباً دس بارہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں اسٹیل کی ایک بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ یہ ٹرے جب اسلم کے سامنے رکھی گئی تو اس نے دیکھا کہ ٹرے میں چائے کے برتنوں کے ساتھ ساتھ دیگر کئی لوازمات بھی موجود ہیں۔ شاید مقصود نے اس کی بھوک کا خیال کر کے چائے کے ساتھ یہ اہتمام کروایا تھا اور ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہی مصر ہوگیا تھا کہ اسے ٹرے میں موجود ہر شے اس کے معدے میں منتقل ہو جائے۔ ان لوازمات میں بازاری نمکو وغیرہ کے علاوہ گھر کے بنے ہوئے شامی کباب اور بیسن کا حلوہ بھی شامل تھا اور یہ دونوں ہی چیزیں اتنی مزیدار تھیں کہ اسے تکلف برطرف رکھنا پڑا۔ اس کے باوجود مقصود اسے مزید کھلانے پر بضد تھا۔

''بس میرے بھائی! میرے معدے پر رحم کرو۔ یہ سب چیزیں بے شک بہت مزے کی ہیں لیکن ابھی سے سیر ہو کر میں رات کے کھانے سے ہرگز بھی محروم نہیں ہونا چاہتا۔'' اس نے باضابطہ دونوں ہاتھ مقصود کے سامنے باندھ دیے تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور یوں اس کی کھانے پینے سے گلوخلاصی ہو سکی۔

''اگر آپ مزید آرام کرنا چاہیں تو اسی کمرے میں کر سکتے ہیں ورنہ اگر گپ شپ کا موڈ ہو تو بیٹھک میں چلے جائیں، ابا جی وہیں ہیں۔ میں بھی یہ برتن اندر پہنچا کر وہیں آتا ہوں۔'' مقصود نے اس کے سامنے دونوں آپشن رکھ دیے جس میں سے اس نے بیٹھک میں جانے والی پیشکش قبول کر لی۔ جتنا آرام وہ کر چکا تھا، اس کے بعد یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رات کو نیند دیر سے ہی آ سکے گی۔ مزید آرام کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر ضرورت محسوس بھی ہوتی تو وہ اپنے مخلص میزبانوں کی محبت پر اسے قربان کر دیتا کہ ایسے نادرِ روزگار لوگوں کا ساتھ روز روز میسر نہیں آتا۔

''اخاہ۔۔۔ نیند پوری ہو گئی تمہاری۔ آؤ یہاں میرے پاس چلے آؤ۔'' وہ دستک دے کر بیٹھک میں داخل ہوا تو حامد راؤ نے اس کا خوش دلی سے استقبال کیا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے جا بیٹھا۔ حامد راؤ کے سامنے بساط بچھی ہوئی تھی اور وہ اس پر مہرے سجائے بڑے مصروف نظر آ رہے تھے۔

''کچھ کھایا پیا بھی یا سیدھے یہیں چلے آ رہے ہو؟'' نظریں مہروں پر جمی ہونے کے باوجود وہ اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔

''آپ کے فرماں بردار صاحب زادے کی موجودگی میں بھلا میرا بھوکا رہنا کیسے ممکن تھا۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ اس دور میں اتنا فرماں بردار اور ذمّے دار بیٹا ملا ہے۔'' وہ حامد راؤ کے سامنے مقصود کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا جسے سن کر ان کے ہونٹوں پر بس لمحہ بھر کے لیے فخریہ سی مسکراہٹ جھلکی لیکن انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اسلم بھی ان کے مزاج کو کسی حد تک سمجھ گیا تھا۔ وہ ایک سیدھے سادے اور کھرے آدمی تھے جن سے یہ امید کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کی ذرا سی تعریف سن کر سینہ پھلا کر بیٹھ جاتے اور اپنی اچھی تربیت کے گن گانے لگتے۔

''آپ کیا اکیلے ہی شطرنج کھیلنے کے شوقین ہیں؟'' اتنی دیر میں وہ دیکھ چکا تھا کہ حامد راؤ دونوں طرف کی چالیں خود ہی چل رہے ہیں اس لیے یہ سوال کر بیٹھا ورنہ بیٹھک میں داخل ہوتے وقت تو وہ یہی سمجھا تھا کہ باپ بیٹے مل کر کھیل رہے ہوں گے اور مقصود اس کی خاطر تواضع کے لیے درمیان سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اپنے اس خیال میں وہ اس لیے بھی حق بجانب تھا کہ مقصود نے واپس بیٹھک میں آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

''مجبوری ہے، اکیلے ہی کھیلنا پڑتا ہے۔ مقصود ہر معاملے میں بے حد لائق ہونے کے باوجود شطرنج میں حد سے زیادہ نکما ہے۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے شطرنج کھیلنی آ جائے لیکن نالائق کو آج تک ڈھنگ کی ایک چال چلنی نہیں آئی اور اناڑی بندے کے ساتھ کھیلنے میں مجھے مزہ نہیں آتا۔ اس سے بہتر مجھے یہی لگتا ہے کہ دونوں طرف سے خود ہی کھیل لوں۔ کم از کم مقابلہ تو برابری کا رہتا ہے۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ حامد راؤ نے خود کو سنبھال لیا ہے اور اس موڈ سے نکل آئے ہیں جو صبح ان پر طاری تھا۔ شاید انہوں نے شفقت راؤ کے اقدام پر جلنے کڑھنے کے بجائے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور اطمینان اور صبر سے وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شفقت راؤ منظر پر آتا تو ان لوگوں کی بہت سی الجھنیں خود بخود ہی دور ہو جاتیں اور وہ دونوں دوست مل کر یقیناً آئندہ کا کوئی لائحہ عمل طے کر لیتے۔ حامد راؤ کی سوچ جو بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی، اس نے جاننے کے لیے دوبارہ اس ناخوشگوار موضوع کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گلا کھنکھارتے ہوئے ذرا شوخی سے بولا۔

"اگر آپ پسند کریں تو ایک گیم میرے ساتھ کھیل لیں۔ مجھے مہارت کا تو دعویٰ نہیں لیکن پھر بھی آپ اتنا اناڑی نہیں پائیں گے کہ کھیل سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ تھوڑی بہت اس کھیل کی سوجھ بوجھ مجھے بھی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کے تھوڑا بہت کھیل جاننے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اباجی بوریت سے بھی بچ جائیں گے اور جیت بھی انہی کی ہوگی۔" مقصود جو ابھی ابھی اس بیٹھک یا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا، شوخی سے بولا جس پر حامد راؤ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر منہ پھیر کر مسکراہٹ پر قابو پانے کے بعد رعب دار لہجے میں بولے۔

"تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟ کیا تم مجھ پر یہ الزام لگانا چاہ رہے ہو کہ میں صرف جیتنے کے لیے کھیلتا ہوں؟"

"تو اس میں غلط کیا ہے؟ ہر کھلاڑی جیتنے کی نیت سے ہی میدان میں اترتا ہے۔" انہیں اطمینان سے جواب دیتے ہوئے مقصود نے ایک کرسی سنبھال لی۔ اس وقت اس کا اپنے باپ سے رویہ ایسا تھا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کو کوئی بات سمجھا رہا ہو۔ پہلی بار اسلم کو احساس ہوا کہ باپ بیٹے میں صرف احکامات کے اجرا اور فرماں برداری کا تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے اچھے دوست بھی ہیں۔ البتہ مقصود کے اندر حالات کی نزاکت کو سمجھنے اور موقع محل دیکھ کر بات کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ صبح حامد راؤ کے چہرے پر پریشان کن تاثرات تھے تو مقصود بھی خول میں سمٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ اب ان کا موڈ بحال ہو گیا تو اس کی بھی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔

"اس نالائق کی باتوں کو رہنے دو اسلم میاں! آؤ ہم بساط سجاتے ہیں۔" حامد راؤ نے مصنوعی غصے کے اظہار کے لیے منہ پھلایا اور مقصود کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر جو ان دونوں کے درمیان کھیل شروع ہوا تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ کھیلنے کے دوران وہ آپس میں گفتگو بھی کرتے جارہے تھے۔ اس گفتگو کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ مقصود نے ایگری کلچر میں گریجویٹ کیا ہوا ہے لیکن کہیں شہر میں رہ کر نوکری کرنے کے بجائے باپ کی فرمائش پر گاؤں میں رہ رہا ہے اور اپنے علم کی روشنی میں اپنی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ حامد راؤ بیٹے کی اس فرماں برداری پر بہت خوش تھے کیونکہ ان کے خیال میں علم اور محنت جب یکجا ہوں تو زیادہ بہتر نتائج سامنے آتے ہیں اور ان کے اس خیال پر مہرِ تصدیق اس لیے ثبت ہو گئی تھی کہ واقعی جب سے مقصود نے اُن کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا تھا، پیداوار بڑھ گئی تھی۔ ان کے کھیتوں اور باغوں میں اگنے والی سبزیاں اور پھل اتنے عمدہ معیار کے تھے کہ خریدار پیشگی بکنگ کروا دیتے تھے۔

مقصود کے حوالے سے حامد راؤ کی آنکھوں میں چمکتے فخر اور ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ نے جہاں اسلم کو خوش کیا، وہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں درد کی لہریں بھی اٹھنے لگیں۔ حامد راؤ کو دیکھ کر اسے بے ساختہ ہی اپنے باپ کی یاد آگئی تھی۔ اس کا سادہ لوح باپ بھی تو اس کے حوالے سے ایسے ہی کچھ خواب دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں بھی یہی خواہش تھی کہ اسلم پڑھ لکھ کر کسی اونچے عہدے پر فائز ہو جائے تاکہ اپنے پسماندہ گاؤں کی ترقی اور خوش حالی کے لیے کچھ کر سکے۔ بدقسمتی سے اس کے باپ کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے زیرِ سایہ تربیت دیتا۔ باپ کی وفات کے بعد ماں اور بہن نے اَن تھک محنت سے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کی لیکن یہاں ایک بار پھر قسمت انہیں مات دے گئی اور حالات کی ستم ظریفی سے وہ کتاب اور قلم کا ساتھ چھوڑ کر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی زندگی کے کئی قیمتی برس حالات کے انہی تھپیڑوں کو سہتے ہوئے گزر گئے تھے۔ اور اسے جس گاؤں کی خوش حالی کے لیے کام کرنا تھا، وہاں قدم رکھنے سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ اب ماہ بانو کے زندگی میں آجانے سے اسے یہ سنہری موقع ملا تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنی زندگی کو بدل سکے چنانچہ وہ ہر حال میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوشاں تھا۔ ابتدا میں ہی حامد راؤ جیسے شخص سے واسطہ پڑنے کی وجہ سے اس کے دل میں یہ خوش امیدی بھی پیدا ہو گئی تھی کہ آگے بھی قدرت اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دے گی۔

"آپ دونوں کا کھیل دیکھ کر تو مجھے لگ رہا ہے کہ رات بھر میں بھی ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے میرے خیال میں بہتر ہے کہ پہلے کھانا کھا لیا جائے پھر اگر آپ لوگ چاہیں تو اپنا کھیل جاری رکھ سکتے ہیں۔" خیالات میں ڈوبے ہونے کے باوجود اس کا کھیل پر ارتکاز کم نہیں ہوا تھا، تب ہی مقصود کے ٹوکنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے پیٹ میں مروڑ اٹھنے

کے باوجود وہ وہاں جم کر بیٹھنے پر مجبور ہو۔ اسے بے ساختہ ہی ہنسی آگئی۔

"چلو اسلم میاں! اس کے کہنے پر کھانا کھا لیتے ہیں ورنہ یہ اسی طرح یہاں بیٹھ کر جلتا رہے گا۔" حامد راؤ نے بھی بیٹے کے تاثرات ملاحظہ کیے تھے اور اب اسے چھیڑنے والے انداز میں اسلم سے مخاطب تھے۔

"مجھے جلنے کڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے آپ لوگوں کو ٹوکا ہے کہ اسلم بھائی نے دوپہر کا کھانا کھانے کے بجائے صرف چائے پر اکتفا کیا تھا۔ پھر صبح ہی ہمیں سفر پر نکلنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ رات کا کھانا وقت پر کھا لیا جائے۔" مقصود نے فوراً ہی وضاحت پیش کی جسے سن کر حامد راؤ بوکھلا گئے۔

"ارے بھئی یہ کیا؟ تم نے دوپہر کا کھانا کیوں نہیں کھایا؟ اور تم بھی یہ بات اب بتا رہے ہو۔ اگر ایسا کوئی معاملہ تھا تو کھانا اور بھی جلدی لگوا لینا چاہیے تھا۔" وہ اسلم سے بات کرتے کرتے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسے سرزنش کرنے لگے۔

"آپ فکر نہیں کریں، میں نے بے شک کھانا نہیں کھایا لیکن چائے کے ساتھ بھی مقصود نے اتنا کچھ کھلا دیا تھا کہ پیٹ اچھا خاصا بھر گیا ہے۔ البتہ مقصود کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ہمیں رات کا کھانا کھا لینا چاہیے۔ صبح سفر کے لیے نکلنا ہے اس لیے مقصود کا بھرپور نیند لینا ضروری ہے ورنہ اسے ڈرائیو کرنے میں مشکل ہوگی۔" اسلم نے فوراً ہی مقصود کی حمایت کی ذمّے داری سنبھال لی جس پر حامد راؤ کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ کھانا کھانے کا پروگرام طے ہو جانے کے بعد بساط سمیٹ لی گئی کیونکہ حامد راؤ نے اس کے ساتھ کھیل کا لطف آنے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ سفر تو اسلم کو بھی کرنا ہے اس لیے رات کو جاگ کر کھیلنے کے بجائے اس کا آرام کرنا بھی ضروری ہے، کھیل جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ بساط سمیٹ کر وہ لوگ منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر واپس وہاں آکر بیٹھے تو مقصود کھانے کے برتن وغیرہ سجانے کا آغاز کر چکا تھا۔ کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا گیا تھا چنانچہ زنان خانے سے یہاں تک کھانا لانے کے لیے اسے کئی چکر لگانے پڑے۔ اسلم کو اندازہ تھا کہ وہ بے چارہ اس کی وجہ سے اس مشقت میں پڑ گیا ہے ورنہ وہ اور حامد راؤ تو ظاہر ہے گھر والوں کے ساتھ ہی کھاتے پیتے ہوں گے اور اس صورت میں دسترخوان پر کھانا چننے کی ذمّے داری خواتین کے سر ہی ہوتی ہوگی۔ اس نے زبان سے بھی مقصود کو اپنی وجہ سے ہونے والی اس زحمت کا اظہار کر دیا جسے سن کر حامد راؤ فوراً ہی بول پڑے۔

"زحمت کیسی؟ یہ میرا بیٹا ہے اور مہمان نوازی کی روایت اسے مجھ سے ورثے میں ملی ہے۔ تم یہ گمان نہ کرو کہ صرف تمہاری خاطر یہاں کچھ انوکھا ہو رہا ہے۔ اللہ کے فضل سے اکثر و بیشتر ہی ہمارے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی مہمان موجود ہوتا ہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ عام دنوں میں یہ سارے کام جو اس وقت تمہیں مقصود کرتا ہوا نظر آرہا ہے، ایک ملازمہ انجام دیتی ہے۔ صبح ناشتے کے وقت تم نے اس ملازمہ کو دیکھا بھی ہوگا۔ گھر کی خواتین کی مدد اور زنان خانے سے مردانے تک بھاگ دوڑ کی ذمّے داری صبح سے شام تک اسی کے سر ہوتی ہے لیکن آج اتفاق سے اس بے چاری کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی چھٹی لے کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔" حامد راؤ کے اس جواب نے اس کی ہر الجھن دور کر دی ورنہ اس کے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ صبح نظر آنے والی ملازمہ دوبارہ کیوں نظر نہیں آئی اور مقصود کو ہی سارے کام کیوں انجام دینے پڑ رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ اپنے میزبانوں کی دعوت پر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا خوش رنگ، خوشبودار اور خوش ذائقہ تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد لیمو والی سبز چائے کی پیالیاں پیش کی گئیں جس سے کھانے کا لطف دوبالا ہو گیا۔ وہ فارغ ہو کر اس محفل سے اٹھا تو بہت سرشار تھا اور سرشاری کے اس احساس کے ساتھ بے حد مگن سا اپنے لیے مخصوص کیے گئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ابا جی کہ اچانک اماں کو کیا ہو گیا تھا۔ میری جب ان سے آخری بار بات ہوئی تھی تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ انہوں نے مجھ سے اپنی کسی تکلیف کا ذکر نہیں کیا تھا پھر بالکل اچانک ہی ایسا کیا ہو گیا کہ انہیں علاج کے لیے لندن بھجوانا پڑا اور وہ وہاں بھی جانبر نہیں ہو سکیں۔ اتنے قابل ڈاکٹر ہیں لندن میں، ان میں سے کسی کو اماں کی بیماری سمجھ نہیں آئی۔ آپ کو مجھے پہلے سے بتانا تو چاہیے تھا۔ میں خود لندن آتا اور وہاں آ کر ڈاکٹروں سے بات کرتا۔" یہ مراد شاہ تھا، چودھری افتخار عالم شاہ کا بڑا بیٹا اور وارث جو ماں کے اچانک چل بسنے کی خبر سن کر فون پر باپ سے شکوے کر رہا تھا۔

"بس پتر۔۔۔ کیا کر سکتے ہیں۔ بیماری اور موت پر آدمی کا زور تھوڑی چلتا ہے۔ تیری ماں کو اچانک ہی بیماری نے اس طرح لپیٹ میں لیا کہ دنوں میں ہی اس کا حال خراب ہو گیا۔ میں نے تو اسے بچانے کے لیے اپنی پوری کوشش کر ڈالی۔ جھٹ پٹ لندن بھی بھجوا دیا لیکن جب آدمی کا وقت پورا ہو جائے نا تو ساری دنیا کی طاقتیں مل کر بھی اس کی زندگی نہیں بڑھا سکتیں۔ ملک الموت جب روح قبض کرنے آ جائے تو فیر خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔" وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔ لندن کے چند روز قیام میں اس نے اپنے لیے دل بھر کر خوشیاں کشید کی تھیں۔ مسٹر الفا کی وجہ سے وہ ایک بار ضرور لنڈا سے محروم ہوا تھا لیکن اس کے بعد لنڈا نے پوری دو راتیں اس کے ساتھ گزاری تھیں۔ لنڈا کی لندن سے روانگی کے بعد بھی وہاں حسن و شباب کی کوئی کمی نہیں تھی چنانچہ وہ خوب جی بھر کر عیش کرتا رہا تھا۔ ادھر پاکستان اور امریکا میں اس کے بچے اپنی ماں کی طرف سے فکرمند تھے لیکن اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ روانگی والے دن تک کسی کو وڈی چودھرائن کے مرنے کی اطلاع نہیں دی تھی اور کوشش کرتا تھا کہ کم ہی کسی کی فون کال اٹینڈ کرے۔ کبھی کسی سے بات کر بھی لیتا تھا تو

طفل تسلیاں دے ڈالتا تھا۔ اب اچانک اس کی طرف سے چودھرائن کے مرنے کی اطلاع پہنچنے پر سب ہی صدمے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مراد شاہ نے اس المیے کا سب سے گہرا اثر لیا تھا کیونکہ وہ بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ماں کا بہت لاڈلا بھی تھا اور پھر اسے یہ خلش بھی تھی کہ طویل عرصے سے دیارِ غیر میں قیام کی وجہ سے وہ جیتی جاگتی ماں کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔

"آپ کی ہر بات ٹھیک ہے ابا جی لیکن دل میں خلش سی ہے کہ کچھ نہیں تو کاش آخری دنوں میں مجھے اماں کی خدمت کا موقع ہی مل جاتا۔ آپ نے مجھ پر یہ بڑا ظلم کیا کہ آخر تک اصل صورتِ حال سے آگاہ ہی نہیں کیا۔" مراد شاہ اس سے شکوے کر رہا تھا۔ اب وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس نے خصوصیت کے ساتھ اسے بے خبر رکھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ ایک مراد شاہ ہی تھا جو اصل صورتِ حال جاننے کے لیے لندن پہنچنے کی کوشش کرتا اور اس کے لندن آنے کا مطلب تھا کہ چودھری کے جھوٹ کا سارا پول کھل جاتا چنانچہ آواز پر رقت طاری کرتے ہوئے مکاری سے بولا۔

"تو جسے ظلم کہہ رہا ہے نا پتر وہ میری محبت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس تکلیف سے میں دن رات گزر رہا ہوں، میری اولاد بھی اس میں مبتلا ہو۔ مجھے تو تیرا اور تیری بہنوں کا اتنا خیال ہے کہ میں نے تیری ماں کے مرنے کے بعد بھی فوراً اطلاع اس لیے نہیں دی کہ میت کے پاکستان پہنچنے تک تم لوگ انتظار کی سولی پر لٹکے رہو گے۔ میں تنہا اپنی جان پر سب سہتا رہا لیکن تم لوگوں کو پریشان کرنا گوارا نہیں کیا۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ برسوں سے زندگی کے دکھ سکھ میں شریک گھر والی کے بچھڑ جانے پر میرا کیا حال ہے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ دن رات بس بستر پر پڑا روتا رہوں لیکن تیری ماں کو پاکستان لے جانے کے لیے دوڑ دھوپ بھی تو کرنی تھی۔ روتے بلکتے دل کے ساتھ میں نے یہ کام کیسے نبیڑا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔" اپنی بات میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے وہ آخر میں بلک بلک کر رونے کی اداکاری بھی کرنے لگا۔ فون کے دوسری طرف موجود بیٹا اس کی آواز ہی سن سکتا تھا، تصویر تو اس کے سامنے تھی نہیں جو حقیقت جان سکتا چنانچہ اس صورتِ حال پر بوکھلا گیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

"میرا مقصد یہ نہیں تھا ابا جی! اگر میری کسی بات سے آپ کا دل دکھا ہے تو میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں تو بس اپنے دل کی خلش کی بات کر رہا تھا ورنہ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کو اماں کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔"

"چل چھڈ اس گل کو۔ یہ بتا کہ تو حویلی کب تک پہنچے گا؟ تو آئے گا، تب ہی تیری ماں کی تدفین ہو گی۔ کچھ نہیں تو بدنصیب بیٹے کے ہاتھوں قبر میں ہی اتر جائے گی۔ تیرے ولایت رہنے پر ہمیشہ یہی خوف رہتا تھا اسے کہ جانے پتر جنازے کو کندھا دینے بھی آئے گا یا نہیں۔" بیٹے کے بوکھلا جانے پر اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ اس سے مزید باز پرس نہیں کر سکے گا چنانچہ بے حد ہوشیاری سے ایک ایسی بات کہہ ڈالی جسے سن کر اس کے دل کا بوجھ مزید بڑھ جائے، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ بے حد دبنگ اور ظالم وڈی چودھرائن کو کبھی مرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا جو وہ اس قسم کی باتیں کرتی۔ وہ تو بڑے ٹھسے سے حویلی پر حکمرانی کر رہی تھی کہ اچانک ہی اپنی ایک غلط چال کے نتیجے میں چودھری کے عتاب کا شکار ہو کر دنوں میں اپنی جان سے چلی گئی۔ اس نے تو اپنی طرف سے بڑی عقلمندی دکھائی تھی کہ بہزاد شاہ کی نام نہاد بیوی فریدہ کو حمل کے انتہائی نازک موڑ پر حادثاتی طور پر مروانے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے بطن سے حویلی کا کوئی نیا وارث جنم نہ لے سکے اور ساری جائداد اس کی اولاد کے حصے میں ہی آئے۔ اتفاق سے اس کی یہ سازش ناکام رہی اور فریدہ سیڑھیوں سے گرائے جانے کے باوجود نہ صرف خود زندہ رہی بلکہ اس کا بچہ بھی بچ گیا۔ ادھر وڈی چودھرائن کے ستارے گردش میں تھے کہ چودھری کو اس سازش کی خبر مل گئی اور اس نے اسے فریدہ کے ساتھ ظلم سے زیادہ اپنے ساتھ دھوکا دہی پر محمول کرتے ہوئے چودھرائن کو تہ خانے کی ہولناک قید میں ڈال دیا جہاں ناقص غذا، آلودہ پانی، سیلن اور بے آرامی نے اسے فوراً ہی بیمار کر ڈالا۔

غیظ و غضب میں اس کے ساتھ یہ سلوک کرنے والے چودھری کو ذرا ہوش آیا تو یہ احساس ہوا کہ قید خانے سے آزادی ملنے کی صورت میں چودھرائن اس کے ساتھ بغاوت پر اتر آئے گی اور اپنے میکے والوں کی مدد سے اس کا ناک میں دم کر دے گی۔ اس پریشانی سے بچنے کا بہترین حل یہی تھا کہ چودھرائن کی زندگی ختم کر دی جائے۔ چنانچہ اس نے بہت ہوشیاری سے سارا کھیل کھیلا۔ چودھرائن کے حویلی سے غیاب کو چھپانے کے لیے وہ پہلے ہی اس کے لاہور اور پھر وہاں سے لندن منتقل ہونے کی کہانی سنا چکا تھا چنانچہ جب ڈیوڈ کی طرف سے اسے لندن جانے کا حکم ملا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے لندن میں چودھرائن کے مرنے کا ڈراما بھی رچانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ اس طرح حویلی کے تہ خانے میں ہلاک کی جانے والی چودھرائن کو نہایت رازداری

سے ایک مردہ خانے میں منتقل کرنے کے بعد یہ ظاہر کرنے کا بندوبست کر لیا گیا کہ چودھری افتخار عالم شاہ بہ نفسِ نفیس اپنی بیوی کے تابوت کے ساتھ لندن سے پاکستان واپس آ رہا ہے۔ اس کا دستِ راست منشی اللہ رکھا اس سازش میں پوری طرح اس کے ساتھ شامل تھا اور اتنی بھرپور معاونت کر رہا تھا کہ اسے کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں تھا۔

"میں کوشش میں تو لگا ہوا ہوں کہ جلد سے جلد گاؤں پہنچ جاؤں لیکن پھر بھی مجھے پہنچنے میں دو سے تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔" اس کی مکاریوں سے بے خبر مراد شاہ نے دھیرے سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ چودھری نے اس پر جو نفسیاتی دباؤ ڈالا ہے، وہ پوری طرح اس کے زیرِ اثر آ گیا ہے اور فی الحال باپ کے ساتھ کسی قسم کی جرح نہیں کر سکتا۔

"تو فیر ٹھیک ہے پتر! اب حویلی میں ہی تجھ سے ملاقات ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تیری بہشتن ماں کی روح تجھے حویلی میں دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔" نرمی سے بولتے ہوئے وہ بیٹے کو ایک اور چرکا لگانے سے باز نہیں آیا۔ اگرچہ جوان بیٹے سے اس موضوع پر بات کرنے میں اسے دانتوں پسینا آ گیا تھا لیکن تجربے اور عیاری سے اس نے بیٹے کو اس طرح قابو کیا تھا کہ اس کی بنائی گئی کہانی میں کئی جھول ہونے کے باوجود وہ اس سے زیادہ بحث نہیں کر سکا تھا اور آئندہ بھی وہ ایسا کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

رنجیدہ اور شرمسار مراد شاہ نے جب اس سے اختتامی جملے بول کر فون بند کیا تو کچھ دیر قبل رقت زدہ نظر آنے والے چودھری کے ہونٹوں پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس برطانوی کال گرل کی طرف واپس پلٹا جو اردو سے ناواقفیت اور بوریت کے باعث وہسکی سے شغل میں مصروف تھی۔ کال گرل اسے فارغ ہوتے دیکھ کر فوراً ہی اپنی پیشہ ورانہ اداؤں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھنے کے ساتھ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے رخساروں اور تھوڑی پر بڑھے ہوئے شیو کو سہلانے لگی۔ یہ شیو اس نے قصداً بڑھائی تھی تاکہ جب وہ پاکستان پہنچے تو زیادہ الم زدہ اور تھکا ہوا محسوس ہو۔ اس بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ جب وہ سرخ آنکھوں اور مضمحل کیفیت میں پاکستان پہنچتا تو اس کی اولاد کو کیسے یقین نہیں آتا کہ ان کا باپ ان کی ماں کی دیکھ بھال میں دن رات مصروف رہا تھا اور اب اس کے مرنے پر غم سے بے حال تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ آنکھوں کی یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرخی بے تحاشا شراب نوشی اور تھکن کال گرلز کے ساتھ گزری راتوں کا تحفہ تھی۔

اب بھی اس کی روانگی میں محض چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ پھر بھی وہ اس کال گرل کے ساتھ مصروف تھا۔ شاید لندن سے روانہ ہونے سے قبل وہ یہاں سے کیف و سرور کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر پی لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ اب حویلی میں بہت سے بے کیف دن اور راتیں اس کی منتظر ہوں گے۔ وڈی چودھرائن کی تدفین کے بعد بھی وہاں افسوس کے لیے آنے والیوں کا جو تانتا بندھنا تھا، اس سے آسانی سے جان چھوٹنی مشکل تھی۔ پھر دوسرا مسئلہ مراد شاہ کا بھی تھا۔ جو ..... چودھریوں سے کافی مختلف مزاج رکھنے والے بیٹے کی موجودگی میں وہ کھل کر عیش نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے آنے والے قحط کا سوچ کر خوب خوب موجیں کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے کمرے میں موجود حسینہ کچھ ایسی خاص حسین نہیں تھی لیکن وہ اس کی گوری چمڑی اور سنہری زلفوں کے باعث اس پر نثار ہوا جا رہا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور صلاحیت کا مظاہرہ کرتی وہ کال گرل جو اس سے خود ہی آچمٹی تھی، اسے من مانیوں کے لیے خوب ہی چھوٹ دے رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ اس کمرے سے رخصت ہوگی تو طے شدہ معاوضے کے علاوہ بھی ایک بڑی رقم اس کے پرس میں منتقل ہو چکی ہوگی۔ اس کے تجربے نے اسے سکھایا تھا کہ ان مشرقی جاگیرداروں کے لیے سفید چمڑی والی عورتیں کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتیں۔ وہ ان پر جی بھر کر لٹاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اداؤں سے کام لے کر چودھری کو زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی کوشش میں تھی۔ اگر ادائیں کم پڑ جاتیں تو عقل خبط کرنے کے لیے شراب کی بھری ہوئی بوتل بھی وہاں موجود تھی۔ یعنی شکار اس کے سامنے پوری طرح بے بس تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ دن رات اپنے مزارعوں کا خون پی کر اپنی تجوریاں بھر لینے والے ہوس پرست چودھری کو اس پر چند ہزار پاؤنڈ خرچ کرنے کے بعد کوئی دکھ نہیں ہونے والا تھا کیونکہ اب تو اس کالے دھن میں ہیروئن سے حاصل ہونے والی خطیر آمدنی بھی شامل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شکم پری کے بعد اسلم بڑی موج میں اپنے لیے مخصوص کمرے کی طرف بڑھا تھا لیکن کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے بڑی زور کا جھٹکا لگا۔ وہ ڈبل بیڈ جس پر اب تک وہ سوتا رہا تھا، اس وقت ماہ بانو کے زیرِ تصرف تھا اور وہ مزے سے سینے تک چادر تانے وہاں سو رہی تھی۔ اس کی یہاں موجودگی پر وہ آنکھیں مل مل حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے شک سا ہو رہا تھا کہ خمارِ گندم کہیں اس کے دماغ پر تو طاری نہیں ہو گیا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے بھی ماہ بانو کو اپنے بستر پر دیکھ رہا تھا، ورنہ خواب میں تو خیر وہ ہر روز اس کے پہلو میں سوتی ہی تھی۔ اس کی اس بے یقینی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ماہ بانو تیزی سے بستر پر اٹھ بیٹھی۔ یقیناً دروازہ کھولے جانے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ خود حیران پریشان سی اپنے سامنے موجود اسلم کو دیکھ رہی تھی۔

’’تم یہاں اس کمرے میں کیا کر رہی ہو؟‘‘ آخر اسلم نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور اس سے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔

’’سو رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں؟‘‘ کچی نیند سے جاگنے کے باعث اس کی سیاہ آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور وہ کچھ جھنجلائی ہوئی لگ رہی تھی۔

’’یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تم یہاں کیوں سو رہی ہو؟ یہ کمرا تو میرے لیے مخصوص ہے۔‘‘ اسلم نے اپنے سوال کو مزید واضح کیا۔

’’لیکن انیلا نے تو یہ کمرا مجھے سونے کے لیے دیا ہے، وہ خود مجھے اس کمرے تک چھوڑ کر گئی ہے۔‘‘ اس نے تردد سے جواب دیا۔

’’حیرت ہے۔‘‘ اسلم نے اپنی پیشانی کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسلا۔ ’’یہ کمرا میرے لیے مخصوص ہے، ناشتے کے بعد میں شام تک اسی کمرے میں سوتا رہا ہوں اور اب بھی کسی نے کوئی ذکر نہیں کیا کہ کوئی تبدیلی کر دی گئی ہے۔ پھر میرا کمرا تمہیں کیوں دے دیا گیا؟‘‘ وہ واقعی حیران تھا۔

’’میں کیا کہہ سکتی ہوں۔‘‘ ماہ بانو بھی بے یقینی سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

’’تم دن میں کہاں آرام کر رہی تھیں؟ ایسا کرو کہ اب بھی واپس وہیں جا کر سو جاؤ۔‘‘ اسلم کے ہاتھ گویا اس مسئلے کا حل آ گیا۔

’’دن میں زیادہ دیر سوئی ہی نہیں، صرف ڈھائی تین گھنٹے کی نیند لی تھی اور اس کے لیے انیلا نے مجھے اپنا بیڈ روم دے دیا تھا۔ اب میں وہاں جا کر تو نہیں سو سکتی۔ ظاہر ہے اس وقت بیڈ روم میں اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی موجود ہوگا۔‘‘ نیند خراب ہونے پر برے برے منہ بناتے ہوئے ماہ بانو نے رکھائی سے جواب دیا جسے سن کر یکدم ہی اسلم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور ساری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے ان لوگوں سے ماہ بانو کو اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف

کروایا تھا اور اس تعارف کے بعد ان دونوں کو شب بسری کے لیے ایک کمرا مہیا کیا جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ان کے میزبانوں نے تو ایک طرح سے انہیں بہترین سہولت فراہم کی تھی لیکن وہ دونوں مشکل میں پڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے ذہن میں آنے والا خیال ماہ بانو کے بھی گوش گزار کرایا۔

’’تمہیں اس قسم کا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟‘‘ وہ سن کر جھلائی۔

’’ضرورت یہ تھی کہ میں حقیقت بتا کر تمہیں اور خود کو ان لوگوں کے سامنے مشکوک نہیں ٹھہرانا چاہتا تھا، ورنہ تم خود ہی سوچو کہ کسی غیر مرد کے ساتھ ماری ماری پھرنے والی عورت کے بارے میں یہ لوگ کس انداز میں سوچتے؟ میرے خیال میں کسی مشکوک کردار کی عورت کو اپنے زنان خانے تک جانے کی اجازت دینا تو دور کی بات، یہ تمہیں اپنی چھت کے نیچے ایک رات بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس وقت ہم یہاں معزز مہمانوں کی حیثیت سے رہ رہے ہیں تو شفقت راؤ کی سفارش کے علاوہ ہمارا غیر مشکوک کردار بھی اس سلسلے میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔‘‘ اس بار وہ اپنے لہجے میں تلخی در آنے سے نہ روک سکا۔ ماہ بانو نے اس تبدیلی کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور شرمندہ سی ہو گئی۔ ویسے بھی نیند کے خمار میں ہونے کی وجہ سے اس کا ذہن وہ حقائق سمجھنے سے قاصر رہا تھا جو اسلم نے فوراً ہی اخذ کر لیے تھے چنانچہ فوراً ہی اپنے رویے کی خرابی کے لیے اس سے معذرت طلب کر لی۔

’’معذرت کی ضرورت نہیں، مجھے تمہاری کٹ حجتی سے بس یونہی ہی ذرا سا غصہ آ گیا تھا ورنہ میرے لیے تمہاری طرف سے دل میں کدورت رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔‘‘ وہ فوراً ہی نرم پڑ گیا۔

’’اب یہ سوچو کہ ہم کیا کریں۔ میں تو اس طرح یہاں نہیں سو سکتی۔‘‘ اس کا موڈ بحال ہوتے دیکھ کر وہ تیزی سے فوری درپیش مسئلے کی طرف آ گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسلم کے مقابلے میں اس نے دن میں بہت کم آرام کیا تھا اور حامد راؤ کی بیوی اور بہو کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہی تھی اس لیے اس وقت اسے بہت زوروں کی نیند آ رہی تھی۔

’’ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں بیٹھک میں جا کر سو جاؤں لیکن گھر کے کسی فرد نے مجھے وہاں سوتے ہوئے دیکھ لیا تو کوئی اچھا تاثر نہیں ہوگا۔ وہ لوگ یہی گمان کریں گے کہ ہم اتنے جاہل اور اجڈ میاں بیوی ہیں کہ دوسروں کی چھت کے نیچے بھی جھگڑنے اور پھر اپنے جھگڑے کو کمرے کی چار دیواری تک محدود رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔‘‘ اسلم نے معاملے کی نزاکت کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

’’لیکن میں تمہارے ساتھ تنہا اس کمرے میں نہیں سو سکتی۔‘‘ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

’’کیوں؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟ اتنے دنوں کے ساتھ میں تمہیں میرے کردار کے بارے میں اتنا تو یقین ہو ہی جانا چاہیے کہ میں دھوکے سے تمہاری آبرو پر ہرگز بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اگر مجھے ایسے کرنا ہوتا تو ڈیرے پر مجھے کھلی چھوٹ حاصل تھی۔ پھر ان ویران پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے بھی کئی ایسے موقع آئے کہ میں تم پر قابو پا سکتا تھا۔ اس ویرانے میں میرا ہاتھ روکنے والا کون تھا؟ تم خود بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتی ہو کہ اگر میں من مانی پر آ جاتا تو تمہارے اندر میرے مقابلے میں مزاحمت کی طاقت نہیں تھی۔ اگر اتنے عرصے تک میں نے اپنی طاقت اور خودمختاری کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی تو اس ایک رات میں کیا قیامت آ جائے گی؟ تم مجھ سے شادی کے لیے ہامی بھر چکی ہو اور آج نہیں تو کل مجھے تمہارے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہے پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ جائز طریقے سے حاصل ہو جانے والی چیز کو حرام کر کے کھاؤں۔‘‘ اس نے غصے میں بولنا شروع کیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ اس بار ماہ بانو نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور سر سے پیر تک چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اسے اسلم کے اس کمرے میں سونے پر اعتراض نہیں ہے اور وہ اس کے دیے ہوئے دلائل سے قائل ہو گئی ہے۔ اس کی اس حرکت پر اسلم نے اسے گھور کر دیکھا لیکن سر سے پیر تک چادر میں محصور ماہ بانو کے لیے یہ گھورنا بیکار تھا۔ وہ زمین پر دھب دھب پیر مارتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ وہاں اپنے چہرے پر پانی کے کئی چھپاکے مارنے کے بعد اس کا مزاج اعتدال پر آیا تو وہ واپس کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں اس ڈبل بیڈ کے علاوہ جس پر ماہ بانو محوِ استراحت تھی، کوئی دوسرا ایسا فرنیچر نہیں تھا جسے وہ شب بسری کے لیے استعمال کر سکتا۔ بس فرش پر ایک پتلا سا کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ اس نے اسی کارپیٹ پر شب بسری کا فیصلہ کیا کیونکہ اسے اپنے کردار کی مضبوطی پر لاکھ یقین سہی، وہ ماہ بانو کے ساتھ بیڈ پر سونے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے خود بھی معلوم تھا کہ آگ اور تیل کی اس قدر قربت کسی ارادی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمل کے بغیر بھی تباہی لاسکتی ہے۔ اس نے بیڈ پر موجود دوسرا تکیہ اٹھایا اور نیچے کارپیٹ پر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ جب کمرے میں آیا تھا تو وہاں کی روشنیاں پہلے ہی سے گل تھیں اور نائٹ بلب کی ہلکی سی خواب آور روشنی نے ماحول کو سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ اس سحر نے پہلے مرحلے پر اسے اس لیے نہیں گھیرا تھا کہ وہ بالکل غیر متوقع طور پر ماہ بانو کو وہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا اور ان کا سارا وقت صورتِ حال پر تبادلہ اور بحث مباحثہ کرتے ہوئے گزر گیا تھا۔ اب جو وہ ذرا سکون سے لیٹا تو کمرے کے خوابیدہ ماحول نے اسے اپنے سحر میں جکڑنا شروع کر دیا۔ ابھی تک وہ کارپیٹ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ تبدیل ہوتی ذہنی و قلبی کیفیت نے اسے اکسایا کہ وہ کروٹ لے کر ماہ بانو کی طرف رخ کر لے۔ کروٹ لینے کے بعد اس نے آنکھوں کی جھری سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ نیچے لیٹے ہونے کی وجہ سے وہ واضح طور پر ماہ بانو کو نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن اتنا بہرحال پتا چل رہا تھا کہ وہ اب تک سر سے پیر تک اوڑھی گئی چادر کے حصار میں چھپی ہوئی ہے اور اس احتیاطی تدبیر کے باوجود اندرونی بے چینی کے باعث سونے سے محروم ہے۔ اس بار اس نے غصے میں مبتلا ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے ماہ بانو کی کیفیت پر غور کیا تو وہ اسے اپنے طرزِ عمل میں حق بجانب نظر آئی۔ کسی بھی عورت کے لیے اس کی عزت کے آب دار موتی سے زیادہ قیمتی شے کوئی نہیں ہوتی۔ یہ موتی کسی زبردستی، مجبوری یا حادثے کے نتیجے میں اپنا آپ کھو بیٹھے تو عورت پل میں انمول سے بے مول ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اگر اپنے بے مول ہو جانے سے ڈر رہی تھی تو یہ ایسی کوئی بات نہیں تھی جسے محسوس کر کے وہ اس پر غصہ کرتا۔

اس نے اپنے جن دلائل کی مدد سے اسے یہاں سوئے رہنے پر آمادہ کر لیا تھا، اس کمرے کی نیلگوں اور خوابیدہ فضا میں خود اسے ہی بودے معلوم ہونے لگے تھے۔ یہ آرام دہ بند کمرا ڈاکوؤں کے ڈیرے یا پہاڑی سلسلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر اگر آزادی اور خواہش کے باوجود اس نے ماہ بانو کو نہیں چھوا تھا تو اس عمل میں ماہ بانو کی عزت و تکریم کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی کارفرما تھا کہ اس کے ساتھی ڈاکوؤں پر عرصے سے اس کی راست بازی اور اعلیٰ کردار کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جسے وہ مٹانا نہیں چاہتا تھا۔ رہا پہاڑی سلسلے میں سفر کا معاملہ تو ایسے مخدوش حالات میں جبکہ بندے کی اپنی جان پر بنی ہوئی ہو ایسی خرمستیاں کب سوجھتی ہیں؟ اس کا اصل ماحول تو یہاں اس پُرتعیش کمرے میں شروع ہوا تھا جہاں کی رومان پرور فضا مسلسل اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے اس نے فوراً ہی مخالف سمت کروٹ لے لی۔ اب ماہ بانو اس کی نظروں سے اوجھل تھی پھر بھی وہ کمرے میں اس کی مہک کو محسوس کر سکتا تھا۔ خود پر بے انتہا جبر کرتے ہوئے وہ اپنا دھیان اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کوشش میں کتنا وقت گزرا اس کا تو اسے اندازہ نہیں ہوا لیکن یہ طے تھا کہ ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزرا تھا اور وہ باوجود کوشش کے ایک بار بھی پلک تک نہیں جھپکا سکا تھا۔ شاید اس میں کچھ دخل دن میں لی جانے والی بھرپور نیند کا بھی تھا۔ بہرحال جو بھی بات تھی، اب اس کے لیے ایک ہی پہلو پر لیٹے رہنا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی اس کی نظر ماہ بانو کے بستر کی طرف گئی۔ وہ بالکل بے خبر سو رہی تھی۔ شاید بے چینی اور اضطراب پر نیند کی شدت غالب آگئی تھی جس نے اسے مزید جاگنے نہیں دیا تھا اور سوتے میں وہ چادر کی قید سے بھی آزاد ہو گئی تھی۔ اسلم اسے اس حالت میں دیکھ کر گنگ رہ گیا۔ ڈبل بیڈ پر پڑے اس کے جسم کے سارے نشیب و فراز اور خال و خد نیلگوں روشنی کی انعکاس کے ساتھ عجب ہی سحر پیدا کر رہے تھے۔ اس کا دل بہت شدت سے ماہ بانو کے قرب کے لیے مچلا مگر اس سے قبل کہ ضبط کے بندھن ٹوٹتے وہ بدحواس سا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کسی بدترین جرم سے بچنے کے لیے فی الحال یہی مناسب تھا۔ باہر نکلنے کے بعد وہ یونہی برآمدے میں آگے بڑھ رہا تھا کہ سیڑھیوں پر نظر پڑ گئی۔ مقصود پہلے اس کے استفسار پر اسے بتا چکا تھا کہ یہ سیڑھیاں چھت پر جاتی ہیں جہاں ان کے پالتو آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بنا سوچے سمجھے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا جہاں رات کی لحہ بہ لحہ ٹھنڈی ہوتی ہوا نے اس کے جلتے بدن پر حیرت انگیز اثر کیا اور وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے چھت پر ہی ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ چند منٹ کے لیے چھت پر کھنچی باؤنڈری وال کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور دیوار کی منڈیر پر ہتھیلیاں جما کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اسے کھڑے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ وہ بری طرح چونک گیا یقینی طور پر وہ کچھ انسانی سائے ہی تھے جو حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یومِ تقدیر

عکسِ فاطمہ

ہر شخص کی زندگی میں ایک یادگار دن ضرور موجود ہوتا ہے... جسے دریافت کرنے کی دیر ہوتی ہے... وہی دن اس کی تقدیر کا خاص دن ہوتا ہے... ایک ایسے ہی بچے کی زندگی کے نشیب و فراز جسے ایک خاص دن کی خاص ملاقات نے ماہر کھلاڑی بنادیا...

اس منہ زور شخص کا ماجرا جو جرم اور قانون کے شکنجے میں جکڑتا چلا گیا

میرا پختہ یقین ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں ایک دن تقدیر کا ہوتا ہے۔ یہ دن آتا ضرور ہے لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ کب آئے گا۔ تقدیر کا پہیا چلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گھومتے گھومتے تقدیر کا وہ خاص دن ہماری زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر پوری زندگی کا رُخ پلٹ دیتا ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں تقدیر اور خوش بختی پر یقین نہیں لیکن میرے پاس اس پر یقین کرنے کے لیے ٹھوس دلائل ہیں۔ اسی لیے کہ میرا تقدیر کے ایک 'خاص دن' پر پکا یقین ہے۔ کچھ لوگ اسے اتفاق مانتے ہیں، بعض اسے حادثات کا نام دے دیتے ہیں اور مجھ جیسے لوگ اسے تقدیر کا لکھا تسلیم کرتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اچانک کچھ ایسا ہو جاتا ہے جو انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا اور پھر زندگی کا بہاؤ کسی اور سمت ہو جاتا ہے۔ وہ سمت جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود زندگی اسی رخ پر چل پڑتی ہے۔

پینتیس برس پہلے ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ 1923ء کے موسمِ گرما کی ایک شام تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک قتل ہوا جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے والی بروکلین

اسٹریٹ سے گزر رہا تھا۔ واردات کے بعد قاتل لڑکے نے مجھے اور میں نے اسے دیکھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو تکتے رہے اور پھر اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس وقت میری عمر بارہ برس تھی۔ وہ بھی میرا ہم عمر تھا۔ اس سے دوبارہ کبھی نہ ملنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس واقعے کے دوسرے دن میرا خاندان مین ہٹن منتقل ہو گیا اور میں پھر کبھی لوٹ کر وہاں نہ جا سکا۔

میرے ذہن نے کئی بار مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ میں واردات کا حصہ تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے تقدیر یہ سمجھاتی کہ نہیں تم صرف وہاں سے گزر رہے تھے۔ اُس نے جو کچھ کیا، اس کا ذمے دار وہی تھا، تم نہیں۔ وہ دن یقیناً اس لڑکے کا دن تھا جس کی پستول سے نکلی گولی نے اس کا ساتھ دیا، وہ کامیاب ہوا اور میں جو یہ سب کچھ دیکھ چکا تھا، اسے پکڑنے یا پکڑوانے کے بجائے اپنی راہ چل دیا۔ واقعی وہ دن اُس کی تقدیر کا دن تھا۔ اس نے جرم کیا اور عینی شاہد موجود ہونے کے باوجود اسے سزا نہ مل سکی۔ یہ بات میں کبھی نہیں جان سکا کہ آخر میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ کارتوسی پستول تھا جس میں ایک بار میں صرف ایک کارتوس ڈالا جاتا ہے اور وہ کارتوس چل چکا تھا۔ اگر میں اسے پکڑنے کی کوشش کرتا تو اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے کمزور تھا۔ اس کا پستول خالی تھا اور دوسری بار پستول میں کارتوس ڈالنے کے لیے وقت درکار تھا۔ بظاہر حالات اس کے مخالف تھے لیکن مجھے بعد کے برسوں میں یقین آ گیا کہ پینتیس برس قبل بیتا وہ دن اس لڑکے کی تقدیر کا خاص دن تھا اور اس شام مقدر کا شہنشاہ وہ تھا۔

☆☆☆

مجھے اس قتل کا پتا اخبار کے ذریعے چلا تھا۔ میں اور میری بیوی ایلس ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ وہ ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس نے اخبار موڑ کے میز پر رکھا اور کیتلی سے اپنے کپ میں کافی اُنڈیلنے لگی۔ اخبار اس طرح رکھا ہوا تھا کہ پہلے صفحے پر چھپی ہوئی بڑی سی تصویر میرے رُخ پر تھی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی میں نے تجسس سے اخبار اٹھایا اور سیدھا کر کے دیکھنے لگا۔ بڑا بھیانک منظر تھا۔ مقتول کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ منہ اتنا زیادہ کھلا ہوا تھا کہ حلق تک نظر آ رہا تھا۔ چہرہ خون میں لت پت تھا اور وہ آڑا ترچھا سڑک پر پڑا تھا۔ تصویر دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے جھرجھری آ گئی۔ ”بڑی بھیانک موت ہے۔“ میرے منہ سے اچانک یہ الفاظ نکلے۔ ایلس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے کافی کا مگ آہستہ سے میری طرف کھسکا دیا۔

میرے لیے اس تصویر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بس ایک تصویر تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ اس تصویر کی جلی سرخی جمی ہوئی تھی ”جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ قتل کر دیا گیا۔“ میں نے اخبار ایک جانب رکھ دیا اور کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ میں نے سامنے دیکھا۔ ایلس خاموشی سے اخبار کے اندرونی صفحات پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ میں مکمل خاموش تھا۔ ویسے بھی کسی کا قتل اور پھر مقتول کی بھیانک رنگین تصویر کوئی ایسا موضوع نہیں تھا کہ جس پر ناشتے کی میز پر بیٹھ کر میاں بیوی سیر حاصل اظہارِ خیال کر سکیں۔

چند لمحوں کے بعد نجانے کیوں میں نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا اور ایک بار پھر تصویر پر نظر جما دی لیکن اس بار میرا مقصد تصویر دیکھنا نہیں بلکہ اس کے نیچے لکھے ہوئے کیپشن کو پڑھنا تھا۔ تجسس انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ شاید اسی وجہ سے میں ایسا کرنے پر مجبور ہوا۔ کیپشن پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا اور میرے مگ سے کافی چھلکتے چھلکتے بچی۔ ”بروکلین میں جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ ایگی کیوواک کی لاش، جسے کل رات قتل کر دیا گیا۔“ کیپشن پڑھتے ہی میرے دماغ میں جیسے بجلی کوند گئی ہو۔ پہلے تو میرے لیے یہ تصویر اہمیت کی حامل نہیں تھی لیکن اب یہ میرے لیے اہمیت کی حامل بن گئی۔ کیپشن پڑھتے ہی میں اندرونی طور پر شدید جذباتی ہیجان سے دوچار ہو گیا۔

میں نے اپنے ہیجان کو ایلس کی نظروں سے چھپانے کے لیے خود کو بظاہر پُرسکون رکھنے کی کوشش کی اور تصویر کو ایک بار پھر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے کار میں بیٹھے ہوئے قتل کیا گیا تھا اور لاش کار کے اگلے دروازے کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ کھلا ہوا دروازہ بھی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ اب مجھے لگا کہ میں اسے پہچاننے میں غلطی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے آخری بار میں نے پینتیس برس قبل بروکلین اسٹریٹ پر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ نوعمر لڑکا تھا اور اب وہ پختہ عمر مرد۔ اتنا بڑا عرصہ گزر چکا تھا۔ اتنے طویل عرصے میں اگر کسی شخص کو نہ دیکھا ہو تو اس کا چہرہ ذہن کے نہاں خانوں میں دھندلانے لگتا ہے لیکن میں اسے اس وقت بھی پہچان چکا تھا جب کہ تصویر میں اس کا سارا چہرہ خون آلود تھا۔ لاش کے پاس ہی گولف بیگ پڑا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اُس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تقدیر کا 'خاص دن' یقیناً بہت طویل عرصے تک اُس کے ساتھ رہا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاندار کار، گولف بیگ۔۔۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کرنے کا خواہش مند تھا، اُس نے وہ سب کچھ پا لیا تھا۔

بروکلین میرا ماضی تھا، جسے میں تقریباً بھلا چکا تھا۔ میں وہاں پیدا ہوا اور بچپن بھی وہیں گزرا لیکن لڑکپن میں شہر آ جانے کے بعد میں چاہنے کے باوجود بھی کبھی لوٹ کر وہاں نہ جا سکا۔ مجھے وہاں کی ایک ایک چیز یاد تھی۔ بیس بال کے سارے میدان اور تمام گولف کلب یاد تھے۔ اس خبر نے مجھے ایک دم حال سے ماضی میں پہنچا دیا تھا۔ مدتوں بعد میں ایک بار پھر اپنے ماضی میں کھو چکا تھا۔ میری یادداشت تیزی سے اُلٹے رخ پر سفر کر رہی تھی۔ میرا دماغ ماضی کے اُس دور میں پہنچ کر ایک ایک چیز کو فلم کی طرح دکھا رہا تھا۔

”کیا بات ہے مسٹر والٹر وچل۔۔۔“ ایلس نے نہایت پُرسکون لہجے میں پکارا تو میرا انہماک ٹوٹ گیا۔ ”کہاں کھو گئے ہو۔“ میں نے اس کی طرف چونک کر دیکھا تو وہ ایک بار پھر اطمینان بھرے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”سوری۔۔۔ یہ تصویر دیکھ کر مجھے سخت دھچکا لگا ہے۔“ میں نے اخبار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے جانتا ہوں۔“

”کیا۔۔۔ کیا کہا تم نے۔۔۔ اسے جانتے ہو؟“ اس نے میری بات سن کر تصویر پر نظر ڈالی اور اگلے ہی لمحے نہایت حیرت سے ٹکر ٹکر تکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“

”واقعی۔۔۔ تم اسے بدمعاش کو جانتے ہو لیکن کب سے، تم اس سے کہاں ملے تھے؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے تشویش کے عالم میں ایک ہی سانس میں دو سوال کر ڈالے۔

”اوہ۔۔۔“ میں نے اس کے شک کو محسوس کر لیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ تم شاید میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔“

”میرے سوال کا جواب دو۔ تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ اس نے ایک بار پھر تصویر کو دیکھا۔

”یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم بروکلین میں رہا کرتے تھے۔ ہم دونوں بچے تھے۔ یہ میرا سب سے بہترین دوست تھا۔“ میں نے اسے بتانا شروع کیا۔

”مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“ اس نے قطع کلامی کی۔ اس کے لہجے سے افسوس جھلک رہا تھا۔ ”میں تو یہ بات بھی

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جان ہی نہیں سکی کہ جب تم بچے تھے تو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث لڑکا تمہارا سب سے بہترین دوست تھا۔ یقیناً تم بھی۔۔۔“ اس نے آگے کچھ کہنے سے بہتر سمجھا کہ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دے لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔“ میں نے خفگی سے جواب دیا۔

”تم آج یہ بات کہہ سکتے ہو لیکن اُس وقت ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ وہ بدستور اپنی بات پر جمی ہوئی تھی۔

”تم مانو یا نہ مانو مگر حقیقت یہی ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔“ میں نے اس کا شک دور کرنے کے لیے وضاحت کی۔ ”ویسے اب تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب ماضی کا قصہ ہے۔“ میں نے بات مکمل کر کے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”او کے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتی۔ ویسے بھی ایلس مباحثوں سے گھبراتی تھی۔ جب بھی گفتگو بحث کی شکل اختیار کرنے لگتی وہ 'او کے' کہہ کر بات ختم کر دیا کرتی تھی۔ میں اس کی یہ عادت بہت اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بات ختم ہو گئی۔ وہ کسی اور مناسب وقت پر یہ بات دوبارہ شروع کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے خاموشی سے پوری توجہ کافی کے مگ پر مبذول کر دی۔

☆☆☆

یہ 1923ء کی بات ہے۔ اُن دنوں ہم بروکلین میں رہا کرتے تھے۔ میں بیس بال اور اس کے بعد گولف کا شوقین تھا۔ ہم سب بچے سڑک پر بیس بال کھیلا کرتے تھے۔ ویسے بھی اُن دنوں آج کی طرح گاڑیوں کی بھرمار نہیں تھی اور سڑک پر کھیلنے سے بچوں کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم بنا روک ٹوک اپنا فارغ وقت بیس بال کھیل کر گزارتے یا پھر میں اور ایگی گولف کلب کا رخ کر لیتے تھے۔ اُسے تو گولف کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ایگی کیوواک کا گھر ہمارے بالکل

برابر تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ وہ میرا سب سے اچھا دوست بن گیا تھا۔

ایگی کے والد کیوواک گودی پر کرین سپر وائزر تھے جبکہ میرے والد آڑھت کرتے تھے۔ اُس کی نسبت ہمارا گھرانا مالی لحاظ سے خاصا خوشحال سمجھا جاتا تھا۔ ہم شہر کے جس علاقے میں رہتے تھے، وہاں سب گھر ایک ہی طرح کے بنے ہوئے تھے سوائے ایک گھر کے۔ یہ گلی کے کنارے پر بنا ہوا ایک مکان تھا جس کا اندازِ تعمیر باقی سب سے جدا تھا۔ ہمارے سامنے ہی اس پرانے مکان کو تڑوا کر بنوایا گیا تھا۔ جس کے بعد یہاں ایک خاندان رہنے کے لیے آگیا۔ ہمیں کافی دنوں بعد پتا چلا کہ اس گھر میں مسٹر روس اور ان کی فیملی رہتی تھی۔ انہوں نے ہی یہ گھر بنایا تھا۔ یہ بڑا شاندار گھر تھا۔ اگرچہ یہاں ہر گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا لان موجود تھا لیکن اس گھر کے سامنے کا لان نہ صرف بہت بڑا تھا بلکہ اس کا ڈرائیووے بھی بہت پُرکشش تھا۔ مجھے اور ایگی کو یہ ڈرائیووے ہمیشہ اپنی جانب کھینچتا تھا۔ اس کشش کی وجہ یہ تھی کہ ڈرائیووے کے اختتام پر پورچ میں ہمیشہ مسٹر روس کی سرمئی رنگ کی شاندار پیکارڈ کھڑی رہتی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں اس کار پر پڑتیں تو جیسے زمین ہمارے قدموں کو جکڑ لیتی تھی۔ اس کار میں ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی جو ہمیں بے اختیار اپنی جانب کھینچتی تھی۔ ویسے بھی ہمارے اردگرد ایسا کوئی گھرانا نہیں تھا جس کے پاس اپنی گاڑی ہو۔ ایسے میں اپنے وقت کی پرکشش پیکارڈ ہمیں خوابوں کی دنیا میں لے جاتی تھی۔ ہم دونوں روزانہ دور دور سے اس کار کو تکتے رہتے تھے۔ اس پر سوار ہونا ہمارا خواب تھا مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر کب ہوگا، ہم دونوں اس سے لاعلم تھے۔

ہماری شدید خواہش تھی کہ کسی طرح اس کار کو چھو کر دیکھیں، اسے محسوس کریں اور یہ جانیں کہ کار کا احساس کیا ہوتا ہے۔ آخر ہم نے اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک سہ پہر ہم دونوں سب کی نظروں سے بچتے بچاتے مسٹر روس کے گھر میں داخل ہو گئے۔ ابھی ہم کار سے چند گز کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ایک آواز گونجی۔ ”نکلو یہاں سے۔“ کسی شخص نے ہمیں نہایت درشت لہجے میں ڈانٹا۔ ہم دونوں یہ سنتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر باہر بھاگے۔ ہمیں تو یہ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مسٹر روس یا کوئی اور کار پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ بعد میں جب ہم دونوں بھاگتے بھاگتے گھر سے بہت دور نکل آئے تو ہم نے اپنی پھولی سانسوں کو درست کرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھا، تب جا کر اندازہ ہوا کہ ہمیں ڈانٹنے کی آواز پورچ کے عین اوپر بنے کمرے کی کھڑکی سے آئی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ جب کار کے قریب پہنچیں گے تو یہ خیال رکھیں گے کہ کسی کھڑکی سے کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ پہلی ناکام کوشش کے بعد بھی ہم نے کار کو چھونے کی تشنہ خواہش کو ترک نہیں کیا تھا۔

کچھ دنوں بعد ایک بار پھر ہم نے کار کے قریب پہنچنے کا منصوبہ بنایا۔ اس بار ہم نے تمام تر احتیاطی تدابیر کو بھی سامنے رکھا تاکہ پکڑے نہ جاسکیں۔ ویسے ایگی کو پکڑے جانے کا خوف نہیں تھا۔ وہ خاصا نڈر لڑکا تھا لیکن مجھے اس بات کا بہت ڈر تھا۔ اسکول اور گھر، دونوں جگہ میری تعریف ہوتی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسی کوئی حرکت مجھ سے سرزد ہو جس کی وجہ سے ڈانٹ پڑے۔ ویسے بھی میں اپنے پاپا سے بہت ڈرتا تھا۔

ایک روز سہ پہر کے وقت ہم دونوں چھپتے چھپاتے کار کے قریب پہنچ ہی گئے۔ چمچماتی پیکارڈ ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ میں آگے اور میرے پیچھے ایگی کھڑا تھا۔ ہم ہاتھ بڑھا کر کار کے بونٹ پر لگے چمکتے ہوئے مونو گرام کو چھونے ہی والے تھے کہ اچانک ایگی کی گھگیائی ہوئی آواز سن کر میرا انہماک ٹوٹ گیا۔ وصل کی ساری لذت پلک جھپکتے ہی غائب ہو گئی۔ گھبراہٹ میں مڑ کر دیکھا تو شاندار سیاہ سوٹ میں ملبوس مسٹر روس نے ایگی کو گردن اور بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ پکڑے جانے کے باوجود اس کا چہرہ بے خوف تھا لیکن یہ منظر دیکھتے ہی میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ ایگی بدستور مسٹر روس کی گرفت میں تھا اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہوا انہیں دھمکیاں بھی دیے جا رہا تھا۔ ”چھوڑو مجھے۔۔۔ میں اپنے پاپا کو بتادوں گا۔ چھوڑ دو، چھوڑو مجھے۔“ مگر اس کی دھمکیاں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ مسٹر روس درمیانی عمر کے شخص تھے لیکن جسمانی لحاظ سے خاصے صحت مند اور چاق و چوبند۔ اس کے بازو اور گردن پر ان کی گرفت زیادہ سخت نہیں تھی لیکن پھر بھی ایگی ایک بچہ ہی تھا۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود ان کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ آخر انہیں ترس آگیا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگر آئندہ تم دونوں مجھے یہاں نظر آئے تو مار مار کر چوہا بنادوں گا۔“ انہوں نے کچھ دیر بعد ہم دونوں کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے ایگی پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ جان چھوٹتے ہی ہم دونوں خرگوش سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دوڑے۔ بھاگتے ہوئے ہمیں اپنے

پیچھے ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا لیکن اس وقت مڑ کر دیکھنے کی ہمت کس میں تھی۔ پھر بھی مجھے یقین تھا کہ مسٹر روس ہماری بدحواسی پر ہنسے تھے۔ ہم دونوں اپنے اپنے گھر تک بھاگتے رہے۔ جب ہمیں گھر نظر آگیا، تب کہیں جا کر جان میں جان آئی۔ ہم دونوں گھر کے سامنے ایک بینچ پر جا کر ڈھیر ہو گئے، اس وقت ہم دونوں کی سانسیں سخت منتشر تھیں۔ کافی دیر تک ہم دونوں چپ بیٹھے اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

”بڑے ہی کمینے ہیں وہ۔“ کافی دیر بعد ایگی نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”بس ہم ہاتھ لگانے ہی والے تھے مگر نہ جانے وہ کیسے پہنچ گئے۔“

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔“ میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں یہ بات اپنے دل سے نکال دینی چاہیے۔ مسٹر روس اپنی گاڑی کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔“ میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس واقعے سے میں بہت ڈر گیا تھا، البتہ ایگی اب بھی بے خوف نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

”نہیں۔۔۔“ میری بات سن کر اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”میں اس گاڑی کو ہاتھ بھی لگاؤں گا اور ایک دن ایسی گاڑی خریدوں گا بھی۔“ اس کے لہجے میں عزم جھلک رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، خرید لینا مگر میں تو گھر جا رہا ہوں۔“ میں اٹھ کر اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ ایگی بدستور بینچ پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔

اس روز میں بہت خوفزدہ تھا۔ سارا دن یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں مسٹر روس میرے گھر پہنچ کر پاپا سے میری شکایت نہ کر دیں لیکن میری خوش نصیبی کہ ایسا نہیں ہوا۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلا کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایگی اور میں یک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہر جمعے کو ہمارا تحریری ٹیسٹ ہوا کرتا تھا۔ پیر کے دن ٹیچر یہ طے کرتے تھے کہ ہم کس پوزیشن پر بیٹھیں گے۔ پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے پہلی قطار میں، چوتھے، پانچویں اور چھٹے نمبر پر آنے والے دوسری قطار میں۔۔۔ اس ترتیب سے سب بچے بیٹھتے تھے۔ میں ہمیشہ کلاس میں سب سے آگے والی قطار میں بیٹھا کرتا تھا جبکہ ایگی پانچویں اور چھٹی قطار میں ہی گردش کرتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ اسے پڑھائی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی یہ فکر کہ اچھے نمبر نہیں آنے پر اس کے گھر والے کیا سلوک کر سکتے ہیں۔ وہ ان چیزوں کا عادی ہو چکا تھا۔

ایگی کے پاپا کیوواک ویسے ہی بے پروا اور من موجی آدمی تھے۔ اس کی مما کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ وہ سادہ سی عورت تھی۔ ایگی کے چھ بہن بھائی تھے اور وہ سب انہیں اتنا وقت ہی نہیں دیتے تھے کہ وہ بے چاری گھر کے کاموں سے بے فکر ہو کر بچوں کی تعلیم پر توجہ دے پاتی۔ کیوواک بیس بال کے ایک اچھے کھلاڑی تھے اور ہر اتوار کو قصبے میں ہونے والے بیس بال میچ میں حصہ لیتے تھے۔ ہم دونوں کو بھی بیس بال سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس لیے اتوار کا دن ہمارا پسندیدہ دن تھا۔ ہم دونوں اکھٹے بیٹھ کر میچ دیکھتے تھے۔ میچ کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ ساتھ لگا رہتا اور میں گھر چلا آتا۔

یہ بات اس کے گھر والوں کے علم میں ضرور ہوگی کہ وہ پڑھنے میں زیادہ بہتر نہیں تھا لیکن اُس وقت یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ اس کے گھر والے اس بات پر اس کی سرزنش کیوں نہیں کرتے لیکن آج میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ غربت اور زیادہ بچے ہوں تو ماں باپ کی توجہ بچوں پر وہ نہیں رہتی جیسی کہ میرے والدین کی تھی۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا، شاید اسی لیے اُن دونوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ ماں باپ کی حد سے زیادہ توجہ کے سبب میں نازک مزاج اور ذرا بزدل ہو چکا تھا۔ ویسے بھی میرے والدین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روایت پسند تھے۔ اوپر سے مالی خوشحالی بھی تھی۔ وہ مجھے ہر سال چھٹیوں میں بروکلین سے باہر گھمانے پھرانے لے جاتے تھے۔ اچھے اچھے کپڑے، جوتے دلواتے۔ میرے والد خاص طور پر میری تعلیم پر بہت توجہ دیتے تھے۔ مجھے ہمیشہ یہ خوف رہتا تھا کہ اگر کبھی میرے نمبر اچھے نہ آئے تو مجھے کیا نتیجہ بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ اس لیے میں کھیل کے ساتھ ساتھ پڑھائی پر بھی ضرورت سے زیادہ توجہ دیتا تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ تعلیم کے معاملے میں مجھے والدین کی سرزنش کا کبھی سامنا نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے بڑی حد تک مطمئن تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ مجھ پر کڑی نظریں رکھتے تھے۔

جب مجھے پہلی بار یہ پتا چلا کہ میرے والدین بروکلین سے مین ہٹن منتقل ہو رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہاں میرے دوست تھے۔ مجھے یہاں کا ماحول بہت اچھا لگتا تھا۔ میں ایک دو بار اپنے والدین کے ساتھ مین ہٹن ہو کر آچکا تھا۔ وہاں کی شہری اور ہلچل والی زندگی بروکلین سے بالکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مختلف اور کسی حد تک مصنوعی پن کا شکار تھی جبکہ یہاں زندگی اپنی مکمل حقیقتوں اور متنوع رنگوں کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ مجھے یہاں سے جانے کا سن کر اچھا نہیں لگا لیکن اس کے باوجود یہ سچ ہے کہ میں صرف اپنی خواہش کے باعث وہاں پر رک نہیں سکتا تھا۔ ایک کم عمر کمزور بچہ زندگی کو اپنی پسند کے مطابق نہیں بلکہ والدین کی منشا کے مطابق بسر کرتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہونے جا رہا تھا۔ اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا لیکن اس پر کم سے کم افسوس تو ضرور کر سکتا تھا، سو اُن دنوں میں یہی کر رہا تھا۔

میں کئی روز تک پریشان رہا مگر جیسے جیسے ہمارے گھر میں سامان کی پیکنگ شروع ہوئی میرے جذبات بھی بدلتے رہے۔ اب مجھے پہلے کی طرح بروکلین چھوڑنے کا افسوس نہیں بلکہ نئے شہر میں، نئے سرے سے زندگی گزارنے کا تجسس ابھرتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ افسوس پر۔۔۔ آنے والے کل میں زندگی بسر کرنے کا تجسس مجھے مکمل طور پر اپنے سحر میں جکڑ چکا تھا۔ مجھے اب اپنا وہ گھر اجنبی اجنبی سا لگنے لگا تھا، جہاں میں پیدا ہوا اور اس کے در و دیوار میں اب تک کی بسر کی ہوئی زندگی رچی بسی تھی۔

ایگی یہ بات جانتا تھا کہ ہم بہت جلد یہاں سے جانے والے ہیں۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا اور ایک اچھے دوست کی طرح وہ بھی میری جدائی کا سن کر پریشان ہو گیا لیکن وہ بچہ ہونے کے باوجود مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ جب میں نے منہ بسورتے ہوئے اُسے یہاں سے جانے کی خبر سنائی تو چند لمحوں تک تو وہ اداس نظر آیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجھے یہ سمجھانے میں لگ گیا کہ زندگی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں ان باتوں پر پریشان نہیں ہونا چاہیے بلکہ نئے ماحول میں نئی اور بہتر زندگی گزارنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ حقیقت ہے کہ اس کی باتیں مجھے خاصا حوصلہ دیتی تھیں۔

ہم بروکلین سے کب جانے والے تھے، یہ بات حتمی طور پر تو میں نہیں جانتا تھا لیکن گھر میں سامان کی پیکنگ وغیرہ دیکھ کر میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اس شہر میں اب ہمارے دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔ امتحانات کے بعد اسکول میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ میں صبح سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ اس دن سو کر اٹھا اور ناشتے سے فارغ ہو دوپہر تک پورے گھر میں بے مقصد اِدھر سے اُدھر گھومتا رہا۔ مما سامان پیک کرنے میں مصروف تھیں۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ آخر اُکتا کر باہر نکلا تو سامنے ایگی نظر آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' اس کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی۔

''کچھ نہیں۔ گھر میں سامان پیک ہو رہا ہے۔''

''آؤ۔۔۔ اُدھر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے سامنے کی طرف پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم یہاں سے جانے کی وجہ سے اُداس ہو رہے ہوں نا۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ہم دونوں پتھر کی طرف جا رہے تھے۔

''ہاں۔۔۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''اس میں اداسی کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ ایک بڑے شہر میں جا رہے ہو۔ وہاں تمہارے دیکھنے کے لیے بہت سی چیزیں ہوں گی۔'' حسبِ عادت ایک بار پھر اس نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

''بڑے شہر میں جا کر مجھے کچھ نہیں دیکھنا۔'' ایک بار پھر مجھ پر اداسی کا دورہ پڑ چکا تھا۔

''اچھا چھوڑو یہ بات۔۔۔'' اس نے میرا دھیان بٹانے کی غرض سے کہا۔ ''میرے پاس کہانیوں کی دو نئی کتابیں ہیں۔ کل ہی پاپا لے کر آئے ہیں۔ ایک ہے ٹارزن اور دوسری سنڈریلا کی کہانی۔ تم پڑھو گے؟'' اس نے بڑے پیار سے پیشکش کی۔

''نہیں۔۔۔ پڑھنے کا دل نہیں کر رہا ہے۔'' میں نے بددلی سے کہا۔

''چلو۔۔۔ پھر ایسا کرتے ہیں کہ کھیلتے ہیں۔'' اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے میری اداسی پریشان کر رہی ہے۔

''کیا کھیلیں؟''

''بیس بال تو کھیل نہیں سکتے، دھوپ بہت تیز ہے۔'' اس نے آسمان پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''گولف کلب بھی نہیں جا سکتے، وہاں بھی لوگ پہنچ چکے ہوں گے۔''

''تو پھر کیا کریں؟''

''ایسا کرتے ہیں جھیل پر چلتے ہیں اور گولف بال جمع کرتے ہیں۔'' ایگی نے ایسے کہا کہ جیسے اس نے اس سہ پہر کو کارآمد بنانے کے لیے بالآخر ایک مقصد تلاش کر ہی لیا ہے۔

''یہ اچھا ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہ بھی میرے پیچھے پیچھے اٹھ گیا۔ اب ہم دونوں بروکلین ہائٹس کے وسیع و عریض گولف کلب کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بیس بال اگرچہ میرا اور ایگی کا پسندیدہ کھیل تھا لیکن جس

کھیل میں اسے سب سے زیادہ دلچسپی تھی وہ ہے گولف۔ بروکلین میں کئی چھوٹے بڑے گولف کلب تھے لیکن بروکلین ہائٹس گولف کلب ان میں سب سے بڑا اور شاندار تھا۔ ہم اکثر فارغ وقت میں وہاں چلے جاتے اور کھلاڑیوں کو کھیلتے دیکھتے رہتے۔ کھیل میں اس کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ وہ قصبے کے واحد بازار میں گولف کا سامان فروخت کرنے والی دکان کے بہانے بہانے سے چکر لگاتا رہتا۔ دُکان دار آرنلڈ ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ وہ ایگی کے والد کا دوست بھی تھا۔ اس لیے اس نے کبھی اسے یہاں آنے سے منع نہیں کیا۔ وہ دُکان میں جاتا، مختلف اِسٹک اٹھا کر اس طرح اس سے کھیلنے کی کوشش کرتا جیسے کہ وہ ماہر کھلاڑی ہے۔ یہ دیکھ کر آرنلڈ بھی مسکراتا رہتا۔

''دیکھنا۔۔۔ ایک دن میں بروکلین ہائٹس کلب خرید لوں گا۔'' ایک دن جب ہم دونوں اپنی شرٹ کے دامن میں گولف کی درجنوں سفید گیندیں جمع کر کے جھیل سے لوٹ رہے تھے تو اس نے نہایت پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''یہ اچھا ہوگا۔'' میں نے ہنستے ہوئے اس کی ہمت بندھائی تھی۔

جھیل کی سطح پر ہمیں اکثر گولف کی ڈھیروں گیندیں تیرتی ہوئی مل جاتی تھیں۔ یہ وہ گیندیں ہوتی تھیں جو کھلاڑیوں کے لانگ شارٹ کی وجہ سے اکثر جھیل میں آ گرتی تھیں، جنہیں بعد میں صفائی پر مامور عملہ نکال لیتا تھا۔ صفائی تین چار دن بعد ہوا کرتی تھی، اس لیے ہمیں اکثر یہاں سے گیندیں مل جایا کرتی تھیں۔ ان گیندوں کو ہم آرنلڈ کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے۔ ان کے خریدار چھوٹے چھوٹے گولف کلب میں کھیلنے والے وہ غریب کھلاڑی ہوتے تھے جو نئی گیندیں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ایگی ان پیسوں کو کانچ کے ایک چھوٹے سے مرتبان میں جمع کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دن اس کے پاس اتنے پیسے ضرور جمع ہو جائیں گے، جس سے وہ اپنا پسندیدہ گولف کلب خرید کر جی بھر کے اپنا شوق پورا کرے گا۔ اُس وقت تو میں یہ نہیں جانتا تھا کہ گولف کلب خریدنے کے لیے کتنے پیسے درکار ہوتے ہیں تاہم میں سچے دل سے یہ دعا کرتا تھا کہ وہ ایسا کر سکے۔

اُس دن جب ہم جھیل پر پہنچے تو خوش قسمتی سے پانی کی سطح پر درجنوں گیندیں تیر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر ہم بہت خوش ہوئے۔ ہم نے پتلون کے پائنچے چڑھائے اور پانی میں گھس گئے۔ کچھ دیر میں ہی ہماری جھولی میں ڈیڑھ درجن کے قریب گیندیں جمع ہو گئی تھیں۔

''بس بہت ہو گئی ہیں، چلو واپس چلتے ہیں۔'' میں نے گیندیں دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''ابھی وہاں اور بھی کئی گیندیں نظر آ رہی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہ بہت دور ہیں۔ میں اتنی دور نہیں جاؤں گا۔'' وہ گیندیں جھیل کے تقریباً وسط میں تھیں۔ اس لیے میں نے قناعت بھرے لہجے میں کہا۔ یہ اور بات ہے گہرے پانی میں جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا۔

''میں تیرتا ہوا وہاں تک جاؤں؟'' اس نے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔۔ بس بہت ہیں۔'' میں نے اسے جانے سے روکا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' اس نے میری بات مان لی اور تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں واپسی کے لیے چل دیے۔ سورج ڈھلنے والا تھا۔ ہم نے ساحل والا راستہ لیا اور حفاظتی بند کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ہمارے جوتے کیچڑ میں اٹ چکے تھے، ہاتھوں پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی۔ ساحل پر جا کر ہم پہلے اپنا حلیہ درست کرتے، گیندوں کو دھو کر صاف کرتے اور پھر گھر لوٹتے۔ گیندیں جمع کرنے کے بعد یہ ہمارا معمول تھا۔

چلتے چلتے اچانک قریب ہی کہیں سے ہمارے کانوں میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ اس وقت ہم پرائیویٹ پراپرٹی میں تھے۔ پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ اس لیے خوف زدہ ہو گئے اور جہاں تھے وہیں دُبک گئے۔ چند لمحوں بعد ہمیں محسوس ہوا کہ جس گاڑی کی آواز سنائی دی تھی، وہ بند کے پار آ کر رُک گئی ہے۔ میں نے سر اٹھا کر جھانکا تو حیران رہ گیا۔ دوسری طرف مسٹر روس کی شاندار سرمئی پیکارڈ کھڑی تھی۔ میں فوراً نیچے جھکا اور یہ بات ایگی کو بتائی۔

''یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔ ویسے بھی اسے مسٹر روس سے زیادہ اُن کی گاڑی میں دلچسپی تھی۔

''چلو۔۔۔ یہیں ٹھہر کر دیکھتے ہیں، وہ کیا کر رہے ہیں۔'' ایگی فطرتاً مہم جو تھا۔ اب اسے ایک نیا خیال سوجھ گیا۔ ویسے بھی ہم جس جگہ موجود تھے، وہاں لوگ کچرا پھینکتے تھے۔ اسی لیے اُس جگہ ہر وقت سخت بو رہتی تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ مسٹر روس جیسا شخص اپنی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر وہاں کیا کرنے آیا ہے۔ اب وہ کچرا تو پھینکنے سے رہے۔ میرا دماغ بدستور اس سوچ میں مستغرق تھا۔

چند لمحوں بعد ہم دونوں نے خود کو اُن کی نظروں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچاتے ہوئے ایک بار پھر دوسری طرف جھانکا۔ کار سے مسٹر روس سمیت تین آدمی باہر نکل چکے تھے۔ تینوں شاندار سیاہ سوٹ، ہیٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے۔ ہم دونوں دم سادھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ویسے بھی ہم جس جگہ پر موجود تھے، وہ ساحل سے خاصی اوپر تھی اور ان تینوں کی نظریں صرف ایک دوسرے پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ ان میں مسٹر روس کے علاوہ ایک طویل قامت جبکہ دوسرا پستہ قد شخص شامل تھا۔ اُن دونوں کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ اس سے ہمیں خاصا حوصلہ ملا۔ ہمیں یقین تھا کہ پکڑے نہیں جاسکتے۔ چند لمحوں تک وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ زیادہ تر مسٹر روس بول رہے تھے۔ ان کی آواز اونچی تھی اور چہرے کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہیں۔ ویسے بھی ہم دونوں ان کا غصہ اس وقت دیکھ ہی چکے تھے جب ان کی پیکارڈ کو چھونے کی خواہش میں ہم ڈرائیوے تک پہنچ کر پکڑے گئے تھے۔

ہم نے یہ محسوس کیا کہ لمبا آدمی لاتعلق سا کھڑا تھا اور مسٹر روس بدستور بولے چلے جارہے تھے جبکہ پستہ قد آدمی صرف سر ہلا ہلا کر ان کی بات کی تائید کررہا تھا۔ اچانک پستہ قد شخص نے بھاگنا شروع کردیا۔ وہ حفاظتی دیوار کی طرف دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ اسے بھاگتا دیکھ کر لمبا آدمی بھی اس کے پیچھے دوڑا اور کچھ ہی دیر بعد اس نے ٹانگ اڑا کر اسے نیچے گرالیا اور اس پر چڑھ بیٹھا۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں سخت حیران رہ گئے۔ مسٹر روس بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس طرف آرہے تھے، جہاں لمبا آدمی پستہ قد شخص کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر چلا رہا تھا لیکن اس کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہورہی تھیں۔

چند لمحوں کے اندر اندر مسٹر روس بھی اس کے سر پر پہنچ گئے اور قریب آتے ہی انہوں نے ایک زوردار ٹھوکر اس شخص کی کمر میں ماری۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کے بعد تو انہوں نے اس پر لاتوں کی بارش کردی۔ جب وہ مار رہے تھے تو لمبے قد والے نے اس بدنصیب کو بدستور دبوچ رکھا تھا۔ اس کے چیخنے چلانے کی آواز ہمارے کانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔

''ہاں اب بول، مانگے گا اپنا حصہ۔'' اچانک مسٹر روس نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور چلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ شخص لڑکھڑا رہا تھا۔ انہوں نے ایک زوردار مکا اس کی پسلیوں پر رسید کیا۔ اس بے چارے کے منہ سے ایک بار پھر زوردار چیخ نکلی اور وہ گھٹنوں کے بل زمین پر جھکتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر لمبے قد والا آدمی اور مسٹر روس زور زور سے ہنسنے لگے اور واپس جانے کے لیے پلٹے۔ دو قدم آگے بڑھ کر وہ پھر پلٹے اور ایک بار پھر اس کی کمر پر زوردار ٹھوکر ماری۔ اس بے چارے کے منہ سے زوردار چیخ نکلی۔ ''آج زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ اب اگر پیسے مانگے تو بنا مارے ہی موت دے دوں گا۔'' مسٹر روس نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس وقت ان کے چہرے پر نہایت مکروہ مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

''چلو ایگی۔۔۔ یہاں سے چلتے ہیں۔'' میں یہ سب کچھ دیکھ کر کافی ڈر گیا تھا۔ وہ دونوں پیکارڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ بہتر موقع ہے، یہاں سے کھسک لو۔

''نہیں۔'' اس نے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''روس بدمعاش ہے۔ اس نے اس بے چارے کو بری طرح پیٹا ہے۔'' اس نے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''بھول گئے، اس نے مجھے بھی پکڑا تھا۔ یہ میرا بھی دشمن ہے۔'' ایگی کا لہجہ ایک دم سخت ہوگیا۔

''ہمیں کیا لینا دینا، چلو نکلتے ہیں۔'' میں نے ایک بار پھر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں گاڑی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گاڑی آگے کی طرف جارہی تھی۔ پٹنے والا پستہ قد شخص بدستور ریت پر ڈھیر تھا۔

''ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے کی طرف بڑھا۔

''رک جاؤ۔'' میں نے اسے روکنا چاہا۔

''کیوں؟'' اس نے پلٹ کر مجھے گھورا۔ ''اگر تم ساتھ نہیں آسکتے تو نہ آؤ، میں جارہا ہوں۔'' اس نے درشت انداز میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ ایگی دوڑتا ہوا اس کی طرف جارہا تھا۔ میں مجبوراً اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

اس شخص کے چہرے پر سخت تکلیف کے آثار تھے۔ تھوڑی دیر تک ایگی اس کی کمر دباتا رہا۔ کافی دیر بعد اس کی حالت میں تھوڑی سی بہتری آئی۔ ایگی دوڑ کر گیا اور نہ جانے کہاں سے پینے کے لیے تھوڑا سا پانی لے آیا۔ وہ شخص ریت پر چت لیٹا ہوا تھا۔ ایگی نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ ڈال کر تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور اسے پانی پلایا۔ پانی پینے کے بعد اس کی حالت میں خاصی بہتری آگئی تھی۔ ''کون ہو تم؟'' جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ بڈھا تمہیں کیوں مار رہا تھا؟'' ایگی نے تعارف

کروانے کے بعد اس سے سوال کیا۔

''جانتے ہو اسے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ ایک دن اس نے مجھے بھی پکڑا تھا۔ بڑا کمینہ ہے وہ۔'' ایگی نے نفرت سے کہا۔

''اس نے تمہیں کیوں پکڑا تھا؟'' اجنبی نے ایک بار پھر سوال کیا اور ایگی نے سارا واقعہ بیان کردیا کہ پیکارڈ کے چکر میں کس طرح وہ مسٹر روس کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

''میرا نام جانسن ہے۔'' اجنبی نے اپنا داہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم نے میری مدد کیوں کی؟'' اس نے ایک بار پھر اپنا پرانا سوال دُہرایا۔ وہ ایگی سے مخاطب تھا اور مجھے بدستور نظرانداز کررہا تھا۔ ویسے بھی مجھے اس سارے قضیے سے بہت گھبراہٹ ہورہی تھی۔

''اس لیے کہ وہ میرا دشمن ہے اور تم بھی شاید اس کے دشمن ہو۔'' ایگی میرا ہم عمر تھا لیکن جس طرح وہ اس شخص سے بات کررہا تھا، اس سے اس کے اندر کی خوداعتمادی صاف نظر آرہی تھی۔

''بہت خوب۔۔۔'' ایگی کا جواب سن کر اس شخص کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''مجھ سے دوستی کرو گے۔ میں تمہیں روس جیسی پیکارڈ میں گھومنے کا موقع دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اپنا داہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''کیوں نہیں۔'' پیکارڈ کا ذکر سن کر ایگی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ اس نے اُس شخص کا ہاتھ تھام لیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم بھی میری طرح روس سے بدلہ لینا چاہو گے۔ آخر اس نے تمہیں بھی تو پکڑ کر مارنے کی کوشش کی تھی۔'' جانسن نے ایگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔ تم میری مدد کرو گے؟'' ایگی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہم دونوں مل کر اسے سبق سکھائیں گے۔'' جانسن نے ایگی کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہوا۔ ایگی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے سہارا دینے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ شخص چند لمحوں تک ہم دونوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا اور دو نوٹ نکالے۔ ''یہ لو۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک نوٹ پکڑ کر ہماری طرف بڑھائے۔ ایگی نے فوراً نوٹ اُچک لیا جبکہ میں ہچکچا رہا تھا۔ ''لو۔۔۔ لے لو شریف بچے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے بدقتِ تمام نوٹ لے کر مٹھی میں سمیٹ لیا۔

''سنو ایگی۔۔۔ یہی نام بتایا تھا نا تم نے اپنا۔۔۔'' اس نے ایگی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔ یہی نام ہے میرا۔''

''کل شام چار بجے کے قریب تم مجھ سے بروکلین ہائٹس گولف کلب کے پچھلے دروازے پر آکر ملنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایگی نے جواب دیا۔ ''تمہیں روس نے مارا ہے، تم پولیس کے پاس جاکر رپورٹ کیوں نہیں لکھواتے اس کے خلاف۔'' ایگی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے دھندے میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے مگر ہم پولیس کے پاس نہیں جاسکتے۔''

''لیکن کیوں؟''

''تم میرے دوست بن گئے ہو، کل ملنا سب سمجھادوں گا۔'' جانسن نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی تم نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو کہا تھا وہ تمہارا بھی دشمن ہے۔ ہم دونوں اسے مل کر ماریں گے۔۔۔ سمجھے۔''

''یہ تو ہے۔'' ایگی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اب تم جاؤ، کل شام ملتے ہیں۔'' اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم تھوڑا آگے بڑھے تو اس نے پکارا۔ ''ایگی کل شام صرف تم آؤ گے۔''

''اوکے۔'' اس نے جواب دیا۔ ہم دوڑتے ہوئے ساحلی بند کی طرف جانے لگے۔

اس بھاگ دوڑ میں وہ گیندیں کہیں گرچکی تھیں، جنہیں ہم نے جھیل سے اکٹھا کیا تھا۔ اس لیے اب ہمیں سیدھا گھر ہی جانا تھا۔ ''تمہیں اس نے کتنے پیسے دیے ہیں۔'' گھر سے کچھ فاصلے پر تھے جب ایگی نے پوچھا۔ یہ سنتے ہی میں نے مٹھی کھول کر نوٹ سیدھا کیا۔ ''یہ دیکھ لو۔'' میں نے ایک ڈالر کا نوٹ اس کی نگاہوں کے سامنے کیا۔ ''اور تمہیں؟''

''پانچ ڈالر۔'' اس نے نوٹ جیب سے نکال کر میرے سامنے خوشی سے لہراتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی تم رکھ لو۔'' میں نے اپنے حصے کا نوٹ بھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا مگر اس نے لینے سے انکار کردیا۔ آخر میرے زور دینے پر اس نے نوٹ لے لیا۔

''جب میں بروکلین ہائٹس گولف کلب کا مالک بن جاؤں گا تو تم میرے پارٹنر ہوگے۔۔۔ ایک ڈالر کا پارٹنر۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے۔'' میں بھی بنا کچھ سوچے سمجھے ہنس دیا۔

دوسرے دن سہ پہر کو میں گھر سے کھیلنے کے لیے نکلا تو ایگی کہیں نظر نہیں آیا۔ سامنے سڑک پر کچھ بچے بیس بال کھیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے تھے، میں ان کے ساتھ کھیلنے لگا اور شام ہونے پر گھر لوٹ آیا۔ اس سے اگلے دن بھی ایگی کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے بھی اس کی غیر موجودگی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ میرے ذہن سے یہ بات تقریباً نکل چکی تھی کہ اسے جانسن نے ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ اس دن کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا۔

تیسرے دن صبح کے دس بج رہے ہوں گے۔ گھر میں پیکنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ میں باہر نکلا تو سامنے ہی مجھے ایگی جاتا ہوا نظر آیا۔ ”اے۔۔۔ رکو۔ کہاں غائب تھے تم۔“ میں نے اسے دیکھتے ہی پکارا۔ وہ میری آواز سن کر رکا اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔

”ارے جلدی آؤ۔“ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں ساحلی بند پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”تمہیں پتا ہے، جانسن بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے پاس گاڑی بھی ہے۔“ ایگی اُس شام اکیلے میں اس سے ہونے والی ملاقات کا احوال سنا رہا تھا۔ ”وہ بہت بڑا بدمعاش ہے۔ مسٹر روس نے اس سے بہت سارے پیسے اُدھار لے کر گولڈن ہائٹس کلب میں پارٹنر شپ لی تھی۔ اب وہ پیسے مانگ رہا ہے تو وہ نہیں دے رہا۔ اس لیے اس نے جانسن کی پٹائی لگائی تھی۔ جانسن کہہ رہا تھا کہ روس بڑا آدمی ہے لیکن وہ بھی بدمعاش ہے۔ اسے اس مار کی سزا ضرور دے گا۔“

”اور کیا کہہ رہا تھا تم سے۔“ وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ مجھے یہ باتیں بالکل کہانیوں جیسی لگ رہی تھیں اور میں دلچسپی سے سن رہا تھا۔

”میں کل بھی اس کے پاس ہی تھا۔“ وہ مجھے پستول چلانا سکھا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ گولف کلب پیسے جمع کر کے نہیں، پستول چلا کر ہی خریدا جاسکتا ہے۔“

پستول والی بات سن کر میں ڈر گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ”کیا تم نے پستول چلائی ہے؟“ میں نے تجسس بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔ کل شام ساحل پر کافی دور جاکر چلائی تھی۔“ اس نے سینہ تان کر میری بات کا جواب دیا۔ ”بڑی خوفناک آواز آئی، جب اس میں سے گولی نکلی۔ دھائیں۔“ ایگی نے انگلی کی مدد سے خیالی پستول چلاتے ہوئے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ پستول کس طرح چلائی تھی۔

”میرے خیال میں تم کچھ غلط کر رہے ہو۔“ میں نے اپنی بساط کے مطابق سوچتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاپا کو پتا چل گیا تو۔۔۔“

”کچھ غلط نہیں کر رہا اور پاپا کو پتا چلتا ہے تو چلنے دو۔ مجھے گولف کلب خریدنا ہے۔ جانسن کہتا ہے کہ اگر پاپا نے تمہیں کچھ کہا تو تم میرے پاس آجانا۔“ اس نے بے خوفی سے جواب دیا۔

”یہ تو بڑی بری بات ہے۔ اپنے پاپا کے بارے میں ایسے باتیں نہیں کرتے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”پیارے۔۔۔ جیب میں پیسے آتے ہوں تو کسی کو کچھ بھی کہہ لو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے آوارہ لڑکوں کی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

جانسن سے ہماری ملاقات بالکل اتفاقی تھی لیکن اس ملاقت کو تین دن ہی گزرے تھے کہ ایگی کا رویہ بالکل بدل چکا تھا۔ اس کی باتوں کا انداز، چال ڈھال اور مستقبل کے عزائم۔۔۔ سب اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اب اس کی زندگی کس رخ پر چلے گی۔ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میری مما گندے بچوں کی جو کہانیاں سناتی تھیں، اس وقت وہ مجھے بالکل ویسا ہی بچہ لگ رہا تھا۔ کچھ دیر تک میں اس کے ساتھ بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اٹھ کر گھر چلا آیا۔ جب میں وہاں سے اٹھا تو ایگی بھی چل دیا۔ اسے جانسن سے ملنے جانا تھا۔

☆☆☆

جانسن سے پہلی ملاقات کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اُس کے بعد ایگی پھر کبھی نہ تو میرے ساتھ کھیلنے کے لیے آیا اور نہ ہی ہم گولف کی گیندیں جمع کرنے کے لیے گئے۔ اب وہ شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا۔ ہمارے گھر کا سامان بھی مین ہٹن بھیجا جانے لگا تھا۔ پاپا وہیں تھے اور گھر سیٹ کروا رہے تھے۔ میں فارغ وقت میں باہر نکل آتا اور دوسرے بچوں کے ساتھ بیس بال کھیلنے لگتا۔

اُس دن ہمارے گھر کا پورا سامان بھجوایا جاچکا تھا۔ گھر خالی ہوچکا تھا۔ اگلی صبح ہمیں یہاں سے چلے جانا تھا۔ ہم لوگ ایک دن کے لیے اپنے پڑوس میں منتقل ہوچکے تھے۔ یہ انکل ایڈیسن کا گھر تھا۔ وہ میرے پاپا کے بہت اچھے دوست تھے۔ شام تک پاپا بھی آنے والے تھے۔ اگلی صبح ہم ان کے ساتھ ہی اپنے نئے گھر کے لیے چلے جاتے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ آنٹی نے بڑا شاندار کھانا بنایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہماری دعوت ہو۔ میں بیک وقت اداسی اور تجسس کی ملی جُلی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ میری عمر بارہ برس

تھی۔ اس عمر میں کسی حد تک ملن اور جدائی کے معنی پتا چل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی میں ایک تو ایگی کی وجہ سے پریشان تھا۔ جب سے اس کی جانسن کے ساتھ دوستی ہوئی تھی، اس نے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے افسوس تھا کہ میں اپنے سب سے اچھے دوست سے الوداعی ملاقات کیے بغیر یہاں سے جارہا ہوں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ مجھے ایگی کی بہت یاد آرہی تھی۔ آخر میں نہایت بے قراری کے عالم میں گھر سے باہر نکلا۔ میں ہر حالت میں ایگی سے ملنا اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ میں اس کی تلاش میں سب سے پہلے محلے کے اِرد گرد کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ جگہ جگہ بچوں کی ٹولیاں بیس بال کھیل رہی تھیں لیکن وہ ان میں کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ میں گولف کلب کے داخلی دروازے اور قصبے کے سب سے بڑے بیس بال گراؤنڈ تک بھی گیا مگر اسے نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ آخر میں بس ایک ہی ایسی جگہ رہ گئی تھی، جہاں اگر وہ نہ ملتا تو میں گھر لوٹ آتا۔ یہ جگہ وہ جھیل تھی جہاں ہم دونوں گولف کی گیندوں کی تلاش میں جایا کرتے تھے۔ سورج ڈھلنے والا تھا اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جھیل کی طرف جارہا تھا۔

جھیل کی سطح پر سفید سفید انڈے جیسی بہت ساری گیندیں تیر رہی تھیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں انہیں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوجاتا لیکن آج میں ان کی تلاش میں نہیں تھا اور نہ ہی میں نے ان پر دوسری نظر ڈالی۔ میری نظریں ایگی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں بے تابی سے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا لیکن چہار سُو سناٹا طاری تھا نہ آدم نہ آدم زاد ماسوائے میرے۔ میری تلاش بے سُود رہی۔ مایوس ہوکر واپس پلٹا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اب میں شاید کبھی بھی ایگی سے نہیں مل سکوں گا۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف جانے لگا۔ اچانک میرے دل میں ایک خیال آیا اور میرے قدم ساحلی بند کی طرف اٹھنے لگے۔ اچانک میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ بند والے راستے سے ہوتا ہوا گھر لوٹوں۔ ابھی میں کچھ دور ہی گیا تھا کہ اچانک مجھے گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں نے اُچک کر دیوار کے پار نظر ڈالی تو وہاں مجھے مسٹر روس کی پیکارڈ گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ میں پہچان گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اُس روز مسٹر روس نے جانسن کی بری طرح پٹائی کی تھی۔ میں کسی انجانے تجسس کے باعث جہاں تھا، وہیں دم روک کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے لگا کہ آج پھر مسٹر روس کسی شخص کو لے کر وہاں پہنچے ہیں اور اب پھر کوئی

ریڈیو اسٹیشن لاہور کے سینٹرل پروڈکشن یونٹ میں احمد ندیم قاسمی کا انٹرویو ریکارڈ ہونا تھا، سبھی حاضرین احمد ندیم قاسمی سے اپنے دیرینہ تعلقات کی گواہی دینے لگے۔ احمد راہی نے پوپلے منہ سے کہا۔ ”ہماری تو احمد ندیم قاسمی سے اس وقت کی نیاز مندی ہے جب ان کے سر کے بال سفید ہوتے تھے۔“

احمد ندیم قاسمی نے بے ساختہ داد دیتے ہوئے کہا۔ ”واقعی وہ پہلے سر کے بال رنگا نہیں کرتے تھے۔“

ایک پارٹی میں ایک حسین لڑکی کو اس کی سہیلی نے بڑھ کر چوم لیا۔

تو ایک نوجوان نے آہ بھر کر کہا۔

”آج کی دنیا کی یہی مصیبت ہے کہ لڑکوں کے کام بھی لڑکیاں کرنے لگی ہیں۔“

☆☆☆

ایک فوجی اسپتال کی نئی نرس ایک دن نشانے بازی کی مشق دیکھنے گئی۔ بہت سی رائفلوں نے ایک ساتھ گولیاں اگلیں تو نرس نے گھبراہٹ میں قریب کھڑے ایک فوجی جوان کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

اگلے ہی لمحے وہ اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”معاف کیجیے گا۔ امید ہے آپ نے برا نہیں منایا ہوگا؟“

نوجوان نے کہا۔ ”ذرا بھی نہیں۔ آیئے آپ کو توپوں کی گولہ باری کی مشق دکھاؤں۔“

پشاور سے موسیٰ خان کی سوغات

بدنصیب ان کی مار کا نشانہ بننے والا ہے۔ جہاں میں تھا، وہاں سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ دروازہ کھلا اور مسٹر روس باہر نکلے۔ دوسری طرف سے جانسن باہر آیا۔ یہ دیکھ کر میں بہت پریشان ہوا کہ کیا آج یہ پھر مار کھانے کے لیے پہنچ گیا ہے۔ ”اگر اسے مار پڑی تو میں نہیں بچاؤں گا اس کم بخت کو۔“ جانسن کو دیکھتے ہی اچانک میرے اندر جذبۂ نفرت ابھر آیا اور میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ میری جانسن سے نہ دوستی تھی اور نہ ہی دشمنی لیکن اس کی وجہ سے میرا سب سے پیارا دوست مجھ سے دور ہوگیا تھا۔ میں نے نفرت سے اس طرف دیکھا اور غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کئی قدم آگے بڑھ آئے تھے۔ میں بدستور دیوار سے سر نکالے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس طرح آج وہ دونوں باتیں کر رہے تھے، اسے دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر لگتا تھا کہ اُن دونوں میں دوستی ہو چکی ہے۔ جانسن بھی بہت پُرسکون نظر آرہا تھا۔ اچانک میری نظر ناریل کے درختوں پر جا پڑی۔ ایگی ایک درخت کی اوٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے چلّا کر آواز دینی چاہی لیکن اگلے ہی لمحے میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ وہ روس اور جانسن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس جانب پشت کیے کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر میں سہم گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا پورا جسم برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا ہوا۔ میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ میں بُری طرح خوف زدہ ہو چکا تھا۔ ایگی کیا کرنے والا تھا، شاید چھٹی حس نے میرے ذہن کو خبردار کر دیا تھا۔ وہ بدستور دبے قدموں سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایگی اُن دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے پیشہ ور بدمعاشوں کی طرح پستول تھام رکھا تھا۔ ”مسٹر روس۔۔۔“ اچانک وہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے ان کا نام اتنی اونچی آواز میں پکارا تھا کہ میں نے بھی سن لیا، حالانکہ میں ان سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہ سنتے ہی وہ پلٹے۔ جیسے ہی وہ پلٹے ایگی نے گولی چلا دی۔ لمحہ بھر کے لیے فضا گولی کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی ان کے سر پر لگی تھی۔ وہ ریت پر گر چکے تھے۔ یہ دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ”یہ کیا کر دیا تم نے۔“ میں زور سے چلایا۔ ایگی نے میری آواز سن لی۔ وہ دوڑتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ اس نے دیوار پھلانگی اور میرے قریب پہنچ کر رُکا اور غور سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں بھی ڈرا سہما اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ ایک انسان کو قتل کر دینے کے باوجود وہ مکمل حواس میں تھا۔ اس کے چہرے پر اُن شکاریوں کی سی مسکراہٹ تھی، جنہوں نے اُڑتی ہوئی مرغابی کو مار گرایا ہو اور اب اپنے پختہ نشانے کی داد پانے کے لیے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ اس نے بدستور پستول اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورے جا رہے تھے۔ اتنی دیر میں جانسن بھی قریب پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر شاید وہ پریشان ہو گیا تھا۔ ”اسے تم ساتھ لے کر آئے تھے۔“ اس نے ایگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر وہ خاموش رہا۔ ”اے لڑکے۔۔۔ تم نے کیا دیکھا۔“

”کچھ نہیں۔۔۔“ نہ جانے کہاں سے اچانک میرے اندر اتنی ہمت آگئی کہ میں نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا اور پھر بروکلین اسٹریٹ پر اپنے قدم بڑھا دیے۔ ایک بار میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ایگی اور جانسن واپس جا رہے تھے۔ پستول اس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ میں نے تھوڑا آگے آنے کے بعد ساحل پر نظر ڈالی۔ وہ دونوں لاش کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ایگی نے اُس پیکارڈ کے مڈگارڈ پر اپنا ایک پاؤں رکھا ہوا تھا، جسے چھونے کی تمنا اسے مہینوں تک بے قرار رکھے رہی تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ آسمان پر ڈوبتے سورج کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہم مین ہٹن چلے آئے۔ اس کے بعد میں پھر کبھی بروکلین گیا اور نہ ہی کبھی ایگی سے کوئی رابطہ ہوا اور نہ ہی کوئی ایسا مشترکہ دوست ملا جس سے اس کی کوئی خیر خبر ملتی۔

☆☆☆

بروکلین چھوڑے ہوئے پینتیس برس گزر چکے تھے۔ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک بینک میں ملازم ہو گیا اور ترقی کرتا ہوا اعلیٰ عہدے تک پہنچ گیا۔ میری بیوی ایلس نہایت پُرامن مزاج کی حامل عورت تھی۔ اسے جرم سے شدید نفرت تھی۔ وہ مقامی کالج میں اخلاقیات پڑھاتی تھی۔ ہم دونوں سالانہ چھٹیوں پر تھے اور ہمارا سارا وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔ اس صبح بھی ہم نہایت سکون سے ناشتا کر رہے تھے جب ایگی کی ہلاکت کی تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔ گو کہ ابتدائی طور پر صبح ناشتے کی میز پر میں نے ایلس کو جو کچھ بتایا تھا، بظاہر وہ اس سے مطمئن ہو چکی تھی لیکن جب رات کو ہم سونے کے لیے لیٹے تو اس نے ایک بار پھر وہی تذکرہ شروع کر دیا۔ آخر مجھے اس کو مطمئن کرنے کے لیے سارا قصہ سنانا پڑا۔ پوری داستان سننے کے بعد اس نے ایگی کی موت پر بطور انسان افسوس کیا اور مجھ سے معذرت چاہی کہ اس نے مکمل احوال جانے بغیر مجھ پر شک کیا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر اخبار نظر نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ایلس نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہوگا۔ ناشتے کے بعد میں اٹھا اور لیونگ روم میں چلا آیا۔ مجھے یقین تھا کہ اخبار وہیں ہوگا۔ میں ایگی کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج کے اخبار میں اس کے بارے میں تفصیل سے خبریں ہوں گی۔ میری توقع کے مطابق اخبار لیونگ روم میں ہی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اخبار اٹھایا اور لان میں چلا آیا۔ نومبر کی ہلکی دھوپ اچھی لگ رہی تھی اور میں کرسی پر بیٹھ کر اخبار کھولنے لگا۔

اخبار کے پہلے صفحے کے نچلے حصے پر ایک بڑی سی رنگین

تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ایگی تابوت میں لیٹا ہوا تھا۔ یہ تصویر چرچ میں اس کی آخری رسومات کی ادائیگی کے موقع پر لی گئی تھی۔ تصویر کے ساتھ چھپی ہوئی خبر میں اس کی تدفین کا احوال بیان کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس کے جنازے میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی جن میں شہر کی لگ بھگ تمام معروف شخصیات بھی شامل تھیں۔ آخر میں لکھا تھا کہ ایگی کی زندگی کے بارے میں مزید کئی خبریں اندرونی صفحات پر ملاحظہ کریں۔ میں بے چینی سے اندرونی صفحات کھولنے لگا۔ وہاں اس کے بارے میں کئی خبریں موجود تھیں لیکن مجھے ان میں دلچسپی نہیں تھی۔ میں اس کی زندگی کا خاکہ پڑھنا چاہتا تھا۔ آخر میری مطلوبہ خبر نظر آگئی۔ خاصی تفصیلی خبر تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا:

بروکلین میں مارے گئے مافیا کے سربراہ اور گولڈن ہائٹس گولف کلب کے مالک ایگی کیوواک نے 1911ء کو بروکلین میں ہی جنم لیا۔ وہ کیوواک نامی ایک گودی سپروائزر کا بیٹا اور چھ بہن بھائیوں میں پہلے نمبر پر تھا۔ صرف بارہ برس کی عمر میں اس نے بروکلین کے ساحل پر گولڈن ہائٹس گولف کلب کے پارٹنر اور مافیا کے رکن روس اینڈرسن کو گولی مار کر قتل کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے یہ قتل اپنے گاڈ فادر جانسن کے کہنے پر کیا، جس کا مسٹر روس سے مالی تنازع چل رہا تھا۔ پولیس نے ایگی کو گرفتار کر لیا تھا لیکن گواہوں کے نہ ہونے اور ثبوت کی عدم موجودگی کے باعث عدالت نے اسے تین ماہ میں ہی بری کر دیا۔ جس کے بعد جانسن نے اس کی سرپرستی شروع کر دی۔

جانسن مافیا کا رکن اور جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ روس کے قتل کے بعد اس نے بروکلین میں مافیا کا سارا کام سنبھال لیا۔ وہ بے اولاد تھا۔ اس نے ایگی کو اپنا لے پالک بیٹا بنا لیا۔ اس کی موت کے وقت ایگی کی عمر صرف انیس برس تھی لیکن جرم کی دنیا میں اس کا نام عمر سے کئی گنا بڑا تھا۔ جانسن کی موت کے بعد اس نے سارا کاروبار سنبھال لیا۔ بہت جلد وہ پورے بروکلین پر راج کرنے لگا۔

بتایا جاتا ہے کہ جس رات ایگی کو ہلاک کیا گیا، اس وقت اس کے کارندے گولڈن ہائٹس گولف کلب کے اُس دروازے کے باہر منشیات کی بھاری مقدار خریدار کے حوالے کر رہے تھے جو صرف کلب کے مالک کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ انہیں اس ڈیل کی خفیہ اطلاع مل چکی تھی اور وہ نہ صرف منشیات کو پکڑنا چاہتے تھے بلکہ وہ کارندوں کے ساتھ ساتھ سرغنہ کو بھی گرفتار کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

جس وقت ڈیل ہو رہی تھی، اس وقت پولیس نے کارروائی شروع کر دی۔ اسی دوران میں اچانک ایگی کیوواک بھی باہر نکل آیا۔ وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں گولف کِٹ بیگ تھا۔ یہ سب کچھ اتنی برق رفتاری سے ہوا کہ ایگی کو بھاگنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ جب وہ باہر نکلا تو اچانک گولیاں چلنے لگیں۔ اس نے صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ کار کے قریب پہنچ کر اس نے گولف کِٹ بیگ پھینکا اور گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک شیرف کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ گولی اس کے جبڑے میں لگی اور حلق کو چیرتی ہوئی دماغ میں گھس گئی۔ یوں بروکلین میں جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ مدتوں راج کرنے کے بعد آخر اپنے انجام کو پہنچا۔ شیرف جیکی روس اینڈرسن کی ایک ہی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ شیرف کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کئی دہائی پہلے قتل ہونے والے مافیا کے رکن مسٹر روس کا چھوٹا بیٹا ہے۔ یہ وہی روس تھے جنہیں مبینہ طور پر ایگی کیوواک نے قتل کیا تھا تاہم خوش قسمتی سے سزا سے بچ گیا۔ بالآخر مجرم باپ کے بیٹے نے پولیس والا بن کر اپنا فرض نبھایا اور قانون کے نام پر اس کی گولی اُس مجرم کو موت سے ہمکنار کر گئی جو اس کے باپ کا قاتل بھی تھا۔

رپورٹ کی آخری سطریں پڑھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ تقدیر بھی کیا رنگ دکھاتی ہے۔ مجھے تو پہلے سے یقین تھا مگر اب یہ یقین اور پختہ ہو گیا کہ واقعی تقدیر کا ایک دن انسان کی زندگی پر اپنا سایہ ضرور کرتا ہے اور جب تک یہ سایہ رہتا ہے، وہ شخص اپنی منزل کی طرف کامیابی سے اُڑان بھرتا رہتا ہے لیکن جونہی تقدیر اپنے پر سمیٹتی ہے، انجام بھی لپک کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔

پینتیس برس پہلے ایگی کے ہاتھوں ایک گولی چلی۔ اُس گولی کی گونج اس کی پوری زندگی پر چھائی رہی۔ اُس دن تقدیر اس کے ساتھ تھی۔ پھر یوں ہوا کہ پینتیس برس کے بعد ایک اور گولی چلی۔ اب کی بار ایگی اس کا نشانہ تھا۔ تقدیر کا وہ ’خاص دن‘ ہمارے کتنے روز و شب پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا۔

میں نے اخبار تہ کر کے برابر میں رکھا اور بینچ پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ میری ہمیشہ شدت سے یہ خواہش رہی تھی کہ ایک دن بروکلین جاؤں مگر اس وقت مجھے لگا کہ اس خواہش نے اپنے پر سمیٹ لیے ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلدل

آصف ملک

معمولاتِ زندگی میں کئی طرح کے حادثات رونما ہوتے ہیں... لیکن کوئی حادثہ ایسا بھی ہوتا ہے جو ہماری نظر میں انتہائی غیر اہم ہوتا ہے اور ہم اسے نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں ...ایک ایسے ہی غیر اہم اور معمولی حادثے کا شاخسانہ جو رفتہ رفتہ غیر معمولی نوعیت اختیار کرتا چلا گیا...

اس شخص کا المیہ جو ایک دلدل سے نکل کے دوسری دلدل میں جا پھنسا تھا.....

اس کا نام فرینک مارش ہے۔ وہ ایک شریف اور قانون کی پابندی کرنے والا شخص ہے۔ مارش فیملی ویسے بھی اٹلانٹا سٹی میں قانون کے احترام کے لیے مشہور ہے، یعنی قانون کا احترام اسے گھٹی میں ملا ہے۔ اسے نہیں یاد کہ اس نے کبھی قانون کی معمولی سی خلاف ورزی بھی کی ہو۔ حد یہ کہ کسی ٹریفک قانون کو توڑنے پر چالان تک نہیں ہوا۔ قانون کی طرح وہ اخلاقیات اور اصولوں کی پابندی بھی کرتا ہے۔ پڑوسیوں کے کیا حقوق ہیں، اجنبیوں سے کس طرح پیش آنا ہے، اس کی وجہ سے کسی کو ذرا سی بھی تکلیف نہ ہو، یہ سب باتیں ہمیشہ اس کے ذہن میں رہتی ہیں۔ اس کے واقف کار دوست احباب اور ملنے جلنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے اس معاملے میں فرینک سے بہتر شخص نہیں دیکھا۔ شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جسے اس سے کوئی شکایت ہو یا اسے فرینک سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ فرینک نے قاتل بننے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ ارادہ اتنا پختہ تھا کہ اسے ذرا بھی بے چینی اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ اس کے خیال میں اس کمینے شخص کا وجود دنیا سے پاک کرنا نہایت ضروری ہو گیا تھا جو فرینک کی روح کا آزار بن گیا تھا۔ اس نے فرینک کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے چند مہینوں میں فرینک کو ذہنی اور مالی طور پر اتنا پریشان کیا کہ وہ پاگل ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بے تحاشا پینے لگا اور رات کو جب تک کئی نیند کی گولیاں نہ کھالے، اسے نیند نہیں آتی تھی۔ ماضی کی پُرسکون نیند اب قصۂ پارینہ بن گئی تھی۔ فرینک کے بارے میں مشہور تھا کہ فرینک کے کان کے پاس توپ بھی داغ دی جائے تو اس پر اثر نہیں ہوگا اور اب وہ اتنا اعصاب زدہ ہو گیا تھا کہ فون کی بیل سن کر بھی اچھل پڑتا۔ فرینک کو اس کا نام ہی نہیں معلوم ہے۔ اس لیے وہ اسے گالیوں سے یاد کرتا ہے۔

فرینک ایک چھوٹا سا پرنٹنگ ہاؤس چلا رہا ہے اور آرڈر پر مختلف چیزیں پرنٹ کر کے دیتا ہے۔ یہ اچھا بزنس ہے اور فرینک نے اس سے کمایا بھی بہت ہے۔ اس کی رہائش اٹلانٹا سٹی کے ایک نواحی قصبے میں ہے۔ یہ بڑا خوب صورت ڈچ ہاؤس ہے۔ اس کی مالیت کم سے کم ایک ملین ڈالرز ہے۔ اس کے پاس ایک شان دار کار بھی موجود ہے۔ تین سال پہلے فرینک نے شادی کی تھی۔ جینا عمر میں اس سے بارہ سال چھوٹی تھی۔ وہ شادی کے وقت بائیس سال کی تھی۔ تین سال بعد ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ فرینک نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ وہ شادی کی اہمیت کا قائل ہے لیکن اس کے خیال میں غلط عورت سے شادی کرنے سے بہتر ہے آدمی اکیلا رہے اور خوش رہے۔ اس لیے وہ اب اکیلا اور خوش تھا جب تک وہ حادثہ پیش نہیں آیا جس نے اسے ایک ایسی دلدل میں پھنسا دیا جس سے نہ وہ نکل پا رہا تھا اور نہ ہی یہ اسے نگل رہی تھی۔

وہ تباہ ہونے کے قریب تھا۔ اس کے ہاتھ میں رقم

نہیں رہی اور وہ دو ہفتے سے دفتر نہیں گیا تھا۔ اس کام میں نفع اچھا ہوتا ہے لیکن عام طور سے رقم کام کی تکمیل کے بعد ملتی ہے۔ یعنی رقم اپنی جیب سے لگانا پڑتی ہے۔ اب فرینک کے پاس کیش نہیں تھا اور اگر اسے کوئی آرڈر ملتا، تب بھی وہ اس کی تکمیل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اصل مسئلہ یہ بھی نہیں تھا۔ کاروبار کے لیے وہ کہیں نہ کہیں سے رقم کر لیتا۔ اس کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ اسے بینک سے بھی قرض مل سکتا تھا۔ اصل مسئلہ وہ شخص تھا جو اسے جونک کی طرح چمٹ گیا تھا اور اس کا خون چوس رہا تھا۔

اس چکر کا آغاز فرینک کے کزن جیف مارش کی ویک اینڈ پارٹی سے ہوا۔ جیف دولت مند شخص تھا اور اسے پارٹیاں دینے کا شوق تھا۔ عام طور سے ہر ویک اینڈ پر اس کے گھر پارٹی ہوتی تھی جس میں کھانے پینے کا زبردست انتظام ہوتا اور تقریباً سارا خاندان اس موقع پر جمع ہوتا تھا۔ اس لیے فرینک بھی مہینے میں ایک دو بار چلا جاتا تھا۔ جیف کا گھر شہر سے باہر اس کے فارم کے ساتھ ہی ہے۔ جیف فارمر ہے اور اس کے پاس کوئی دو ہزار ایکڑ زمین ہے۔ وہ اس سے خوب کماتا ہے۔ مارش خاندان کے زیادہ لوگ اسی علاقے میں آباد ہیں اور فرینک کی طرح شہر میں کام کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ اسے بہت طویل ڈرائیو کر کے جیف کے گھر جانا پڑتا ہے، اس لیے وہ عام طور سے مہینے میں ایک دو بار ہی جاتا۔

یہ پارٹی بہت شان دار تھی۔ خاص طور سے جیف نے باربی کیو اور اسکاٹ لینڈ کی خاص اسکاچ وہسکی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ فرینک عام طور سے کھانے اور پینے کے معاملے میں محتاط رہتا ہے لیکن اس بار اس نے بے اعتدالی کی۔ دل بھر کر کھانے کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ اس لیے رات گئے جب گھر کے لیے روانہ ہوا تو فرینک کے ذہن پر خمار چھا رہا تھا۔ جیف نے اس سے رکنے کو کہا۔ ”اس حالت میں ڈرائیونگ کرنا مشکل ہوگی۔“

”نہیں، میں چلا جاؤں گا۔“ فرینک نے جواب دیا۔ اصل میں اسے اگلے دن کچھ کام نمٹانے تھے کیونکہ کارڈز پرنٹ کا ایک بڑا آرڈر آیا تھا اور گاہک نے نمونے مانگے تھے۔ وہ اسے تیار کر کے دکھانے تھے۔ وہ رک جاتا تو نمونے بنانے کا کام پیر تک چلا جاتا اور پیر کو مصروفیت بہت زیادہ ہوتی تھی اس لیے وہ بہرصورت گھر جانا چاہتا تھا۔ ڈیزائننگ کا بہت سارا کام وہ گھر پر کرتا اور اس کے پاس گھر میں کام کرنے کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ اسے کوئی چالیس میل تک ڈرائیونگ کرنا تھی اس لیے اس نے روانہ ہونے سے پہلے چند کھٹے زیتون کھا لیے۔ اس سے فرینک کے حواس بہتر ہوئے۔ ڈرائیونگ کے دوران میں وہ کوشش کر رہا تھا کہ کار کی رفتار ایک حد میں رہے۔ ہائی وے کا یہ حصہ رات کے وقت سنسان ہو جاتا ہے۔ یہاں روشنی کا بندوبست بھی نہیں تھا، آدمی کو صرف اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر بھروسا کرنا پڑتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔

جب فرینک اپنے قصبے کی طرف جانے والی سڑک کے پاس پہنچا تو وہ سب ہو گیا جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے کار ذیلی سڑک پر موڑی، جھاڑیوں سے ایک شخص نکل کر اچانک ہی سڑک پر آ گیا۔ فاصلہ دس گز بھی نہیں تھا۔ پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑتی کار کو اتنی جلدی روکنا ناممکن تھا اس کے باوجود اس نے پوری قوت سے بریک لگائے اور فرینک قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ جب کار اس شخص سے ٹکرائی تو اس کی رفتار دس میل فی گھنٹا بھی نہیں رہی تھی۔ بمپر اس کی ٹانگوں سے ٹکرایا اور وہ الٹ کر بونٹ سے ہوتا ہوا سڑک کے کنارے جا گرا۔ کار ایک جھٹکے سے رکی۔ فرینک چند لمحے کے لیے حواس باختہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا۔ پھر وہ کار سے اتر کر اس شخص کی طرف جھپٹا۔ وہ سڑک کے کنارے دائیں کروٹ کے بل پڑا تھا اور اس کے آس پاس زمین پر خون پھیل رہا تھا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی نظر آ رہا تھا اور سر کی حالت تو بُری تھی۔ فرینک کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی کم رفتار سے ٹکر ہونے کے بعد کوئی آدمی اتنی بُری طرح زخمی ہو سکتا ہے۔ زخمی کی بائیں آنکھ کی جگہ صرف گوشت کا لوتھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی فرینک کھڑا سوچ رہا تھا کیا کرے کہ عقب سے کسی گاڑی کی روشنی نمودار ہوئی اور ایک پک اَپ آ کر ان کے پاس رکی۔ اس سے ایک چھوٹے قد کا لیکن گٹھے ہوئے جسم والا شخص اترا۔ اس نے کسانوں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے منہ سے سستے تمباکو کی بو آ رہی تھی۔ اس کا ہلتا ہوا منہ بتا رہا تھا کہ وہ تمباکو چبا کر استعمال کرتا ہے۔ پاس آ کر اس نے پہلے زخمی اور پھر فرینک کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا چکر ہے؟''

فرینک ہکلانے لگا تھا۔ ''وہ... یہ... یہ شخص اچانک... سامنے... آ گیا... میں قسم کھا کر کہتا ہوں... میری کار کی رفتار صرف دس میل فی گھنٹا... ہو گی جب اس سے ٹکرائی۔''

اس شخص نے فرینک کی بات کا قطعی اعتبار نہیں کیا۔ دس میل فی گھنٹا کی رفتار سے ٹکر مارنے سے کسی کا یہ حال نہیں ہو سکتا تھا جو اس شخص کا دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص نے جھک کر زخمی کی گردن پر نبض دیکھی اور کھڑے ہو کر بولا۔ ''یہ مر چکا ہے۔''

یہ سن کر فرینک کے ہاتھ پیر کانپنے لگے اور وہ بوکھلا کر ایک بار پھر وضاحت کرنے لگا۔ اس شخص نے فرینک کی بات کاٹی۔ ''یہ وضاحتیں تم پولیس کے سامنے کرنا۔'' وہ اپنی پک اَپ کی طرف جانے لگا تو فرینک نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''نہیں... پلیز... میری بات سنو... میں شریف آدمی ہوں۔''

اس نے غور سے فرینک کو دیکھا۔ ''ہاں، لگتے بھی ہو لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بہر حال، تمہاری گاڑی سے ٹکرا کر ایک شخص مر گیا ہے۔''

''سنو، اس میں میرا قطعی کوئی قصور نہیں ہے۔'' فرینک نے اضطراب سے کہا۔ ''یہ شخص خود اچانک جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی تھی۔''

''ممکن ہے تم سچ کہہ رہے ہو۔'' وہ بولا۔ ''لیکن یہ سب پولیس کو بتانا، مجھے بتانا تو بیکار ہے۔''

''میں معاملہ پولیس تک نہیں لے جا سکتا۔ میں ایک معزز کاروباری شخص ہوں۔ اگر یہ بات پولیس تک پہنچ گئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔''

اس شخص کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ ہم لاش یہیں چھوڑ کر چلے جائیں؟''

فرینک نے سر ہلایا۔ ''یہی مناسب ہے ورنہ میں بہت مشکل میں پڑ جاؤں گا۔''

فرینک کو اپنی ساکھ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس شخص کی موت کا الزام اس پر نہیں آئے گا لیکن یہ ممکن تھا کہ پولیس اسے نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کی مرتکب قرار دے دے اور اس کا ڈرائیونگ لائسنس عارضی طور پر منسوخ کر دیا جائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب یہ بات منظرِ عام پر آئے گی تو اس کی کتنی جگ ہنسائی ہو گی۔ کسان نے اپنا بازو فرینک سے چھڑا لیا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ہر صورت میں پولیس کو رپورٹ کروں گا۔''

فرینک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح روکے۔ اس شخص کا لباس اور پک اَپ دونوں خستہ حال تھے اور وہ غریب لگ رہا تھا۔ اچانک فرینک کے ذہن میں خیال آیا اور اس نے اپنا بٹوا نکال کر اس میں جتنی رقم تھی، وہ سب نکالی اور کسان کی جیب میں ٹھونس دی۔ ''سنو دوست... مجھ پر رحم کرو اور اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔''

رقم جیب میں آئی تو کسان کا رویہ نرم پڑ گیا۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن اگر بات پولیس تک گئی تو میں

تباہ ہو جاؤں گا۔ یہ مر چکا ہے... اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ مجھے کوئی سزا ملتی ہے یا نہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن پولیس بعد میں تفتیش کرے گی تو ممکن ہے تمہیں یا مجھے تلاش کر لے اور پھر حادثے کے بجائے قتل کا الزام لگے۔'' کسان نے ایک نکتہ اٹھایا۔ فرینک بھی سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ یہاں کوئی نشان چھوڑ جاتے اور پولیس اس کی مدد سے فرینک تک رسائی حاصل کر لیتی۔ اس نے کسان کی طرف دیکھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

اس نے اپنی خشخشی داڑھی کھجائی اور کچھ دیر بعد بولا۔ ''اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اس کی لاش یہاں سے ہٹا کر جنگل میں کہیں دبا دی جائے۔''

فرینک کو لاش دفنانے کے بارے میں سوچ کر ہی پسینا آنے لگا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''او کے... میں کر دیتا ہوں۔'' کسان نے کہا اور لاش اٹھا کر پک اَپ کے عقبی حصے میں ڈال دی۔ ''تم رکو... میں اسے جنگل میں کہیں دبا کر آتا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر پک اَپ میں بیٹھا اور اسے گھما کر سڑک سے نیچے جھاڑیوں میں لے گیا۔ چند لمحے بعد پک اَپ کی آواز جنگل میں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ فرینک کچھ دیر تو وہاں کھڑا رہا، جب اسے یقین ہو گیا کہ پک اَپ دور جا چکی ہے تو وہ تیزی سے اپنی کار میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے گھر میں تھا۔ اگرچہ وہ خاصی پی کر آیا تھا لیکن اسے پھر طلب ہو رہی تھی، اس نے برانڈی لی۔ وہ اس وقت تک پیتا رہا جب تک نشہ اس کے حواس پر پوری طرح غالب نہیں آ گیا پھر وہ سو گیا۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ درد سے اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر غسل کیا اور تیز گرم کافی کے ساتھ دو پین کلر گولیاں لیں، تب کہیں جا کر وہ سوچنے کے قابل ہوا۔ اسے پہلی سوچ یہ آئی کہ رات جو ہوا تھا، وہ خواب تھا یا حقیقت۔ وہ ڈرتے ڈرتے پورچ میں آیا اور گاڑی کے اگلے حصے کا معائنہ کیا۔ وہاں ڈینٹ کا کوئی نشان نہیں تھا البتہ ہلکی سی سرخی تھی جیسے وہاں خون لگ گیا ہو۔ فرینک نے جلدی سے پانی مار کر اسے صاف کر دیا۔ یہ نشان دیکھ کر اسے کسی قدر یقین آ گیا کہ رات اس سے سچ مچ حادثہ ہوا تھا۔ وہ اس کسان کا شکر گزار تھا جس نے اس کی مدد کی اور اسے ایک بڑی مشکل سے نکالا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اسے بھی دھوکا دے کر چپکے سے بھاگ آیا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ ورنہ بعد میں کوئی پیچیدگی بھی پیدا ہو سکتی تھی۔

ایک دو دن تو وہ پریشان رہا۔ اسے رہ رہ کر حادثے اور اس میں مرنے والے کا خیال آتا رہا۔ دو دن میں اس نے ہر اخبار دیکھ لیا اور نیوز چینل کی تمام خبریں دیکھ لیں مگر کہیں سڑک کے حادثے میں مرنے والے کا ذکر نہیں تھا۔ جو ایک دو حادثے رپورٹ ہوئے تھے، وہ کہیں اور کے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کسان نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ اس نے لاش کو اس طرح چھپا دیا تھا کہ وہ پولیس کو نہیں مل سکی تھی ورنہ اب تک اس کے بارے میں کہیں نہ کہیں خبر آ جاتی۔ فرینک خوش ہوا۔ تیسرے دن سے اس نے اپنی معمول کی زندگی شروع کر دی اور ایک ہفتے بعد وہ اس حادثے کو تقریباً بھول گیا۔ فرینک کا خیال تھا کہ اب تک تو وہ کسان بھی اس بات کو بھول گیا ہو گا اور ممکن ہے اس کا فرینک سے کہیں سامنا ہو تو وہ اسے پہچان بھی نہ سکے۔ خود فرینک کی یادداشت میں اس کی صورت دھندلا رہی تھی۔

لیکن ایک مہینے بعد جب ایک صبح فرینک دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تو سڑک کے اس پار اسی کسان کی کھٹارا پک اَپ اور پک اَپ میں کسان کو دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تمباکو چبا رہا تھا۔ وہ فرینک کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا لیکن اس نے پک اَپ سے اتر کر فرینک کے پاس آنے کی زحمت نہیں کی۔ فرینک خود مُردہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور چال سے بھی زیادہ مُردہ لہجے میں کہا۔ ''تم... یہاں تک کیسے آئے؟''

اس نے تمباکو کی پچکاری ماری اور بولا۔ ''ایک مہینا لگ گیا لیکن آخر میں نے تمہیں تلاش کر لیا۔''

''مجھے تلاش کیا... لیکن کیوں؟''

اس نے پھر پچکاری ماری اور بگڑے لہجے میں بولا۔ ''تم نے مجھے لاش چھپانے کے صرف دو سو ڈالرز دیے تھے۔''

''خدا کے لیے۔'' فرینک نے گھبرا کر آس پاس دیکھا۔ ''آہستہ بولو... کوئی سن لے گا۔''

وہ فرینک کی بات سنے بغیر بولا۔ ''میں نے لاش جنگل میں ایسی جگہ چھپائی ہے جہاں کوئی اسے قیامت تک تلاش نہیں کر سکتا۔ صرف میں جانتا ہوں کہ لاش کہاں ہے۔'' اس نے آخری جملے پر زور دے کر کہا۔

فرینک کو یوں لگا جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو۔ وہ سکون جو اسے حادثے کے کئی دن بعد ملا تھا، آن واحد میں غائب ہو گیا تھا۔ اس نے کسان کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

اس بار اس نے بدتمیزی سے یوں پچکاری ماری کہ تمبا کو کی پھوار فرینک کے جوتوں تک آئی۔ ”تم نے کوشش کی کہ سستے میں چھوٹ جاؤ لیکن یہ کام اب اتنا سستا نہیں ہے۔ حادثہ کرنا الگ بات ہے لیکن حادثے کے بعد لاش چھپانا سنگین جرم ہے۔“

”لاش تم نے خود چھپائی تھی۔ تجویز بھی تم نے دی تھی۔“

”لیکن کس کے لیے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”تمہارے لیے نا... اس لیے اب معاوضہ بھی تم ادا کرو گے۔“

”معاوضہ کس بات کا؟“ فرینک نے لہجہ تیز کرنے کی کوشش کی۔ ”تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟“

”چلو اگر تم ایسا سمجھ رہے ہو تو بلیک میل ہی سہی۔“ وہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں کل شام کو کسی وقت تمہارے دفتر آؤں گا، دس ہزار ڈالرز تیار رکھنا۔“

”دس ہزار ڈالرز!“ فرینک چلّا اٹھا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے؟“

”بالکل درست ہے۔“ وہ پک اَپ اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے دس ہزار ڈالرز نہیں ملے تو پھر میں پولیس کو کال کروں گا اور اسے لاش والی جگہ بتا دوں گا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ تم بچ جاؤ گے؟ لاش تم نے دفن کی ہے۔“

”اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن تمہاری کار پر اور مرنے والے کی لاش سے سراغ مل جائے گا۔ پولیس والوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور پھر تم حادثے کے الزام میں نہیں بلکہ قتل کے جرم میں پکڑے جاؤ گے۔“ اس نے کہا۔ ”یاد رکھنا، میں کل شام چار بجے تک آؤں گا۔“

کسان نے پک اَپ آگے بڑھا دی اور فرینک احمقوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔ وہ دفتر جانے کے بجائے واپس گھر میں آیا اور ایک مہینے بعد اس نے دوبارہ برانڈی کی بوتل کھولی۔ وہ پیتا رہا اور اس مسئلے کا حل سوچتا رہا۔ بدمعاش کسان صاف بلیک میلنگ پر اتر آیا تھا اور ایک بار تو فرینک کو خیال آیا کہ وہ خود پولیس کو مطلع کر دے لیکن پھر اسے حادثہ یاد آیا۔ پولیس کسان کو بعد میں پکڑتی، پہلے اسے دھر لیتی۔ کئی گھنٹے تک سوچنے اور پوری بوتل ختم کرنے کے بعد یہی حل اس کے ذہن میں آیا کہ وہ کسان کو دس ہزار ڈالرز ادا کر دے۔

ممکن ہے اس کے بعد وہ پلٹ کر نہ آئے اور ہمیشہ کے لیے اس کی جان چھوڑ دے۔ اگلے دن دفتر جانے سے پہلے اس نے بینک سے.... دس ہزار ڈالرز نکلوا لیے۔

شام تک وہ سخت اضطراب کے عالم میں تمام کام چھوڑ کر بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی کال ریسیو نہیں کی اور جو گاہک اس کے دفتر آئے، اس نے ان کو ٹہلا دیا۔ شام چار بج کر بیس منٹ پر کسان اپنے مخصوص لباس میں اندر آیا۔ وہ تمبا کو چبا رہا تھا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔ ”لاؤ دس ہزار ڈالرز۔“

فرینک نے لفافہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ ”اس میں دس ہزار ڈالرز ہیں۔ لیکن اب یہ سلسلہ یہیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے۔“

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔“ کسان نے خلوص سے کہا۔ ”اگر مجھے اشد ضرورت نہ ہوتی تو میں کبھی تمہیں تنگ نہ کرتا۔ لاؤ، یہ لفافہ مجھے دے دو۔“

بادلِ ناخواستہ فرینک نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا اور کمزور لہجے میں دھمکی دی۔ ”اب اگر تم مجھے دوبارہ دکھائی دیے تو میں خود پولیس کو کال کر دوں گا۔“

لفافہ کھول کر اس نے رقم دیکھی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”تم بالکل بے فکر رہو، میں اب دوبارہ تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ اب بھی مجبوری نہ ہوتی تو یقین کرو میں کبھی تمہارے پاس نہ آتا۔“

جب وہ فرینک کو یقین دلا رہا تھا تو اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بلیک میلر کا منہ ایک بار کھل جائے تو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ایک بار رقم ملنا اس کے منہ کو خون لگنے کے مترادف ہوتا ہے۔ بس فرینک کو ایک امید تھی کہ وہ شاید دوبارہ نہ آئے۔ ممکن ہے کسی حادثے میں اس کا انتقال ہو جائے۔ وہ تمبا کو چباتا تھا اس لیے اسے دل کا دورہ پڑنے کا بھی امکان تھا۔ یا پھر وہ کہیں دور چلا جائے، کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ دس ہزار ڈالرز معمولی رقم نہیں تھی۔ یہ اس کی ایک مہینے کی کمائی کے برابر تھی اور یہ شخص ایک منٹ میں اس سے دس ہزار ڈالرز لے گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا اور پھر دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا۔ جب کسان نے اس سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تو فرینک کا اطمینان واپس آنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا نے اس کی دعا سن لی ہے اور اب کسان پھر نہیں آئے گا۔ لیکن جب اس کا یقین پختہ ہونے والا تھا تو اس کی منحوس صورت دوبارہ دکھائی دی اور اس بار وہ براہِ راست اس کے دفتر چلا آیا۔ جب وہ اچانک اندر آیا تو فرینک کا دل رکتے رکتے رہ گیا۔ بہت دیر تک تو اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا ہی نہیں گیا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

”تم... کیوں آئے ہو؟“

”بس ایسے ہی۔“ اس نے حسبِ معمول تمبا کو چباتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ ”سوچا تم سے مل لوں۔ دراصل مجھے کچھ رقم کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن یہ میں تم سے ادھار مانگ رہا ہوں۔ جیسے ہی میرے حالات ٹھیک ہوں گے، میں ادا کر دوں گا۔“

”بکو مت۔“ فرینک پھٹ پڑا۔ ”تم ذلیل گھٹیا بلیک میلر... میں تمہیں ایک ڈالر بھی نہیں دوں گا۔“

”مجھے ایک ڈالر نہیں، اس بار بیس ہزار ڈالرز چاہئیں۔ میں جلد از جلد لوٹا دوں گا۔“

”بیس ہزار ڈالرز!“ فرینک کے منہ سے بڑی مشکل سے نکلا۔ ”تمہیں معلوم ہے یہ کتنی بڑی رقم ہے؟“

”معلوم ہے، تب ہی تو مانگ رہا ہوں۔“

”میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔“

”میں بہت مجبوری میں یہاں آیا ہوں۔“ کسان نے ذرا آگے ہو کر کہا۔ ویسے وہ انداز سے بالکل بھی مجبور نہیں لگ رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنا قرض وصول کرنے آیا ہو۔

”میں رقم نہیں دے سکتا۔“ فرینک نے پھر کہا۔

”سنو دوست... یہ وقت میرے لیے مشکل ہے۔ اگر مجھے بیس ہزار ڈالرز نہیں ملے تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ مجھے کچھ لوگوں کی رقم دینی ہے اور اگر میں رقم نہیں دے سکا تو مجھے جیل جانا پڑے گا لیکن میں اکیلے جیل نہیں جاؤں گا۔“ اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ فرینک جیل جانے کے تصور سے کانپ اٹھا۔ کسان غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم ایک بڑی حیثیت کے آدمی ہو۔ تمہارے پاس شان دار گھر اور مہنگی گاڑی ہے۔ یقیناً اچھا خاصا بینک بیلنس بھی ہوگا۔ پھر یہ کاروبار اور لوگوں میں تمہاری ساکھ ہے۔ صرف بیس ہزار ڈالرز کی خاطر تم یہ سب ختم کر دو گے؟ تمہاری عزت اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔“

کسان بڑی چالاکی سے اسے راضی کر رہا تھا۔ خود فرینک بھی دل ہی دل میں صورتِ حال کا تجزیہ کر رہا تھا۔ کسان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کے پاس جو کچھ تھا، وہ بیس ہزار ڈالرز سے کہیں زیادہ قیمتی تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ اگر اس نے کسان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ پولیس کو سب بتا دے گا اور اس کے بعد وہ سب تباہ ہو جائے گا جسے وہ اب تک بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس نے سرد آہ بھری اور بڑی بے بسی سے اس شخص کو دیکھا جو اب بڑی مکاری سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے فرینک کے تاثرات سے اس کی شکست بھانپ لی تھی۔

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم پھر مجھے تنگ نہیں کرو گے؟“

”میں قسم کھاتا ہوں کہ اب کبھی یہاں نہیں دکھائی دوں گا۔“ اس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

فرینک کو اس کی قسم پر اتنا ہی اعتبار تھا جتنا کہ وہ شیطان کی قسم پر کر سکتا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے اس شخص کا مطالبہ پورا کرنا ہی تھا۔ ”ٹھیک ہے، میں کل تک تمہیں بیس ہزار ڈالرز کر کے دے دوں گا لیکن اس کے بعد تم نے مجھ سے کوئی مطالبہ کیا تو...“

”نہیں، بس یہ آخری بار ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”تو میں تم سے رقم لینے کب آؤں؟“

”کل اسی وقت آ جانا۔“

وہ فرینک کے دفتر سے مسکراتا ہوا جانے لگا تو فرینک کا دل چاہا کہ عقب سے اس کے دل میں پیپر نائف گھونپ دے۔ اس کے دفتر میں یہی ایک ہتھیار موجود تھا۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی کو قتل کرے۔ چاہے وہ اس بلیک میلر کا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ بس فرینک کا خیال تھا۔ بعد میں اس میں تبدیلی آئی۔ کسان اگلے دن اس سے آ کر بیس ہزار ڈالرز لے گیا۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا اور فرینک کا خون جلتا رہا۔ جب وہ جا رہا تھا تو فرینک کے دل میں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اب اسے یہ منحوس صورت بار بار دیکھنا پڑے گی۔ اس کا اندازہ بالکل درست نکلا۔

صرف تین ہفتے بعد اس نے پھر فرینک سے پندرہ ہزار ڈالرز کا مطالبہ کیا جو اسے پورا کرنا پڑا۔ اس کے دو ہفتے بعد اس نے پھر دس ہزار ڈالرز مانگے اور اس بار وہ واضح بلیک میلنگ پر اتر آیا۔ اس نے فرینک سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ اسے ہر مہینے دس ہزار ڈالرز دے گا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ان دونوں میں سے ایک بھی زندہ ہے۔ اس نے فرینک سے کہا۔ ”تم مجھے ہر مہینے کہیں سے بھی کر کے دس ہزار ڈالرز دو گے۔ چاہے تمہیں اس کے لیے اپنا مکان یا کاروبار کیوں نہ بیچنا پڑے۔“

”اب میرے پاس یہی دو چیزیں رہ گئی ہیں۔“ فرینک نے اسے مطلع کیا۔ ”باقی جتنی رقم تھی، وہ سب تمہیں دے چکا ہوں۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ اس نے مکروہ انداز میں تمبا کو چباتے ہوئے کہا۔ وہ شروع سے اب تک فرینک سے ایک ہی حلیے میں ملتا آیا تھا۔ یعنی وہ کسانوں کے کام والا لباس پہنا ہوتا

تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کھٹارا پک اَپ ٹرک میں آتا تھا۔ وہ اب تک فرینک سے پچاس ہزار ڈالرز سے زیادہ رقم لے چکا تھا لیکن اس کے حلیے یا صحت سے کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ اس نے یہ رقم خود پر خرچ کی ہے۔ غالباً وہ اس رقم کو کہیں اڑا رہا تھا۔ شاید عورتوں پر یا شاید اسے جوئے کی عادت تھی۔ فرینک نے بے بسی سے کہا۔

”میں تمہیں ہر مہینے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔ میرے پاس اب اتنی رقم نہیں ہے کہ میں اپنا کاروبار جاری رکھ سکوں۔“

”اچھا، ایسا کرو... مجھے ایک لاکھ ڈالرز دے دو اور ہم اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔“

”ایک لاکھ ڈالرز!“ فرینک کا دل ایک لمحے کو رک گیا۔

”ہاں پھر میں تم سے کبھی کوئی رقم نہیں مانگوں گا۔“ اس نے فراخ دلی سے کہا۔ ”ایک لاکھ ڈالرز دو اور ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرلو۔“

”لیکن تم ہر بار یہی کہتے تھے کہ بس آخری بار رقم لے رہے ہو اور پھر لینے آجاتے تھے۔“ فرینک نے تلخی سے کہا۔

”وہ تو چھوٹی موٹی رقم ہوتی تھی۔ ایک لاکھ ڈالرز کے بدلے میں تمہیں پکی ضمانت دوں گا۔ اس کے بعد میں چاہوں، تب بھی تمہیں بلیک میل نہیں کر سکوں گا؟“

”وہ کیسے؟“

”میں اس آدمی کی لاش تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم اسے کہیں بھی لے جا کر دفنا سکتے ہو یا کسی بھی طریقے سے ضائع کر سکتے ہو۔ جب میرے پاس لاش نہیں ہوگی تو میں تمہیں بلیک میل کیسے کروں گا۔“

فرینک کے خیال میں اس کی پیش کش اچھی تھی۔ لیکن وہ اسے ایک لاکھ ڈالرز نہیں دے سکتا تھا۔ یہی بات اس نے کہہ دی۔ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، جب تک تم ایک لاکھ ڈالرز کا بندوبست نہیں کر لیتے، مجھے دس ہزار ڈالرز ہر مہینے دیتے رہنا اور جب تم ایک لاکھ ڈالرز دے دو گے تو میں یہ چکر ختم کر دوں گا۔“

فرینک کو اسے دس ہزار ڈالرز دینا ہی پڑے۔ جب وہ اسے رقم دے رہا تھا، تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بس یہ آخری بار ہے۔ اب وہ اسے مزید ایک ڈالر بھی نہیں دے گا۔ لیکن اس وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اس شخص کو قتل کر دے گا۔ یہ خیال فرینک کو بعد میں آیا۔ وہ ٹی وی پر آنے والی ایک کرائم سیریز شوق سے دیکھتا تھا اور اس بار سیریز میں ایک شخص کو بلیک میلر سے چھٹکارے کے لیے اسے قتل کرتے دکھایا گیا تھا۔ اتفاق سے بلیک میلر کچھ اسی کسان جیسا تھا۔ بلیک میل ہونے والا اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن جب وہ اسے قتل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ پہلے اس کے گھر کا پتا چلاتا ہے اور پھر اس کے معمولات کا جائزہ لے کر اسے قتل کر دیتا ہے۔ یہیں سے فرینک کے ذہن میں خیال آیا۔ اس بلیک میلر سے چھٹکارے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اس کے منحوس وجود کو اس دنیا سے مٹا دیا جائے۔ جیسے جیسے وہ اس بات پر غور کرتا گیا، یہ خیال اس کے اندر پختہ ہوتا چلا گیا اور بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے فرینک نے اپنی زندگی میں لال بیگ سے بڑے کسی جان دار کو نہیں مارا تھا۔ کیڑے مکوڑے سے یک دم جست لگا کر کسی انسان کے قتل کا فیصلہ آسان نہیں ہوتا۔ مگر فرینک اس فیصلے سے بہت مطمئن اور خوش تھا۔ کسان کا وجود اس کے نزدیک لال بیگ سے بھی گیا گزرا تھا اور وہ کسی صورت انسان کہلانے کا مستحق نہیں تھا۔ اس لیے وہ اسے قتل کرنے میں حق بہ جانب ہوتا۔ ایک بار ارادہ کرنے کے بعد وہ کسی ایسے موزوں طریقے پر غور کرنے لگا جس میں قتل کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو اور الزام بھی اس پر نہ آئے... بلکہ اس کی لاش بھی اگر اس شخص کی طرح غائب ہو جائے جو فرینک کی کار سے ٹکرایا تھا تو یہ سب سے اچھی صورت ہوتی۔ لیکن پہلا مرحلہ اس کا پتا معلوم کرنا تھا۔

فرینک دفتر نہیں جا رہا تھا۔ وہ ہمہ وقت گھر پر رہتا اور اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے رقم لینے کے لیے یہیں آئے گا۔ اس نے سب سے پہلے یہ کیا کہ ایک پرانی کار خرید لی اور اپنی شان دار کار کو گیراج میں چھپا دیا ورنہ وہ عام طور سے ڈرائیو وے میں کھڑی رہتی تھی۔ اب اسے انتظار تھا کہ کسان کب آتا ہے۔ فرینک کے پاس ایک پستول تھا لیکن وہ اس کے نام پر تھا اور اگر وہ اسے استعمال کرتا تو امکان تھا کہ جلد پکڑا جائے گا۔ اس لیے اس نے ایک غیر قانونی پستول بھی حاصل کر لیا۔ یہ پستول لینے کے لیے اسے ریاست سے باہر جانا پڑا کیونکہ جارجیا میں کوئی ہتھیار لینے کے لیے ڈرائیونگ لائسنس یا سوشل سیکیورٹی دکھانا لازمی ہوتا ہے اور یہاں ہر ہتھیار رجسٹرڈ ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ سے پستول خرید کر لے آیا جہاں کسی قسم کی رجسٹریشن نہیں ہوتی اور نہ ہی خریدنے والے سے کوئی شناختی چیز مانگی جاتی ہے۔ اب وہ پوری طرح تیار تھا اور کسان کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔

اس کی توقع کے عین مطابق وہ ایک مہینے سے پہلے آ گیا۔ کال بیل کے جواب میں وہ دبے قدموں دروازے

تک گیا اور جیسے ہی اسے کسان کی صورت نظر آئی، وہ اسی طرح واپس آ گیا۔ اس نے دوسرا پستول لیا اور چپکے سے پیچھے والے دروازے سے نکل کر عقبی گلی میں آیا جہاں اس کی نئی خستہ حال کار کھڑی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور اسے گھما کر گلی کے سرے پر واقع سڑک پر ایک جگہ روک دیا۔ گلی سے نکلنے والے کو لازمی اسی جگہ سے گزرنا پڑتا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کسان کی کھٹارا پک اَپ گلی سے نمودار ہوئی اور مخالف سمت میں مڑ گئی۔ فرینک نے کار اس کے پیچھے لگا دی۔ لیکن وہ اتنا قریب نہیں گیا کہ کسان عقبی آئینے میں اس کی صورت دیکھ لیتا۔ ویسے بھی پک اَپ اتنی بڑی تھی کہ وہ دور سے اس پر نظر رکھ کر آسانی سے تعاقب کر سکتا تھا۔ اسے تعجب ہوا جب اس نے کسان کو اسی طرف جاتے دیکھا جہاں فرینک کی گاڑی سے حادثہ پیش آیا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کم ہوا تو فرینک مزید محتاط ہو گیا اور اس نے کار کچھ اور پیچھے کر لی۔ وہ اس جگہ کے پاس سے گزرے جہاں حادثہ ہوا تھا۔ پک اَپ اس جگہ سے کوئی ایک کلومیٹر بعد اسی جنگل میں بائیں طرف مڑ گئی۔ یہاں کہیں کہیں فارم بنے ہوئے تھے۔

فرینک اس کچے راستے پر مڑنے سے پہلے کچھ دیر ہچکچاتا رہا پھر اسے خیال آیا کہ وہ نہتا نہیں ہے۔ اگر کسان سے کہیں سامنا ہو گیا تو اس کے پاس پستول موجود ہے۔ وہ ہمت کر کے اس کچے راستے پر روانہ ہو گیا۔ یہاں فارم اچھی حالت میں نہیں تھے اور اکثر فارم بے آباد پڑے ہوئے تھے۔ فرینک کو یاد آیا کہ یہاں زیرِ زمین پانی میں کوئی مسئلہ ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے کاشت کاری کے لیے استعمال کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ شاید اسی لیے یہاں کے فارمز اجاڑ پڑے ہوئے تھے۔ فرینک فارمز کے پاس سے گزرتا ہوا ان پر ایک نظر ڈال رہا تھا۔ بالآخر اسے پک اَپ ایک فارم ہاؤس کے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ یہ فارم اور اس میں موجود مکان دونوں خستہ حال اور اجڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مکان کا بیرونی رنگ و روغن اڑ گیا تھا اور اس کے بعض حصے مرمت طلب لگ رہے تھے۔ فارم کی حالت اس سے بھی زیادہ بری تھی۔ ہر طرف لمبی گھاس تھی یا خودرو جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ فرینک ایک منٹ کے لیے فارم کے سامنے رکا اور اس کا محلِ وقوع اچھی طرح ذہن نشین کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

رات کو وہ دوبارہ اس طرف آیا۔ وہ پوری تیاری سے آیا تھا۔ اس نے پرانے کپڑوں کی دکان سے ایک لباس خریدا اور اس کے ہاتھوں میں دستانے تھے۔ کام مکمل کرنے کے بعد وہ اس لباس کو نذرِ آتش کر دیتا۔ کار اس نے کسان کے فارم سے کچھ دور روکی۔ وہ پستول، ٹارچ اور ایک بیگ لے کر کار سے اترا۔ اس نے بیگ پشت سے باندھ لیا۔ فی الحال اسے ٹارچ جلانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ابتدائی چاند اور ستاروں کی روشنی کافی تھی۔ وہ فارم کے پاس پہنچا اور سن گن لینے لگا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ کتوں کا تھا۔ ویسے فارم اور مکان کی حالت سے لگ نہیں رہا تھا کہ کسان نے ان کی رکھوالی کے لیے کتا رکھا ہوگا لیکن ممکن ہے اس نے شوقیہ کتا پال رکھا ہو۔ بلا جھجک اندر جانے کی صورت میں فرینک مشکل میں پڑ سکتا تھا۔

مگر خاصی دیر بعد بھی جب کسی کتے کی آواز نہیں آئی اور نہ ہی کہیں سے کوئی حرکت محسوس ہوئی تو وہ لکڑی کی خستہ حال باڑ پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ وہاں جھینگر بول رہے تھے اور جھاڑیوں میں گرگٹ اور چھپکلی کی نسل کے جانور دوڑتے پھر رہے تھے۔ فرینک کے قدموں کی آہٹ سن کر ان میں کھلبلی مچ گئی تھی اور بعض اوقات تو اتنی سرسراہٹ پیدا ہوتی کہ فرینک ڈر کر رک جاتا۔ موسم سرد تھا اس لیے امکان تھا کہ کسان اندر ہی موجود ہوگا۔ جب وہ مکان کے پاس آیا تو اسے پچھلی طرف ایک چھوٹا سا گودام نظر آیا۔ کسان عام طور سے اس میں اپنا سامان رکھتے ہیں اور اناج ذخیرہ کرتے ہیں۔

مکان کے قریب آ کر فرینک پھر سن گن لینے لگا۔ اصل میں اس کی ہمت کچھ جواب دے رہی تھی اور وہ پہلے جتنا... پُراعتماد نہیں رہا تھا۔ بلکہ اندر آنے سے پہلے ایک دو بار اسے خیال بھی آیا تھا کہ واپس چلا جائے۔ قتل کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی مگر پھر اس نے خود کو یاد دلایا کہ اس شخص نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا اور مزید کیا کرتا... اگر زندہ رہتا۔ فرینک خود کو اشتعال دلاتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ اندر جانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن جب اس نے برآمدے کے تختوں پر پاؤں رکھا تو وہ اتنی بُری طرح چرچرائے کہ اس نے ڈر کر جلدی سے پاؤں واپس کھینچ لیا۔ برآمدے میں جانے کے بجائے وہ گھوم کر مکان کی پچھلی سمت میں آیا۔ یہاں تختے نہیں تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ کھڑکیاں بند تھیں اور دروازہ کوئی نہیں تھا۔ اس نے باری باری دونوں کھڑکیوں پر طبع آزمائی کر لی۔ دونوں اندر سے بند تھیں۔ وہ دل ہی دل میں کسان کو گالیاں دیتا ہوا سامنے کی طرف آیا۔ اس نے پستول نکال لیا اور دل کڑا کر کے برآمدے میں قدم رکھا۔ تختے اس بار بھی چرچرائے۔ وہ پروا کیے بغیر دروازے تک آیا۔ باہر ٹوٹا ہوا فولادی نیٹ کا دروازہ تھا اور اندر لکڑی کا دروازہ تھا۔ فرینک نے اسے کھولنے کی کوشش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی توخلافِ توقع اسے کھلا پایا۔ اسے حیرت ہوئی۔۔۔ اس شخص نے کھڑکیاں تو اتنی مضبوطی سے بند کررکھی تھیں لیکن دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ دروازہ بھی کسی ڈراؤنی فلم کے انداز میں اتنا زیادہ چرچرا کر کھلا کہ فرینک بوکھلا کر اسے بند کرنے والا تھا پھر اسے یاد آیا کہ اس نے دروازہ کھول تو لیا ہے۔ اس نے اندر جھانکا تو اسے کسان نظر آگیا۔ وہ بستر پر پڑا خراٹے لے رہا تھا اور آس پاس پڑی بیئر اور دیگر سستی اقسام کی شراب کی بوتلیں بتارہی تھیں کہ اگر اس کے سر پر کھڑے ہوکر ڈھول بجایا جاتا یا توپ داغ دی جاتی، تب بھی اس کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑتا۔ فرینک بلاوجہ اتنی احتیاط کررہا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اندر آگیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کسان کا جائزہ لیا۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ وہ اتنا تنومند نہیں، جتنا کام کے لباس میں نظر آتا تھا۔ اس وقت اس نے آدھے بازو کی بنیان اور سادہ نیکر پہن رکھی تھی۔

فرینک نے پستول جیب میں رکھ لیا، اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے پشت سے بیگ اتار کر اس میں سے نائلون کی بنی ہوئی مخصوص ہتھکڑیاں نکالیں۔ انہیں کسی کو پہنا کر صرف ڈوری کھینچنا پڑتی اور یہ لاک ہوجاتیں۔ ان کو کھولنا ممکن نہیں تھا، صرف کاٹ کر اتارا جاسکتا تھا۔ اس نے پہلے کسان کے ہاتھ پشت پر کرکے ان کو جکڑ دیا اور اس کے بعد اس کے پیروں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ آخر میں اس نے چوڑا ٹیپ نکال کر اسے کس کر کسان کے منہ پر لگادیا۔ عین اس وقت اس نے کسمسانا شروع کردیا۔ فرینک نے چیزیں دوبارہ بیگ میں ڈالیں اور اسے پشت پر لٹکالیا۔ اب وہ کسان کے جاگنے کا انتظار کررہا تھا اور اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ کچھ دیر کسمساتا رہا پھر یک دم اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ پھر اس نے فرینک کو پہچان لیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"تم نے یقیناً مجھے پہچان لیا ہے؟" فرینک نے ذرا جھک کر کہا۔ کسان نے سر ہلایا اور ناک سے آواز نکالی۔

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔"

فرینک نے پیچھے ہٹ کر ایک کرسی کھینچ لی اور اس پر بیٹھ کر بولا۔ "تم بول نہیں سکتے لیکن سن سکتے ہو اور میرا خیال ہے سمجھ بھی جاؤ گے۔ ویسے اپنی حالت دیکھ کر تم سمجھ تو گئے ہوگے کہ میں کس ارادے سے یہاں آیا ہوں۔ یقیناً میں اپنے سر پر لٹکتی تلوار کو ہمیشہ کے لیے ہٹانے اور کہیں دفن کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے تمہیں بے بس کردیا ہے۔ نہیں۔۔۔ کوشش مت کرو۔ تم ان بندشوں کو نہیں توڑ سکتے ہو۔ یہ بہت مضبوط ہیں اس لیے میری بات سنو۔"

کسان اسے التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فرینک نے کہا۔ "ایسی نظروں سے دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں فیصلہ کرکے آیا ہوں اور درحقیقت مجھے اس فیصلے پر تم نے مجبور کیا ہے۔ ورنہ میں نے اپنی زندگی میں کسی چیونٹی کی جان بھی نہیں لی ہے۔ کم سے کم جان بوجھ کر نہیں لی ہے۔"

کسان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ فرینک کے ارادے اس کے لیے نیک نہیں ہیں لیکن اس کے منہ سے اپنی موت کے بارے میں سن کر اس کی حالت بُری ہوگئی اور وہ ایک بار پھر مچلنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح خود کو آزاد کرالے۔ وہ پاؤں پٹخ رہا تھا اور سر بستر پر مار رہا تھا لیکن پوری کوشش کے باوجود وہ ناکام رہا۔ بندشیں واقعی بہت سخت اور غیر لچک دار تھیں۔ ان میں ذرا سی نرمی بھی نہیں آئی تھی۔ ناکامی کے بعد وہ دوبارہ سے خاموش التجاؤں پر اتر آیا اور اس بار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

فرینک نے سرد آہ بھری۔ "اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں تمہیں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو تم مجھے نہیں چھوڑو گے اور ساری عمر میرا خون چوستے رہو گے۔ لیکن تم فکر مت کرو، میں تمہیں کسی پُرتشدد طریقے سے نہیں ماروں گا بلکہ میں تمہیں یا کسی کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں مار سکتا۔۔۔ اس لیے میں نے تمہاری خاطر ایک طریقہ سوچ لیا ہے۔"

وہ زبان سے تو نہیں پوچھ سکتا تھا لیکن اس کی آنکھیں سوال کررہی تھیں کہ فرینک نے اسے دنیا سے رخصت کرنے کا کون سا ایسا طریقہ سوچا ہے جس میں تشدد بھی نہ ہو اور وہ اسے اپنے ہاتھ سے بھی نہیں مارے گا۔ فرینک نے اس کی نظروں کا سوال نظرانداز کیا اور مکان کا جائزہ لیا۔ وہاں سوائے کسان کے اور کوئی نہیں تھا۔ اسے اطمینان ہوگیا کہ وہ جو کرنے جارہا تھا، اس کا گواہ کوئی نہیں ہے۔ اس نے کسان کو اٹھا کر شانے پر ڈالا۔ اس کا وزن بھی اتنا نہیں تھا کہ فرینک کو دشواری ہوتی اور اگر ہوتی تب بھی وہ آج رات کے لیے تیار ہوکر آیا تھا۔ کسان مچلنے لگا۔ فرینک اسے باہر لایا اور کھلی جگہ میں ایک طرف پٹخ دیا۔ اس کے بعد وہ گودام نما عمارت کی طرف گیا۔ اسے کچھ اوزاروں کی تلاش تھی لیکن ان کے لیے اندر جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہ اسے باہر پڑے نظر آگئے۔ اب اسے کسی کا خوف نہیں تھا اس لیے اس نے ٹارچ روشن کرلی۔ اس نے ایک بیلچہ اٹھایا اور واپس کسان کے پاس آیا۔ بیلچہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف نظر آنے لگا۔ فرینک نے اسے تسلی دی۔

"فکر مت کرو۔۔۔ میرا تم پر تشدد کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔"

کسان کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ ایک بار پھر مچلنے لگا لیکن فرینک نے اس کی پروا کیے بغیر اسے اٹھا کر شانے پر ڈالا اور فارم ہاؤس کے عقب میں واقع جنگل کی طرف بڑھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا وہ کئی سو گز دور نکل آیا۔ ایک کسی قدر کھلی جگہ دیکھ کر اس نے کسان کو زمین پر ڈال دیا اور بیلچہ مار کر زمین کی نرمی کا اندازہ کرنے لگا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہاں زمین نرم تھی اور اسے کھودنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ کسان کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کررہا ہے۔ وہ ایک بار پھر ہلنے جلنے اور گھسٹ کر اس جگہ سے دور جانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ کچھ دور نکل گیا تو فرینک نے جاکر اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے کھینچ کر واپس لے آیا۔ پھر اس نے اپنے بیگ سے تیز شراب کی ایک بوتل نکالی اور کسان کے منہ سے ایک جھٹکے سے ٹیپ اتار کر بوتل اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ اسے بولنے کا موقع نہیں ملا۔ فرینک نے اس کا منہ دبا دیا تھا تاکہ وہ اسے باہر نہ نکال سکے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں آدھی بوتل اس کے معدے میں جاچکی تھی۔ فرینک نے بوتل نکال کر ٹیپ دوبارہ اس کے منہ پر لگادیا۔ اگرچہ یہاں جنگل میں کسی کی موجودگی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا لیکن پھر بھی وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر کسان چیخ پکار کرتا تو کوئی سن بھی سکتا تھا۔ آدھی بوتل تیز شراب نے یقیناً اس کا سر گھما دیا۔ رات ویسے بھی اس نے بہت پی تھی اس لیے وہ زمین پر سر رکھے بے سدھ ہوگیا۔ فرینک نے آرام سے زمین میں گڑھا کھودا۔ یہ کوئی چار فٹ لمبا، دو فٹ چوڑا اور کوئی پانچ فٹ گہرا تھا۔ دو گھنٹے بعد اس نے بیلچہ ایک طرف رکھا اور بیگ سے بوتل نکال کر چند گھونٹ لیے۔ کسان کسی قدر ہوش میں آگیا تھا۔ فرینک نے اس سے کہا۔

"مجھے تمہارا نام نہیں معلوم۔۔۔ خیر، اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے تمہارے لیے قبر تیار کرلی ہے۔ تم اکیلے رہتے ہو اور میرا خیال ہے اس دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جسے تمہاری پروا ہو۔ اس لیے جب تم اچانک غائب ہوجاؤ گے تو کوئی پوچھنے نہیں آئے گا اور جب کسی کو احساس ہوگا تو بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ ممکن ہے پولیس تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کرے لیکن کوئی تمہیں اس جنگل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تلاش نہیں کرے گا۔ یہاں زمین سے کوئی پانچ فٹ نیچے۔"

کسان رونے لگا۔ وہ ناک سے التجا آمیز آوازیں نکال رہا تھا۔ فرینک کو اس پر ترس آنے لگا لیکن یہ ترس اتنا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے معاف کرنے کو تیار ہو جاتا۔ اس نے بوتل سے چند گھونٹ اور لیے اور اسے بیگ میں رکھ لیا۔ "میں نے کہا تھا کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے نہیں ماروں گا۔ میں تمہیں اس گڑھے میں دھکا دے کر اوپر سے مٹی ڈال دوں گا۔"

یہ سن کر کسان کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ فرینک نے گڑھے کا جائزہ لیا اور سوچا کہ اسے مزید گہرا کر دے۔ کہیں جانور لاش کی بو سونگھ کر اسے نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ اس نے گڑھے کو مزید ایک فٹ گہرا کیا اور پھر باہر نکل کر کسان کی طرف بڑھا۔ وہ کانپنے لگا اور پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ فرینک کو اسے کھینچ کر گڑھے تک لانے اور اندر گرانے میں خاصی جدوجہد کرنا پڑی۔ جیسے ہی وہ اندر گرا، فرینک نے بیلچہ اٹھا کر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ کسان کھڑا ہو گیا تھا اور اسے اس پوزیشن میں دفن کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجبوراً فرینک نے اس کے سر پر بیلچہ مارا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ موقع غنیمت جان کر فرینک نے اس کے دوبارہ ہوش میں آنے اور کھڑے ہونے سے پہلے ڈھیروں مٹی اس پر ڈال دی۔ آدھے گھنٹے میں گڑھا پورا بھر چکا تھا۔ فرینک نے اس پر کھڑے ہو کر اور پاؤں مار مار کر مٹی بٹھائی اور باقی مٹی بھی اس پر ڈال دی۔ ابتدائی گھبراہٹ پر قابو پانے کے بعد اب فرینک پُرسکون تھا۔ اس نے آرام سے اس جگہ سے کھدائی کے آثار مٹائے۔ آس پاس سے خشک پتے جمع کر کے اس جگہ ڈال دیے۔ اسے امید تھی کہ کل صبح کی روشنی میں کسی نے اس جگہ کو دیکھا تو اسے ہرگز شک نہیں ہوگا کہ یہاں زمین کھودی گئی ہے اور کسی کو دفن کیا گیا ہے۔ واپسی پر اس نے بیلچہ جھاڑ کر اسی جگہ ڈال دیا اس نے اسے بالکل صاف نہیں کیا تھا ورنہ وہ دوسرے اوزاروں سے الگ محسوس ہونے لگتا۔ اس وقت فرینک کسی باریک بین مجرم کی طرح ایک ایک چیز کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس نے مکان کا داخلی دروازہ اسی طرح بند کر دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے کسان سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی تھی۔ اس نے اگرچہ فرینک کو بہت بڑا دھچکا دیا تھا اور اس سے خاصی رقم اینٹھ لی تھی مگر اسے امید تھی کہ وہ خود کو سنبھال لے گا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا اور اب وہ بغیر کسی خوف کے اپنا کاروبار چلا سکتا تھا۔ جب وہ کار لے کر ہائی وے پر پہنچا تو اسے خیال آیا کہ اسے کسان کے گھر کی تلاشی لینی چاہیے تھی، ممکن ہے اس نے فرینک سے لی جانے والی رقم کا کچھ حصہ کہیں چھپا رکھا ہو۔ فرینک کو واپس جانے کا خیال بھی آیا لیکن اس نے فوراً یہ خیال مسترد کر دیا۔ آخری بار اس نے اسے دس ہزار ڈالرز دیے تھے اور اس بات کو بھی خاصے دن گزر چکے تھے۔ اس نے یقیناً رقم اڑا دی تھی اور تبھی وہ فرینک کے پاس مزید رقم لینے آیا تھا۔ اس کے فارم کی طرف واپس جانا بہت بڑا رسک لینے کے برابر تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اپنا نقصان بھول جائے۔

فرینک کو کاروبار دوبارہ سے معمول پر لانے میں چند ہفتے لگے لیکن وہ کامیاب رہا۔ اس نے بینک سے کچھ قرض لیا اور کچھ مستقل گاہکوں سے ایڈوانس لینے میں کامیاب رہا۔ ایک مہینے بعد ہی اس نے بینک کا قرض واپس کر دیا۔ دو مہینے بعد اس نے گاہکوں کا حساب بھی صاف کر دیا اور اب اس کا کاروبار پہلے سے زیادہ اچھا چل رہا تھا اور تیسرے مہینے اس کے اکاؤنٹ میں پچیس ہزار ڈالرز کی رقم موجود تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کسان کے بارے میں کہیں کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے چالاکی اور حوصلے سے کام لے کر اس جونک سے جان چھڑا لی تھی جو مستقل اس کا خون چوس رہی تھی۔ اسے ان دنوں معمول سے زیادہ آرڈر مل رہے تھے اور صحیح معنوں میں اسے سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ وہ صبح دفتر آتا اور نو دس بجے سے پہلے اس کی روانگی عمل میں نہیں آتی تھی۔ اس دن بھی وہ نو بجے دفتر میں تھا جبکہ عمارت میں موجود باقی تمام دفاتر بند ہو چکے تھے۔

فرینک اکیلا ہی کام کرتا تھا کیونکہ وہ اکیلا ہی اپنے سارے کام نمٹا لیا کرتا تھا۔ وہ کام میں مصروف تھا کہ دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان اندر آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس نے سستے قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کا تعلق نچلے طبقے سے ہے اور اس نے اچھا وقت نہیں دیکھا ہے۔ اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور کسی قدر نروس انداز میں بولا۔ "مسٹر فرینک مارش؟"

"ہاں... لیکن ابھی میں مصروف ہوں۔ اگر تمہیں کوئی کام ہے تو کل بلکہ دو دن بعد آنا۔"

"مجھے کام ہے اور ابھی ہے۔" وہ میز کے پاس آ گیا اور پھر اجازت لیے بغیر فرینک کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں نے کہا نا مجھے فرصت نہیں ہے۔" اس بار فرینک نے روکھا لہجہ اختیار کیا۔ "تم جا سکتے ہو۔"

"مجھے وہ کام نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ مجھے تم سے دوسرا کام ہے مسٹر فرینک مارش۔" یہ کہتے ہوئے نوجوان کا

ہچکچاتا لہجہ بدل کر تحکمانہ ہو گیا۔ "تمہیں میری بات سننا ہوگی۔"

فرینک نے چونک کر اسے دیکھا اور پہلی بار اسے نوجوان ذرا الگ محسوس ہوا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں کچھ دکھانے لایا ہوں۔" اس نے کہا اور جیب سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ فرینک نے لفافہ لیا۔

"اس میں کیا ہے؟"

"خود دیکھ لو۔"

فرینک نے لفافہ کھولا تو اندر سے چند تصویریں نکلیں اور پہلی تصویر پر نظر پڑتے ہی اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اس میں وہ کسان کو کندھے پر ڈال کر جنگل کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ واضح نہیں تھا لیکن کسان کا چہرہ واضح تھا۔ فرینک نے کانپتے ہاتھوں سے دوسری تصویر سامنے کی۔ اس میں وہ کسان کو لٹا کر خود زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ تصویر میں اس کا چہرہ نمایاں تھا۔ تیسری میں وہ کسان کو زبردستی شراب پلا رہا تھا۔ چوتھی میں وہ اسے گڑھے میں دھکیل رہا تھا اور باقی دو تصویروں میں وہ گڑھے میں مٹی بھرتے اور زمین کو ہموار کرتے دکھ رہا تھا۔ فرینک کو لگا کہ اسے دل کا دورہ پڑ رہا ہے۔ وہ ساکت ہو گیا۔ کچھ دیر بعد نوجوان نے کہا۔

"تم یقیناً صورت حال کو سمجھ گئے ہو گے۔"

فرینک سرگوشی میں بولا۔ "یہ تم نے کیسے لیں؟"

"میں وہیں تھا، میں جیک کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"کون جیک؟"

"جیک جو تمہیں بلیک میل کر رہا تھا۔"

"جھوٹ... وہاں کوئی نہیں تھا۔"

"اگر تم پیچھے والے کیبن میں ایک نظر ڈال لیتے تو تمہیں پتا چل جاتا کہ وہ گودام نہیں بلکہ میری رہائش ہے۔"

"تم نے دیکھ لیا تھا اور جان گئے تھے کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں؟"

"ہاں، جب تم مکان کے پیچھے آ کر کھڑکیاں کھول کر دیکھ رہے تھے، تب ہی میں جان گیا تھا۔ پھر میں نے تمہیں جیک کو جنگل کی طرف لے جاتے دیکھا۔ میں تمہارے پیچھے گیا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس کیمرا بھی تھا جو بغیر فلیش کے رات میں بھی تصویر اتار سکتا ہے۔"

"تم نے میری تصویریں اتار لیں اور اب مجھے بلیک میل کرو گے۔" فرینک نے دل سے آہ بھری۔ "تم فرینک کے کیا لگتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں... اس نے مجھے بھی بلیک میل کر کے ساتھ رکھا ہوا تھا اور مجھ سے ملازموں کی طرح کام لیتا تھا۔ اس کے علم میں میرا ایک جرم آ گیا تھا۔"

"اوہ... تبھی تم نے اسے بچانے کی کوشش نہیں کی؟"

فرینک نے سر ہلایا۔ "دوسرے اب تم مجھے بلیک میل کر سکو گے۔"

"یہی بات ہے... اگر میرے پاس کیمرا نہ ہوتا اور تمہیں بلیک میل کرنے کا خیال نہ ہوتا، تب بھی میں اسے بچانے کی کوشش نہ کرتا۔ ویسے وہ تمہیں میرے بارے میں بتانے کی کوشش کرتا رہا لیکن تم نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔"

فرینک کو یاد تھا کہ جیک کس طرح ناک سے آوازیں نکال رہا تھا۔ "لیکن وہ مجھے تمہارے بارے میں بتانے کی کوشش کیوں کر رہا تھا؟"

"اس طرح اس کی جان بچ جاتی مگر یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر تم اسے زندہ دفن نہ کرتے تو اس کی جان بچ جاتی اور تم بھی بچ جاتے لیکن میری زندگی مسلسل عذاب میں رہتی۔"

"میں کیسے بچ جاتا؟" فرینک اس کی بات نہیں سمجھا۔ ویسے بھی اس وقت اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی۔

"تم اس طرح سے بچ جاتے کہ اس نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ تمہیں ایک ایسے جرم پر بلیک میل کر رہا تھا جو تم نے کیا ہی نہیں تھا۔"

فرینک دم بہ خود رہ گیا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ وہ شخص میری کار سے ٹکرا کر مر گیا تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا۔"

"کیا تم نے اس کی نبض دیکھی تھی؟"

"نہیں، جیک نے دیکھی تھی۔"

"تم نے جیک کو لاش دفناتے دیکھا تھا؟"

"نہیں لیکن اس نے لاش کہیں تو دفن کی ہوگی؟"

"وہ سرے سے لاش ہی نہیں تھی۔ تمہاری کار سے ٹکرانے اور پھر مرنے کا صرف ڈراما تھا۔ وہ شخص مرا نہیں تھا۔ خون بھی مصنوعی تھا اور زخم کچے گوشت سے بنائے گئے تھے۔ جیک کا یہ پرانا دھندا تھا۔ وہ اس طرح کچھ رقم کما لیتا تھا لیکن جب اس نے تمہاری کار دیکھی اور تم نے اسے دو سو ڈالرز دیے تو اس کی نیت بدل گئی اور اس نے تمہیں مستقل بلیک میل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔"

فرینک اس وقت خود کو بہت زیادہ احمق محسوس کر رہا تھا۔ "تمہارا مطلب ہے جو شخص میری کار سے ٹکرایا، وہ مرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر وہ شخص مر گیا ہوتا تو آج تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔"

فرینک اچھل پڑا۔ "وہ تم تھے؟"

"ہاں، میں نے ایک بار نہیں، کوئی پچاس بار یہ رول کیا ہے اور جیک ٹکر مارنے والے سے اسی طرح کچھ نہ کچھ اینٹھ لیتا تھا۔ صرف تمہیں اس نے بلیک میل کیا اور اتنی رقم حاصل کر لی۔ اگر وہ لالچ نہ کرتا اور تم سے معقول رقم لیتا تو آج زندہ ہوتا۔ اس کی لالچ اور کم عقلی نے اسے مروا دیا۔"

"میرے خدا!" فرینک نے سر تھام لیا۔ "میں نے اسے بلاوجہ قتل کر دیا۔ اب تم مجھے لوٹو گے؟"

"تم مجھے جیک کی طرح مت سمجھو۔" نوجوان نے اسے تسلی دی۔ "میں نہ تو لالچی ہوں اور نہ احمق... جیک کے ساتھ رہ کر مجھے عقل آ گئی ہے۔ اب میں اپنی تعلیم مکمل کروں گا اور کوئی اچھا پیشہ اپنانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے لیے تم مجھے رقم دو گے۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔" فرینک کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"تمہاری مرضی۔" نوجوان نے شانے اچکائے۔ "بہرحال تم نے تصویریں دیکھ لی ہیں اور یہ تمہیں ساری عمر کے لیے جیل بھیجنے کے لیے کافی ہیں۔"

فرینک جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ دنیا کی کوئی عدالت اس کے جرم سے انکار کو تسلیم نہ کرتی اور اس کو سزائے موت نہ بھی ہوتی، تب بھی وہ مرتے دم تک جیل میں رہتا۔ نوجوان غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں جیک کی طرح خوف بن کر تمہارے سر پر سوار نہیں رہوں گا۔ تم مجھے آخری بار دیکھ رہے ہو۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ یوں سمجھ لو، میں تم سے کم سے کم ہزار میل کے فاصلے پر ہوں گا۔ میں تمہیں اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر بتا دیتا ہوں اور تم ہر مہینے اس اکاؤنٹ میں پانچ ہزار ڈالرز جمع کراؤ گے۔ میرا کُل مطالبہ یہی ہے۔"

"پانچ ہزار ڈالرز!" فرینک کراہا۔ "وہ بھی ہر مہینے؟"

"ہاں... تم نے چار مہینے میں جیک کو پچاس ہزار ڈالرز سے زیادہ کی رقم دے دی اور میں صرف پانچ ہزار ڈالرز مہینے کے مانگ رہا ہوں جو آدھے سے بھی کم ہیں... اور تم دے سکتے ہو۔ مجھے معلوم ہے تمہارا کام بہت اچھا چل رہا ہے۔"

فرینک نے اس مہینے پچیس ہزار ڈالرز سے زیادہ کمائے تھے اور وہ آسانی سے پانچ ہزار ڈالرز دے سکتا تھا۔

"لیکن یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" نوجوان نے معذرت کر لی۔ "ممکن ہے تمہیں ساری عمر رقم دینی پڑے۔"

"لیکن فرض کرو، میرا کاروبار ختم ہو جاتا ہے اور میں تمہیں رقم دینے کے قابل نہیں رہتا، تب کیا ہو گا؟"

"تم مجھے اپنا انکم ٹیکس ریٹرن بھیجو گے اور اس سے مجھے تمہاری مالی حیثیت کا اندازہ رہے گا۔ اگر مالی حالت خراب ہوئی تو میں رقم کم کر سکتا ہوں یا چھوڑ بھی سکتا ہوں اور اگر بہتر ہوئی تو بڑھا بھی سکتا ہوں۔ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں خاموشی سے آ کر تمہارے حالات کا جائزہ لے جاؤں گا اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ بولو، اب کیا کہتے ہو؟"

فرینک سوچتا رہا۔ وہ ایک بار پھر پھنس گیا تھا اور اس بار خطرہ زیادہ بڑا تھا۔ اس نے جیک کو قتل کیا تھا۔ لاش اور قتل کی تصویریں مل کر اسے جیل کی کوٹھری میں پہنچا سکتی تھیں۔ اچانک اسے لاش کا خیال آیا اور اس نے نوجوان سے پوچھا۔ "اس بات کو تین مہینے سے زیادہ گزر گئے ہیں، تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟"

"ایک تو میں چاہتا تھا کہ تم اپنے حالات بہتر کر لو۔ مجھے معلوم ہے جیک نے تمہیں ذبح کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ دوسرے اس عرصے میں جنگل میں وہ ساری نشانیاں بدل چکی ہیں جن سے تم جیک کی قبر کا سراغ لگا سکتے ہو۔ ممکن ہے، وہاں اب جھاڑیاں ہوں، یا درخت کٹ گیا ہو... یا وہاں کوئی پودے اگ آئے ہوں۔ جنگل بہت بڑا ہے، کوئی ایک مربع کلومیٹر پر پھیلا ہے اور تم اب وہاں لاش تلاش نہیں کر سکتے۔"

فرینک نے ایک اور سرد آہ بھری۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر بتاؤ۔"

"لکھ لو بلکہ میرا ای میل بھی لکھ لو۔ تم اس پر مجھے اپنا انکم ٹیکس ریٹرن بھیج سکو گے۔"

فرینک نے دونوں چیزیں نوٹ کیں۔ نوجوان کھڑا ہو گیا۔ "تم یہ تصویریں رکھ سکتے ہو۔ کل پانچ ہزار ڈالرز میرے اکاؤنٹ میں ڈال دینا اور پھر ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اس میں پانچ ہزار ڈالرز آ جانے چاہئیں ورنہ تم جانتے ہو کہ کیا ہو گا۔" نوجوان کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ وہ جیک سے کتنا ہی بہتر سہی مگر تھا تو وہ بھی بلیک میلر۔ فرینک بے بسی سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی اور اب ساری عمر اسے اس کا تاوان ادا کرنا تھا۔

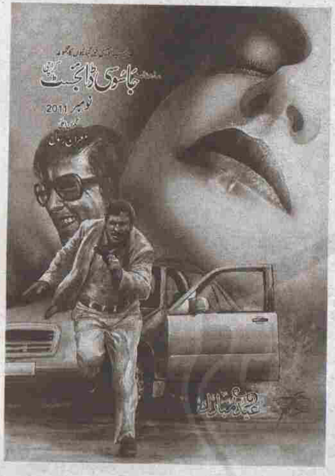

طے شدہ محبت

کاشف زبیر

وقت کے بدلتے موسموں... بدلتی رُتوں میں محبت کرنا کوئی جرم نہیں رہا... بلکہ فن گردانا جاتا ہے... اب ہر لڑکا اور لڑکی خللِ عشق میں گرفتار نظر آتا ہے... محبت کی راہیں کتنی ہی پُرپیچ کیوں نہ ہوں... اسے حاصل کرنے کے لیے غلط راستوں کا انتخاب نئی نسل کی تباہی کا پہلا زینہ ہے... ایک لڑکا اور لڑکی کی محبت کا فسانہ... جن کے والدین ایک اکھاڑے میں آکھڑے ہوئے تھے۔

تیمور اور شامی کی بزم میں ایک اور فساد محبت کا یادگار اضافہ

شامی نے نوشی کو دیکھ کر پلٹنا چاہا لیکن اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ آج خلافِ معمول شامی صبح سویرے اٹھ گیا تھا اور مزید شامتِ اعمال، وہ جوگنگ کرنے بھی نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ نوشی بلاناغہ جوگنگ کے لیے نکلتی ہے۔ شامی نے گہری سانس لے کر جاگنگ جاری رکھی۔ نوشی کے تاثرات اسے دیکھ کر خوفناک ہو گئے تھے۔ وہ قریب آتے ہوئے اس کے پاس رک گئی۔ مجبوراً شامی کو بھی رکنا پڑا۔

"ہیلو۔" وہ خوش خلقی سے مسکرایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن نوشی نے مسکرانے کی بالکل بھی کوشش نہیں کی اور کھردرے لہجے میں بولی۔ ”وہ لڑکی کون تھی اس روز تمہارے ساتھ ریستوران میں؟“

”کس دن؟“ شامی نے سر کھجایا۔ ”جب تک تم دن کی وضاحت نہیں کرو گی، مجھے کیسے یاد آئے گا؟“

اس پر نوشی نے دانت پیسے۔ ”جولائی کے آخری دن کی بات کر رہی ہوں۔“

”اوہ، اچھا۔“ شامی نے یاد کرنے کی اداکاری کی۔ ”کیا خوب یاد دلایا۔ وہ روشا تھی۔“

”روشا کون؟“

”روشا ایک لڑکی ہے۔“ شامی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تم نے دیکھا تو تھا اگرچہ ذرا موٹی ہے لیکن خوب صورت ہے۔“

نوشی نے دوبارہ دانت پیسے۔ ”شامی! میں تمہیں قتل کر دوں گی۔“

شامی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”اس طرح دانت پیسنے سے یہی ہوگا۔ یقیناً تمہارا سر چکراتا ہوگا اور تمہارے خیالات تو سن چکا ہوں۔ اس کیفیت میں انسان بلاوجہ قتل وغیرہ کرنے کا سوچتا ہے۔“

نوشی نے پاؤں پٹخے۔ ”میں اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں... اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”فی الحال تو کوئی تعلق نہیں ہے۔“ شامی نے سادگی سے کہا۔ ”ممکن ہے بعد میں کوئی تعلق بن جائے۔ بائی دی وے، تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

نوشی نے مزید کچھ دیر دانت پیسنے کا شغل جاری رکھا پھر کہا۔ ”شامی! تم سدھر جاؤ ورنہ...“

”بس۔“ شامی نے منہ بنا کر کہا۔ ”اس کام کے لیے دادا جان کافی ہیں۔ کاش، تم مجھ سے پہلے دادا جان سے ملی ہوتیں۔“

”کیا مطلب؟“ نوشی چونکی۔ ”ان سے مل کر کیا کرتی؟“

”تم دونوں کچھ کرتے، دادا جان کو بھی اکیلے رہتے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے۔ میری جان بچ جاتی اور ممکن ہے شادی کے بعد دادا جان کے خیالات میں بھی خوشگوار تبدیلی آجاتی۔“

شامی بات مکمل کرتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نوشی کی سمجھ میں کچھ دیر سے آیا اور وہ اس کے پیچھے لپکی لیکن اتنی دیر میں شامی وقار ولا کے گیٹ سے اندر جا چکا تھا۔ لان میں فولاد خان اخبار تہہ کر کے پڑھ رہا تھا۔ شامی اس کے پاس ہی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔

”فولاد خان! کوئی خاص خبر ہے؟“

”خاص تو نہیں اے پر کل رشید بلا اور اکرم موجی کے درمیان لڑائی اوئی۔ دونوں طرف سے دبا کر فیرنگ اوئی اور دو آدمی مارا گیا۔“

شامی چونکا۔ رشید بلا اور اکرم موجی اس علاقے کے نامی گرامی بدمعاش تھے اور ان کے باقاعدہ گینگ تھے۔ دونوں حریف تھے لیکن تصادم کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ انہوں نے شہر کو بانٹ رکھا تھا۔ بھتا، کار لفٹنگ، پاکٹ مار اور منشیات فروشی ان کی کمائی کا ذریعہ تھے۔ ایک طرح سے وہ شہر کے مافیا تھے۔ شامی نے فولاد خان سے اخبار طلب کیا۔ ”ذرا دیکھوں، وجہ کیا ہے؟“

لیکن وجہ کا علم رپورٹر کو بھی نہیں تھا۔ خبر کے مطابق کل شام پانچ بجے اچانک ہی دونوں پارٹیاں مسلح ہو کر آمنے سامنے آ گئیں اور شہر کا ایک معروف بازار میدانِ جنگ بن گیا۔ اندھا دھند فائرنگ میں ہمیشہ کی طرح دو بے گناہ افراد داعیٔ اجل کو لبیک کہنے پر مجبور ہوئے۔ پولیس کا آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جب نجی ٹی وی چینل اس جنگ کی براہِ راست کوریج کرنے لگے تو مجبوراً پولیس بھی ان کو کوستی ہوئی حرکت میں آئی اور ان کے آنے سے دونوں حریف بادل ناخواستہ لیکن نہایت اطمینان سے رخصت ہوئے۔ پولیس نے ان کی روانگی میں کسی قسم کا خلل نہیں ڈالا۔ ایک وجہ تو دونوں گروپوں سے پولیس کے دیرینہ تعلقات تھے، دوسرے وہ پولیس سے کہیں زیادہ جدید اسلحے سے لیس تھے اور اگر پولیس روکنے کی کوشش کرتی تو پورا امکان تھا کہ مارے جانے والوں میں دو تین پولیس والوں کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ دونوں گروپ اپنے زخمی ہونے والے آدمی بھی ساتھ لے گئے۔ باقی دو لاشیں اور کوئی نصف درجن زخمی وہیں پڑے رہ گئے۔ ابھی تک اس تصادم کی وجہ سامنے نہیں آئی تھی۔

اخبار دیکھ کر شامی اندر آیا تو نظام دین ٹکر گیا۔ اس نے شامی کو دیکھ کر مخصوص میسنے انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”شامیر صاحب! آپ کو نواب صاحب ناشتے کی میز پر طلب کر رہے ہیں؟“

عام طور سے ناشتے کی میز پر طلبی اس وقت ہوتی تھی جب نواب صاحب کو انہیں کوئی کام سونپنا ہوتا تھا۔ جبکہ سرزنش کے لیے ڈنر کے بعد اسٹڈی میں طلبی ہوتی تھی اور ہنگامی حالات میں بے عزتی کے لیے کوئی وقت اور جگہ مخصوص نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ نواب صاحب اس کے لیے ان کو کہیں بھی اور کبھی بھی طلب کر لیتے تھے۔ شامی نے نظام دین سے کہا۔ ”میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“

تیمور خوابِ خرگوش میں مگن تھا۔ کسی وجہ سے آج اس کی یونیورسٹی بند تھی اور وہ سو رہا تھا۔ شامی نے اسے نہیں چھیڑا اور ہاتھ لے کر نیچے آیا جہاں نواب صاحب ناشتے سے فارغ ہو کر اس کے منتظر تھے۔ چائے وہ اپنی اسٹڈی میں لیتے تھے۔ شامی نے سعادت مندی سے ناشتے کے آغاز سے پہلے کہا۔ ”جی دادا جان، آپ نے طلب کیا ہے؟“

”ہاں برخوردار! آج کل تم دونوں فارغ ہو۔“

”جی دادا جان۔“ شامی نے بادل ناخواستہ کہا، اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ”حکم فرمائیں۔“

”وقار ولا کے ٹیکس میں کچھ مسئلہ ہوا ہے۔ ٹیکس بہت زیادہ لگا دیا ہے۔ تم اور تیمور جا کر اس معاملے کو دیکھو۔“

شامی نے سکون کا سانس لیا۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اگرچہ اس قسم کے معاملات نواب صاحب کا وکیل دیکھتا تھا لیکن ان دنوں وہ بائی پاس کی وجہ سے بستر پر دراز تھا۔ شامی نے مستعدی سے کہا۔ ”بالکل دادا جان! میں اور تیمور آج ہی جاتے ہیں۔“

”آج نہیں برخوردار! ابھی ایک گھنٹے میں روانہ ہو جاؤ۔ اس قسم کے سارے کام صبح سویرے احسن انداز میں ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے دن چڑھتا ہے افسر شاہی کا دماغ بھی خراب ہوتا جاتا ہے۔“

اگرچہ افسر شاہی کا دماغ درست کرنے کے لیے نواب صاحب کا نام ہی کافی ہوتا لیکن شامی نے عجلت میں ناشتا کیا اور پھر تیمور کو اٹھا کر خوش خبری سنائی۔ ”دادا جان نے ولا کے ٹیکس کا معاملہ سپرد کیا ہے۔ ٹیکس والوں کے دفتر جانا ہے۔“

تیمور نے جماہی لی۔ ”یار! تو چلا جا، ایک آدمی بھی یہ کام کر سکتا ہے۔“

”میں چلا جاؤں؟“ شامی نے چالاکی سے کام لیا۔ ”لیکن دادا جان کا حکم ہے کہ ہم دونوں کو ساتھ جانا ہے۔“

تیمور نے غصے سے اسے دیکھا اور بادل ناخواستہ حرکت میں آیا۔ شامی نے اسے خبردار کیا کہ ناشتے کا وقت نہیں ہے کیونکہ دادا جان نے روانگی کے لیے انہیں ایک گھنٹے کا وقت دیا ہے۔ اس میں سے نصف گھنٹا گزر چکا تھا۔ تیمور عجلت میں تیار ہو کر آیا۔ وہ روانہ ہوئے۔ راستے میں پہلے تیمور نے ایک کیفے سے ناشتا کیا اور پھر وہ پراپرٹی ٹیکس کے دفتر پہنچے۔ نوٹس میں ٹیکس غلط لگا دیا گیا تھا۔ کچھ رقم فی مربع گز سے بڑھ جانے کی صورت میں ٹیکس خاصا بڑھ گیا تھا کیونکہ وقار ولا تقریباً ڈھائی ہزار گز پر تھا۔ انہیں کچھ مشکل تو پیش آئی لیکن وہ معاملہ سیٹ کر کے وہاں سے نکلے۔ نواب صاحب کا نام سن کر متعلقہ افسر ویسے ہی موم ہو گیا تھا اور اس نے یقین دلایا کہ جلد درست ٹیکس کے ساتھ نوٹس جاری کر دیا جائے گا۔ وہ باہر نکلے تو شامی کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے بھی جلدی میں ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا تھا اس لیے انہوں نے پھر ایک ریستوران کا رخ کیا۔

☆☆☆

اس پرانی ساخت لیکن مضبوط باڈی اور طاقتور انجن والی کار میں تین افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جبکہ پیچھے ایک تنومند آدمی کے ساتھ ایک نازک اندام اور نوجوان لڑکا سہا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے ڈر کی وجہ وہ پستول تھا جو اس کی پسلیوں سے لگا ہوا تھا۔ اس نے منمنا کر کہا۔ ”تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”کاکے! تجھے جلد پتا چل جائے گا۔“ ڈرائیونگ کرنے والے نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”کل تک تیرے باپ کو بھی پتا چل جائے گا۔“

لڑکے کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بہت مسرور تھا، اس نے کہا۔ ”استاد خوش ہو جائے گا۔“

ڈرائیونگ کرنے والے نے کہا۔ ”استاد تو خوش ہو جائے گا پر بندہ غلط نکل آیا تو پھر کون بھگتے گا؟“

”اس کی فکر مت کرو۔“ وہ شخص بولا۔ ”بندے کی گارنٹی ہے۔ آخر اس شخص نے ٹھیک ہی اطلاع دی۔“

”پھر بھی اس سے پوچھ لو۔“ ڈرائیور نے اصرار کیا۔ ”ایسا نہ ہو یہ کسی دینو قصائی کی اولاد نکل آئے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اڈے پر پہنچ کر اس کی زبان خود کھل جائے گی اور یہ سارا سبق فرفر سنا دے گا۔“

”اچھا تیری مرضی، پر میں بول دوں گا اسے تُو نے پہچانا تھا۔“

”ہاں، بے شک بول دینا۔ ابھی اس سے کچھ پوچھا تو یہ جھوٹ ہی بولے گا، پر جب دو چار ہنٹر لگیں گے تو بالکل سچ بولے گا۔“

نوجوان مزید سہم گیا، اسے ان لوگوں کے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ ”تم لوگ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“

”کاکے! اتنی جلدی کیا ہے، آرام سے پوچھیں گے۔“ اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے چمکار کر کہا۔ اس دوران میں کار ایک ٹریفک سگنل پر رکی اور اس شخص نے جیب سے موبائل

نکلا۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ”استاد! میں بات کر رہا ہوں... جی سرکار، بندہ ہاتھ آ گیا ہے... اوئے اوئے...“

یہ الفاظ اس نے نوجوان سے کہے تھے جو اچانک ہی کار کا دروازہ کھول کر نیچے لڑھک گیا تھا۔ موبائل پر بات کرتے ہوئے اس شخص کا پستول ذرا ہٹ گیا تھا اور کار رکی ہونے کی وجہ سے اس نے پستول چھپالیا تھا تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔

گزشتہ پندرہ منٹ سے نوجوان اتنا فرماں بردار بنا ہوا تھا کہ اسے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ فرار کی کوشش بھی کر سکتا ہے اور یہ حرکت بھی اس نے اپنی جان پر کھیل کر کی تھی۔ ان لوگوں کی بدقسمتی کہ اسی لمحے سگنل کھل گیا اور گاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔ نوجوان نیچے اترا تھا اور کہیں غائب ہو گیا تھا۔ فون کرنے والا اب فون بند کر کے اس کے پیچھے جانے کے لیے اتر رہا تھا کہ دروازہ جھٹکے سے بند ہوا۔ اس کا ایک پاؤں اور ایک ہاتھ باہر آ چکا تھا، وہ دروازے میں آ گیا اور اس نے دہاڑ نما چیخ ماری۔ دروازہ بند کرتے ہی نوجوان اٹھ کر بھاگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چلتی گاڑیوں کے درمیان پھرتی سے سڑک کراس کر لی۔ ڈرائیور اتر کر اس کے پیچھے لپکا جبکہ دوسرا اس قابل نہیں تھا۔ اس کے پاؤں پر شدید چوٹ آئی تھی۔ عقب میں موجود گاڑیوں نے ہارن بجانا شروع کر دیے تھے۔ ہارن کے شور میں اس کے منہ سے نکلنے والی گالیاں دب گئیں۔

سڑک کراس کرنے میں ڈرائیور کو دیر لگی تھی اور جب تک وہ اس طرف آتا، نوجوان غائب ہو چکا تھا، اس کی پھرتی قابلِ داد تھی اور یہ داد اسے ڈرائیور کی غائبانہ گالیوں کی صورت میں مل رہی تھی۔ ڈرائیور کچھ دیر پاگلوں کی طرح آس پاس بھاگتا رہا۔ پھر وہ مایوس ہو کر پلٹ آیا۔ اس کا ساتھی اپنے پاؤں کو رو رہا تھا۔ وہ آتے ہی اس پر چڑھ دوڑا۔ ”تجھے نمبر بنانے کا چسکا تھا نا... اس پر نظر نہیں رکھی۔ فون کرنا ضروری تھا؟“

دوسرے نے واویلا مچایا۔ ”وہ میرے پاؤں کی ہڈی توڑ گیا ہے۔“

”اولاد کس کی ہے، شکر کر تیرا سر سلامت ہے۔“ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب استاد کو جواب دینا۔ کال بھی کر دی ہے، چھپا بھی نہیں سکتے۔ ورنہ بول دیتے کہ بندہ ملا ہی نہیں۔“

ان دونوں کے چہروں پر بارہ بج رہے تھے۔ دوسرا بندہ بولا۔ ”اسے تلاش کرتے ہیں ورنہ استاد نہیں چھوڑے گا۔“

وہ تقریباً نصف گھنٹے تک وہاں چکراتے رہے۔ کار انہوں نے سڑک کے کنارے لگا دی تھی مگر نوجوان نہیں ملا۔ مایوسی کے عالم میں وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس دوران میں انہوں نے استاد کو کال کر کے نوجوان کے فرار کی اطلاع کر دی اور اس سے گالیاں بھی کھا لی تھیں۔ ان کی گاڑی روانہ ہونے کے بعد نوجوان نے ایک کار کی عقبی سیٹ سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور کار سے اترنے والا تھا کہ اس نے دو نوجوانوں کو کار کی طرف آتے دیکھا۔ وہ جلدی سے دوبارہ سیٹوں کے درمیان والی جگہ دبک گیا۔ ان کو چکما دے کر وہ اس کار میں گھس گیا تھا۔

شامی اور تیمور ریستوران سے باہر آئے۔ پیٹ بھرنے کے بعد شامی کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے تیمور سے کہا۔ ”آج صبح ہی صبح شامت آئی اور میں جوگنگ کرنے نکل پڑا۔“

”یقیناً نوشی ٹکرا گئی ہو گی؟“ تیمور ہنسا۔ ”روشنا کے بارے میں پوچھ رہی ہو گی؟“

”یار! یہ ابھی سے اتنا میرے سر پر سوار ہوتی ہے۔“ شامی کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”شادی کے بعد تو جینا حرام کر دے گی۔ شاید پردے میں بٹھا دے۔“

”بیٹے تُو نے بھی تو اسے لارے دیے تھے۔ اب دوسری لڑکیوں کے ساتھ نظر آئے گا تو اس کا دماغ خراب ہو گا۔“

”میں کون سا روشنا سے عشق لڑا رہا تھا۔“ شامی بھنّا گیا۔ ”وہ اتنی دور سے ملنے آئی تھی تو کیا انکار کر دیتا؟“

”یہ بات نوشی کی سمجھ میں تو نہیں آئے گی۔ تُو ہمت کر کے اسے بتا کیوں نہیں دیتا؟“

شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ نہیں مانے گی۔ شک اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔“

”شک ہر عورت کے اندر بھرا ہوتا ہے۔“ تیمور نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”بلکہ کہنا چاہیے کہ عورت کی کمپوزیشن میں شک کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔“

شامی کچھ کہنے جا رہا تھا کہ تیمور نے چھینک ماری۔ شامی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تجھے زکام ہو رہا ہے؟“

تیمور ہنسا۔ ”چھینک تجھے آئی ہے اور زکام مجھے ہو رہا ہے۔“

”چھینک تجھے آئی ہے۔“ شامی نے تردید کی۔

”میں نہیں چھینکا بھائی۔“

پھر دونوں کے ذہن میں بیک وقت آیا کہ جب ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سے کوئی نہیں چھینکا تو چھینک کس نے ماری تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر پچھلی نشست کی طرف دیکھا۔ وہاں نشستوں کے درمیان لیٹا ہوا نوجوان انہیں دیکھ کر معصومیت سے مسکرایا تو بے ساختہ وہ دونوں بھی مسکرا دیے اور پھر شامی اسے ہیلو کہنے کا ارادہ کر رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ وہ اس وقت ایک کار ڈرائیو کر رہا ہے اور اس نے خاصی دیر سے سامنے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ بوکھلا کر سیدھا ہوا اور بروقت سیدھا ہوا کیونکہ کار سگنل پر رکی، ایک دوسری کار کی طرف جا رہی تھی اور اس سے مشکل سے بیس گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ شامی نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ کار جھٹکے سے رکی۔ اگلی کار صرف ایک فٹ دور رہ گئی تھی۔ جھٹکے سے تیمور بھی سیدھا ہوا۔ کار رکی تو نوجوان نے نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن شامی نے بروقت مڑ کر اس کی شرٹ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ اس دوران میں تیمور کار سے اتر کر پچھلی نشست پر آ گیا اور اس نے نوجوان کی گردن دبوچ لی۔

”کون ہو تم اور ہماری کار میں کیسے گھسے؟“

”دروازہ کھلا تھا اس لیے گھس گیا۔“ نوجوان نے سادگی سے وضاحت کی۔

تیمور بھنّا گیا۔ ”دروازے کے بچے، میں پوچھ رہا ہوں تم کیوں گھسے اندر؟“

”یہ چور ہے۔“ شامی نے سگنل کھلنے پر کار آگے بڑھا دی۔ ”اگرچہ صورت سے نہیں لگتا۔“

”میں چور نہیں ہوں۔“ نوجوان نے احتجاج کیا۔

”پھر کون ہو اور کار میں کیوں گھسے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”یہ چور ہے۔“ شامی نے پھر کہا۔

”دیکھیں، ان کو منع کریں میں چور نہیں ہوں۔“ نوجوان نے پہلے سے زیادہ احتجاجی لہجے میں کہا۔

”اچھا، کسی دوسرے کی کار میں اس طرح چھپ کر تم کوئی نیک کام کر رہے تھے؟“ شامی کے لہجے میں طنز تھا۔ اس نے کار مین روڈ سے ہٹا کر ایک ذیلی سڑک پر روک دی تھی۔ ”اس سے پہلے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کریں، شرافت سے اگل دو کار میں کیوں گھسے تھے؟“

”وہ... میں اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے یہاں چھپا تھا۔“ نوجوان نے ہچکچا کر کہا۔

شامی نے اس کا جائزہ لیا۔ ”برخوردار! ابھی تم صحیح سے بالغ بھی نہیں ہوئے ہو اور دشمنیاں بھی شروع کر دی ہیں؟“

”میں نے کوئی دشمنی نہیں شروع کی ہے۔“ اس نے اس بات کا بھی بُرا مان کر کہا۔ ”وہ خود میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور مجھے پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ سگنل پر رکے تو میں ان کی کار سے بھاگ گیا۔“

”لگتا ہے تمہیں سگنل پر بھاگنے کی عادت ہے۔“ شامی نے تبصرہ کیا اور تیمور کی طرف دیکھا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے؟“

”آج کل کوئی کسی کو بلاوجہ پکڑ کر نہیں لے جاتا۔ تم نے کچھ تو کیا ہو گا؟“ تیمور نے شک سے کہا۔

”اسے پولیس کو دے دو، وہ خود اگلوا لے گی۔“ شامی نے کہا اور کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ ”پولیس اسٹیشن یہاں سے قریب ہے۔“

”پلیز! میری بات سنو۔“ نوجوان گھگیایا۔ لہجے سے وہ تعلیم یافتہ لگ رہا تھا۔

”کیا سنیں؟ جب تم کچھ بتانے کے لیے تیار ہی نہیں ہو۔“ شامی نے کہا۔ ”ہماری کار میں گھس کر تم نے ایک جرم اور کیا ہے۔ اس پر تمہیں کم سے کم چھ مہینے کی سزا ہو سکتی ہے۔“

نوجوان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”میں گھر سے بھاگا ہوا ہوں۔“

شامی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ”لڑکیاں تو گھر سے بھاگتی تھیں، اب لڑکے بھی بھاگنے لگے ہیں۔“

نوجوان دکھی ہو گیا۔ ”آپ میرا مذاق مت اڑائیں جی۔ میں بہت مجبوری میں گھر سے بھاگا ہوں۔“

”لڑکیاں بھی اسی قسم کے بیانات دیتی ہیں جب پکڑی جاتی ہیں۔“ شامی اب بھی اپنی ہنسی روک رہا تھا۔ تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔

”یار! مجھے تو اس پر ترس آ رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں اسے گھر لے چلتے ہیں، وہاں سکون سے بیٹھ کر اس کی کہانی سنیں گے۔“

”اور اس کے بعد دادا جان کے سوالوں کے جوابات دیں گے اور بے عزتی کرائیں گے۔“ شامی نے طنز کیا۔ ”مجھے تو معاف رکھو۔“

”یار! اب دادا جان اتنے بھی خطرناک نہیں ہیں۔ وہ تو ہمارے کام ہی ایسے ہوتے ہیں جن کا انجام بے عزتی ہوتی ہے۔“ تیمور نے حقیقت سے کام لیا مگر شامی اس سے متفق نہیں تھا۔

”آج کل ستارے کچھ زیادہ ہی گردش میں ہیں اس لیے ہر بات پر بے عزتی ہوتی ہے۔“

نوجوان یہ سن کر خوش ہوا۔ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”آپ خود دوسروں کی بے عزتی کرتے ہیں اس لیے

آپ کی بھی بے عزتی ہوتی ہے۔“

”میں صرف ان کی بے عزتی کرتا ہوں جو اس کے مستحق ہوتے ہیں۔“ شامی نے بُرا منایا اور کار اسٹارٹ کر کے دوبارہ سڑک کی طرف آ گیا۔ ”یار! لکھ کر رکھ لے اُسے بالآخر واپس پولیس اسٹیشن لانا پڑے گا اور اس وقت تک دادا جان بھی اس معاملے میں شامل ہو جائیں گے۔“

”تو کیا ویسے دادا جان شامل نہیں ہوں گے؟“ تیمور نے طنز کیا۔ ”پولیس والے صرف ہماری صورت دیکھ کر اسے رکھ لیں گے۔ وہاں نام پتا کچھ نہیں دینا ہوگا؟“

شامی نے اس بارے میں تو سوچا نہیں تھا لیکن اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”یہ مسئلہ بھی کسی طرح حل کر لیتے لیکن ایک بار اسے گھر لے گئے تو اس کے بعد یہ معاملہ لازمی دادا جان کے علم میں آ جائے گا۔“

”یہ بھی اچھا ہوگا اگر کوئی گڑبڑ ہوگی تو دادا جان اسے خود دیکھ لیں گے اور ہمارے سر کوئی الزام نہیں آئے گا۔“

”لگتا ہے آپ کے دادا جان میرے ابّا کی طرح ہیں۔ بچوں کا خون خشک کر کے رکھتے ہیں۔“ نوجوان نے درمیان میں مداخلت کی۔

”تم اپنے ابّا سے ڈرتے ہو؟“ شامی نے سوچ کر کہا۔ ”تب کیوں نہ تمہیں تمہارے ابّا کے حوالے کر دیا جائے۔“

نوجوان کانپ گیا۔ ”بالکل نہیں جی... وہ مجھے قتل کر دیں گے۔“

تیمور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے ابّا تمہیں قتل کر دیں گے۔ وہ کیوں؟“

”آپ میرے ابّا کو نہیں جانتے۔“ نوجوان نے کہا۔ ”مجھے جانے دیں، میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ آپ کی کار میں نہیں گھسوں گا۔“

”برخوردار! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ تیمور نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ”کچھ دیر ہمارے پاس رہو۔“

”ممکن ہے ہم تمہارے کام آئیں۔“ شامی بولا۔ ”ویسے ہی آج کل ہم خدائی فوج دار کا کردار ادا کر رہے ہیں۔“

نوجوان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پُر امید لہجے میں بولا۔ ”آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔“

تیمور چونکا۔ ”ہماری؟... تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

نوجوان بوکھلا گیا۔ ”جی، وہ میں اکیلا ہوں۔“

”پھر تم نے ہماری کا لفظ کیوں استعمال کیا؟“ شامی نے پوچھا۔

”غلطی سے کہہ دیا۔“ وہ مردہ لہجے میں بولا۔ لیکن شامی اور تیمور دونوں نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لڑکا اگرچہ نازک اندام تھا لیکن لڑکیوں کے لیے اس میں خاصی کشش موجود تھی۔ عمر اٹھارہ انیس کے آس پاس تھی جو احمقانہ عشق کے لیے نہایت موزوں ہوتی ہے۔ شامی نے کار کی رفتار تیز کر دی اور دس منٹ بعد وہ وقار ولا میں تھے۔ فولاد خان نے لڑکے کو غور سے دیکھا لیکن اس کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ کار پورچ میں کھڑی کر کے تیمور لڑکے کو اپنے ساتھ لے گیا۔ شامی کو نواب صاحب کے حضور رپورٹ پیش کرنا تھی۔ وہ فائل لے کر اسٹڈی میں پہنچ گیا۔ نواب صاحب نے رپورٹ سن کر شامی کو شاباش دی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

”کیا زمانہ آ گیا ہے، آج کل کے نوجوانوں کو اتنے سے کام پر بھی شاباشی دینا پڑتی ہے۔ اللہ بخشے والد صاحب مرحوم خلد آشیانی نے جنگ سے زندہ سلامت واپسی پر بھی جو ذرا تحسین فرمائی ہو۔“

”اس زمانے میں جنگ سے زندہ واپسی شاید قابلِ تحسین ہوتی بھی نہیں ہوگی۔“ شامی نے دبی زبان میں کہا۔ نواب صاحب نے گھورا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”اس وقت بزرگ ذرا مختلف خیال رکھتے تھے، سب آپ کی طرح فراخ دل تو نہیں ہوں گے۔“

”برخوردار! چاپلوسی کی نہیں ہو رہی ہے۔“ نواب صاحب نے کتاب اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے اس لیے شامی نے فوری باہر کا رخ کیا۔ نوجوان کو تیمور اپنے کمرے میں لے گیا تھا اور اس کے لیے ناشتا بھی منگوا لیا تھا۔ شامی نے اعتراض کیا۔

”اتنی جلدی ناشتا... ابھی تو اس سے پوچھ گچھ بھی کرنی ہے۔“

”یار! اب یہ ہمارے گھر میں ہے اور ہمارا مہمان بھی ہے اس لیے کھلانا پلانا تو فرض ہے۔“

”اللہ ان کا بھلا کرے، صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ناشتا لینے نکلا تھا۔“ نوجوان بولا۔

”اپنا نام تو بتا دو؟“ شامی نے اسے گھورا۔ نہ جانے کیوں اسے اس لڑکے سے چڑ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتا تو اسے غصہ آنے لگتا۔

”مجید جی... ویسے سب جوجی کہتے ہیں۔“

”تو برخوردار جوجی! اب تم اگل دو کہ تم ہماری گاڑی

میں کیوں گھسے تھے اور کون لوگ تمہیں اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟ غلط بیانی کی صورت میں تمہیں اس شخص کے حوالے کر دیا جائے گا جسے تم نے ابھی گیٹ پر دیکھا ہوگا۔ وہ دو منٹ میں تمہاری چٹنی بنا دے گا۔“

”آپ نے پتا نہیں میرے خلاف کیوں بغض پال لیا ہے۔“ جوجی جز بز ہو کر بولا۔ ”میں آپ سے سچ بولوں گا لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے؟“

”وہ شرط کیا ہے؟“

”آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔“

”تمہاری مدد؟“ شامی بدک کر بولا۔ ”وہ کس خوشی میں؟“

”آپ نے خود تو کہا ہے کہ آپ خدائی فوج دار ہیں، دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔“ جوجی بات کرتے کرتے چونکا۔ ”میرے خدا! تبھی آپ مجھے جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ آپ شامی اور تیمور ہیں نا۔“

شامی نے تیمور کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”وہ میں آپ کے ناموں کی بات نہیں کر رہا... آپ کی کہانیاں میں پڑھتا رہا ہوں۔ ابّا جی نے کئی بار اس بات پر بھی مارا اور ڈائجسٹ چھین لیا۔“

”ہاں، ہم وہی ہیں۔“ شامی نے تسلیم کیا۔ ”لیکن کہانی کوئی اور لکھتا ہے۔“

جوجی پُر جوش ہو گیا۔ ”میں آپ کا فین ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ اپنے اس فین کے ضرور کام آئیں گے۔“

”لیکن فین صاحب، یہ تو پھوٹیں کہ آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“

اس سے پہلے جوجی کچھ کہتا، باورچی ناشتے کی ٹرالی لے آیا۔ اس کے جاتے ہی جوجی بے تکلفی سے ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ تیمور نے اپنے اور شامی کے لیے چائے منگوائی تھی۔ وہ دونوں چائے پینے لگے۔ اپنی چھریری جسامت سے قطع نظر جوجی کی خوراک اچھی خاصی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تقریباً پوری ٹرالی صاف کر دی۔ اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ایک ہلکی سی ڈکار لی اور اپنے لیے چائے نکالنے لگا۔ شامی بڑی دیر سے خود پر ضبط کر رہا تھا اور تیمور اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ چائے بنا کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہاں جی پوچھیں، آپ کو جو پوچھنا ہے؟“

”ہمیں پوچھنا نہیں تمہیں کچھ بتانا ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”شروع سے سارا قصہ سناؤ کیا ہوا اور تم ہماری کار تک کیسے پہنچے؟“

”قصہ تو جی بڑا لمبا ہے۔“ اس نے سر کھجایا۔

”تم فکر مت کرو، ہمارے پاس بہت وقت ہے۔“ شامی بولا۔ ”بس کچھ جھوٹ مت بولنا ورنہ اب تو تم ہمیں جانتے ہی ہو۔“

”میں کالج میں پڑھتا ہوں۔“ جوجی نے کہا اور اسلام آباد کے ایک بہترین پرائیویٹ کالج کا نام لیا۔ ”میں پری میڈیکل کے فائنل میں ہوں۔ وہیں میری ملاقات صوبی سے ہوئی۔“

”یہ صوبی کون ہے؟“

”صاحبہ ہے اصل نام لیکن پیار سے صوبی کہتے ہیں۔ جیسے مجھے جوجی کہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، تمہاری صوبی سے ملاقات ہوئی جو پسند اور پھر محبت میں بدل گئی۔ تم دونوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور ساری عمر ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بتاؤ کہ اس کے بعد کیا ہوا؟“ شامی نے کہا تو جوجی کا منہ کھل گیا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا جی؟“

”برخوردار! ہم نے بھی اس دشت کی سیاحی کی ہے۔“ شامی نے سرد آہ بھری۔ ”اب تو سیاحت کا بھی خاتمہ قریب ہے۔ خیر اسے چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم دونوں گھر سے کب بھاگے؟“

جوجی مزید دم بہ خود رہ گیا۔ ”آپ یہ بھی جانتے ہیں؟“

”ہاں یار! اب اتنا تو جان لیتے ہیں۔“ تیمور نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”اب تم اصل کہانی کی طرف آؤ، تمہارے والد صاحب تمہیں مانے۔“

جوجی سخت متاثر ہو رہا تھا۔ ”آپ تو بہت ذہین ہو۔ سب جانتے ہو جبکہ میں نے کچھ نہیں بتایا ہے۔“

”یہ بتاؤ کہ صوبی کیسی ہے؟“

”بہت پیاری ہے جی، مجھے تو پتا نہیں تھا یہ تو مجھے سرمد نے بتایا۔“

”سرمد... یہ کون ہے؟“

”میرا دوست ہے۔“ جوجی بولا۔ ”اس نے بتایا کہ صوبی بہت پیاری لڑکی ہے اور مجھے اس سے دوستی کرنی چاہیے۔“

شامی نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”تمہارا مطلب ہے اس سے پہلے تمہیں احساس نہیں تھا کہ صوبی ایک پیاری لڑکی ہے اور اس سے محبت کی جا سکتی ہے؟“

”جی ایسا ہی ہے۔“ جوجی بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ سرمد کیسا آدمی ہے اور تمہارا دوست کیسے بنا؟"

"وہ جی... مجھے کالج میں ملتا ہے لیکن وہ وہاں نہیں پڑھتا۔"

"تمہارے والد یا کسی اور کو سرمد کے بارے میں علم ہے؟"

"نہیں، میں نے کسی کو نہیں بتایا کیونکہ ابّا جی نے مجھے کسی سے دوستی کرنے سے منع کیا تھا۔"

"یعنی کوئی نہیں جانتا کہ تمہارا کوئی سرمد نام کا دوست بھی ہے؟" اس بار تیمور نے سوال کیا۔

"جی پھر سرمد نے بھی مجھے منع کیا تھا کہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤں خاص طور سے ابّا جی کو۔"

"ٹھیک ہے، سرمد نے تمہیں صوبی کی طرف متوجہ کیا اور تم ہو گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟" شامی نے پوچھا۔

"وہی جو آپ نے کہا تھا۔" جوجی شرمایا۔ "ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"ابھی دو مہینے پہلے کی۔"

شامی اور تیمور حیران ہوئے۔ "اتنی جلدی وہ لڑکی تمہارے ساتھ گھر سے بھاگنے پر بھی تیار ہو گئی؟"

"ہاں جی، سرمد نے ترکیب ایسی کی تھی۔"

"کیسی ترکیب؟" شامی بولا۔ ان کی اس معاملے میں دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ جوجی نے اس سوال کے جواب میں بتایا کہ سرمد نے اسے لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ایک اچھی ترکیب بتائی۔ یہ کو ایجوکیشن کالج تھا اور لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ کالج میں کلاس کے بعد صوبی لڑکیوں کے واش روم کی طرف جا رہی تھی کہ دو لڑکوں نے اسے گھیر لیا اور تنگ کرنے لگے۔ عین موقع پر جوجی ہیرو بن کر وہاں پہنچ گیا اور اس نے لڑکوں کو مار بھگایا۔ صوبی اس کی احسان مند ہو گئی۔ ان میں بات چیت ہوئی پھر ملاقاتیں ہوئیں اور آخر میں صوبی کو اس سے محبت ہو گئی۔ شامی نے سر پکڑ لیا۔

"یہ فلمی اسٹوری کب تک چلے گی؟ آج کل بھی لڑکیاں اس طرح بے وقوف بن جاتی ہیں؟"

تیمور نے اسے گھورا۔ "میرے بھائی، بات ترکیب کی نہیں ہوتی ہے اس عمر میں لڑکیاں بے وقوف بننے کی شوقین ہوتی ہیں۔ برخوردار یہ بتاؤ کہ صرف اسے تم سے محبت ہوئی تھی یا..."

"نہیں جی، مجھے بھی اس سے محبت ہے۔" جوجی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے ماں جی اور ابّا جی سے بھی کہہ دیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ماں جی نے تو دو جوتیاں ماری تھیں، پھر صوبی کے بارے میں پوچھنے لگیں کہ کیسی ہے اور کس خاندان کی ہے۔ پر ابّا جی کو زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا۔ انہوں نے ڈنڈا اٹھا لیا۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔" شامی ہنسا۔ "کتنے دن بستر پر پڑے رہے؟"

جوجی ہنسا اور بولا۔ "وہ جی، میں پہلے ہی فرار ہو گیا۔ بعد میں ماں جی نے ابّا جی کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ پر ابّا جی نے مجھ سے کہا کہ اب میں اس لڑکی سے ملا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"لیکن ظاہر ہے، تم نے ملنا نہیں چھوڑا ورنہ نوبت یہاں تک کیوں آتی۔" شامی نے کہا۔ "ویسے تم نے کیا شادی کے لیے کہا تھا؟"

"نہیں جی، اتنی جلدی شادی کا کیسے کہہ سکتا تھا؟ ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔ میں نے تو پسند کی بات کی تھی۔"

"یہ بھی تمہیں اس سرمد نے سکھایا ہوگا؟" تیمور نے کہا۔

"جی وہی مجھے سب بتاتا ہے۔" جوجی نے تصدیق کی۔

شامی اور تیمور نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر شامی نے سرمد کے .... بارے میں کئی سوالات کیے۔ ان کو پتا چلا کہ جوجی سرمد کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا ہے کہ وہ ایک بہت اچھا اور دوستانہ رویّے والا شخص ہے۔ وہ لباس، انداز اور زبان سے بہت مہذب لگتا ہے۔ لیکن وہ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اور اس سے کیوں ملتا ہے؟ جوجی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ تیمور شامی کو اس سے ذرا دور لے گیا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ سرمد نامی شخص اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔"

"تجھے لگ رہا ہے جبکہ مجھے یقین ہے وہ اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔ مگر ابھی بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ ابھی اس کی کہانی مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

وہ اس کے پاس واپس آئے۔ چائے پینے کے بعد وہ دل جمعی سے بچے ہوئے کیک پیس صاف کر رہا تھا۔ شامی نے پوچھا۔

"یار! محبت میں تو آدمی کی بھوک مر جاتی ہے اور تم کھائے جا رہے ہو؟"

"اچھا۔" اس نے آخری کیک پیس رکھ دیا۔ "سرمد نے یہ بات تو بتائی ہی نہیں تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔ دادا جان ابھی ان کی نسل کا رونا رو رہے تھے۔ اگر وہ اس نئی پود کو دیکھ لیتے تو نہ جانے کیا کرتے جسے عشق ضرور ہوتا ہے لیکن وہ اس کی مبادیات سے بھی انجان ہے۔ تیمور نے اس کی کہانی کو دوبارہ ٹریک پر لانے کی کوشش کی۔ "ٹھیک ہے، جب تمہارے گھر والوں نے صوبی کو پسند کرنے سے انکار کر دیا تب تم نے کیا کیا؟"

"مجھے کیا کرنا تھا جی، میں صوبی سے ملتا رہا، ابّا جی سے بالکل نہیں ڈرا۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے اگر ان کو پتا چل گیا کہ میں صوبی سے ملتا ہوں تو وہ میری ٹانگیں توڑ دیں گے۔"

شامی اور تیمور اس کی ثابت قدمی سے متاثر ہوئے۔ شامی نے پہلی بار اسے اچھی نظر سے دیکھا۔ "تم کہاں ملتے تھے اس سے؟"

"کالج میں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا تو ان دونوں نے خود کو سخت بے وقوف محسوس کیا۔ یہ نوجوان اور خود بے وقوف نظر آنے والا لڑکا الٹا ان کو بنا رہا تھا۔ شامی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پھر تم نے اور صوبی نے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کیا؟"

"نہیں جی، ہم نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ میں نے صوبی کو بتا دیا کہ میرے گھر والے اسے پسند کرنے کو تیار نہیں ہیں۔"

"اور صوبی کے گھر والے؟"

"ان کو تو پتا نہیں ہے، اس کا باپ بھی کم خطرناک نہیں ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس کا باپ خطرناک ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"صوبی نے خود بتایا ہے جی۔"

"اگر تم دونوں کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تو گھر سے کیوں بھاگے؟"

"سرمد نے کہا تھا۔ اس نے کہا اگر ہم گھر سے بھاگ جائیں تو ہمارے ماں باپ مجبور ہو جائیں گے اور وہ ہماری شادی پر مان جائیں گے۔"

"گویا یہ سرمد کا پلان تھا۔" شامی نے غور کیا۔ "اس نے تمہیں سمجھایا کہ گھر سے بھاگ جانا ہے لیکن بھاگ کر کہاں جانا ہے؟ ظاہر ہے تمہارے پاس کوئی ٹھکانا تو ہوگا نہیں جہاں چھپ سکو۔"

جوجی نے سر ہلایا۔ "ہاں جی، یہ بھی اسی نے بتایا تھا۔"

"اور تم اتنے احمق تھے کہ اس کی باتوں میں آ گئے؟" تیمور نے کہا۔

"میں احمق نہیں ہوں جی۔" جوجی نے بُرا مان کر کہا۔ "سرمد میرا دوست ہے۔"

شامی نے اسے گھورا۔ "دوست کے بچے... اس نے تمہیں مروا دیا ہے۔ اب پولیس تمہیں اور صوبی کو تلاش کر رہی ہوگی۔"

"پولیس!" وہ خوف زدہ ہو گیا۔ "نہیں جی، وہ کیوں تلاش کرنے لگی؟"

"کیونکہ تم گھر سے بھاگے ہوئے ہو۔" شامی نے کہا۔ "ایسے لوگوں کو پولیس تلاش کرتی ہے۔"

"پولیس ہمیں ساری عمر تلاش نہیں کر سکتی۔" جوجی نے اعتماد سے کہا۔ "خطرہ ابّا جی سے ہے۔"

تیمور بولا۔ "او بھائی، ٹھیک ہے تمہارے ابّا جی تمہارے لیے خطرناک ہوں گے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمہیں اتنے بڑے شہر میں تلاش بھی کر لیں۔"

"آپ نہیں جانتے جی۔" جوجی فکر مند ہو گیا۔ "وہ کر سکتے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر ان سے لگ رہا ہے۔"

شامی نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ "یار! تمہارے پتا جی کیا رشید بلا ہیں جو تم اتنا ڈر رہے ہو۔"

جوجی بھونچکا رہ گیا۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

اس بار شامی دنگ رہ گیا۔ اس نے ہڑبڑا کر کہا۔ "کیا... سچ مچ... میں نے تو مذاق میں کہا تھا۔"

"یہ سچ ہے جی۔" جوجی دکھی نظر آنے لگا۔ "مذاق تو میرے ساتھ قدرت نے کیا ہے مجھے ابّا جی کے گھر پیدا کر کے۔"

تیمور بھی حیران تھا۔ "تم رشید بلا کے بیٹے ہو جو نامی گرامی بدمعاش ہے؟"

جوجی مزید دکھی ہو گیا۔ "بس اسی وجہ سے میں اسکول اور کالج میں بھی کسی کو نہیں بتاتا تھا کہ میرے ابا کون ہیں۔"

"ہاں، لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔"

"نہیں جی اتنی جرأت تو کسی میں نہیں تھی۔ جن کو پتا چل جاتا وہ مجھ سے دور بھاگ جاتے تھے۔" جوجی اب رونے کے قریب تھا۔ "اسی وجہ سے میرا کوئی دوست نہیں بنا۔ میں نے صوبی کو بھی نہیں بتایا تھا ورنہ وہ بھی مجھ سے دور ہو جاتی۔"

اس بار شامی تیمور کو ایک طرف لے گیا۔ "دیکھا، میری چھٹی حس ٹھیک اشارے کر رہی تھی۔ ہم ایک بڑی مصیبت کو اٹھا لائے ہیں۔ اس سے جتنی جلدی چھٹکارا حاصل کر لیں، اتنا اچھا ہے۔"

”تُو رشید بلا سے ڈر رہا ہے؟“

”یار! ایسے لوگوں سے ڈرنا چاہیے۔“ شامی نے حقیقت پسندی سے کہا۔ ”سانپ، بچھو اور مگر مچھ سے سب کو ڈرنا چاہیے لیکن اصل مسئلہ دادا جان کا ہے۔ اگر ان کو پتا چل گیا تو تو سوچ سکتا ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔“

تیمور بھی متفکر ہو گیا۔ اب اسے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اس نوجوان کو یہاں لا کر غلطی کی ہے۔ جوجی ناشتے کے بعد نہایت پُرامید نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کھانے پینے کے بعد وہ اس کے باقی مسائل بھی حل کر دیں گے۔ مگر تیمور کو تجسس بھی تھا۔ ”یار! اس نے ابھی پوری کہانی نہیں سنائی ہے۔“

”او بھائی، کہانی کے چکر میں یہ اسٹوری ہمارے گلے نہ پڑ جائے۔ پتا ہے کل شام رشید بلا کا اپنے حریف اکرم موجی سے خوں ریز تصادم ہوا ہے جس میں دو بے گناہ لوگ مارے گئے۔ یہ تصادم شاید اسی کے مسئلے پر ہوا ہے۔ لڑکا گھر سے غائب ہے اور اس کا باپ سمجھ رہا ہے کہ مخالف نے غائب کر دیا ہے۔ اگر ہم نے اس سے چھٹکارا نہ پایا تو ممکن ہے مارے جانے والوں میں دو بے گناہوں کا اور اضافہ ہو جائے۔“

شامی کے تجزیے نے تیمور کو مزید متفکر کر دیا تھا۔ ”تُو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ چل اس کی کہانی سن کر اسے کہیں چھوڑ آتے ہیں۔“

شامی کہانی سننے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن تیمور کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ ویسے بھی جوجی کو تیمور ہی لایا تھا اس لیے مرضی اس کی چل رہی تھی۔ وہ واپس آئے تو جوجی نے کہا۔ ”آپ میرے ابا کا نام سن کر ڈر گئے ہیں نا؟“

شامی کو غصہ آ گیا۔ ”دیکھو برخوردار! ہم ایک شریف خاندان سے ہیں اور کسی بدمعاش کے منہ نہیں لگتے لیکن ڈرتے کسی سے نہیں ہیں۔“

خلافِ توقع نوجوان خوش ہو گیا۔ ”مجھے بھی یہی توقع تھی جی... یعنی آپ میری مدد کرو گے؟“

اس پر تیمور نے نہایت غضبناک نظروں سے شامی کو گھورا جس کا نوابی خون غلط وقت پر جوش میں آیا تھا اور نوجوان ان سے توقع لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے چالاکی سے کہا۔ ”یار! تم پہلے اپنی کہانی تو مکمل کرو تاکہ ہم فیصلہ کر سکیں کہ تمہاری مدد کریں یا نہ کریں۔“

اس نے سر ہلایا اور اپنی کہانی وہاں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ جوجی نے ایک بار بات کر کے اپنے خطرناک باپ کا ردِعمل دیکھ لیا تھا اس لیے اس نے دوسری بار حماقت نہیں کی اور اپنے ہمدرد سرمد سے مشورہ کیا۔ اس نے کلاسیک مشورہ دیا یعنی صوبی کو تیار کر کے گھر سے بھاگ جاؤ۔ لیکن اس سے پہلے اس کی پوری تیاری کر لو کیونکہ اگر وہ بغیر سوچے سمجھے بھاگا تو فوراً اپنے باپ کے ہتھے چڑھ جائے گا جو اس کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دے گا اور اس کے پاس بدمعاشوں کی کمی نہیں تھی جو شہر میں کسی کو بھی تلاش کر سکتے تھے۔ جوجی صوبی سے یہ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نہیں مانے گی لیکن جب اس نے بات کی تو صوبی حیرت انگیز طور پر فوراً مان گئی۔ اس نے جوجی سے کہا۔

”میرے بابا تمہیں کبھی نہیں مانیں گے، وہ بہت سخت ہیں۔ بس یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم گھر سے بھاگ جائیں۔“

”تو تم میرے ساتھ گھر سے بھاگنے کے لیے تیار ہو؟“

”ہاں ہم شادی کر سکتے ہیں اور کہیں چھپ کر رہ سکتے ہیں۔“ صوبی نے جوش سے کہا۔ کم عمری کے رومان نے اسے سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی کہ گھر سے بھاگ کر وہ کہاں رہیں گے اور زندگی کیسے گزاریں گے؟ جوجی خوش ہو گیا کہ صوبی اتنی آسانی سے مان گئی ہے۔ اس نے سرمد کو بتایا، اس نے جوجی کو پلان تیار کر کے دیا۔ اس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ انہیں گھر سے بھاگنے سے پہلے جتنا ہو سکے، مال و دولت سمیٹ لینا چاہیے۔ جوجی کے گھر میں اس کی کمی نہیں تھی اور صوبی بھی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ سرمد کا پلان جوجی نے اسے بھی سمجھایا۔ صوبی مان گئی۔ انہوں نے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جوجی کے گھر میں رقم کی کمی نہیں تھی کیونکہ دیگر مجرموں کی طرح رشید بلا بھی بینک کا قائل نہیں تھا اور دولت کو نقد یا دوسری قیمتی شکلوں میں رکھا کرتا تھا۔ اس نے بلاشبہ کروڑوں روپے اور سیروں کے حساب سے سونا اور دیگر قیمتی چیزیں گھر میں رکھی ہوئی تھیں۔

لیکن یہ سب رشید بلا نے تجوری میں رکھا ہوا تھا اور اس کا نمبر صرف اسے یا جوجی کی ماں کے علم میں تھا۔ باقی الماریوں میں بھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ ماں باپ کی طرف سے جوجی پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جتنی چاہے رقم لے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے دل کھول کر رقم لینا شروع کر دی اور یہ سب جمع کرتا رہا۔ دوسری طرف صوبی بھی رقم جمع کر رہی تھی اور وہ جو رقم چراتی، لا کر اگلے دن اسے جوجی کے حوالے کر دیتی تھی۔ انہوں نے فرار سے دو مہینے پہلے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ شامی نے پوچھا۔

”تم دونوں نے مل کر کتنی رقم ماری؟“

”پتا نہیں جی، شاید دس لاکھ سے اوپر ہو گی۔ ویسے صحیح

حساب سرمد کو پتا ہو گا۔“

”سرمد کو... کیا رقم اس کے پاس ہے؟“

”ہاں کیونکہ میں کہاں رکھتا... گھر میں تو ابا پکڑ لیتے۔“ جوجی نے کہا۔ ”صوبی جو زیور لائی تھی، وہ بھی سرمد کے پاس ہے۔“

شامی کا دل چاہا کہ سر پیٹ لے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا اور سرد آہ بھر کر پوچھا۔ ”خود سرمد کہاں ہے؟“

”فلیٹ میں۔“ جوجی بولا۔

”کون سے فلیٹ میں؟“

”جہاں میں اور صوبی بھاگ کر رکے ہیں۔ وہیں سے تو میں ناشتا لینے نکلا تھا تو دو آدمی مجھے پکڑ کر لے گئے۔ مگر میں بہت چالاک ہوں، راستے میں بھاگ نکلا۔“

شامی اور تیمور اس چالاک نوجوان کی عقل پر رشک کر رہے تھے۔ رشید بلا جیسے شاطر آدمی کی اولاد عقل سے اتنی پیدل نکلے گی، یہ تو خود رشید بلا نے بھی نہیں سوچا ہو گا۔ گزشتہ دن دونوں گھر سے کالج پہنچے مگر اندر جانے کے بجائے وہاں سے سیدھے اس فلیٹ پر پہنچے جو راولپنڈی کی ایک پرانی آبادی میں سرمد نے لیا تھا۔ اس نے جوجی کو فلیٹ دکھایا تھا۔ رقم وہ پہلے ہی اسے دے چکے تھے پھر صوبی اپنی ماں کا سارا زیور بھی لے آئی تھی اور یہ بھی اچھا خاصا تھا۔ ظاہر ہے وزن تو صوبی کو بھی نہیں پتا تھا۔ جوجی کا اندازہ تھا کہ زیور کا وزن ایک کلوگرام سے زیادہ ہی تھا۔ فلیٹ پر پہنچنے کے بعد سرمد نے یہ زیور بھی اپنے قبضے میں لے لیا اور ان لوگوں کو چھوڑ کر اسے حفاظت سے رکھنے کہیں چلا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ جگہ محفوظ نہیں۔

تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”پھر وہ واپس نہیں آیا ہو گا؟“

”جب بہت دیر تک نہیں آیا تو مجھے بھی یہی خیال آیا تھا۔“ جوجی نے سر ہلایا۔ ”لیکن وہ شام کو آ گیا تھا۔ رات کو فلیٹ میں رکا۔ ایک کمرے میں، میں اور سرمد تھے، دوسرے میں صوبی تھی۔ سرمد نے کہا کہ کل وہ ہمیں ایک اور جگہ لے جائے گا جہاں ہمارا نکاح ہو گا۔“

تیمور نے خفت سے کہا۔ ”اچھا، میں تو سمجھا تھا وہ زیور لے کر نو دو گیارہ ہو جائے گا۔“

”زیور ہی کوئی پچاس لاکھ کا تو ہو گا۔“ شامی نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ یہ شخص کس حیثیت کا ہے؟ مطلب امیر ہے، غریب ہے یا درمیان کا ہے؟“

”پتا نہیں جی لیکن کپڑے اچھے پہنتا ہے اور اس کے پاس پرانی گاڑی بھی ہے۔“

”تب وہ درمیانہ قسم کا شخص ہوا۔ اس کے لیے ساٹھ لاکھ بڑی رقم ہو گی۔“ شامی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب وہ تمہیں فلیٹ میں نہیں ملے گا۔“

اچانک تیمور چونکا۔ اس نے جوجی سے پوچھا۔ ”ناشتا لینے تم نکلے تھے یا اس نے تمہیں بھیجا تھا؟“

”اس نے بھیجا تھا۔“ جوجی بولا۔ ”اس کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی۔“

”اور باہر نکلتے ہی ان لوگوں نے تمہیں پکڑ لیا؟“

”جی... جب وہ مجھے لے جا رہے تھے تو ایک کہہ رہا تھا، کسی نے ان کے استاد کو فون کر کے میرے بارے میں بتایا ہے۔“

تیمور شامی کو پھر ایک طرف لے گیا۔ ”یہ کوئی اور چکر لگ رہا ہے۔“

”سامنے کی بات ہے، سرمد فراڈ ہے۔ اس نے ان دونوں کو بے وقوف بنایا ہے۔“

”میں فراڈ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ وہ شخص کسی اور چکر میں بھی ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”مجھے شک ہے کہ اسی نے جوجی کے بارے میں ان لوگوں کو اطلاع کی ہو گی۔“

”ممکن ہے وہ رشید بلا کے ساتھی ہوں۔“

”یار! کیا تم عقل کہیں بھول آئے ہو۔ اگر وہ اس کے باپ کے ساتھی ہوتے تو اسے پستول دکھا کر کیوں لے جاتے؟ وہ کسی استاد کے بچے ہیں اور وہ تو اس کی زبان کھلوانے کی بات کر رہے تھے۔“

”تب وہ کون ہو سکتے ہیں؟“

”ممکن ہے لڑکی سے تعلق ہو۔“ تیمور نے کہا۔ ”لڑکی بھی تو اپنے باپ سے ڈر رہی تھی۔“

”او بھائی، ضروری نہیں ہے لڑکی بھی کسی بدمعاش فیملی کی ہو۔ اور اس قسم کے کام کرنے والی تمام لڑکیاں اپنے باپوں سے ڈرتی ہیں۔“

”ممکن ہے لیکن یہ شخص سرمد ضرور چکر باز ہے۔ میرا دعویٰ ہے، اب جوجی اس فلیٹ میں جائے گا تو اسے وہاں سرمد نہیں ملے گا بلکہ صوبی بھی نہیں ملے گی۔“

شامی چونکا۔ ”تیرا مطلب ہے وہ صوبی کو بھی لے جائے گا؟“

”بالکل، وہ شخص صرف رقم کے چکر میں نہیں رہا ہو گا۔ رشید بلا جیسے آدمی کے بیٹے کو لوٹنے والے کے پاس بڑا دل گردہ ہونا چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ صرف دولت کا چکر نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"لڑکی کو لے جا کر اس نے کیا کرنا ہے؟"

"یار! لوگ لڑکیوں کا کیا کرتے ہیں۔ اور یہ شخص تو ویسے بھی مشکوک لگ رہا ہے۔ ممکن ہے اس بے چاری کو لے جا کر کہیں بیچ دے۔"

شامی نے سوچا اور پھر جوجی کی طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہے جو ہمیں معلوم کرنا تھا وہ ہم نے کرلیا۔ اب اسے کہیں چھوڑ کر آتے ہیں۔"

تیمور سوچ رہا تھا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ "یار! کیا یہ مناسب ہوگا؟"

"بالکل مناسب ہوگا۔" شامی نے کہا۔ "اس کیس میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ہمارا اس میں شامل ہونا کسی طور مناسب نہیں ہوگا۔"

تیمور نے شامی کو گھورا۔ "شامی! اگر اس کی جگہ کوئی لڑکی ہوتی تو تب بھی تیرا یہی جواب ہوتا؟"

"مجھے جذباتی بلیک میل نہ کر، یہ بتا کیا تو اس کی مدد کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں، مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ اس بے چارے کو یوں آس دلا کر بے سہارا چھوڑ دیا جائے۔ پھر اس سے ہماری ساکھ پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔"

"کون سی ساکھ؟" شامی نے بے خیالی میں پوچھا۔

"وہی جو ہماری کہانیاں پڑھ کر لوگوں میں بن چکی ہے۔"

"مگر ساکھ کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لینا ٹھیک ہوگا؟ تم جانتے ہو، دادا جان یہ بدمعاش ٹائپ کی چیزیں پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی ان سے دور رہنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے لیکن جوجی بدمعاش نہیں ہے، اس کا باپ بدمعاش ہے۔"

"اس کا باپ ہی تو اصل مسئلہ ہے۔" شامی بولا۔ "لیکن پہلے اس سے کچھ گفتگو کرلی جائے۔"

وہ واپس آئے تو جوجی فکرمند تھا، اس نے کہا۔ "لگتا ہے آپ میری مدد نہیں کرنا چاہتے؟"

"تم کس قسم کی مدد چاہتے ہو برخوردار؟" شامی نے ملائمت سے پوچھا۔ "ہم تمہارا نکاح نہیں پڑھا سکتے اور نہ ہی تمہیں یہاں پناہ دے سکتے ہیں۔"

جوجی نے دونوں ہاتھ ملے اور پھر بولا۔ "وہ جی، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہورہا ہے۔ ہمیں اس طرح گھر سے بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ اب مجھے خیال آرہا ہے کہ ابّا جی ہمیں کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ جو لوگ تمہیں پکڑ کر لے جا رہے تھے وہ تمہارے ابّا جی کے آدمی تھے؟" تیمور نے پوچھا۔

"نہیں جی، ابّا جی کے تمام آدمی میں نے دیکھے ہوئے ہیں اور سب مجھے پہچانتے ہیں۔ کوئی مجھے اس طرح گن پوائنٹ پر نہیں لے جاسکتا۔ ابّا جی بعد میں اس کی کھال اتار دیتے۔"

"پھر وہ کون ہوسکتے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔" جوجی نے بے چینی سے کہا۔ "پلیز اگر آپ میرے لیے کچھ نہیں کرسکتے تو مجھے واپس اسی جگہ چھوڑ دیں۔ مجھے صوبی کے پاس واپس جانا ہے۔"

"وہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں؟"

اس نے ہچکچا کر کہا۔ "کسی طرح مجھے اور صوبی کو واپس گھر پہنچا دیں کہ ہمارے ماں باپ ہمیں کچھ نہ کہیں۔"

"یار! اس معاملے میں تو ہم اپنے ماں باپ کی گارنٹی نہیں دے سکتے۔ تمہارے ماں باپ کی کہاں سے دیں؟" شامی ہنسا۔

"دوسرے تمہیں یقین ہے کہ جب تم واپس جاؤ گے تو صوبی وہاں موجود ہوگی؟" تیمور نے پوچھا۔

جوجی اچھل پڑا۔ "کیا مطلب جی؟"

"بات یہ ہے برخوردار۔" شامی نے کہا۔ "مجھے سرمد فراڈ لگ رہا ہے۔ اس نے تمہیں کسی مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ اگر اسے صرف رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ نکل جانے کے بعد واپس ہی نہ آتا۔ وہ یقیناً لڑکی کے چکر میں واپس آیا ہوگا اور آج اس نے تمہارا پتا بھی صاف کرنے کی کوشش کی لیکن تم بچ نکلے۔ مگر لڑکی کو وہ لے جاچکا ہوگا۔"

"م... مجھے جانا ہوگا۔" جوجی بے چین ہوگیا، وہ دروازے کی طرف بڑھا تو تیمور نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے برخوردار، میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔" تیمور نے کہتے ہوئے شامی کی طرف دیکھا تو اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔

"میں بھی چل رہا ہوں لیکن کوئی مسئلہ ہوا تو وہ تیرے ذمے ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" تیمور خوش ہوگیا۔ جوجی ان کے ساتھ چلنے کا سن کر خوش ہوگیا تھا لیکن صوبی کے حوالے سے اس کی فکر کم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے غالباً اس معاملے میں اپنا دماغ استعمال کرنے کے بجائے وہی کیا تھا جو سرمد اسے سمجھاتا آیا تھا۔ شاید اپنے باپ کی وجہ سے وہ تنہا زندگی بسر کرتا آیا تھا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور اسے گھر سے باہر کے لوگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ماں باپ اور گھر والوں پر اعتماد کرنے کی وجہ سے دوسروں پر اعتماد کرنا اس کی فطرت میں شامل ہوگیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بڑی آسانی سے سرمد کی باتوں میں آگیا تھا۔ لیکن اب اس کی سمجھ کام کرنے لگی اس لیے وہ واپس جانے کی بات کررہا تھا۔

تیمور اور شامی اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ولا میں موجود واحد مقامی کاران کے استعمال میں رہتی تھی کیونکہ نواب صاحب اپنی غیر ملکی لگژری گاڑیوں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ ایک فور وہیل تھی لیکن وہ شہر سے باہر یا کسی پہاڑی مقام کی طرف جاتے ہوئے استعمال کی جاتی تھی۔ شامی نے راستے میں جوجی سے سرمد کے بارے میں کئی سوال کیے لیکن اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ سرمد سے اس کی ملاقاتیں گزشتہ اٹھارہ مہینے سے جاری تھیں لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ شامی کو بھی لگ رہا تھا کہ تیمور کا اندیشہ درست ہے۔ سرمد نامی یہ شخص کسی اور چکر میں بھی تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ صوبی کو بھی لے جاسکتا تھا۔ شامی نے اب دوسرے زاویے سے تفتیش شروع کی۔

"کبھی اس شخص نے تمہارے ابّا جی کے بارے میں بات کی؟"

"جی کئی بار کی۔"

"تمہیں کیا محسوس ہوا کہ وہ انہیں پسند کرتا ہے یا ناپسند کرتا ہے؟"

شامی کے اس سوال پر وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ "اس نے کبھی کہا تو نہیں لیکن مجھے لگا کہ وہ ابّا جی کو پسند نہیں کرتا ہے۔ ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ عجیب سا ہوجاتا تھا۔"

"اس کا تمہارے ابّا جی سے کبھی تعلق رہا ہے؟"

"اس بارے میں مجھے نہیں معلوم۔"

تیمور خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ شامی نہایت ذہانت سے سوال کررہا تھا اس لیے اس نے دخل اندازی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن جب وہ اس علاقے کے پاس پہنچے جہاں سے جوجی ان کی کار میں گھسا تھا تو اس نے پوچھا۔

"وہ عمارت کہاں ہے؟"

"یہ اس طرف موڑ لیں جی۔" جوجی نے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر میں وہ اس کی راہنمائی میں ایک ایسی گلی کے سامنے پہنچے جس میں کار نہیں جاسکتی تھی۔ جوجی نے بتایا۔ "یہاں سے کچھ دور پیدل جانا ہوگا۔"

یہ نچلے طبقے کا علاقہ تھا جہاں تنگ گلیاں اور جابجا بہتی ہوئی نالیاں اور گندگی کے ڈھیر تھے۔ گلی سے گزرتے ہوئے جوجی کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس قسم کی بدبو اور گندگی کا عادی نہیں تھا لیکن وہ یہاں آنے پر مجبور ہوا تھا۔ گلی کے کونے پر ایک چار منزلہ عمارت تھی۔ فلیٹ اس کے تیسرے فلور پر تھا۔ جوجی نے بے تابی سے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ جوجی دوبارہ دستک دینے جا رہا تھا کہ شامی نے اسے روک لیا۔ اس نے دروازہ دیکھا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ جوجی تیزی سے اندر گھسا۔ فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا اور اسے دیکھنے میں دس سیکنڈ بھی نہیں لگے۔ فلیٹ خالی تھا جیسا کہ شامی اور تیمور کو توقع تھی۔ جوجی کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے چھوٹے سے کچن اور باتھ روم میں بھی جھانک لیا۔ وہ بالکونی کی طرف جا رہا تھا کہ تیمور نے اسے روک لیا۔

"بس بھائی، کیا اب خودکشی کا ارادہ ہے۔"

جوجی اب مشتعل ہورہا تھا۔ "وہ صوبی کو کیسے لے جاسکتا ہے؟"

"یہ تو وہی بتائے گا۔" شامی نے کہا۔ "لیکن وہ کہاں ہوسکتا ہے، تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"اس نے اسے دھوکا دیا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "اس نے صرف لوٹا نہیں ہے بلکہ وہ لڑکی کو بھی لے گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ تم سے کسی بات کا بدلہ بھی لینا چاہتا تھا ورنہ لڑکی کو لے جانے کی کوئی تک نہیں بنتی ہے۔"

"تم بھول رہے ہو۔" شامی نے مبہم انداز میں کہا۔ "وہ اس کا مصرف نکال سکتا ہے۔"

تیمور نے سوچا اور سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" پھر اس نے جوجی کی طرف دیکھا۔ "اب تم کیا کرو گے؟"

"میں اسے قتل کردوں گا۔" جوجی مشتعل ہوکر بولا۔

"اب تمہارے اندر ابّا جی کا خون بول رہا ہے۔" شامی نے طنز کیا۔ "لیکن قتل کرنے کے لیے اسے تلاش کرنا ضروری ہے۔"

"میں اسے تلاش کرلوں گا۔"

"کیسے؟"

جوجی کے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ایک ناتجربہ کار اور جذباتی نوجوان تھا جو اپنی عقل کو کم ہی استعمال کرتا تھا اور اسی وجہ سے اس حال کو پہنچا تھا۔ اس دھچکے نے اس کے حواس اڑا دیے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے شامی اور تیمور سے کہا۔ "آپ دونوں میری مدد کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔"

تیمور بولا۔ "ہم تمہاری یہ مدد کرسکتے ہیں کہ تمہیں تمہارے گھر پہنچادیں۔ اس کے بعد تمہارے اباجی معاملہ خود سنبھال لیں گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، وہ مجھے گھر میں قید کر دیں گے اور صوبی کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔"

شامی نے کہا۔ "دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمہیں مقامی پولیس اسٹیشن پہنچادیں اور تم وہاں سرمد کے خلاف رپورٹ لکھوا دو۔ پولیس اسے اور صوبی کو تلاش کرسکتی ہے۔"

تیمور نے تائید کی۔ "وہ اسے تلاش کرلے گی، خاص طور سے جب پولیس والوں کو پتا چلے گا کہ وہ لڑکی کے ساتھ تقریباً ساٹھ لاکھ روپے بھی لے گیا ہے۔"

"پولیس اسے تلاش نہیں کرسکتی۔" جوجی نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔"

شامی نے کہا۔ "وہ بہت چالاک نہیں، تم بہت بے وقوف ہو اس لیے بن گئے۔"

جوجی کا چہرہ ستّ گیا اور ذرا سی دیر میں وہ کئی دن کا بیمار لگنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر شامی اور تیمور اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگے۔ حالانکہ دونوں نے اسے اچھی خاصی سنائی بھی تھیں۔ پھر ان کو اس لڑکی کا بھی خیال آرہا تھا جو گھر سے بھاگی تو جوجی کے لیے تھی لیکن ایک غلط آدمی کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ فلیٹ میں کچھ نہیں تھا۔ سوائے معمولی سے فرنیچر کے اور ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے سرمد کی شخصیت پر کوئی روشنی پڑتی۔ وہ لوگ باہر آئے۔ شامی نے برابر والے فلیٹ کا دروازہ بجایا تو ایک تیز طرار سی عورت نے دروازہ کھولا۔

"کیا ہے؟"

"باجی ہمیں اس برابر والے فلیٹ کے آدمی کے بارے میں پوچھنا ہے، وہ یہاں نہیں ہے۔" شامی نے کہا۔

عورت نے بے رخی سے کہا۔ "اگر نہیں ہے تو مجھے کیا معلوم؟"

"آپ پڑوس میں رہتی ہیں اور یقیناً آپ نے اسے آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ ماشاءاللہ صورت سے ہی آپ ذہین لگ رہی ہیں۔" شامی نے چرب زبانی کا مظاہرہ کیا۔ عورت خوش ہوگئی۔

"ہاں، کچھ دیر پہلے وہ یوں گیا جیسے یہاں پولیس آنے والی ہو۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔"

"کتنی دیر ہوئی ہے؟" شامی نے پوچھا۔

"کوئی گھنٹا بھر ہوگیا ہے۔" عورت نے کہا۔

"آپ جانتی ہیں وہ کب سے یہاں ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم، میں اسے دو دن سے دیکھ رہی ہوں۔ اس کے بارے میں شیخ صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ وہ اس فلیٹ کے مالک ہیں۔"

"شیخ صاحب کہاں ملیں گے؟"

"اسی بلڈنگ میں سب سے نیچے ان کا فلیٹ بھی ہے۔ لال رنگ کے دروازے والا۔ نام افضل حسین ہے۔ میری ہانڈی جل رہی ہے۔" عورت نے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔ شامی اور تیمور نے شکر ادا کیا کہ اُس نے ان سے ان کے بارے میں نہیں پوچھا ورنہ ان کو بہت سارے جھوٹ بولنا پڑتے۔ نیچے آتے ہوئے شامی نے کہا۔

"یہ شیخ اتنی آسانی سے اس کے بارے میں نہیں بتائے گا۔ اس کے لیے ترکیب اختیار کرنا ہوگی۔"

"کیسی ترکیب؟" تیمور نے پوچھا۔

شامی نے سوچا اور جوجی سے کہا۔ "تم اداکاری کرلیتے ہو؟ آخر محبت بھی تو کی ہے۔"

"اداکاری... وہ کیوں جی؟"

"سوال نہیں، جیسا کہتا ہوں ویسا کرتے جاؤ۔ تمہیں ایسی اداکاری کرنی ہے جیسے ہم کسی ایجنسی کے لوگ ہیں اور تمہیں پکڑ کر لائے ہیں اور تمہارے باقی ساتھیوں کی تلاش میں ہیں۔"

"میں سمجھ گیا جناب۔" اس نے مستعدی سے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ شیخ کے فلیٹ کا دروازہ بجا رہے تھے۔ شیخ خود باہر آیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا موٹی توند والا شخص تھا۔ اس نے انہیں دیکھا۔ "جی فرمائیں۔"

"شیخ افضل حسین تم ہو؟" شامی نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ تیمور جوجی کو کلائی سے پکڑے کھڑا تھا۔

"جی میں ہی ہوں۔" وہ شامی کے انداز سے دب گیا۔

"اسے پہچانتے ہو؟" شامی نے جوجی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی نہیں۔" شیخ نے حیرت سے کہا۔ "یہ کون ہے؟"

"یہ اس شخص کا ساتھی ہے جسے تم نے فلیٹ کرائے پر دیا ہوا ہے۔"

وہ چونکا۔ "کون سا فلیٹ جناب؟... اس بلڈنگ میں میرے چار فلیٹ ہیں۔" اس نے دریافت کیا۔

"جو تیسرے فلور پر ہے۔" شامی نے کہا۔ "شیخ! یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ تم جانتے ہو آج کل حالات کیسے ہیں۔ تم نے اس شخص کے بارے میں جانے بغیر اسے فلیٹ کیسے دے دیا؟"

اس بار افضل حسین کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ذہین شخص تھا، اسے شامی کی بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ "کک... کیا ہوا ہے جناب؟"

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" تیمور نے کہا۔

"سس... ساتھ کیوں جناب؟ جو پوچھنا ہے یہیں پوچھ لیں اور میں شفقت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"شفقت کون ہے؟" شامی نے پوچھا۔

"جسے میں نے فلیٹ کرائے پر دیا ہے۔ میرا پرانا جاننے والا ہے۔"

شامی نے شفقت کا حلیہ معلوم کیا اور شیخ نے جو حلیہ بتایا جوجی نے سر ہلا کر اس کی تصدیق کی کہ یہی سرمد ہے۔ شامی نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے وہ نام بدل کر کارروائی کر رہا ہے۔"

"جناب! اس نے کیا کیا ہے؟"

شامی نے محسوس کیا کہ آس پاس کے فلیٹوں میں ہلچل ہونے لگی تھی اور لوگ اپنے دروازوں سے کان لگائے کھڑے تھے۔ ایک تو جھانک بھی رہا تھا، اس نے شیخ افضل حسین سے کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں اندر بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔"

خود شیخ بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ انہیں اندر لے آیا۔

"معاملہ کیا ہے جناب؟ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"تم شریف ہو لیکن شفقت شریف نہیں ہے۔ پھر بھی تم نے اسے فلیٹ کرائے پر دے دیا۔"

شیخ بوکھلا گیا۔ "میں جانتا ہوں جناب لیکن اتنے عرصے بعد وہ ملا تو اس کا حلیہ اور انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ شریف ہوگیا ہے۔"

"حالانکہ وہ کبھی شریف نہیں رہا۔"

"میں جانتا ہوں جی، وہ پہلے اکرم موجی کے ساتھ تھا۔ اپنے باپ کے مارے جانے کے بعد وہ کام کرنے لگا تھا لیکن پھر وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔" شیخ افضل حسین شفقت یا سرمد کے بارے میں بتا رہا تھا۔ "دس سال سے اس کا کچھ نہیں پتا تھا پھر وہ میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ اب وہ شرافت کی زندگی گزار رہا ہے اور ایک کمپنی میں ملازمت کر رہا ہے۔ اسے رہائش کی ضرورت ہے۔"

یہ ایک اور نئی بات تھی۔ اب اس معاملے میں اکرم موجی بھی آگیا تھا۔ شفقت یا سرمد اس کے لیے کام کرتا رہا تھا جبکہ وہ جوجی کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ رشید بلا کا بیٹا ہے۔ "اس کا باپ کیسے مارا گیا تھا؟"

"اکرم موجی کی رشید بلا سے لگتی ہے۔ ان کی آپس کی لڑائی ہوئی اور اس میں شفقت کا باپ مارا گیا۔"

"شفقت پڑھا لکھا ہے؟"

"میرا خیال ہے اسکول تک تو پڑھا ہوا ہے۔ پھر کالج جانے سے پہلے وہ اکرم کے لیے کام کرنے لگا تھا۔" شیخ افضل نے سوچ کر کہا۔ "لیکن کیا وہ کسی چکر میں ہے؟"

"ہاں، اس کا تعلق ایک دہشت گرد گروہ سے ہے۔" شامی نے کہا تو شیخ افضل کا رہا سہا رنگ بھی اڑ گیا۔ "ہم خاصے عرصے سے اس کے پیچھے ہیں۔ اب نظر میں آیا ہے۔"

"لل... لیکن جناب اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"ہم نے اس کے ساتھی کو گرفتار کرلیا ہے۔" شامی نے جوجی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کی نشان دہی پر یہاں چھاپا مارا لیکن وہ اپنی ساتھی لڑکی کے ساتھ فرار ہوچکا ہے۔"

"اگر وہ فرار ہوچکا ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔ میں بال بچوں والا آدمی ہوں۔"

"اسی وجہ سے تم سے یہاں بیٹھ کر بات کر رہے ہیں ورنہ اس وقت تم کسی نامعلوم جگہ الٹے لٹکے میرے سوالوں کے جواب دے رہے ہوتے۔" شامی نے اسے دھمکانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "ٹھیک ہے، تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا ہے لیکن اتنے عرصے میں تم اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئے ہوگے؟"

شیخ افضل نے سوچا۔ "اس نے دو ہفتے پہلے یہ فلیٹ مجھ سے کرائے پر لیا تھا۔"

"اس کے پاس گاڑی بھی ہے؟"

شیخ افضل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کبھی اسے گاڑی میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ پیدل آتا تھا یا ٹیکسی رکشے میں۔" اس نے جوجی کی طرف دیکھا۔ "اس نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"اسے چھوڑو... یہ اس کا ساتھی ہے۔ اس کی بات پر اعتبار نہیں کرسکتے اس لیے تم سے پوچھ رہے ہیں۔ اس دوران میں اس سے کوئی ملنے کے لیے آیا؟"

شیخ افضل سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے چونک کر کہا۔ "کوئی اور تو نہیں مگر رفیق مستری آیا تھا ایک دن اس کا پوچھتے ہوئے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"رفیق مستری کون ہے؟"

"جی ادھر سڑک پر اس کی ورکشاپ ہے۔ میں گھر پر نہیں تھا، میری گھر والی سے پوچھا تھا اس نے۔ اس نے بعد میں بتایا لیکن میرے ذہن سے نکل گیا۔ ابھی آپ نے پوچھا ہے تو یاد آیا ہے۔"

"شفقت کے بارے میں؟"

"جی جناب... میں ہوتا تو معلوم کرتا کہ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔"

شامی کے خیال میں اتنی معلومات کافی تھیں۔ وہ کون سا سچ مچ کسی ایجنسی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی کافی تھا کہ اس کا اصل نام معلوم ہو گیا تھا اور کسی رفیق مستری سے اس کا تعلق نکل آیا تھا۔ وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے شامی نے شیخ افضل کو وارننگ دی۔ "یہاں جو گفتگو ہوئی ہے وہ یہیں تک محدود رہے کیونکہ شفقت جلد یا دیر سے ہمارے قابو میں آجائے گا۔ اور اگر تمہاری کسی بات میں تضاد نکلا تو تم بھی اس کے ساتھ ہو گے۔ ہم اپنے قیدیوں کو کس طرح رکھتے ہیں، یہ تم جلد دیکھ لو گے۔"

"میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی ہے جناب۔" شیخ گڑگڑایا۔ "میں اپنے بچوں کی قسم کھاتا ہوں۔"

وہ باہر نکلے اور کار تک آئے۔ تیمور نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اس رفیق مستری کو دیکھنا پڑے گا؟"

"ہاں، شفقت اور صوبی تک پہنچنے کا یہی ایک واحد راستہ نظر آیا ہے۔" شامی نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

صاحبہ بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔ تیکھے نین نقش والی، پتلے سے ہونٹ اور بڑی آنکھیں۔ اس کی رنگت گلابی تھی اور مجموعی طور پر وہ بہت دل کش لگتی تھی۔ لیکن اس کے سر میں اتنی ہی عقل تھی جتنی اس عمر کی لڑکیوں کے سر میں پائی جاتی ہے، خاص طور سے لڑکوں کے بارے میں۔ اسے سرمد اچھا لگا۔ پھر یہ اچھا لگنا محبت میں بدل گیا اور وہ اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے پر تیار ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ کبھی نہیں مانے گا بلکہ اسے شبہ بھی ہو جاتا کہ صاحبہ گھر سے بھاگنے کا سوچ رہی ہے تو وہ اس کی ٹانگیں توڑ دیتا۔ اس لیے صاحبہ نے گھر سے بھاگنے کے منصوبے پر بڑی احتیاط سے عمل کیا۔ اس نے ماں باپ کو شک کا موقع دیے بغیر رقم چوری کی اور اپنی ماں کا زیور نظر میں رکھ لیا تھا۔ جس دن اسے گھر سے فرار ہونا تھا، اس نے صبح اٹھ کر ماں کا زیور اپنے کالج بیگ میں رکھا اور وقت پر کالج روانہ ہو گئی لیکن وہ کالج نہیں گئی۔ جو جی باہر اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے لے کر اس فلیٹ تک آیا جو ایک گندی غلیظ گلی میں تھا۔ اس وقت صوبی کو سرمد کے بارے میں علم نہیں تھا اس لیے وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"یہ کون ہے؟" اس نے جو جی سے پوچھا۔

"یہ میرا دوست ہے، یہ ہماری مدد کر رہا ہے۔ یہ جگہ اسی نے دی ہے۔"

نہ جانے کیوں صوبی کو وہ شخص بالکل اچھا نہیں لگا۔ حالانکہ اپنے مہذب چہرے اور مخصوص طرز کی عینک کی وجہ سے وہ کوئی پروفیسر لگ رہا تھا۔ اس کے پرانے طرز کے اسٹائل میں بنے سرخ بال کانوں تک آرہے تھے۔ پھر سرمد نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا، وہ نظریں بھی اسے بالکل اچھی نہیں لگی تھیں۔ جو جی اس کا محبوب تھا لیکن اس نے بھی کبھی صوبی کو ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں کم عمری کی محبت کا شکار ضرور ہوئے تھے لیکن ان کی محبت میں وہ نفسی کیفیت نہیں تھی جو آج کل کی محبت کا طرۂ امتیاز ہو گئی ہے۔ صوبی نے موقع پا کر جو جی سے سرگوشی میں کہہ دیا۔ "مجھے یہ شخص اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

مگر جو جی اس سے متفق نہیں تھا۔ "صوبی! سرمد اچھا آدمی ہے اور ہماری مدد کر رہا ہے ورنہ ہمارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔ ہم دونوں کم عمر ہیں اور اپنے مسائل خود سے حل نہیں کر سکتے۔"

صوبی خاموش ہو گئی۔ جو جی نے اس سے اس کی ماں کے زیورات لیے اور سرمد کو دینے چلا گیا۔ جب سرمد فلیٹ سے نکل گیا، تب صوبی کو علم ہوا کہ جو جی نے زیور اور ساری رقم بھی سرمد کو دے دی ہے۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ اب اگر وہ سب لے کر بھاگ گیا تو...؟"

"سرمد ایسا نہیں کر سکتا، وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔" جو جی نے یقین سے کہا۔ لیکن جب شام تک سرمد کی واپسی نہ ہوئی تو اس کا یقین بھی ڈانواں ڈول ہو گیا۔ وہ پریشان ہو گیا اگر سرمد ان کا سارا اثاثہ لے جا چکا تھا تو اب وہ کیا کرتے اور کیسے گزر بسر کرتے؟ جو جی نے نوکری کرنے کا کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اسے کام کرنے کی عادت بھی نہیں تھی مگر ابھی اس کی پریشانی اتنی نہیں بڑھی تھی کہ وہ سرمد کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ پھر شام ہوتے ہی سرمد واپس آگیا۔ اس نے آتے ہی معذرت کی۔

"سوری دوستو! مجھے دوسرا مکان تلاش کرنے میں دیر ہو گئی۔ کل تک اس کی چابی مل جائے گی پھر تم لوگوں کو اس گندی جگہ نہیں رہنا پڑے گا اور اسی گھر میں تمہارا نکاح ہو گا۔"

جو جی نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا اور اس کی بات سن کر دونوں خوش ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ رقم اور سونا اس نے ایک محفوظ جگہ رکھ دیا ہے کیونکہ یہ جگہ محفوظ نہیں تھی۔ یہاں آئے دن مکانوں میں چوریاں ہوتی تھیں۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کا یہ اثاثہ لٹ جائے۔ میرے دیر سے آنے سے تم پریشان تو نہیں ہوئے؟"

"مجھے تم پر اعتماد ہے۔" جو جی نے کہا۔

لیکن صوبی کا دل نہیں مان رہا تھا۔ لڑکی ہونے کے ناتے اس کے اندر ایک اضافی حس بھی تھی جو اسے بتاتی تھی کہ کون سا مرد اس کے بارے میں کس طرح سے سوچ رہا ہے اور اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا تھا کہ سرمد اس کے بارے میں اچھی سوچ نہیں رکھتا۔ آنے والی رات وہ الگ کمرے میں سوئی اور اس نے احتیاطاً اندر سے کنڈی لگا لی تھی۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ جو جی اور سرمد ابھی تک پڑے سو رہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ اتنی دیر تک کیسے سوتی رہی۔ اس کی آنکھ صبح جلدی کھل جاتی تھی۔ وہ باہر آئی تو دوسرا کمرا کھلا ہوا تھا اور کچن میں سرمد تھا۔ جو جی اسے نظر نہیں آیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "جو جی کہاں ہے؟"

"وہ ناشتا لینے گیا ہے۔" سرمد نے کہا۔ وہ چائے بنا رہا تھا۔ اس نے ایک کپ صوبی کی طرف بڑھایا۔ "جب تک وہ ناشتا لے کر آتا ہے، تم چائے پی لو۔"

صوبی کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن سرمد کے اصرار پر اس نے چائے لے لی اور دو گھونٹ لے کر اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے پریشان ہو کر سرمد کی طرف دیکھا تو وہ شیطانی انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر ہوش و حواس سے بیگانہ رہی تھی لیکن جب اسے ہوش آیا تو ایک صاف ستھرے اور مناسب فرنیچر سے آراستہ کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا اور شاید وہ چند گھنٹے سے زیادہ بے ہوش نہیں رہی تھی۔ وہ گھبرا کر بستر سے نیچے اتر آئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا۔ باہر ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا جس کے ایک طرف اوپن کچن تھا۔ لاؤنج میں صوفے پر سرمد بیٹھا تھا اور اس کے سامنے میز پر ایک خوفناک سا سیاہ پستول رکھا ہوا تھا۔ صوبی کا دم خشک ہو گیا۔ اس نے تھوک نگل کر کہا۔

"تت... تم مجھے یہاں کیسے لائے؟"

وہ مسکرایا۔ "میں نہیں لایا، تم خود اپنے پیروں پر چل کر آئی ہو۔"

"جھوٹ... مجھے ہوش نہیں تھا۔" صوبی بولی۔

"میں نے چائے میں تمہیں جو دوا دی تھی، اس سے آدمی بہ ظاہر بے ہوش ہو جاتا ہے لیکن اس کے حواس جاگتے رہتے ہیں اور چلتا پھرتا بھی ہے۔ کسی کو شک نہیں ہوا اور میں تمہیں لے کر آرام سے یہاں آگیا۔"

"لیکن کیوں؟" صوبی رونے والی ہو گئی۔ "کیوں لائے ہو مجھے اس طرح؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" سرمد اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کا انداز اتنا خوفناک تھا کہ صوبی نے سہم کر بھاگنا چاہا لیکن وہاں جگہ ہی کہاں تھی۔ سرمد نے آرام سے اسے پکڑ لیا۔ وہ چیخی چلائی لیکن اس نے اثر نہیں لیا۔ وہ اسے پکڑ کر لاؤنج میں لایا اور لکڑی کی ایک ہتھی والی کرسی پر بٹھا کر چوڑے مضبوط ٹیپ سے اس کے ہاتھ پاؤں کرسی سے اس طرح باندھ دیے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس دوران میں وہ مسلسل چیختی رہی، اسے امید تھی کہ کوئی تو اس کی آواز سنے گا۔ لیکن جب سرمد اسے باندھ چکا تو اس نے کہا۔ "لڑکی! تم بیکار میں اتنی زحمت کر رہی ہو۔ یہاں دور دور تک تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔"

صوبی رو رہی تھی۔ "تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تمہیں جلد پتا چل جائے گا کہ میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں۔" سرمد نے کہا اور چوڑے ٹیپ کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس کے منہ پر لگا دیا۔ "اب تم ذرا آرام کرو۔"

سرمد نے ایک عدد موبائل فون نکالا۔ اس نے کسی کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ "ہاں اکرم صاحب! میں بات کر رہا ہوں۔ میری بات کی تصدیق ہو گئی نا؟"

صوبی اس کی بات سن کر تڑپ گئی، وہ کرسی پر ہلنے لگی اور ناک سے آوازیں نکالنے لگی۔ سرمد اس سے ذرا دور چلا گیا۔ دوسری طرف سے جواب سن کر اس کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔ "بھاگ گیا... کیسے جناب... آپ کے آدمی نکمے ہیں۔ ہاں لیکن لڑکی اس کے باپ کے قبضے میں ہے اور مجھے یقین ہے دونوں باپ بیٹے مل کر اس کی عزت خراب... آہستہ جناب... آپ جانتے ہیں رشید بلا کتنا کمینہ شخص ہے۔ یہ لڑکا مجید اسی کی اولاد ہے۔ دونوں ایک سے کمینے ہیں۔"

صوبی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے پھر ناک سے آوازیں نکالیں لیکن سرمد اتنا دور تھا کہ اس کی آواز کسی صورت فون تک نہیں جا سکتی تھی۔ سرمد کہہ رہا تھا۔ "مجھے یقین ہے جناب کہ یہ سارا منصوبہ رشید بلا کا ہے۔ اس نے آپ کو ذلیل کرنے کے لیے بنایا ہے اور اپنے بیٹے کی مدد سے اس پر عمل کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فہرست کتب 2009 2010

کتابیات پبلی کیشنز
مکتبہ نفسیات

تصوّف

سفیرانِ حرم	(خان آصف) (چاروں ایمائے کرام کے حالاتِ زندگی)	250/-
صاحب کرامات (4حصے مکمل)	(سندھ کے مشہور بزرگ کی بات سے واقعات مع مجرب وظائف و تعویذات)	250/- فی حصہ
سوانح انبیاء	(ضیاء تسنیم بلگرامی) 2حصے	250/- فی حصہ
روشنی کے مینار	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
عظمت کے مینار	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
پراسرار بندے	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
نبوت کے جھوٹے دعوے دار (2حصے جاری ہے)	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/- فی حصہ
احوالِ اولیا	(ڈاکٹر ساجد امجد) (اولیاء کرام کی سوانح حیات)	350/-
خاصانِ خدا	(ڈاکٹر ساجد امجد) (اولیاء کرام کی سوانح حیات)	250/-
سفرِ آخرت	(محمد فاروق قادری)	250/-
حکایات اولیاء ① ②	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	30/- فی حصہ

افسانے / ناول

ایمان کا سفر	(محی الدین نواب کی کہانیوں کا مجموعہ)	250/-
کچرا گھر	(محی الدین نواب کی کہانیوں کا مجموعہ)	200/-
آدھا چہرہ	(محی الدین نواب کا طویل معاشرتی ناول)	300/-
بہتے پانی پہ مکاں	(ناہید سلطانہ اختر کا رومانی ناول)	250/-
دکھ کا دریا سکھ کا ساگر	(آسیہ مرزا کا رومانوی ناول)	800/-
دھوپ بارش اور سائے	(نگہت سیما)	1000/-
سیپ، صدف اور ساحل	(رخ چوہدری کا مکمل ناول)	450/-
خلش	(ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی)	450/-
بہتی چاندنی کا سکوت	(ناہید چوہدری کا خوب صورت ناول)	450/-
مہمان	(ماہ مبین)	300/-
منزل کہاں ہے	(ماہ مبین)	300/-
قیدی سانس لیتا ہے	(زاہدہ حنا کے انقلابی افسانے)	100/-
بجلی گری نشیمن پر	(نورحسین شاہ کا مکمل معاشرتی ناول)	150/-
صحرا میں کنول	(نورحسین شاہ کا مکمل ناول رنگین تصاویر کے ساتھ)	150/-
گھن لگا چاند	(نورحسین شاہ کا مکمل ناول)	150/-
آدم زادی	(مظلوم عورتوں کی سچی کہانیاں)	100/-
انجم تاباں	(فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کا مختصر تعارف)	200/-
سفید ڈاکو	(محسن رضا کا طبع زاد ناول)	200/-
مارکو پولو	(محسن رضا کے قلم سے)	200/-
تم میرے سنگ ہو	(رضوانہ پرنس کے خوب صورت افسانے)	130/-
سدا میرے ہی رہنا	(رضوانہ پرنس کے خوب صورت افسانے)	130/-
یہ کیسا جیون	(شمیم نازصدیقی کے خوب صورت افسانے)	125/-
دس خوفناک کہانیاں	(ابنِ حق کے قلم سے)	200/-

سسپنس ڈائجسٹ کے سلسلے

دیوتا	50حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
طالوت	3حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
موت کے سوداگر	18حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
فرعون	2حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

جاسوسی ڈائجسٹ کے سلسلے

گمراہ	8حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مغرور	6حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
صدیوں کا بیٹا	5حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
شکاری	20حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مجاهد	11حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
آتش فشاں	13حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

سب رنگ ڈائجسٹ کے سلسلے

بازی گر	7حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
انکا	2حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
اقابلا	2حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
سونا گھاٹ کا پجاری	(مکمل)	60/- فی حصہ
غلام روحیں	(مکمل)	60/- فی حصہ

دیگر ڈائجسٹوں کے سلسلے

چھلاوا	صبیحہ بانو	(مکمل)	500/-
جال	صبیحہ بانو	(مکمل)	75/-
ہمزاد	شمیم نوید	(مکمل)	75/-
شاطر ① ②	مسٹری میگزین کا سلسلہ	(مکمل)	75/- فی حصہ
نک ویلوٹ کی چوریاں	2حصے	(مکمل)	75/- فی حصہ
انعام یافتہ کہانیاں	ڈائجسٹوں کی بہترین کہانیاں		50/-
چارلس سوبھراج کی سرگزشت			60/-
کالی کہانیاں	اے ایس صدیقی		40/-
بہترین کہانیاں	اے ایس صدیقی		75/-
شیطان صفت	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ	(زن، زر، زمین کے مقدمات کی سچی کہانیاں)	75/-
سبز قدم	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ	(زن، زر، زمین کے مقدمات کی سچی کہانیاں)	75/-
اسیر ہوس		(ملک صفدر حیات ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ڈائری سے جرائم کے سچے واقعات)	75/-
دست انتقام		(ملک صفدر حیات ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ڈائری سے جرائم کے سچے واقعات)	75/-
ماورائی لوگ		(روحانی صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے سچے واقعات)	85/-
کشتۂ سیاست		(ایک کنوارے سیاست داں کی سرگزشت)	85/-

الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانیاں

رزم بزم	50/-
آشنا نا آشنا	50/-
راگ کا بدن	50/-
شہزادی کا نیلام	50/-
بالا خانے کی دلہن	50/-
چاند کا خدا	50/-
عجائب خانہ عشق	50/-
کشمیر کی کلی	50/-
داستان حور	50/-
اندر کا آدمی	50/-
موبد زادے کی سرگزشت	160/-
لذت آشنائی (بہترین تاریخی کہانیوں کا انتخاب)	200/-

شگفتہ سیریز / طنز و مزاح

گھر کی مرغی	(اثر نعمانی)	50/-
حکیمی ٹیکسی	(اثر نعمانی)	50/-
بے وقوف	(اثر نعمانی)	50/-
آپ کے سر پر	(اثر نعمانی)	50/-
شرارت	(اثر نعمانی)	50/-
بی وی کی تلاش	(اثر نعمانی)	50/-
الو کی دم	(اثر نعمانی)	50/-
اور سہی	(اثر نعمانی)	50/-
مسٹر مداری	(اثر نعمانی)	50/-
کالے خاں بھورے خاں (اسد قلندر کی کہانیاں)		200/-

نفسیاتی و علمی کتابیں

ٹیلی پیتھی مستقبل بینی	60/-
ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات	60/-
ہپناٹزم	40/-
ہپناٹزم کے عملی طریقے	60/-
ذاتی ہپناٹزم	40/-
ہپناٹزم کی جدید تحقیقات	70/-
مقناطیسیت	50/-
امتحان میں کامیابی	40/-
خوابوں کے اسرار	30/-
عورتوں کی نفسیات	70/-
ازدواجی نفسیات	70/-
مٹاپا اور اس کا سدباب	70/-
نظر کی کمزوری اور اس کا سدباب	30/-
خوف و شرم اور اس کا سدباب	50/-
دست شناسی کے نئے رخ	60/-
تحریر اور شخصیت	30/-
مسائل اور حل	50/-
باخبری	40/-
چھ حیرت انگیز علوم	40/-
احساس کمتری	45/-
کامیابی	40/-
سگریٹ نوشی چھوڑئیے	40/-
کراٹے	70/-
یوگا (زیر طبع)	250/-

سرگزشت

آل ٹائم گریٹ کرکٹرز (1)	250/-
آل ٹائم گریٹ کرکٹرز (2)	250/-

ادب

شہر یارانِ ادب (مشہور نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی)	200/-
خدایانِ سخن (مشہور شعراء کے حالاتِ زندگی)	200/-

موسیقی

ابجد موسیقی (موسیقی سیکھنے کے لیے بہترین کتاب)	200/-
سرسنگ گیت (مشہور فلمی گانوں کی نوٹیشن)	225/-

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5804300-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

- کتابوں کی قیمت اور ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر/ کراسڈ چیک یا بینک ڈرافٹ اس پتہ پر روانہ کریں۔
  (کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس 23 رمضان چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200)
- منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتا اور کتابوں کے نام ضرور لکھیں ورنہ تاخیر کے ہم ذمے دار نہ ہوں گے۔
- ڈاک خرچ (اندرون ملک) ایک کتاب کا -/31 روپے دو کتابوں کا -/33 روپے 3 تا 5 کتابوں کا -/37 روپے ہوگا۔
- کسی قسم کی نقد رقم لفافے میں ڈال کر ہرگز مت بھیجیں ورنہ ہمیں نہیں ملے گی اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی خط و کتابت کی جا سکے گی۔
- کتب بذریعہ وی پی بھی ارسال کی جاتی ہیں
- فہرست میں درج قیمتیں موجودہ ہیں اور کسی بھی وقت ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ کتاب کی قیمت وہی لی جائے گی جو کتاب پر چھپی ہوئی ہوگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ اگرچہ وہ آپ کے آدمیوں سے چھوٹ کر بھاگ گیا ہے لیکن اس سے یہ تو ثابت ہو گیا ہے کہ آپ کی لڑکی کو اٹھانے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے۔"

سرمد معنی خیز نظروں سے صوبی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جی جناب! آپ کی لڑکی بہت کم عمر اور معصوم ہے۔ یقیناً ان لوگوں نے اسے ورغلایا ہوگا۔"

اس نے فون بند کر کے صوبی کے منہ سے ٹیپ اتار دیا اور بولا۔ "تم نے سنا، میں تمہارے باپ سے بات کر رہا تھا۔ اکرم موجی سے... جو اس شہر کا ایک بڑا بدمعاش ہے... ہے نا۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "کاش کہ میں تمہیں سنا سکتا کہ دوسروں کے لیے دل میں ذرا سا رحم نہ رکھنے والا شخص اپنی بیٹی اور اس کی عزت کے لیے کس طرح بلک رہا تھا۔"

صوبی رونے لگی۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے... پتا ہے... بابا اچھے آدمی... نہیں ہیں۔ لیکن... میں نے... کیا کیا... ہے؟"

سرمد نے اس کے ریشمی بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ "تمہارا قصور یہ ہے کہ تم اس کی بیٹی ہو۔"

صوبی کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ "بابا نے... تمہارا... کیا... بگاڑا ہے۔"

"اس کی وجہ سے میرا باپ مارا گیا۔" سرمد نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیے۔ صوبی کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ "اس نے اپنے معمولی سے مفاد کے لیے میرے باپ کو قربان کر دیا۔ اسے مارنے والا رشید بلا تھا۔"

صوبی کراہنے لگی۔ "تو... تم ہم سے بدلہ... لے رہے ہو؟"

"ابھی تو آغاز ہے، ابھی بدلہ لینا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے دوبارہ صوبی کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا اور موبائل نکال کر اس سے دور چلا گیا لیکن وہ لاؤنج میں ہی رہا تھا۔ اس نے پھر کسی کا نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر پوچھا۔ "جناب، میں بات کر رہا ہوں... میں کون ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے جناب۔ یوں سمجھ لیں کہ میں آپ کا ہمدرد ہوں... مجید کا پتا چلا..."

دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "مجھے یقین ہے وہ اکرم کے قبضے میں ہے۔ میں نے خود اسے اکرم کے آدمیوں کے قبضے میں دیکھا ہے۔ آج صبح وہ اسے کہیں لے جا رہے تھے۔ اگر آپ نے جلد کوئی کارروائی نہیں کی تو وہ اسے مار کر کہیں دفنا دیں گے اور اس کے بعد آپ بھی اسے نہیں دیکھ سکیں گے... جناب! آپ مجھے کیوں ستا رہے ہیں۔ میں تو آپ کا ہمدرد ہوں۔ اب دیر مت کریں، اس سے پہلے کہ اکرم اپنا کام کر گزرے۔"

سرمد نے فون بند کر کے ایک بار پھر صوبی کے منہ سے ٹیپ اتارا۔ وہ بولی۔ "تم میرے اور جوجی کے باپ کو لڑانا چاہ رہے ہو؟"

وہ مسکرایا۔ "تم کم عمری میں سمجھ دار ہو گئی ہو۔ ہاں، آج کے دن اس شہر میں بڑا خون خرابا ہوگا اور شام تک رشید یا اکرم میں سے ایک مارا جائے گا اور دوسرا زندہ رہے گا۔ مرنے والا فائدے میں رہے گا کہ وہ کم سے کم اپنی اولاد کا دکھ نہیں دیکھے گا۔" یہ کہتے ہوئے سرمد کا لہجہ سفاک ہو گیا۔

صوبی اپنے باپ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "بابا غصے میں آ جائیں تو..."

"تو زمین آسمان ہل جاتے ہیں۔" سرمد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہی تو میں چاہتا ہوں۔"

صوبی اب اس کی نظروں سے خوف سا محسوس کر رہی تھی۔ وہ کسمسائی۔ "تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟"

"اگر تمہارا باپ کل صبح تک زندہ رہا تو جلد وہ تمہیں دیکھ لے گا اور جس حال میں دیکھے گا، اس کی خواہش ہوگی کہ کاش وہ دیکھنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔" سرمد کا لہجہ بھی خوفناک ہو گیا تھا۔

صوبی سہم گئی۔ "بابا تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔"

سرمد ہنسا۔ "اسے میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم اور تمہیں بھی نہیں معلوم ہے اور ہاں، تم میرے بارے میں اسے جو بتانا چاہو بتا سکتی ہو۔"

صوبی ہمت کر رہی تھی۔ اس نے سرمد کو دھمکایا۔ "تم بچ نہیں سکو گے، تم بابا کو جانتے نہیں ہو۔"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" سرمد نے حقارت سے کہا۔ "میں تمہیں چھوڑ کر اسے چیلنج دوں گا کہ مجھے تلاش کر سکتا ہے تو کر لے۔ ویسے اگر وہ بچ بھی گیا تو اس کے پاس سوائے خودکشی کے اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔"

سرمد یا شفقت اس وقت جس انداز میں بات کر رہا تھا، اندر سے وہ اتنا مضبوط نہیں تھا۔ اکرم کے آدمیوں کے پاس سے جوجی کے فرار کی خبر نے اسے اندر سے ہلا دیا تھا۔ اس کا منصوبہ ادھورا رہ جاتا اگر جوجی ہاتھ نہیں آتا۔ واحد اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ جوجی اب تک واپس اپنے باپ کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ اسے حیرت تھی جوجی کو فرار ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ اب تک اپنے باپ تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کا

مطلب تھا کہ وہ اپنے باپ سے بھی خوف زدہ ہے اور واپس جانا نہیں چاہتا۔ وہ یقیناً فلیٹ کی طرف گیا ہوگا لیکن اب اسے وہاں سرمد یا صوبی کوئی نہیں ملتا۔ وہ وہاں سے کہیں اور چلا گیا ہوگا لیکن وہ کہاں تھا؟ شاید وہ اسے اور صوبی کو تلاش کر رہا تھا لیکن وہ کبھی ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

☆☆☆

مستری رفیق کے پاس جانے سے پہلے ان میں مختصر سی بحث ہوئی۔ شامی کا خیال تھا کہ اب انہیں اس کیس سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اب معاملہ مع جوجی کے اس کے والد کے سپرد کر دیا جائے کیونکہ اگلا مرحلہ خطرناک اور جان جوکھم والا ہو سکتا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ شفقت ایک مجرم تھا اور اس نے صوبی کو اغوا کر کے ایک سنگین جرم کا ارتکاب بھی کر دیا تھا۔ اس قسم کے مجرموں سے نمٹنا ان کا کام نہیں تھا۔ یہ پولیس کا کام تھا بلکہ رشید بلا خود اس سے نمٹ سکتا تھا اور معاملہ بھی اس کا تھا اس لیے انہیں یہیں سے واپس وقار ولا کا رخ کرنا چاہیے لیکن تیمور سے پہلے جوجی نے اس تجویز سے انکار کر دیا۔

"میں کسی صورت اباجی کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

"دیکھو یار! وہ تمہارے اباجی ہیں اور یقیناً اتنے ظالم بھی نہیں ہوں گے جتنا تم ان کو سمجھتے ہو۔" شامی نے اسے سمجھایا۔

"وہ اس سے زیادہ ظالم ہیں جتنا آپ انہیں سمجھتے ہیں۔ وہ میری کھال تو ادھیڑیں گے لیکن صوبی کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ وہ اس ذلیل کے قبضے میں رہ جائے گی۔" جوجی نے اپنا اصل مسئلہ بیان کیا۔ "مجھے صوبی کی فکر ہے۔ اگر آپ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو ٹھیک ہے، میں خود صوبی کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"تم کیسے کرو گے؟" شامی نے پوچھا تو وہ جھنجلا گیا۔

"بس کر لوں گا کسی طرح۔"

"یار! اس کی مدد کرنا ہی پڑے گی۔" شامی نے اب تیمور کی طرف دیکھا۔ "ورنہ یہ گلیوں میں لیلیٰ... لیلیٰ چلاتا پھرے گا... نئے دور کا مجنوں۔"

"میں مجنوں نہیں ہوں جی۔" جوجی نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے عقل آ گئی ہے۔ میں نے اور صوبی نے گھر سے بھاگ کر غلطی کی ہے۔ لیکن مجھے اسے تلاش کر کے اس کے گھر واپس پہنچانا ہے۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ میں ہی اسے بھگا کر لایا ہوں۔"

"بچہ تو سمجھ دار ہو گیا ہے۔" شامی ہنسا۔ "کاش اتنی جلدی عقل مجھے بھی آ جاتی تو آج نوشی نامی بلا میرے گلے نہ پڑی ہوتی۔"

وہ رفیق مستری کی دکان پر آئے۔ دکان مین روڈ پر تھی، اسے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ رفیق مستری تقریباً تیس سال کا دبلا پتلا آدمی تھا اور صورت سے ہی چالاک نظر آتا تھا۔ یہاں بھی شامی اور تیمور نے وہی حربہ استعمال کیا اور جوجی کو گرفتار ظاہر کر کے خود ایجنسی والے بن گئے۔ جب شامی نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو رفیق مستری ڈر گیا۔ "میرا قصور جناب؟"

"قصور کا بھی پتا چل جائے گا۔" شامی درشت لہجے میں بولا۔ "دہشت گردوں کی گاڑیاں ٹھیک کرتے ہو، ان کی مدد کرتے ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے جی... الزام ہے۔ کسی ماں کے یار..."

شامی نے اسے تھپڑ مارا۔ "بک بک بند کرو۔ ہمارے پاس پوری رپورٹ ہے۔"

"تم شفقت کو جانتے ہو؟" تیمور نے پوچھا۔

"جی جانتا ہوں۔" وہ گال سہلاتے ہوئے بولا۔

"تم نے حال ہی میں اس کی گاڑی ٹھیک کی ہے؟"

"جی کی ہے، پر کسی کی گاڑی ٹھیک کرنا کوئی جرم تو..."

شامی نے اسے ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ "جتنا سوال کیا جائے اتنا جواب دو۔"

"جی اچھا۔" اس نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ شامی کے رویّے سے اسے یقین آ گیا تھا کہ وہ ایجنسی والے ہی ہیں۔

"شفقت کہاں رہتا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم جناب۔" اس نے جتنی تیزی سے انکار کیا تھا، اس سے صاف جھلک رہا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ شامی نے اس کی گردن پکڑ لی۔

"لگتا ہے تم اس طرح نہیں مانو گے۔ اب ہمارے ساتھ چلو گے اور جب الٹا لٹکو گے تو تمہیں سب یاد آ جائے گا۔"

وہ بلبلایا۔ "آپ مجھے بے قصور لے جا رہے ہیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ شفقت ایک دہشت گرد ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی دہشت گردی کی وارداتوں میں ملوث ہیں۔ کئی پکڑے گئے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے۔" تیمور نے جوجی کی طرف اشارہ کیا۔ "تم نے اعتراف کیا ہے کہ تم نے شفقت کی گاڑی ٹھیک کی ہے، یعنی تم اس کے لیے کام کرتے ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے فوراً انکار کیا۔ ”نہیں جی، میں نے صرف گاڑی ٹھیک کی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم۔“

”اس نے گاڑی کب دی تھی؟“

”ایک ہفتہ پہلے؟“

”اور لے کر کب گیا؟“

”کل ہی لے گیا ہے۔“ اس نے پھر جھوٹ بولا۔ جھوٹ بولتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک طرح کی عجلت آجاتی تھی۔

”جھوٹ... وہ گاڑی لینے نہیں آیا تھا بلکہ تم اسے گاڑی دینے گئے تھے۔“ تیمور نے کہا۔ شامی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

”کس وقت آیا تھا؟“

”صبح دس بجے۔“ اس نے جواب دیا تو تیمور نے جو جی کی طرف دیکھا۔

”کیوں برخوردار! یہ سچ کہہ رہا ہے؟“

”جھوٹ۔“ جو جی بے ساختہ بولا۔ ”وہ گیارہ بجے تک میرے ساتھ تھا۔ یہ جھوٹ بولتا ہے جی۔“

شامی نے رفیق کو دکان سے باہر دھکا دیا۔ اس کے دو کم عمر شاگرد سہمی ہوئی نظروں سے ان کو دیکھ رہے تھے لیکن انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ رفیق پھر بلبلانے لگا اور دہائیاں دینے لگا کہ وہ بے قصور ہے۔ لیکن شامی اور تیمور اسے دھکیلتے ہوئے گاڑی تک لائے۔ ساتھ ہی وہ اسے ڈرا دھمکا بھی رہے تھے۔ شامی نے کہا۔ ”تم نے ابھی تک سنا ہوگا کہ ایجنسی والے کس طرح تفتیش کرتے ہیں۔ آج تم دیکھ لو گے اور پھر تمہیں پولیس والے بھی رحم دل لگیں گے۔“

جب انہوں نے رفیق کو گاڑی میں بٹھانا چاہا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ”اچھا جی بتاتا ہوں لیکن آپ مجھے لے کر نہیں جاؤ گے؟“

”اگر تم شفقت کا پتا بتا دو تو ہم تمہیں گرفتار نہیں کریں گے۔“ شامی نے اسے یقین دلایا۔

”اس نے مجھے بارہ کہو میں ایک جگہ کا پتا بتایا تھا۔ میں نے گاڑی وہاں پہنچا دی تھی۔ شفقت مجھے کام کے پیسے دے چکا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں گاڑی وہاں مکان کے سامنے کھڑی کر دوں۔ جب میں گاڑی وہاں کھڑی کرنے گیا تو وہاں کوئی نہیں تھا لیکن اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس بارے میں کسی کو بتایا تو میرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔“

”تم نے چابی کس کے حوالے کی تھی؟“ شامی نے پوچھا۔

”میں نے چابی اندر ہی ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دی تھی۔ شفقت کے پاس ڈپلی کیٹ ہے۔“

”پھر تم وہاں سے آگئے؟“

”جی جناب اور اس کے بعد شفقت میرے پاس نہیں آیا۔“

”وہ آئے گا بھی نہیں۔“ شامی نے یقین سے کہا۔ ”وہ ہم سے چھپتا پھر رہا ہے لیکن جیسے اس کے دوسرے ساتھی پکڑے گئے ہیں، جلد وہ بھی پکڑا جائے گا۔“

”آپ اب تو مجھے نہیں لے جائیں گے نا؟“ رفیق مستری نے امید سے کہا۔ اسے یقین آگیا تھا کہ شامی اور تیمور کسی خفیہ ایجنسی کے اہلکار ہیں۔

”نہیں، ساتھ تو چلنا پڑے گا۔“ تیمور نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ وہ چلا اٹھا۔

”تم چل کر ہمیں شفقت کا وہ ٹھکانا دکھاؤ گے جہاں تم نے اس کی گاڑی چھوڑی تھی۔“

”اس کے بعد تم جانے کے لیے آزاد ہو گے۔“ شامی نے کہا۔ ”ورنہ وہاں پہنچ کر پتا چلے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے اور یہاں سے بھی غائب ہو گئے تو پھر شفقت کے ساتھ تمہیں بھی تلاش کرنا پڑے گا۔“

”آسان کام یہ ہے کہ تمہیں لے جائیں اور شفقت کا ٹھکانا دیکھ لیں۔“

رفیق مستری ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا لیکن مجبوراً اسے گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔

☆☆☆

رشید بلا کا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا۔ اس کا باپ ان اولین سرکاری ملازمین میں سے ایک تھا جنہیں دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل کیے جانے کے بعد یہاں بھیجا گیا تھا۔ وہ کلرک کی سطح کا آدمی تھا اور آفس سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہوا تھا۔ اسے شعر و شاعری کا شوق بھی تھا اور کبھی کبھار وہ مشاعروں میں بھی چلا جاتا تھا۔ اس کے دو بڑے بیٹے اسی کی طرح شریف اور لکھنے پڑھنے والے تھے لیکن رشید کی صحبت اسکول کے زمانے سے بگڑ گئی تھی۔ اس نے جیسے تیسے اسکول پاس کیا اور اس کے بعد آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت وہ صرف سترہ سال کا تھا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا لیکن اس کے پاس ہمیشہ رقم موجود ہوتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔

یہ بات اس کے باپ معین الدین سے چھپی نہیں رہی اور جلد اسے معلوم ہو گیا کہ رشید ایک ایسے گروہ میں شامل ہے جو چوریاں کرتا ہے۔ معین الدین کے لیے یہ بڑا صدمہ تھا۔ اس نے ساری زندگی میں کبھی ایک روپیا حرام کا نہیں کمایا تھا اور آج اس کا بیٹا حرام کھا رہا تھا۔ اس نے رشید کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اب سدھرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا اور مار پیٹ اس پر بے اثر تھی۔ اس سے پہلے کہ معین الدین اسے گھر سے نکالتا، وہ خود گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

چوری سے ترقی کر کے اس نے ڈاکا زنی کے کاروبار میں قدم رکھا مگر اس کی ترقی کا اصل سفر افغان جنگ سے شروع ہوا۔ اس نے اسلحے اور منشیات کی اسمگلنگ میں بے تحاشا کمائی کی اور اس کا شمار شہر کے چند نامی گرامی افراد میں ہونے لگا۔ لوگ اس کے منہ پر کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے لیکن پیٹھ پیچھے اسے ہمیشہ رشید بلا کہہ کر پکارا جاتا۔ اس نے دولت اور طاقت کے بل بوتے پر شہر کا بڑا حصہ اپنے کنٹرول میں کر لیا۔ اس حصے سے اس کے آدمی بھتا وصول کرتے تھے اور ماہانہ کروڑوں کی اس رقم میں اوپر والوں کا حصہ بھی ہوتا تھا۔ اس وجہ سے رشید بلا کا کام بلا خوف و خطر جاری تھا۔ اگر کبھی کوئی مسئلہ سامنے آتا تو اوپر والے اسے حل کر دیتے تھے۔

رشید بلا کے لیے ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ اکرم موجی تھا۔ اکرم موجی اس کا حریف تھا۔ وہ خاندانی بدمعاش تھا۔ پہلے وہ میانوالی کے علاقے میں ہوتا تھا لیکن پھر اپنے گروہ سمیت راولپنڈی آگیا اور یہاں اس نے رفتہ رفتہ ہاتھ پاؤں پھیلاتے ہوئے رشید بلا کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اسے بعض سیاست دانوں کی سرپرستی حاصل تھی اور اسی وجہ سے اس نے تیزی سے ترقی کی۔ طاقت میں وہ کسی طرح رشید بلا سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک ان کی ٹکر برابر کی رہی تھی۔ شروع میں دونوں میں خوں ریز جھڑپیں ہوئیں مگر کچھ عرصے سے انہوں نے ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی پالیسی اپنائی ہوئی تھی۔

مگر یہ پالیسی اس وقت ختم ہو گئی جب رشید بلا کا اکلوتا بیٹا مجید عرف جو جی گھر سے غائب پایا گیا۔ وہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن وہ کالج پہنچا ہی نہیں۔ جب وہ گھر واپس نہیں آیا تو اس کی ماں نے رشید کو اطلاع دی اور اس نے اپنے آدمی دوڑا دیے تھے۔ رشید اپنے گھر اور کاروبار کو بالکل الگ الگ رکھتا تھا۔ اس نے ایک عام سی عورت سے شادی کر رکھی تھی اور اپنے گھر کا ماحول بھی الگ رکھا تھا۔ گھر میں وہ رشید الدین ہوتا تھا۔ باپ کی زندگی میں اس کا سب نے بائیکاٹ کر رکھا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ سب کا رشید بلا سے ملنا جلنا ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ جو جی کی ماں بھی تھی جس نے جو جی کی پرورش بھی مختلف انداز سے کی تھی اور اس پر باپ کی شخصیت کا سایہ نہیں پڑنے دیا تھا۔ شاید خود رشید بلا بھی یہی چاہتا تھا۔ جو جی عام بچوں کی طرح اسکول اور پھر کالج جاتا تھا اور بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ رشید بلا کا بیٹا ہے۔ وہ خود بھی دوسروں سے کم گھلتا ملتا تھا۔ کم سے کم اس کے ماں باپ نے اس کا کوئی دوست نہیں دیکھا تھا۔

رشید بلا کے آدمیوں نے بتایا کہ وہ کالج پہنچا ہی نہیں ہے۔ شام تک اسے تمام اسپتالوں اور مردہ خانوں میں دیکھ لیا گیا۔ اس روز کسی حادثے یا مرڈر میں کوئی ایسی لاش نہیں آئی تھی جو جو جی جتنی عمر کے لڑکے کی ہو۔ اب ایک ہی وجہ رشید بلا کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اسے اکرم موجی پر شک ہو رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے رابطہ کرتا، اسے اپنے موبائل پر ایک نامعلوم نمبر سے کال آئی۔ دوسری طرف سے کوئی مرد بات کر رہا تھا۔

”رشید صاحب! میں آپ کا ایک ہمدرد بات کر رہا ہوں۔“

”بولو۔“ رشید بلا نے کہا۔ ”لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بھی نہیں؟“ اس آدمی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”تم... تم کون ہو۔ مجید کے بارے میں جانتے ہو؟“ رشید بلا بے چین ہو گیا۔

”جی جناب! اسی لیے تو جان پر کھیل کر کال کر رہا ہوں۔ اگر اکرم موجی کو پتا چل جائے تو وہ میرے ٹکڑے کر دے۔“

”اکرم کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”اسی نے تو مجید کو اغوا کرایا ہے۔ وہ اس وقت اسی کے قبضے میں ہے۔“

”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟“

”ثبوت بھی کچھ دیر میں مل جائے گا۔ اس کے آدمی آپ کے علاقے میں گھسنے کی کوشش کریں گے۔“ اس آدمی نے ایک علاقے کا نام لیا۔ ”آپ وہاں موجود اپنے آدمیوں

کو ہوشیار کردیں۔"

اس آدمی نے کال منقطع کردی۔ رشید بلا نے نمبر دیکھا، یہ بھی موبائل نمبر تھا۔ اس نے پہلے اپنے ایک نائب سے رابطہ کیا۔ یہ اسی علاقے کا نگران تھا اور اسے ہدایت کی کہ اگر اکرم موجی کے آدمی علاقے میں نظر آئیں تو ان کو گھیر کر پکڑ لیا جائے۔ نائب کو حیرت ہوئی کیونکہ اکثر وہ لوگ ان کے علاقے میں آجاتے تھے، جیسے یہ کسی کام سے ان کے علاقے میں چلے جاتے تھے۔ اس نے رشید بلا سے پوچھا۔

"بے شک وہ کسی کام سے بھی آئے ہوں؟"

"تو میں اور کیا کہہ رہا ہوں۔" رشید بلا غرایا۔ "کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔ اگر پکڑ نہ سکو تو اڑا دینا۔"

"لیکن استاد وجہ کیا ہے؟"

"میرا بیٹا مجید غائب ہے اور مجھے شک ہے کہ اس میں اکرم کا ہاتھ ہے۔"

"مجید غائب ہے؟" نائب نے حیرت سے کہا۔ "آپ نے بتایا نہیں، ہم اسے تلاش کرتے۔"

رشید نے اپنے کچھ خاص آدمیوں کو ہی مجید کی گمشدگی سے آگاہ کیا تھا۔ "میں اب تک شک میں تھا کہ وہ خود کہیں گیا ہے۔"

کچھ دیر بعد رشید بلا کو اطلاع ملی کہ اکرم موجی کے آدمیوں نے اس کے علاقے میں گھسنے کی کوشش کی۔ شدید فائرنگ کے بعد وہ پسپا ہوگئے۔ دونوں کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن دو بے گناہ راہ گیر مارے گئے۔ نائب معافی مانگ رہا تھا کہ وہ کسی کو نہیں پکڑ سکا۔ رشید بلا کی پریشانی بڑھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اب جنگ کھل گئی ہے اور اکرم اس کے خلاف کارروائی کرے گا۔ اس کی مجبوری ہوگی کیونکہ اس کا بیٹا اکرم کے قبضے میں تھا۔ اتنا تو رشید کو اطمینان تھا کہ وہ بلاوجہ اسے کوئی جانی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس نے کسی مقصد کے تحت جوجی کو اغوا کیا تھا۔ رشید بلا نے اپنے سارے آدمیوں کو حکم جاری کردیا کہ وہ مکمل تیاری کی حالت میں پورے علاقے میں پھیل جائیں اور اس کا حکم ملتے ہی حرکت میں آجائیں۔

☆☆☆

اکرم موجی کا غصے سے بُرا حال تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ اکرم کی سب سے چھوٹی بیٹی صاحبہ گھر سے غائب تھی۔ وہ ایک ڈرائیور کے ساتھ کالج جاتی تھی جو اسے کالج کے گیٹ پر اتار کر چلا جاتا تھا۔ اس روز بھی اس نے ایسا ہی کیا اور اسے پتا نہیں چلا کہ اس کے جاتے ہی صاحبہ گیٹ سے باہر آگئی جہاں کچھ دور جوجی اس کا منتظر تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ یہ بات اکرم موجی کو کچھ دیر پہلے ایک نامعلوم شخص نے کال کرکے بتائی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس سازش میں رشید بلا شامل ہے اور اس کے کہنے پر اس کے بیٹے مجید عرف جوجی نے صاحبہ کو اپنے جال میں پھنسایا اور گھر سے بھاگنے پر اکسایا۔ یہ بات بھی جلد سامنے آگئی کہ صاحبہ کی ماں کا سارا زیور غائب ہے اور وہ بیٹی سے زیادہ زیور کا ماتم کررہی تھی۔

"چپ کرجا۔" اکرم موجی نے دہاڑ کر بیوی سے کہا۔ "تجھے زیور کی پڑی ہے، بیٹی کا ہوش نہیں ہے۔"

"تمہیں بھی تو اپنی ناک کی پڑی ہے۔ ابھی بیٹی آجائے تو شاید اسے قتل ہی کردو۔" بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ثابت کردیا، ہم ہوئے کہ تم ہوئے یا میر ہوئے، بیوی کے سامنے سب ہی ذلیل ہوئے۔

اکرم موجی نے دانت پیسے۔ "دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ وہ کم بخت سامنے آجائے تو ٹکڑے کردوں۔"

"بس بدمعاشی شروع کردی۔ یہ نہیں کہ اسے تلاش کرو، اس سے پہلے کہ سارے زمانے میں شہرت ہوجائے۔"

"کیسے تلاش کروں؟" اکرم موجی تلملایا۔ "اپنے آدمیوں سے کہوں کہ بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے، اسے تلاش کرو۔ کیا عزت رہ جائے گی میری ان کے سامنے؟ ابھی تو سر اٹھاتے ہوئے بھی کانپتے ہیں۔"

"تم رشید بلا کے خلاف کچھ کرو۔" بیوی نے مشورہ دیا۔ "اس کے ہوش ٹھکانے لگاؤ۔ ہمارے گھر کو آگ لگا کر وہ کیوں سکون سے بیٹھے۔"

اکرم موجی نے سوچا تو اسے بیوی کا مشورہ مناسب لگا اور اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ رشید بلا کے علاقے میں گھس کر کارروائی کریں۔ اس دوران میں اس نامعلوم آدمی کا فون آگیا اور اس نے اکرم موجی سے پوچھا کہ اس نے اب تک رشید بلا کے خلاف کارروائی کی۔ اکرم موجی نے اسے بتایا کہ فلاں علاقے میں کچھ دیر میں اس کے آدمی کارروائی کریں گے۔ اس آدمی نے اسے خبردار کیا۔ "رشید بلا نے بھی اپنے آدمیوں کو چوکنا کردیا ہے۔ میں پتا لگانے کی کوشش کررہا ہوں کہ آپ کی بیٹی اور مجید کہاں ہیں کیونکہ وہ رشید کے گھر یا اس کے کسی ٹھکانے پر نہیں ہیں۔"

کچھ دیر بعد اسے اطلاع مل گئی کہ جیسے ہی اس کے آدمی رشید بلا کے علاقے میں داخل ہوئے، انہیں گھیر لیا گیا اور شدید فائرنگ کے بعد وہ وہاں سے نکل آنے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے دو آدمی زخمی ہوئے تھے۔ اکرم موجی کا غصہ یہ سن کر مزید بڑھ گیا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"لگتا ہے مجھے اس کے گھر پر چڑھائی کرنا پڑے گی۔"

"ایسا مت سوچنا۔" وہ ڈر گئی۔ "ہماری بیٹی اس کے قبضے میں ہے۔"

"جہنم میں گئی ایسی بیٹی جسے ماں باپ کی عزت کی پروا بھی نہ ہو۔" اکرم موجی نے گرج کر کہا۔ "میں آج رات ہی اس کے گھر کو آگ لگادوں گا۔"

بیوی اسے بھڑکانے کے بعد اب ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ "دیکھو، کوئی ایسا کام مت کرو جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔ تم ایک بار اس سے بات کرکے دیکھو۔"

"بکومت۔" اکرم موجی بھڑک گیا۔ "میں اس سے بات کروں، اس کے آگے جھک جاؤں؟"

"ابھی تم مجبور ہو اس لیے بات کرلو۔ ایک بار بیٹی واپس آجائے تو جو دل چاہے کرتے رہنا۔"

اس بار بات اکرم موجی کے دل کو لگی۔ وہ ذرا موٹے دماغ کا آدمی تھا۔ اس کی خوش قسمتی کہ اسے ساتھی بہت وفادار ملے تھے اور دوسرے اسے میانوالی کے ایک طاقت ور سیاسی خاندان کی حمایت حاصل تھی کیونکہ وہ الیکشن کے دنوں میں ان کے بہت کام آتا تھا۔ اس وجہ سے وہ راولپنڈی میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے پاس رشید بلا کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے اپنے ایک مشترکہ جاننے والے سے بات کی اور اس سے رشید بلا کا نمبر حاصل کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کال کرتا، اسے خود رشید بلا کی کال آگئی۔ وہ اس کا نام سنتے ہی غرانے لگا۔

"رشید! تیری یہ جراٴت ہوگئی ہے لگتا ہے تُو امن سے رہنا نہیں چاہتا۔"

"امن سے میں رہنا نہیں چاہتا یا تجھے کیڑے نے کاٹا ہے۔" رشید بلا نے پھنکار کر کہا۔ "تو کیا سمجھتا ہے، میرے بیٹے کو غائب کرکے تُو سکون سے رہ سکے گا؟"

"اچھا، اب تُو مجھ پر الزام لگائے گا۔" اکرم موجی نے طنز کیا۔ "کیا اس طرح تُو اور تیرا بیٹا خود کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ لعنت ہو تم دونوں پر، تم سے تو ہیجڑے اچھے ہوتے ہیں۔"

"بکواس نہ کر۔" رشید بلا بھڑک کر بولا۔ "اگر میرے بیٹے کو ذرا بھی نقصان ہوا تو میں پورے شہر کو آگ لگادوں گا۔"

"رشید! میں تجھے کال کرنے والا تھا۔ یہ ڈراما بند کر اور میری بیٹی واپس کردے ورنہ میں تم دونوں باپ بیٹے کو ایک ہی قبر میں دفن کردوں گا۔"

رشید بلا کو جھٹکا لگا۔ "بیٹی... کون سی بیٹی، کیا بکواس کررہا ہے؟"

"میری بیٹی کو تیرا بیٹا ورغلا کر لے گیا ہے۔ اگر وہ صبح سے پہلے واپس نہ آئی تو میں تم دونوں کو چھوڑوں گا نہیں۔"

"اب تُو اپنے کرتوت چھپانے کے لیے جھوٹ بولے گا۔" رشید بلا کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔ "تُو خاندانی بدمعاش ہے، کم سے کم اسی کی لاج رکھ لے۔"

اکرم موجی بھی بھڑک گیا۔ "تُو کیا سمجھتا ہے، میں تیری طرح گھٹیا ہوں جو بیٹی کا نام لوں گا۔ میری بیٹی غائب ہے اور میں نے معلوم کرایا ہے۔ وہ کالج سے تیرے بیٹے کے ساتھ نکلی ہے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تیرا بیٹا بھی اسی کالج میں پڑھتا ہے۔"

چند منٹ تک دونوں میں تند و تیز جملوں اور دھمکیوں کا تبادلہ ہوا اور دونوں کا خیال تھا کہ دوسرا اسے دھوکا دے رہا ہے۔ بہرحال بات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی۔ فون بند کرتے وقت انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب دوسرے کو نہیں بخشنا ہے۔ وہ دونوں باپ تھے لیکن ان کی بدمعاش والی انا ان کے لیے اولاد سے بڑھ کر تھی اس لیے اب وہ بہرصورت فریقِ ثانی کو نیچا دکھانا چاہتے تھے، چاہے اس کے لیے انہیں اپنی اولاد کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ فون بند کرکے اکرم موجی نے اپنے آدمیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کل کا دن رشید بلا کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ چاہے اس کے گھر پر حملہ کرکے اسے تباہ کرنا پڑے۔ اسے اطلاع مل رہی تھی کہ رشید بلا کے آدمی بھی مکمل تیاری کی حالت میں اپنے علاقوں میں گشت کررہے ہیں اور کوئی بھی تصادم خوں ریز ثابت ہوسکتا ہے۔ علاقے کے لوگ بھی صورتِ حال بھانپتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ بازار اور دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ پولیس بھی معاملے کی نوعیت دیکھ کر تھانوں میں چلی گئی تھی اور پولیس کے اعلیٰ افسران دونوں فریقوں سے رابطے کی کوشش میں لگے تھے۔ کسی بھی ہنگامہ آرائی کی صورت میں ان کی ملازمتوں پر بن آتی اور دوسرے اس سے ان کی آمدنی بھی متاثر ہوتی۔ مگر رشید بلا اور اکرم موجی ان کی کالز ریسیو نہیں کررہے تھے۔

صبح کے وقت اکرم موجی کو اسی نامعلوم شخص کا فون آیا۔ اب اسے اس شخص پر اعتماد ہو چلا تھا۔ اس کی بتائی ہوئی تمام باتیں درست ثابت ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔ "دیکھا جناب! میری بات درست نکلی نا... یہ سارا رشید اور اس کے پلّے کا کام ہے۔"

"میں اسے چھوڑوں گا نہیں، وہ الٹا مجھ پر الزام لگا رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ میں نے اس کے بیٹے کو اغوا کرایا ہے۔"

"بکواس کرتا ہے۔ اس طرح اپنے جرم پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ آپ کے لیے اچھی خبر ہے۔ میں نے اس جگہ کا سراغ لگا لیا ہے جہاں رشید نے مجید اور آپ کی بیٹی کو چھپا رکھا ہے۔ میں اسی طرف جا رہا ہوں۔ کچھ دیر میں تصدیق کر کے آپ کو فون کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کال منقطع کر دی۔ اکرم موجی اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اس نے اب تک اپنی شناخت بتانے سے انکار کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی شناخت سامنے آگئی تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے مہربانی کر کے اس کی شناخت پر اصرار نہ کیا جائے۔ تقریباً بیس منٹ بعد اس نے اکرم موجی کو دوبارہ کال کی اور پُرجوش لہجے میں بولا۔

"جناب! میں نے مجید کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ اس وقت باہر گھوم رہا ہے۔ آپ فوراً اپنے آدمیوں کو بھیجیں، وہ اسے آرام سے اٹھا سکتے ہیں۔"

"اس کے ساتھ کوئی اور ہے؟"

"نہیں جناب... کوئی نہیں۔" نامعلوم شخص نے کہا۔

"حیرت ہے اکیلا گھوم رہا ہے۔"

اس نے اکرم کو علاقے کے بارے میں بتایا اور اس نے فوری طور پر اپنے آدمیوں کو وہاں پہنچنے اور مجید کو اٹھا کر لانے کا حکم دیا۔ اس کے دو تجربے کار آدمی فوری طور پر روانہ ہو گئے۔ اکرم موجی کے لیے اپنے جوش پر قابو پانا محال ہو رہا تھا کیونکہ ایک بار رشید کا بیٹا اس کے ہاتھ آ جاتا تو وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا مگر آدھے گھنٹے بعد ہی اس کے جوش کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی، جب اس کے آدمیوں نے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ مجید ان کے قابو میں آنے کے بعد ایک سگنل پر ان کی گرفت سے نکل کر بھاگ گیا ہے۔ اکرم موجی غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے اپنے آدمیوں کو بے نقط سناتے ہوئے حکم دیا کہ وہ ہر صورت مجید کو تلاش کریں ورنہ وہ انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دے گا۔ اس نے اپنے دوسرے آدمیوں کو بھی اس علاقے میں پہنچنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم دیا کہ اگر مجید نظر آ جائے اور ان کے قابو میں نہ آئے تو وہ اسے قتل کر دیں۔ کوئی تین گھنٹے بعد اس کے کچھ آدمیوں نے مجید کو دیکھ لیا اور انہوں نے اکرم موجی کو اطلاع دی۔

"جناب! ہم نے اسے دیکھ لیا ہے لیکن وہ دو آدمیوں کے ساتھ ہے۔ وہ ایک گاڑی میں جا رہے ہیں۔"

"ان کا پیچھا کرو اور مجید کو پکڑ لو۔" اکرم موجی نے حکم دیا۔ "اب یہ ہاتھ سے نکلا تو تم سب کو زندہ دفن کر دوں گا۔"

"آپ فکر نہ کریں، وہ بچ کر نہیں جا سکتے۔" اکرم موجی کے آدمی نے یقین سے کہا۔ "میں نے دوسروں کو بلا لیا ہے۔ بندہ کچھ دیر میں آپ کے سامنے ہوگا۔"

اکرم موجی یہ سن کر دوبارہ سے پُرجوش ہو گیا کہ اس کے آدمیوں نے مجید کو ڈھونڈ نکالا ہے لیکن اس بار وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا اور پھر وہ صاحب کا بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ "میں خود آ رہا ہوں، مجھے بتاتے رہو۔"

☆☆☆

رشید بلا رات بھر بے چین رہا۔ اس کے آدمی پورے شہر میں اکرم موجی کے ٹھکانوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے لیکن ان کو کہیں مجید کا سراغ نہیں ملا تھا۔ صبح اس کے بعض آدمیوں نے اکرم موجی کے کچھ لوگوں کو راولپنڈی کے ایک پرانے علاقے میں گھومتے دیکھا تھا لیکن ان سے تصادم کی نوبت نہیں آئی تھی۔ رشید نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ اس علاقے پر خاص نظر رکھیں۔ ممکن ہے مجید کو اسی علاقے میں کہیں رکھا گیا ہو۔ اس کے آدمی اس علاقے میں پھیل گئے۔ دوپہر کے قریب رشید کے آدمیوں کی ایک ٹولی نے اسے اطلاع دی۔

"جناب! اکرم کے کچھ آدمی ایک گاڑی میں جا رہے ہیں۔"

"ان کا پیچھا کرو۔" رشید نے اضطراب سے حکم دیا۔ "ان کو نظروں سے اوجھل مت ہونے دینا۔ شاید یہ اس ٹھکانے سے واقف ہوں جہاں اکرم نے مجید کو رکھا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب۔" گاڑی میں موجود آدمی نے کہا۔ "میں نے سادو اور مجیب کو بھی بلا لیا ہے۔"

"یہ اچھا کیا۔" رشید بلا خوش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اس کے آدمی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "استاد! یہ ایک اور گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں اور اس گاڑی میں مجید صاحب نظر آ رہے ہیں۔"

رشید اچھل پڑا۔ اس نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ "تمہیں یقین ہے آگے والی گاڑی میں مجید ہے؟"

"جی استاد! طارق نے ابھی دوربین سے دیکھا ہے۔"

"اسے ہر قیمت پر نظر میں رکھو۔"

"جی ہم پیچھے ہیں، پر یہ اسلام آباد کا علاقہ ہے۔" رشید کے آدمی کا لہجہ دبا ہوا ہو گیا۔ "ہم مری روڈ کی طرف جا رہے ہیں۔"

"تم پیچھا کرو، میں بھی آ رہا ہوں۔" رشید بلا نے اسے حکم دیا۔ "تمام بندوں کو بھی اس طرف بلا لو۔"

گھر میں رشید کی مخصوص گاڑی اور اس کے خاص چار باڈی گارڈز موجود تھے۔ وہ ان کے بغیر باہر نہیں جاتا تھا۔ گاڑی بلٹ پروف تھی۔ وہ ان کے ساتھ نکل آیا اور اس نے ڈرائیونگ کرنے والے کو ہر ممکن تیزی سے مری روڈ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

☆☆☆

گاڑی میں رفیق مستری شامی کے ساتھ آگے بیٹھا تھا جبکہ تیمور جوجی کے ساتھ پیچھے تھا۔ کچھ دیر تک تو انہوں نے پیچھے کا دھیان نہیں رکھا تھا کیونکہ شہر میں ٹریفک بہت زیادہ تھا لیکن جب وہ نکل کر مری روڈ پر آئے تو شامی چونک گیا۔ اس نے تیمور سے کہا۔ "یہ سرخ اور سیاہ رنگ کی جیپ خاصی دیر سے پیچھے نظر آ رہی ہے۔"

"سڑک ہے ممکن ہے یہ بھی اسی طرف جا رہی ہو۔" تیمور نے ذرا آگے ہو کر عقبی آئینے میں گاڑی کا جائزہ لیا۔

"مجھے یاد ہے، یہ رفیق کی دکان سے روانہ ہونے کے فوراً بعد ہی نظر آنے لگی تھی۔" شامی نے کسی قدر تشویش سے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔ کار میں سولہ سو سی کا طاقت ور انجن تھا اور وہ اسے پیٹرول پر چلاتے تھے کیونکہ نواب صاحب سی این جی کے استعمال کے مخالف تھے۔

شامی نے کار کو ایکسلریٹر دیا تو وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ فوراً ہی پیچھے آنے والی جیپ بھی تیز ہوئی۔ وہ ان سے کوئی چالیس پچاس گز پیچھے تھی۔ شامی کا شک مزید بڑھ گیا کہ وہ ان کے پیچھے ہی آ رہی ہے۔ رفیق مستری سہما ہوا بیٹھا تھا۔ ایجنسی کے نام سے سب کی ہوا خراب ہوتی ہے۔ اس کا ڈرنا برحق تھا۔ جوجی بے چین تھا۔ وہ بار بار شامی سے تیز چلنے کو کہہ رہا تھا لیکن شامی ایک حد میں رہ کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہائی وے پر اوور اسپیڈنگ پر پولیس فوراً روک لیتی ہے اور اگر انہیں پولیس روک لیتی تو اس چکر میں خاصا وقت برباد ہو جاتا اور انہیں نواب صاحب کو الگ حساب دینا پڑتا کیونکہ انہیں چالان کے بارے میں تو پتا چل ہی جاتا۔ اس لیے شامی حدِ رفتار کے مطابق چل رہا تھا۔

شامی نے رفتار صرف تصدیق کے لیے تیز کی تھی۔ جب جیپ کی رفتار بھی بڑھی اور وہ اس سے مخصوص فاصلے تک آ گئی تو شامی کو خاصی حد تک یقین ہو گیا۔ اس نے جوجی سے کہا۔ "برخوردار! لگتا ہے تم اپنے بندوں کی نظر میں آ گئے ہو اور وہی پیچھا کر رہے ہیں۔"

رفیق کا رنگ اڑ گیا۔ "دہشت گردوں کے ساتھی۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ "میں تو جی فری میں مارا جاؤں گا۔"

"نہیں، ایک دو درجن گولیاں یا ایک ڈیڑھ کلو بارود تمہارے حصے میں بھی آئے گا... فری میں کہاں مارے جاؤ گے۔" تیمور نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا خون خشک کیا۔ "تم نے کیا سمجھا ہے، دہشت گردوں سے تعلقات رکھنا کوئی مزے کا کام ہے۔"

"میری توبہ، میرے باپ کی توبہ۔" رفیق مستری رو دینے والے انداز میں بولا۔ "لیکن کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ دہشت گرد ہے یا دہشت گردوں کا ساتھی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے پر بندے کو اپنے طور پر محتاط رہنا چاہیے۔ کسی اجنبی کا کام پکڑو تو اس سے کم سے کم شناختی کارڈ ضرور مانگ لو اور کسی کے بارے میں شک ہو تو پولیس کو اطلاع کرو۔"

"پولیس۔" وہ بدک کر بولا۔ "وہ تو خود مجرموں سے ملی ہوتی ہے، مجھے پکڑ کر لے جائے گی۔"

شامی نے گہری سانس لی۔ تیمور نے پیچھے آنے والی جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ شامی بھی سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا چاہیے۔

بارہ کہو ابھی دور تھا۔ یہ پندرہ بیس سال پہلے تک ایک چھوٹی سی آبادی تھی جس میں مقامی لوگ رہتے تھے۔ لیکن اسلام آباد کے وسعت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ آبادی اس کے اطراف میں پھیلنے لگی۔ ایسے میں بارہ کہو میں بھی اسلام آباد میں کام کرنے والے یہاں رہائش اختیار کرنے لگے۔ اب سڑک کے دونوں اطراف میں خاصی خوب صورت آبادیاں بن گئی تھیں۔ انہیں دائیں طرف جانا تھا۔ کچھ دیر بعد بارہ کہو کی آبادی آ گئی۔ یہاں سڑک تنگ اور تجاوزات سے بھرپور تھی۔ سڑک کے ساتھ اندر آبادی میں جانے کے لیے چھوٹی چھوٹی گلیاں تھیں جہاں سے گاڑیاں نکالنا بہت مشکل تھا۔ شامی پہلے آنے والے کٹ سے مڑ سکتا تھا لیکن اس نے مڑنے کے بجائے سیدھا سفر جاری رکھا۔ رفیق مستری نے مداخلت کی۔

"جناب! اس طرف سے مڑنا ہے۔"

"چپ کر کے بیٹھو۔" شامی غرایا۔ اسی لمحے اس نے ایک گلی سے بڑے سائز کا ٹرک برآمد ہوتے دیکھا۔ یہ چارے والا ٹرک تھا اور اس پر چارا لدا ہوا تھا۔ گلی اتنی تنگ تھی کہ ٹرک سڑک پر آئے بغیر مڑ ہی نہیں سکتا تھا اس لیے وہ سیدھا ہی آ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے کچھ دیر میں سڑک بند ہو جاتی۔ شامی نے ٹرک کو نکلتے دیکھا اور اس نے فوری فیصلہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایکسلریٹر پر دباؤ ڈالا تو کار اچھل کر آگے گئی۔ باقی سوچ رہے تھے کہ شامی رک جائے گا کیونکہ ٹرک نصف سڑک پر آچکا تھا اور اب گزرنے کے لیے بہت تھوڑی جگہ باقی رہ گئی تھی۔ رفیق مستری کے منہ سے چیخ نکلی کیونکہ ٹرک کی رفتار بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ کار تیزی سے تھوڑے سے خلا سے نکلی اور ٹرک سے ٹکرانے سے بال بال بچی۔ تیمور نے ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن جوجی دہل کر رہ گیا۔ رفیق مستری کی تو حالت بری تھی۔ اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔

"وہ تو نہیں ماریں گے لیکن آپ کے ساتھ رہا تو آج زندہ گھر نہیں جاؤں گا۔"

"انشاء اللہ۔" شامی نے کہا۔ "یعنی اگر اللہ نے چاہا تو..."

اس نے رفتار تیز کی۔ اس دوران میں ٹرک سڑک پر پوری طرح قابض ہو گیا تھا اور تعاقب میں آنے والی جیپ کے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ وہیں پھنس گئی تھی۔ شامی نے آنے والے کٹ سے کار موڑی اور واپس چل پڑا۔ یہ سڑک خالی تھی اور اس طرف تجاوزات بھی اتنی نہیں تھیں اس لیے وہ تیزی سے ڈرائیو کر سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرک کے پاس سے گزرے جہاں جیپ اور دوسری کئی گاڑیوں والے پھنسے ہوئے تھے۔ جیپ والوں نے یقیناً کار دیکھ لی تھی۔ تیمور نے پلٹ کر دیکھا۔

"اس سے دو بندے اتر کر اس طرف آرہے ہیں۔"

سڑک کے درمیان کنکریٹ کے بیریئر لگے تھے۔ وہ بندے اس طرف تو آگئے لیکن وہ کار کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ شامی نے رفتار مزید تیز کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پیچھے آنے والے انہیں اس طرف مڑتا دیکھیں جہاں شفقت کا ٹھکانا تھا۔ کھیل کچھ تو ان کی سمجھ میں آگیا تھا اور باقی شاید شفقت سے مل کر سمجھ میں آجاتا۔

☆☆☆

صوبی کم عمر تھی لیکن اتنی نادان نہیں تھی کہ سرمد کے عزائم نہ سمجھ سکتی۔ جب وہ اس کے باپ اور رشید بلا سے بات کر رہا تھا تو اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بات کرتے ہی اس پر ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اپنے عزائم واضح کرنے کے باوجود اس نے صوبی پر مزید توجہ نہیں دی تھی۔ البتہ اس کے منہ سے ٹیپ اتار دیا تھی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور فکر مند تھا۔ صوبی اسے مخاطب کرتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ نہ جانے اس کا ردِعمل کیا ہو اور وہ اپنے ناپاک ارادوں پر عمل نہ شروع کر دے۔ پھر اسے جوجی کا خیال آیا۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"جوجی کہاں ہے؟"

وہ مسکرایا۔ "بڑی دیر بعد خیال آیا تمہیں اپنے یار کا۔" شفقت گھٹیا زبان استعمال کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی شخصیت پر چڑھا ہوا نقاب اتر گیا تھا اور اس کے اندر کا اصل شفقت نکل آیا تھا۔ "میں نے اسے تمہارے باپ کے آدمیوں کے حوالے کیا تھا لیکن وہ نکمے نکلے۔ جوجی ان کو چکما دے کر بھاگ گیا۔"

صوبی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے بہ خوبی اندازہ تھا کہ جوجی اس کے باپ کے ہاتھ آجاتا تو وہ اس کا کیا حشر کرتا۔ شفقت اس کے تاثرات سے چڑ گیا۔ "لیکن فکر مت کرو، جلد یا دیر سے ہاتھ آئے گا اور وہ ہاتھ نہ بھی آیا تو آج تمہارا باپ اور رشید آپس میں لڑ مریں گے اور میں یہی چاہتا ہوں۔ باقی سزا میں تمہارے ذریعے دوں گا۔ رشید کے لیے تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ شاید اسے خوشی ہوتی لیکن اکرم تمہارا باپ ہے اور جوجی تمہارا محبوب ہے۔ وہ یقیناً ہمیشہ اس آگ میں جلتے رہیں گے۔"

"تم صرف اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے یہ سب کر رہے ہو؟"

"ہاں، مجھے اس سے محبت تھی۔ اس دنیا میں ایک وہی تو میرا سب کچھ تھا۔ تمہیں یا کسی کو نہیں معلوم میری ماں ایک بُری عورت تھی۔ وہ میرے باپ کو دھوکا دے کر کسی اور سے تعلق رکھتی تھی۔ جب میرے باپ کو پتا چلا تو اس نے میری ماں کی گردن کاٹ ڈالی اور مجھے لے کر یہاں آگیا۔ وہ پولیس سے چھپتا پھر رہا تھا۔ پھر اکرم موجی نے اسے پناہ دی۔ لیکن پناہ کے نام پر اس نے اسے یرغمال اور پھر غلام بنا لیا۔ میرا باپ اس کے اشارے پر تمام بُرے کام کرتا رہا۔ اس نے چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، حد یہ کہ اکرم کے دشمنوں کو قتل کیا لیکن جواب میں اسے کچھ نہیں ملا۔ اس نے مجھے خود سے الگ رکھا تاکہ اس کی جرائم پیشہ زندگی کا سایہ مجھ پر نہ پڑے لیکن اکرم نے میرا پتا بھی چلا لیا اور اس نے میرے باپ کو مجبور کیا کہ وہ مجھے بھی جرائم کی دنیا کے اسرار اور رموز سکھائے تاکہ میں بھی اس کے لیے کام کر سکوں۔ میرا باپ مجبور تھا۔ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے بھی شامل کر لیا لیکن ساتھ ہی اس نے مجھے سمجھایا کہ جیسے ہی موقع ملے میں فرار ہو جاؤں۔

"پھر میرا باپ ایک معمولی جھگڑے میں رشید بلا کے ہاتھوں مارا گیا۔ اکرم نے اسے زبردستی رشید کے سامنے بھیجا تھا اور اس نے بھی ایک آدمی پر رحم نہیں کھایا۔ باپ کو مارCourtesy www.pdfbooksfree.pk
کے بعد بھی میں اکرم کو نہیں چھوڑ سکا لیکن میں موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر مجھے موقع ملا اور میں غائب ہو گیا۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا تھا ورنہ تمہارا باپ مجھے نہ چھوڑتا۔ اب میں اس قابل ہوں کہ اپنا انتقام لے سکوں۔"

شفقت نے بات کرتے کرتے اچانک اٹھ کر کھڑکی سے ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ صوبی کو باہر کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ دور کہیں سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ شفقت نے فوراً پردہ برابر کر دیا۔ باہر کے سناٹے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ کسی ویرانے میں ہے لیکن مکان سے لگ رہا تھا کہ باقاعدہ کوئی آباد جگہ ہے۔ یہاں بجلی تھی۔ صوبی کو شفقت کے چہرے پر فکر کے تاثرات نظر آئے جیسے اس نے باہر کچھ دیکھا ہو۔ پھر وہ تیزی سے میز کی طرف آیا اور اس نے اپنا پستول اٹھا لیا۔

"کیا بات ہے باہر کوئی ہے؟" صوبی نے امید سے پوچھا۔

"چپ رہو۔" وہ کسی بھیڑیے کی طرح غرایا اور اس نے پاس آکر صوبی کے منہ پر ایک بار پھر ٹیپ لگا دیا۔ اس کے بعد وہ دبے قدموں چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ صوبی کا خیال تھا کہ لاؤنج کا دروازہ باہر کھل رہا ہوگا لیکن اس کا خیال غلط نکلا کیونکہ وہ ایک بند کمرے میں کھلا تھا اور وہاں نیم تاریکی تھی۔ شفقت نے جاتے ہوئے دروازہ پیچھے سے بند کر دیا۔ اس کے جاتے ہی صوبی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور تیزی سے لاؤنج میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے خود کو آزاد کر سکے۔ مگر فی الحال ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ وہ جس کرسی پر بندھی بیٹھی تھی، وہ مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور اسے توڑنا کسی صورت اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہاں ایک صوفہ سیٹ کے ساتھ میز تھی اور اس پر ایش ٹرے رکھی تھی۔

صوبی نے پاؤں کی مدد سے کرسی کھسکانے کی کوشش کی تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کرسی کھسک رہی ہے۔ وہ کسی قدر طویل قد کی مالک تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی عمر سے بڑی نظر آتی تھی۔ فرش پر کارپٹ تھا لیکن کرسی کے گول چکنے پائے اس پر آسانی سے حرکت کر رہے تھے۔ اگر یہی پائے چوکور اور سپاٹ ہوتے تو کرسی الجھ کر گر جاتی۔ وہ کرسی کو لاؤنج کے کچن والے حصے تک لے جا رہی تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی دیوار جس پر ماربل کا تختہ لگا تھا، کچن کو لاؤنج سے جدا کرتی تھی۔ وہ دروازہ کچن کے پاس ہی تھا جس میں شفقت غائب ہوا تھا۔ صوبی کا خیال تھا کہ اس نے کھڑکی سے مکان کے باہر کسی کو دیکھا ہے اور اسے خطرہ محسوس ہوا تھا اسی لیے وہ پستول لے کر باہر گیا تھا۔ کرسی کھسکانے کے ساتھ ساتھ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ باہر پولیس یا اس کے پاپا کے آدمی آگئے ہوں۔ اسے یہ خیال تو آیا ہی نہیں تھا کہ اگر وہ گھر واپس پہنچ گئی تو اس کا باپ خود اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مگر اس وقت اس کے ذہن میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں آرہا تھا کہ کسی صورت اس شخص کے چنگل سے نکل جائے جو اس کی عزت کے درپے تھا۔ مستقل کوشش سے آخر کار وہ کچن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اندر جانے کا راستہ چھوٹا تھا اور سامنے شیلف پر کئی طرح کی چھریاں اور گوشت سبزی کاٹنے والے چھوٹے چاقو رکھے تھے۔ لیکن جب اس نے کرسی کھسکا کر اندر جانے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ کرسی بڑی ہے اور اندر جانے کا راستہ چھوٹا تھا۔

☆☆☆

شامی، رفیق مستری کی راہنمائی میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ مری روڈ سے تقریباً ایک کلومیٹر اندر آچکے تھے۔ شروع میں گھنی آبادی تھی لیکن اس کے بعد آبادی کم ہوتی چلی گئی اور اِکا دُکا مکانات نظر آنے لگے۔ بعض مقامات پر تو ایک ہی مکان نظر آیا تھا اور اس کے آس پاس دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچے تھے کہ رفیق مستری نے اوپر کی طرف جانے والی ایک چھوٹی ذیلی سڑک سے ذرا دور ایک احاطے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ مکان ہے جی۔"

شامی نے کار روکی نہیں لیکن رفتار سست کر دی۔ یہ خاصا بڑا احاطہ تھا، کوئی ایک کنال کا اور اس کے آس پاس اونچائی تک زمین بالکل خالی پڑی تھی۔ احاطے کے سامنے ایک بڑا سا فولادی گیٹ تھا جس پر کنکریٹ کی آرچ بنی ہوئی تھی اور اندر سرخ کھپریل کی چھت نظر آرہی تھی لیکن بہت تھوڑی سی دکھائی دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے احاطے کے اندر چھوٹی سی عمارت ہو۔ ذرا آگے نکل کر شامی نے رفیق مستری سے کہا۔

"تمہیں یقین ہے یہی عمارت ہے؟"

"بالکل جی، اس کا گیٹ دیکھا ہے، اس پر شیر کا سر بنا ہوا ہے۔ میں اسی کے سامنے شفقت کی کار چھوڑ کر گیا تھا۔ اس وقت گیٹ پر تالا لگا تھا اور اب تالا نہیں ہے۔"

یہ تو شامی اور تیمور نے بھی دیکھ لیا تھا کہ گیٹ پر تالا نہیں ہے۔ جوجی بے چین ہو رہا تھا، اس نے کہنا چاہا۔ "جناب! جلدی کریں کہیں وہ..."

"برخوردار! تم سے زیادہ ہمیں جلدی ہے۔" تیمور نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی دبایا۔ اسے

خیال آیا کہ کہیں جوجی کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس سے رفیق مستری پران کی اصلیت کھل جائے۔ ویسے اس سے انہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوتا لیکن ان کے کام میں رکاوٹ پڑ سکتی تھی۔ اس خالی جگہ پر کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں تھیں لیکن مجموعی طور پر زمین صاف تھی اور اگر وہ براہِ راست احاطے کی طرف جاتے تو امکان تھا کہ انہیں دیکھ لیا جاتا۔ اس لیے شامی کار آگے نکال کر لے گیا اور جب احاطہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو شامی نے ایک جگہ کار روک لی۔ تیمور اور جوجی نیچے اتر آئے۔ تیمور نے شامی سے کہا۔

''تم اس کے ساتھ یہیں رکو، میں اسے لے کر ذرا معائنہ کر کے آتا ہوں۔''

شامی نے سر ہلایا۔ وہ رفیق مستری کو اکیلا چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہ تو دو گیارہ ہو جاتا اور اگر پتا غلط نکلتا تو وہ لکیر پیٹتے رہ جاتے، اس لیے شامی رک گیا۔ تیمور اور جوجی ڈھلان سے ہوتے ہوئے اوپر جانے لگے۔ یہاں ڈھلان کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی اس لیے انہیں محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ تیمور کا جسم مضبوط تھا لیکن اس کا اسٹیمنا زیادہ اچھا نہیں تھا اس لیے وہ ہانپنے لگا۔ ''مروا دیا یار تم نے۔''

''مجھے صوبی کا خیال ہے۔'' جوجی بولا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر احاطے کے اندر پہنچ جائے۔ کچھ دیر میں احاطہ نظر آنے لگا وہ اس کے پہلو سے نمودار ہوئے تھے اور یہاں سے انہیں اندر کا حال بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ اندر سفیدے اور جامن کے درخت لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر پھول دار اور انگور کی بیلیں تھیں۔ احاطے کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹی سی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ یہ شاید پورے احاطے کے چوتھائی حصے پر بھی نہیں تھی۔ دائیں طرف کا احاطہ ڈھلان پر تھا اس لیے یہاں زمین دیوار سے زیادہ نیچی نہیں تھی۔ شاید سات فٹ تھی۔ تیمور نے دیوار کے پاس آ کر اردگرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اچھل کر دیوار پر ہاتھ جمائے اور جوجی سے کہا۔

''میرے پیر پکڑ کر اوپر کرو۔''

جوجی نے اس کے پیروں کو سہارا دے کر اسے اوپر کیا۔ اب تیمور احاطے میں جھانک سکتا تھا۔ اسے فوراً ایک پرانی کیڈی لاک نظر آ گئی۔ یہ شاید ستر کا ماڈل تھا لیکن آج بھی چلتا ہے اور دیہی علاقوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ اس نے جوجی کو کار کے بارے میں بتایا۔ وہ بڑی مشکل سے تیمور کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھا۔ لیکن کار کے ذکر نے اسے پُرجوش کر دیا۔

''جی بالکل یہی ہے۔ کیا اس کے دروازے پر شیر کے سر والا اسٹیکر لگا ہوا ہے؟''

''نہیں، ایسا تو کوئی اسٹیکر نہیں ہے۔'' تیمور نے کار کا معائنہ کیا۔ ''لیکن بونٹ پر دائیں طرف ایک پرانے ڈینٹ کا نشان ہے جیسے کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو۔''

''ہاں جی یہی ہے۔'' جوجی مضطرب ہو گیا۔ ''وہ اندر ہی ہے جی اور صوبی بھی اندر ہو گی۔''

تیمور نے عمارت کا معائنہ کیا۔ دائیں طرف ایک چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا لیکن اس کی ساخت گیراج نما تھی اور اس کے برابر میں دیوار پر ایک کھڑکی تھی اور کھڑکی پر پردے پڑے تھے۔ عمارت میں دو تین کمرے لازمی تھے۔ تعمیر پرانی لیکن ڈیزائن بُرا نہیں تھا۔ عمارت کے اردگرد نہ تو کوئی آواز تھی اور نہ ہی کسی انسان کے آثار دکھائی دیے تھے۔ تیمور نیچے اتر آیا۔

''اندر تو کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''وہ مکان کے اندر ہوں گے جی۔'' جوجی بولا۔

تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔ ''سوچ لو... یہ ٹریس پاسنگ کہلاتی ہے اور پکڑے جانے کی صورت میں سزا ہو نہ ہو، عزت افزائی ضرور ہو گی۔''

''تو ہم کیا کریں؟'' جوجی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''صوبی اندر ہے، میں اسے ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''دیکھو بھائی، تم جذباتی ہو رہے ہو، یہ جرم ہے۔ فرض کرو کہ اندر سے کوئی اور نکل آیا تو پھر کیا ہو گا؟'' تیمور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ سمجھنے کی حد سے گزر گیا تھا۔ اس وقت اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح صوبی تک پہنچ جائے۔

''ٹھیک ہے، آپ میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو میں خود چلا جاؤں گا۔'' جوجی نے کہا اور احاطے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں سے دیوار پھلانگ کر اندر جا سکے۔ تیمور اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب وہ نہیں مانا تو مجبوراً تیمور نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ اندر جاؤں گا لیکن ایک شرط پر... نہ تو تم میری اجازت کے بغیر کوئی قدم اٹھاؤ گے اور نہ ہی صوبی یا شفقت کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گے۔''

جوجی نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔''

اس دوران میں وہ مکان کے پچھلے حصے تک چلے آئے۔ یہاں زمین اونچی تھی۔ تیمور نے آس پاس کا جائزہ لیا اور کسی کو نہ پا کر چھت پہ ہاتھ جما کر اوپر چڑھ گیا۔ جوجی کو حیرت ہوئی۔ اس نے دبے انداز اور پُرتحسین لہجے میں کہا۔

''واہ جی، آپ کو تو بڑی مہارت ہے۔''

''اب تم بھی اوپر آ جاؤ۔'' تیمور نے ہاتھ نیچے کیا اور سہارے کے لیے گرل پکڑ لی۔ ''لیکن مہربانی کر کے اب زبان بند رکھنا اور بلا ضرورت بولنے سے گریز کرنا۔''

جوجی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جسامت سے قطع نظر اس کا وزن اچھا خاصا تھا۔ لیکن تیمور نے کسی نہ کسی طرح اسے اوپر کھینچ لیا۔ جوجی نے اس کے کان میں کہا۔ ''آپ خود اتنا بول رہے ہیں۔''

تیمور نے اسے گھورا۔ واش رومز کی چھت کمروں کی چھت سے ذرا نیچی تھی۔ وہ اس پر چڑھ گئے۔ یہ ڈھلان اتنی نہیں تھی کہ ان کے لیے مشکل پیش آتی۔ یہ اصل کھپریل نہیں تھی بلکہ کنکریٹ کی چھت کو یہ شکل دی گئی تھی اس لیے وہ بہ آسانی سے اس پر قدم جماتے چلے گئے۔ اوپر پہنچ کر انہوں نے دوسری طرف جھانکا تو احاطے کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ مزید نیچے دیکھنے کے لیے ان کو آگے جانا تھا۔ تیمور نے جوجی سے وہیں رکنے کو کہا اور خود چھت کے دوسری طرف اترنے لگا۔ اس میں خطرہ تھا کہ اگر کوئی صحن میں آتا اور ذرا آگے سے چھت کی طرف دیکھتا تو تیمور اسے آسانی سے نظر آ جاتا۔ چھت کے کنارے جاتے ہوئے تیمور کو محسوس ہوا کہ اس کا اندازہ اس ڈھلان کے بارے میں درست نہیں تھا۔ یہ زیادہ ترچھی تھی اور اس کی ذرا سی غفلت اسے نیچے صحن میں پہنچا سکتی تھی۔ ابھی وہ درمیان میں تھا کہ اسے صحن میں کسی کی حرکت محسوس ہوئی اور پھر شفقت نکل کر سامنے آیا۔ تیمور کو اسے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ جوجی نے اس کا حلیہ تفصیل سے بتایا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک عدد سیاہ پستول تھا اور تیمور چھت کے درمیان تھا۔ اگر وہ سر اٹھا کر دیکھتا تو تیمور کے چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، وہ چھت کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا۔

☆☆☆

تیمور اور جوجی کے جانے کے بعد شامی رفیق مستری کے ساتھ کار میں موجود تھا لیکن اسے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ تیمور کیا کر رہا ہے اور رفیق کو بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بھی جانا چاہتا تھا، اسے ڈر تھا کہ کہیں تیمور کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔ وہ دونوں مل کر بہت آسانی سے کام کر لیتے تھے۔ اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اس نے رفیق سے کہا۔

''نیچے اترو۔''

رفیق خوف زدہ ہو گیا۔ ''کیوں جی؟''

''کیوں جی کے بچے۔'' شامی نے غرا کر کہا۔ ''جو کہا ہے وہ کرو۔''

رفیق نیچے اتر آیا۔ شامی نے کار کی ڈکی کھولی اور اسے حکم دیا۔ ''اندر لیٹ جاؤ۔''

اس بار رفیق مستری نے بے چون و چرا حکم کی تعمیل کی۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اسے بند کر کے جانا چاہ رہا ہے تاکہ وہ بھاگ نہ سکے۔ وہ اندر سے ڈکی نہیں کھول سکتا تھا۔ لیکن شامی کے جانے کے بعد ہاتھ پاؤں چلا کر کسی کو متوجہ تو کر سکتا تھا اس لیے وہ خاموشی سے لیٹ گیا... ڈکی آٹومیٹک طریقے سے لاک اور اَن لاک ہوتی تھی اس لیے اس کے کھلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شامی جانتا تھا کہ اس کا لاک مضبوط ہے اور رفیق اسے اندر سے نہیں کھول سکے گا۔ شامی نے ڈکی بند کرنے سے پہلے کہا۔ ''اب تم خاموشی سے یہاں لیٹو۔ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔''

شامی جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا احاطے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا شروع میں اس معاملے میں شامل ہونے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ یہ تیمور تھا جس کی وجہ سے وہ ساتھ رہا۔ مگر اب وہ اس میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا۔ ویسے بھی پیچھے ہٹنا ان کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ وسط ایشیا سے ان کے آبا و اجداد گھوڑے دوڑاتے ہوئے واپس نہ جانے کے عزم کے ساتھ آئے تھے۔ وہی ارادے اب تک ان کے خون میں شامل تھے۔ احاطہ نظر آتے ہی شامی محتاط ہو گیا۔ چاروں طرف خالی جگہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھی شخص... بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ اسے تیمور اور جوجی نظر نہیں آئے مگر جیسے ہی اس نے مکان کے اوپر دیکھا، اسے تیمور نظر آ گیا۔ وہ چھت کے اگلے حصے کی ڈھلان پر لیٹا ہوا تھا اور یوں ساکت تھا جیسے کسی کی نظروں میں آنے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پہلے تو شامی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ کوئی شخص صحن میں موجود ہے اور تیمور اس کی نظروں سے بچ رہا ہے۔ شامی نے غور کیا۔ تیمور سامنے کے رخ سے نہیں چڑھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً پیچھے سے گیا تھا اور شاید جوجی بھی وہیں کہیں تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ چلتا ہوا عقبی حصے کی طرف آیا تو اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ یہاں اسے چھت کے پچھلے حصے میں جوجی نظر آ گیا، وہ بھی دبکا ہوا تھا۔ شامی نے ہلکی سی شش کی آواز نکال کر اسے متوجہ کیا۔ جوجی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور سرکتا ہوا کنارے تک آ گیا۔

''آپ بھی یہاں آ گئے؟''

''ہاں، تیمور آگے ہے... صحن میں کوئی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”مجھے نہیں معلوم جی، انہوں نے مجھے آگے آنے سے منع کیا ہے۔“ وہ بے چینی سے بولا۔ ”آپ نے اس آدمی کو کہاں چھوڑا؟“

”ڈکی میں بند کر کے آیا ہوں۔“ شامی نے کہا اور اچھل کر منڈیر پکڑ لی۔ جوجی نے بھی اس کی مدد کی اور وہ اوپر چڑھ گیا۔ یہاں اوپر پہاڑی تک کوئی گھر نہیں تھا اس لیے کسی کے دیکھ لینے کا امکان بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں چھپکلی کی طرح چھت سے چپک کر چلتے ہوئے اوپر پہنچے تو دوسری طرف تیمور نہیں تھا۔ وہ غائب تھا۔

☆☆☆

صوبی انتہائی کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح کرسی اس خلا سے گزار کر کچن تک رسائی حاصل کر لے جہاں کئی چھریاں چاقو تھے اور وہ ان کی مدد سے خود کو آزاد کرا سکتی تھی۔ مگر خلا تنگ تھا، کرسی اس میں پھنس رہی تھی۔ صوبی پیروں کے سہارے کھڑی تھی اُس کے پاؤں کا ٹیپ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ وہ اب واپس بھی نہیں جا سکتی تھی اور نہ کرسی کو نیچے رکھ سکتی تھی۔ سارا زور اس کے پیروں پر آ رہا تھا۔ وہ کمزور لڑکی تھی، ذرا سی دیر میں تھکنے لگی۔ اچانک اسے آہٹ سنائی دی۔ سرمد (شفقت) واپس آ رہا تھا۔ صوبی پھر کوشش کرنے لگی لیکن اس سے پہلے کہ وہ خود کو اس جگہ سے نکال پاتی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور شفقت اندر آ گیا۔ وہ مارے خوف کے ساکت ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا اور خاص طور سے صوبی کی آزاد ہونے کی کوشش اسے مشتعل کر دے گی۔ اس نے جدوجہد ترک کر کے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ قدموں کی آہٹ قریب آئی اور پھر اس نے ایک مردانہ آواز سنی۔

”یہ کیا ہے؟“ لیکن آواز سرمد کی نہیں تھی۔ صوبی نے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا پھر آدمی اس کے قریب آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ہلنا مت... میں تمہارا ہمدرد ہوں، ابھی تمہیں آزاد کرتا ہوں۔“

اس نے معائنہ کر کے پہلے اسے کرسی سمیت پیچھے کھینچ لیا اور پھر آرام سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو ٹیپ سے آزاد کر دیا۔ صوبی نے جلدی سے منہ سے خود ٹیپ اتارا اور اس نوجوان شخص کی طرف دیکھا۔ ”وہ یہیں ہے، ابھی واپس آ جائے گا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ نوجوان نے کہا۔ ”اس کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”تم... کون ہو؟“ صوبی خوف زدہ تھی۔ وہ کسی پر آسانی سے اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”میرا نام تیمور ہے اور میں جوجی کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ اسے تمہاری تلاش ہے۔“

”جوجی۔“ صوبی بے چین ہو گئی۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”باہر موجود ہے۔“ تیمور نے کہا اور اسے وہیں رکنے کا اشارہ کرتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا جس سے گزر کر وہ یہاں آیا تھا۔ وہ چھت پر تھا جب اس نے شفقت کو باہر جاتے دیکھا۔ وہ گیٹ کھول کر نکل گیا تھا اور تیمور موقع غنیمت جان کر نیچے کود گیا۔ آگے والے کمرے کی چھت زمین سے صرف ساڑھے چھ فٹ اوپر تھی اور نیچے زمین بھی کچی تھی اس لیے اسے کودنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ نیچے اترتے ہی وہ اندر گھس آیا کیونکہ اس کا خطرہ تھا کہ شفقت کسی وقت بھی واپس آ جائے گا۔ اس کے پاس یہی چند لمحے تھے کہ وہ اندر کا معائنہ کر سکے۔ پہلا کمرا خالی اور شاید گیراج ہوتا تھا۔ اس سے گزر کر وہ لاؤنج میں آیا اور پھر اس نے صوبی کو کچن میں داخل ہونے والی جگہ پھنسے پایا۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اب اسے یہاں سے لے کر نکلنا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ شفقت واپس تو نہیں آیا ہے۔ جیسے ہی اس نے گیراج کے دروازے سے باہر دیکھا اسے شفقت تیزی سے واپس آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی تیمور اندر کی طرف بھاگا۔ صوبی اس کا انداز دیکھ کر ہی ہراساں ہو گئی، اس نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

”وہ آ گیا ہے۔“ تیمور نے کہا اور اسے کھینچ کر اندر لے جانے لگا۔ اسی لمحے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

☆☆☆

شفقت سکہ بند مجرم تھا اور اس کی چھٹی حس تیز تھی، اس چھٹی حس نے کئی مواقع پر اس کی جان بچائی تھی اور خطروں سے پیشگی خبردار کیا تھا۔ اس وقت بھی اس کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی، اسی وجہ سے باہر نکل آیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ خطرہ آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ اس نے پستول بھی لیا اور باہر صحن میں نکل آیا۔ باہر اسے کوئی نظر نہیں آیا لیکن اس کی چھٹی حس مسلسل خبردار کر رہی تھی۔ اس نے صحن میں موجود درختوں کا جائزہ لیا۔ پھر وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔ یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ اس نے بہت پہلے یہ زمین خریدی تھی اور اس پر یہ عمارت بھی بنی ہوئی تھی۔ اس نے اسے بہتر کرایا تھا اور کچھ تبدیلیاں کی تھیں۔ یہاں وہ مہینوں دوسروں کی نظروں سے چھپ کر رہ سکتا تھا۔ اسے حلیہ بدلنا آتا تھا۔ یہ معاملہ نمٹ جاتا تو وہ اپنا حلیہ تبدیل کر لیتا اور شفقت ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا۔ اس نے ساٹھ لاکھ سے زیادہ رقم حاصل کر لی تھی لیکن اصل چیز وہ انتقام تھا جو اس نے اکرم موجی اور رشید بلا سے لیا تھا۔ وہی اس کے باپ کی موت کے ذمے دار تھے۔

وہ گیٹ سے باہر آیا۔ یہاں بھی دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر سامنے رہا پھر گھوم کر دائیں طرف آیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا اور جب وہ عقب سے گھوم کر دوبارہ سامنے کی طرف آ رہا تھا، تب اس نے نیچے سڑک پر کئی گاڑیاں نمودار ہوتے دیکھیں اور پھر کچھ ایسی ہی گاڑیاں اسی سڑک کے مخالف سمت سے نمودار ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر شفقت کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی نلکی نما دوربین نکالی۔ یہ قریب کی کسی چیز کو واضح دیکھنے کے لیے اچھی تھی اور اتنی مختصر تھی کہ آسانی سے جیب میں سما جاتی۔ اس نے دوربین سے گاڑیوں کا جائزہ لیا تو اس کے ہوش اڑ گئے کیونکہ ایک طرف آنے والی گاڑیوں میں اسے رشید بلا اور اس کے ساتھی نظر آئے تھے جبکہ دوسری طرف سے آنے والے گاڑیوں میں اکرم موجی اور اس کے بدمعاش تھے اور وہ سب پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ شفقت تیزی سے گیٹ کی طرف لپکا اور اندر داخل ہو کر اس نے اسے بند کر لیا۔ ابھی انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ گاڑیاں آمنے سامنے رک گئی تھیں اور اس کے مکان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔

وہ پاگل ہونے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دونوں بیک وقت یہاں کیسے پہنچ گئے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں تھا کہ وہ اس کے ٹھکانے سے واقف ہو گئے تھے اور جلد وہ یہاں ہوتے۔ ان میں سے کوئی اس کے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوتا۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں آتے اُس کا جلد از جلد نکل جانا ضروری تھا۔ وہ اندر کی طرف لپکا۔ جانے سے پہلے وہ مال اٹھاتا اور صوبی کو اس دنیا سے رخصت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صوبی کے بارے میں جو سوچا تھا، اس پر عمل درآمد کے لیے وقت نہیں تھا لیکن وہ اسے قتل تو ضرور کر سکتا تھا۔ مگر جب اس نے گیراج کے کمرے کا دروازہ دیکھا تو اسے کھلا پایا حالانکہ وہ اسے جاتے ہوئے بند کر گیا تھا۔ پھر اسے کس نے کھولا؟ وہ یک دم محتاط ہو گیا۔ اس نے پستول آگے کیا اور تیزی سے اندر داخل ہوا لیکن اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ پوری خاموشی اور احتیاط کے ساتھ لاؤنج میں آیا اور یہاں اس نے خالی کرسی اور کھلا ہوا ٹیپ دیکھ لیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے ایک گالی نکلی اور وہ پلٹ کر صحن میں آیا لیکن صحن پہلے کی طرح خالی تھا۔ صوبی کسی طرح نکل گئی تھی اور اس کے پیچھے جانے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ وہ اندر کی طرف لپکا اور ایک بیڈ روم میں گھس گیا۔ یہاں ایک چھوٹی سی فولادی الماری تھی۔ اس نے الماری کھولی اور اس میں رکھا ایک اسکول بیگ نکال کر اپنی پشت سے باندھ لیا۔ اس بیگ میں اس کا تمام اثاثہ تھا۔ پھر اس نے الماری میں رکھے اپنے پستول کے اضافی میگزین بھی نکال کر جیب میں رکھے۔ یہ کام کر کے وہ باہر نکل آیا۔

اسی لمحے باہر سے ایک فائر ہوا پھر دوسرا اور اس کے بعد تو جیسے محاذ جنگ کھل گیا۔ شفقت مسکرایا۔ صوبی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ چالاک لڑکی نہ جانے کیسے یہاں سے نکلی لیکن اب اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ جو چاہتا تھا وہ ہو گیا تھا۔ رشید اور اکرم آپس میں لڑ پڑے تھے اور امکان تھا کہ ان میں سے کوئی مارا جائے گا لیکن اگر وہ بچ جاتے تب بھی شفقت زندہ ہوتا اور وہ ان سے پھر انتقام لینے کی کوشش کر سکتا تھا۔ وہ گیراج والے کمرے کے لگے سفیدے کے درخت تک آیا اور اس کے تنے پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔ چھت پر آ کر اس نے چاروں ہاتھوں پیروں کے بل رینگتے ہوئے عقبی حصے کا رخ کیا۔

جب وہ چھت کی چوٹی تک آیا تو اس نے پلٹ کر نیچے سڑک کی طرف دیکھا۔ یہاں سے کسی قدر دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں پارٹیاں اپنی گاڑیوں کی آڑ میں ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہی تھیں۔ وہ مسکرایا مگر جب اس نے چھت کے دوسری طرف جھانکا تو اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ اس کے سامنے جوجی موجود تھا صرف جوجی نہیں بلکہ ایک نوجوان اور بھی تھا۔ شفقت انہیں دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ پستول نکالنا بھول گیا۔ جب اسے پستول کا خیال آیا اور اس کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا تو اسی وقت نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر اسے دھکا دے دیا۔ شفقت نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن یہاں ڈھلان زیادہ تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا کنارے تک آیا اور پھر دھماکے سے نیچے جا پڑا۔ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

شامی اور جوجی نے اسے چھت پر آتے دیکھ لیا تھا اور دونوں کو بالترتیب تیمور اور صوبی کی سلامتی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اگر شفقت اتنے مزے سے فرار ہو رہا تھا تو وہ دونوں کہاں تھے؟ اوپر سے انہوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی لیکن یہ فائرنگ کن کے درمیان میں ہو رہی تھی، وہ اس سے ناواقف تھے۔ شفقت کے نیچے جاتے ہی شامی نے جوجی سے کہا۔

”جلدی کرو، ضروری نہیں ہے وہ مر گیا یا ناکارہ ہو گیا ہو۔ اگر اس نے پستول نکال لیا تو کم سے کم چھ گولیاں فی کس مارے گا۔“

وہ تیزی سے ڈھلان کے دوسرے حصے میں آئے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیچی چھت والے کمرے کی طرف بڑھے۔ یہاں سے نیچے آنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شفقت مدہوش پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہل رہے تھے لیکن وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ شامی نے سب سے پہلے اس کا پستول قبضے میں کیا اور جوجی سے کہا۔ ”اندر جا کر دیکھو۔“

جوجی کے جانے کے بعد اس نے شفقت کی پشت سے بندھا ہوا بیگ اتارا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ صرف ایک پرس، ایک موبائل فون، ایک کی چین اور ایک عدد چھوٹی سی دوربین تھی۔ باہر فائرنگ کا سلسلہ رہ رہ کر جاری تھا۔ جوجی اندر داخل ہوا اور اس نے بے تابی سے صوبی کو آواز دی۔ اس کی آواز پر فوری ردِعمل ہوا اور اندر سے صوبی نے چیخ ماری۔ وہ اس کمرے میں بیڈ تلے تھے جہاں صوبی کو ہوش آیا تھا لیکن شفقت نے اسے وہاں دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے خیال میں وہ فرار ہو چکی تھی۔ جوجی کی آواز سن کر وہ اندر سے دوڑی آئی۔ جوجی نے اسے دیکھا۔

”تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“ صوبی کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ ”وہ مجھے زبردستی یہاں لے آیا تھا۔“

وہ دونوں پاس آ گئے تھے لیکن اسی اثنا میں تیمور اندر سے نکل آیا اس لیے سین مزید رومانٹک نہیں ہوا۔ صوبی اور تیمور نے بھی فائرنگ کی آواز سن لی تھی۔ صوبی ڈری ہوئی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”یہ تو باہر چل کر ہی پتا چلے گا۔“ تیمور نے کہا۔ اسے بھی فکر ہو رہی تھی۔ فائرنگ کا مطلب تھا کہ جلد یا بدیر یہاں پولیس آنے والی ہے اور اس کی آمد سے پہلے ان کا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا ورنہ بات تھانے سے آگے نواب صاحب تک چلی جاتی اور شامی نہایت آسانی سے سارا ملبا اس پر ڈال دیتا۔ وہ باہر آئے تو شفقت بے ہوش پڑا تھا۔ جوجی اسے دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور اس نے شفقت کو کئی عدد لاتیں رسید کیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس جیسے سخت جان کا یہ لاتیں کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ وہ تو اوپر سے گر کر بے ہوش پڑا تھا۔ شامی گیٹ سے لگا دوربین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اطلاع دی۔

”باہر دونوں پارٹیاں موجود ہیں اور ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہی ہیں۔“

تیمور اس کے پاس آیا۔ ”کون سی پارٹیاں؟“

”اکرم موجی اور رشید بلا کی۔“ شامی نے اسے آگاہ کیا۔

”ابا جی یہاں ہیں؟“ جوجی بولا۔

”میرے ابو بھی...“ صوبی فکرمند نظر آنے لگی۔ شامی، تیمور اور جوجی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تمہارے ابو...؟“ جوجی نے پوچھا۔

صوبی نے شرمندگی سے سر ہلایا۔ ”اکرم میرے ابو ہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم مجھ سے دور نہ ہو جاؤ۔“

جوجی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اسی وجہ سے میں نے تمہیں اپنے ابا جی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔“

”قدرت کیا پرفیکٹ میچ کرتی ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”لیکن تمہارے والد صاحبان تو لڑنے مرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

”پلیز ان کو روکو۔“ صوبی نے فریاد کی۔

شامی تیمور کو ایک طرف لے گیا۔ ”دیکھ یار! کرنے والے سارے کام ہم نے کر دیے ہیں۔ دو محبت کرنے والوں کو ملوا دیا ہے اور اس فساد کی جڑ بھی یہاں موجود ہے اس لیے ہمیں منظرِ عام سے غائب ہو جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ پولیس یہاں قدم رنجہ فرمائے۔“

تیمور نے اس کی تائید کی۔ ”اور بات دادا جان تک جائے لیکن ان کا کیا کرنا ہے؟“ اس نے صوبی اور جوجی کی طرف دیکھا جو گیٹ کے جھروکوں سے آنکھ لگائے اپنے باپوں کو برسرِ پیکار دیکھ رہے تھے۔

شامی بھنا گیا۔ ”تو کیا اب ان کا نکاح پڑھا کر جاؤ گے؟“

”نہیں یار! یہ نادان ہیں۔ کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لیں اور پھر اتنے لوگ بے گناہ مر جائیں گے۔“ تیمور نے کہا اور پھر شفقت کی طرف دیکھا۔ ”اس کے پاس موبائل ہوگا۔“

”ہاں، یہ اس کے پاس سے نکلا ہے۔“ شامی نے موبائل اسے تھما دیا۔

تیمور نے چیک کیا اور اس کی توقع کے عین مطابق اسے موبائل میں اکرم اور رشید کے نمبر مل گئے۔ اس نے پہلے رشید کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد اس نے کال ریسیو کی۔

”تم... کہاں سے بات کر رہے ہو؟“

”میں کہیں سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ صرف جوجی کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ وہ اور تمہارا اصل مجرم یہ اوپر والے مکان میں موجود ہیں۔ سڑک سے بائیں طرف اوپر دیکھو، سفید دیوار والا احاطہ ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو فائرنگ بند کر دیں۔“

”تم...“ رشید بلا نے کہنا چاہا لیکن تیمور نے اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے لائن کاٹ دی۔ پھر اس نے تیزی سے اکرم موجی کا نمبر ملا کر اسے بھی یہی اطلاع دی کہ اس کی بیٹی اور اصل مجرم مکان میں موجود ہے۔ وہ فائرنگ بند کرے تو وہ باہر آ سکتے ہیں۔ تیمور نے بات کرتے ہی کال کاٹ دی لیکن اس کا اثر فوراً ہوا اور نیچے فائرنگ بند ہو گئی۔ تیمور نے صوبی اور جوجی سے کہا۔

”تم نے محبت کی، یہ بری بات نہیں ہے لیکن گھر سے بھاگ کر تم دونوں نے غلطی کی۔ اس کے نتیجے میں تمہارے باپوں کے درمیان لڑائی ہوئی اور اب تک کئی لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اس لیے اب یہ تم دونوں کا فرض ہے کہ معاملہ ٹھیک کرو۔ چاہے تمہیں اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ فائرنگ رک گئی ہے، تم باہر جا سکتے ہو اور اپنے اپنے باپوں کو اصل صورتِ حال بتا کر اور شفقت کو پیش کر کے معاملے کو ٹھنڈا کر سکتے ہو۔“

”یہ کام تو آپ بھی کر سکتے ہیں۔“ جوجی نے کہا۔

”برخوردار! ہمارا اس معاملے میں ملوث ہونا ٹھیک نہیں ہے اور پھر تم دادا جان کو بھی جانتے ہو۔“ شامی نے کہا۔ ”ہم پیچھے سے نکل جائیں گے۔ امید ہے کہ تمہارے ابا جی اور تمہارے ابو جی تمہیں قتل کرنے سے گریز کریں گے۔ یہ اپنی چیزیں سنبھالو۔“ شامی نے بیگ جوجی کو تھما دیا۔ ”اس میں تمہاری رقم اور زیور ہے۔ اور اب شاباش، باہر نکل جاؤ ورنہ کہیں باہر والے اندر نہ آ جائیں۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ صوبی نے انکار کر دیا۔ ”ابو مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔“

”تم نے کام بھی تو ایسا کیا ہے۔“ شامی نے کہا۔ ”مگر میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔“

جوجی نے بھی صوبی کو سمجھایا اور وہ ہمت کر کے باہر جانے کو تیار ہو گئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے تھے۔ اس لیے اگر نیچے کسی کے ذہن میں گولی چلانے کا خیال تھا تو وہ اپنے ارادے سے باز آ گیا۔ شامی اور تیمور گیٹ سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ دونوں بہ خیر و حفاظت نیچے سڑک تک پہنچ گئے تو شامی نے کہا۔ ”بھائی اب نکل لو، اس سے پہلے کہ وہ یہاں آ جائیں۔“

تیمور نے اس سے اتفاق کیا اور دونوں چھت سے ہوتے ہوئے عقب میں اتر گئے۔ اس کے بعد کسی نہ کسی طرح کار تک پہنچنے میں کامیاب رہے اور فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ خاصا دور نکلنے کے بعد انہیں رفیق کا خیال آیا اور انہوں نے کار روک کر اسے ڈکی سے نکالا۔ دھوئیں کے اثر سے اس کی حالت شرابیوں کی سی ہو رہی تھی لیکن اس کی جان کو خطرہ نہیں تھا۔ کچھ دیر میں اس کی حالت سنبھل جاتی تو وہ خود چلا جاتا اس لیے وہ اسے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

”نوشی۔“ شامی نے ہمت کر کے کہا۔ ”آج موسم اچھا ہے۔“

”اچھا۔“ نوشی نے صاف آسمان کی طرف دیکھا جہاں مشرق سے طلوع ہونے والا سورج نہایت آب و تاب سے چمک رہا تھا اور وہ دونوں صبح سویرے پسینے میں نہا رہے تھے۔ نوشی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”واقعی موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔“

”میرا مطلب ہے آج ہم کہیں باہر چلیں، ڈنر باہر کریں گے۔“

نوشی کے سخت تاثرات کسی قدر نرم پڑ گئے لیکن فوراً اسے کچھ خیال آیا۔ ”سوری، میری پاکٹ منی ختم ہونے والی ہے۔“

”اس بار بل میں دوں گا۔“ شامی نے کمال فراخ دلی سے کہا۔

”تب ٹھیک ہے۔“ نوشی مسکرانے لگی اور اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی گھر کی طرف چلی گئی۔ شامی خوش خوش گیٹ سے اندر آیا تو فولاد خان حسبِ معمول اخبار چیک کر رہا تھا۔ شامی کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

”شامی صیب! قیامت قریب اے۔“

”درست کہا، ابھی ابھی اپنے گھر گئی ہے۔ شام کو مجھ پر گزرے گی۔“ شامی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

فولاد خان مسکرانے لگا۔ ”ام اس قیامت کا بات نہیں کرتا، اس کا بات کرتا اے۔“ اس نے اخبار شامی کے سامنے کر دیا۔ ”پندرہ سولہ سال کا بچہ لوگ اپنا باپ کو کس طرح مجبور کرتا اے۔“

شامی نے اخبار دیکھا جس میں رپورٹر نے نام لیے بغیر جوجی اور صوبی کی ساری داستانِ محبت شائع کر دی تھی اور انکشاف کیا تھا کہ ان کے جانی دشمن باپ اب ان کی وجہ سے دوستی پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ کچھ سال بعد وہ دونوں سمدھی بننے والے تھے۔ رشتہ البتہ طے کر دیا گیا تھا۔ شامی نے سر ہلایا۔ اسے اسی کی توقع تھی۔ آج کل کی نسل ایک یہی ہنر تو اچھی طرح سیکھ گئی ہے کہ ماں باپ کو اپنی مرضی پر کس طرح چلانا ہے۔ ان کی بدقسمتی کہ ان کا سابقہ نواب صاحب سے تھا جو صرف اپنی مرضی چلانا جانتے تھے۔ شامی نے سرد آہ بھری اور اندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

چاہ درپیش

شکیل صدیقی

خیر و شر کے مابین معرکہ جنگ کا آغاز ہوتا ہے... تو یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا اختتام کب، کہاں اور کیسے منتج ہوگا... خیر و شر کے لامتناہی سلسلے سے جنم لینے والی سنسنی خیز کہانی... دو قوتیں بیک وقت ہر صورت اپنے مقصد کو حاصل کر کے گوہرِ کامیابی تک پہنچنا چاہتی تھیں... چاہے راہ میں کتنی ہی رکاوٹیں حائل ہوں...

پڑوسی ملک ایران کی سیاست و انقلاب کے پس منظر میں لکھی جانے والی سربستہ رازوں کی کتھا

رات تاریک تھی اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا دراز قامت شخص تھا۔ پینٹ اور اوور کوٹ میں ملبوس اس شخص نے سر پر فیلٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ اس نے اسی عمارت میں ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہ اس بات کا منتظر تھا کہ خیام کب اس پاگل خانے میں آتا ہے اور وہاں موجود اروناکو لے جاتا ہے۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوا اس چار منزلہ شکستہ عمارت کے زینے اُتر کر احتیاط سے نیچے آگیا۔

اسے وہاں کھڑے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک سایہ گلی کے موڑ سے ٹن گن لیتا ہوا اس عمارت کے قریب آگیا۔ پہلا آدمی قدرے پیچھے ہٹ گیا تاکہ نووارد کی نگاہ میں نہ آسکے۔ احتیاطاً اس نے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ نووارد پست قامت تھا اور اس نے پتلون پر سیاہ جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال ہلکے تھے اور درمیان میں گنج نمایاں تھا۔ وہ سنہری کمانیوں والا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔

"آقائے داریوش!" اس نے سرگوشی نما لہجے میں آواز دی۔

"تم یہاں تک آگئے؟ تمہیں تو اپنے فلیٹ میں ہونا چاہیے تھا؟"

دروازے کے پیچھے کھڑے ہوئے اس شخص نے اطمینان کا سانس لیا اور ریوالور کے دستے کو چھوڑ دیا اور اسی طرح سے سرگوشی میں بولا۔ "میں نے تمہیں کار میں رہنے کا حکم دیا تھا۔" اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"ہم سوچ رہے تھے کہ معلوم نہیں ہمیں کب تک ٹھہرنا پڑے گا۔" احمد یار بولا۔

"جب تک وہ آنہیں جاتا۔" داریوش نے جواب دیا۔ سامنے والی عمارت پر سرخ بلب لگا تھا جس کی روشنی میں اس کا چہرہ مکمل سرخ ہو رہا تھا۔ "وہ تین راتوں سے دکھائی نہیں دیا۔ جب تک وہ آنہیں جاتا تمہیں مزید ٹھہرنا پڑے گا۔" داریوش نے کہا۔ "میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم یہاں خیام شاپور کا انتظار کر رہے ہیں جو یہاں آئے گا اور ایک عورت کو سامنے والے پاگل خانے سے رہائی دلائے گا۔ اس عورت کا فرضی نام ارونا ہے، ہم اس عورت کو اغوا کریں گے۔ بس یا کچھ اور معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ ایک شہزادی ہے۔" احمد یار نے کہا۔ "ایک شہزادی کا پاگل خانے میں کیا کام؟"

"یہ عورت پہلے خیام کے پاس ہی رہتی تھی، پھر وہاں سے نہ جانے کس مقصد کے تحت یہاں آگئی۔ اس نے کچھ لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ یہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی اور اس سے دستاویزات حاصل کرنا چاہیں تو اس نے گھبرا کر تہران کے سب سے بڑے نالے میں کود کر خودکشی کرنی چاہی، مگر وہ بچالی گئی اور اسے پاگل خانے میں لے جا کر بند کر دیا گیا، جو سامنے ہی ہے۔" اس نے اشارہ کر کے بتایا۔

"تو ہمیں بھی یقین کر لینا چاہیے کہ وہ کوئی جعلی شہزادی ہے۔" احمد یار نے کہا۔

"اس کے پاس ایسی دستاویزات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصلی شہزادی ہے جبکہ شاہ پرست تذبذب کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اصلی شہزادی، خیام کے مضافاتی مکان میں مقیم ہے اور اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا ہے۔ ہماری دلچسپی لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو دستاویزات ہیں وہ بہت قیمتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ نے انقلابیوں سے نجات پانے کا کوئی جامع منصوبہ بنایا ہے۔ ان کی منظوری کے لیے اس نے شہزادی کو خفیہ طور پر محل سے نکالا ہے اور اسے عام حیثیت میں شاہ بندر سے گوادر اور وہاں سے کراچی جانا ہے، تاکہ وہ امریکی سفارت خانے جا کر سفیر سے ملاقات کر سکے۔ ہم اس عورت ارونا سے دستاویزات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ ارونا کچھ عرصے کے لیے خیام کی حویلی پر ٹھہری تھی حالانکہ وہ کاریں بنانے والے کارخانے کا مالک اور سرمایہ دار ہے اور اپنے والدین کے ساتھ مضافات میں رہتا ہے۔"

"ہاں، یہی تو میں نے بھی بتایا ہے تمہیں۔ وہاں کچھ عرصہ چھپی رہنے کے بعد وہ تہران آگئی جبکہ خیام اسے واپس لے جانے کے لیے آیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ خیام اس پاگل خانے آرہا ہے اور وہ ارونا کے ساتھ دستاویزات بھی باہر لائے گا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصلی شہزادی ہے؟" احمد یار نے کہا۔ "اگر ان دستاویزات کی کوئی سیاسی اہمیت ہے تو پھر وہ یقیناً قیمتی ہوں گی؟ تمہیں یقین ہے کہ وہ کاغذات ارونا کے پاس ہیں؟" احمد یار نے اضطراب سے پوچھا۔

"ہمیں یہی بتایا گیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو آج رات اس کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔" داریوش نے کہا۔

وہ دروازے کے قریب خاموشی سے کھڑے ارونا کے پاگل خانے سے نکلنے کا انتظار کرتے رہے جسے شاہ کی معتمد خاص کہلانے کا دعویٰ تھا، جس کا حقیقی نام جمیلہ سمنانی تھا اور جو

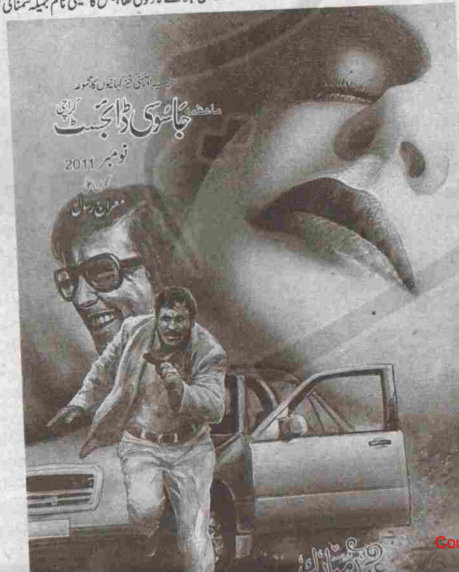

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ کی فرسٹ کزن تھی۔

☆☆☆

خیام اپنی قیمتی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لیموزین سبک رفتاری سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

وہ ایک خاص کام انجام دینے خاص طور پر تہران آیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ چند منٹ کے لیے کار پاگل خانے کے قریب ٹھہرے گی اور اسے اتر کر اندر جانا پڑے گا۔ اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کچھ سیاسی کارکن ارونا کو اغوا کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے ضلع کی انتظامیہ کا خیال تھا کہ وہ شہزادی جمیلہ سمنانی نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی مدد نہیں کرنا چاہیے۔ خیام کو شاہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تاہم اس نے ارونا ایرانی کو مجبور سمجھتے ہوئے اپنی حویلی میں پناہ دی تھی مگر وہ اس کی حویلی سے فرار ہوگئی اور اس نے نالے میں کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ یہ حقیقت تھی یا پھر کسی نے دستاویزات کے لالچ میں اسے نالے میں دھکا دے کر اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ ذہنی طور پر مفلوج تھی لہٰذا کسی بات کی تصدیق نہیں کرسکتی تھی۔

جب خیام کو انتظامیہ کا تعاون نہیں ملا تو اس نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود اسے پاگل خانے سے نکلوانے کی کوشش کرے گا۔ اس سلسلے میں اس نے جعلی کاغذات تیار کرا لیے تھے۔

ڈرائیور نے لیموزین کو بائیں جانب موڑا اور شاہراہ شادمان پر پہنچ گیا۔ کچھ فاصلے پر کاروں کا ایک کارخانہ بھی تھا۔ انہی عمارتوں میں کہیں پاگل خانہ بھی تھا جہاں ارونا ایرانی کو رکھا گیا تھا۔

☆☆☆

داریوش نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی، تین بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ اچانک ایک لیموزین دائیں جانب کے موڑ سے اس سڑک پر آئی اور سست رفتار سے پاگل خانے کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ دائیں جانب کاروں کا ایک کارخانہ تھا جس کے گیٹ پر دو مسلح گارڈز کھڑے تھے۔ کار کا دروازہ کھلا اور ایک کیم شحیم شخص باہر آیا اور اس نے پاگل خانے کے دروازے پر پہنچ کر کال بیل بجائی۔ ایک باوردی افسر ظاہر ہوا، ان کے درمیان کچھ گفت و شنید ہوئی پھر کار سے اترنے والے شخص نے اپنے اوور کوٹ کی جیب سے کاغذات نکال کر افسر کی طرف بڑھائے۔ اس نے روشنی میں جا کر ان کاغذات کو دیکھا پھر جالی والے فولادی دروازے کا لاک کھول دیا۔ وہ شخص اندر چلا گیا تو افسر نے دروازے کو لاک کیا اور اسے استقبالیہ کاؤنٹر سے آگے ہال کی طرف لے جانے لگا۔

”یہی خیام تھا، احمد یار تم جا کر اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ تیار رہیں۔“ داریوش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

احمد یار عمارت سے نکل گیا اور اس نے تاریکی کی آڑ لے کر اپنی کار کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ لیموزین میں بیٹھا ہوا ڈرائیور اسے نہیں دیکھ سکا تھا جبکہ داریوش نے جو عمارت کے دروازے کی آڑ میں تھا اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

☆☆☆

جب وہ ایک ہال میں پہنچے تو اس افسر نے انٹرکام پر یہ اطلاع دی کہ ایک شخص خیام شاپور جس کے پاس ایسے کاغذات ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ارونا کا باپ ہے، اپنی بیٹی کو لینے آیا ہے۔

پانچ منٹ بعد ہی سفید گاؤن پہنے ایک ڈاکٹر نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اس ہال میں آ گیا۔ ”جی فرمائیے؟“ اس نے خیام کی طرف دیکھ کر استفہامیہ انداز سے کہا۔

خیام نے اسے وہ کاغذات دکھائے تو ڈاکٹر نے افسر کو حکم دیا کہ مریضہ کو کمرا نمبر 51 میں لایا جائے۔ جب وہ چلا گیا تو ڈاکٹر نے کہا۔ ”جب مریضہ یہاں لائی گئی تھی تو بہت خاموش تھی مگر اب وہ خوب بولتی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ شاہ کی کزن ہے۔ اس کے پاس خفیہ کاغذات ہیں۔ اس کا نام ارونا کے بجائے جمیلہ سمنانی ہے۔“ خیام شا نے اچکا کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ افسر واپس آ گیا، اس کے ساتھ ارونا تھی، اس کی عمر پچیس برس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ سرو قامت اور لمبی گردن۔ اس کی گردن پر کھرونچوں کے نشانات تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں جبکہ ناک ستواں تھی۔ اس کے چہرے پر کبھی ملاحت رہی ہو گی، لیکن اب اس کے نقوش بگڑے ہوئے سے لگ رہے تھے مگر ان میں سے بھی معصومیت جھلک رہی تھی۔ اس کا لباس ملگجا سا تھا۔

افسر کے ہاتھ میں دو بریف کیس تھے جنہیں اس نے فرش پر رکھا اور واپس چلا گیا۔ خیام نے دونوں بریف کیس اٹھا کر کار کی ڈکی میں رکھے اور ارونا کو عقبی نشست پر بٹھا دیا پھر اس نے ڈرائیور کو کار آگے بڑھانے کو کہا۔

لیموزین کے ڈرائیور عباس نے کار کو بائیں جانب موڑا تو درمیانی کھڑکی کھول کر خیام نے کہا۔ ”ہم راستے میں ایک ہوٹل میں ٹھہریں گے جس کا نام ”لعل بدخشاں“ ہے۔“ وہ بولا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سن کر ڈرائیور نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

خیام نے مطمئن ہو کر کھڑکی بند کر دی۔ ساری چیزیں منصوبے کے مطابق ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ارونا پر ڈالی، وہ ہلکے سروں میں حافظ شیرازی کا کلام گنگنا رہی تھی۔

عباس اچھی ڈرائیونگ کر رہا تھا، وہ تھوڑی دیر بعد تہران کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔ دفعتاً خیام کو گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دائیں جانب سے ایک ٹرین آ رہی تھی۔

عباس نے لیموزین کی رفتار بڑھا دی اور دھواں چھوڑتی ہوئی ٹرین کے آنے سے پہلے ہی وہ ریلوے لائن کو کراس کر گئے۔

ٹھیک اسی وقت پیچھے سے آنے والی سیاہ مرسیڈیز جس میں داریوش اور دیگر افراد بیٹھے تھے، وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ڈرائیور نے بھی رفتار بڑھا دی اور ریلوے لائن کراس کر گیا۔

”تم لوگ ہوشیار رہو۔ ہم ان پر حملہ کرنے والے ہیں۔“ داریوش نے سب کو خبردار کیا۔ ”ہمیں ہر قیمت پر ارونا اور اس کے کاغذات چاہئیں۔ اگر خیام اور اس کا ڈرائیور تمہاری راہ میں آنے کی کوشش کریں تو انہیں ہلاک کرنے سے دریغ نہ کرنا۔“ وہ بولا۔

خیام کی نگاہ اچانک بیک ویو مرر پر پڑی تو اس نے سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز کو پیچھے آتے دیکھا جس کی ہیڈ لائٹس آف تھیں۔ ”عباس ہوشیار۔“ اس نے اضطراب سے کہا۔ ”ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔“

اس کے اضطراب کا ارونا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

عباس نے لیموزین کی رفتار بڑھا دی، لیکن مرسیڈیز اور ان کے مابین فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ان پر چڑھ دوڑے گی۔

آگے سڑک زیرِ تعمیر تھی۔ عباس نے جلدی میں کار کو اس سڑک پر ڈال دیا تھا اور جب بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وقت نکل چکا تھا۔ اس نے جھنجلا کر لیموزین کا انجن بند کر دیا۔ اچانک پیچھے والی کار قریب آ گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس اتنی تیز تھیں کہ خیام کو اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لینا پڑے۔ عباس گھبرا گیا اور اس نے کار کا دروازہ کھول کر اترنا چاہا کہ خیام نے شدت سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”نہیں، عباس باہر نہ جانا۔ یہیں رہو۔“

عباس تذبذب میں تھا کہ اچانک پیچھے سے آنے والی کار سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں کار کی باڈی پر آ کر پڑنے لگیں۔ فائرنگ چونکہ سائلنسر لگے ریوالور سے ہو رہی تھی اس لیے آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو کچھ نہ ہوا، لیکن پھر ایک گولی سے لیموزین کا عقبی شیشہ چھنا کے کے ساتھ ٹوٹ گیا اور ان کے جسموں سے لاتعداد کرچیاں آ کر ٹکرائیں۔ ارونا کو خطرے کا احساس ہوا تو وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

عباس نے کھڑکی کے فریم پر ریوالور ٹکایا اور جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ وہ لوگ چونکہ لیموزین کے بالکل پیچھے تھے، اس لیے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ عباس کو فائر کرنے کے لیے کافی آگے تک جھکنا پڑ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے تقریباً آدھا باہر نکل گیا تھا۔ دفعتاً ایک گولی آ کر عباس کے سینے پر لگی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ کار کی سائڈ میں گر پڑا۔

”اوہ، میرے خدا یہ کیا ہو رہا ہے!“ خیام نے اضطراری طور پر کہا۔

چار آدمی پچھلی کار کے دروازے کھول کر لیموزین کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے دو جو آگے تھے ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ داریوش نے ڈرائیونگ سائڈ کی کھلی ہوئی کھڑکی کے نزدیک آ کر کہا۔ ”تمہارا ڈرائیور مارا گیا ہے۔ اب تم اس خاتون کے ساتھ باہر آ جاؤ۔ کوئی حماقت نہ کرنا ورنہ مجھے افسوس ہو گا۔“

خیام نے مایوسی سے کار کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے اتر آیا۔ ارونا نے بھی اس کی تقلید کی۔

داریوش نے احمد یار کو حکم دیا۔ ”اس لڑکی کو کار تک پہنچاؤ۔“ وہ دونوں آدمی آگے بڑھے اور انہوں نے اسے مرسیڈیز کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ چیخنے چلّانے لگی۔ وہ ویران جگہ تھی جہاں اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ احمد یار نے ڈکی کھول کر دونوں بریف کیس نکال لیے اور کار کی لائٹس آف کر دیں۔ کھیل اس کی توقع کے برعکس بہت جلد ختم ہو گیا تھا۔ اب آخری کام رہ گیا تھا۔ خیام کو ختم کرنا... جیسے ہی داریوش نے اسے ختم کرنے کے لیے ریوالور اٹھایا، خیام نے موت کو سامنے دیکھ کر بے خوفی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ جست لگا کر سیدھا داریوش پر گرنا چاہتا تھا لیکن داریوش نے قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے اس پر فائر کیا۔ ایک ہولناک دھماکا ہوا اور گولی خیام کے سر میں پیوست ہو گئی۔ وہ درمیان ہی میں گر گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ دل دوز تھی۔ سر سے نکلنے والا خون بہتا ہوا اس کے چہرے کو رنگین کرنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک ہاتھ پاؤں مارتا رہا اس کے بعد ساکت ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر احمد یار کو جھرجھری آ گئی پھر اس نے کار کے نزدیک

جا کر خیام کا ریوالور اٹھایا، اس کے بعد دونوں بریف کیس بھی اٹھا لیے اور مرسیڈیز کی طرف بڑھنے لگا۔ اروونا نے خیام کو خون میں نہایا ہوا دیکھ لیا تھا، اس لیے وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

''اسے خاموش کراؤ۔'' داریوش نے اپنا ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے حکم دیا۔

اروونا کی آواز تھوڑی دیر کے بعد آنا بند ہوگئی، ان کے ایک ساتھی افراسیاب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دونوں بریف کیس مرسیڈیز میں رکھ کر اس نے ایک بیلچہ ڈکی سے نکالا اور کھدائی کرنے لگا جب گہرائی تین فٹ ہوگئی تو انہوں نے دونوں لاشوں کو گڑھے میں ڈالا اور اس پر مٹی ڈال کر برابر کر دی۔ طے یہ پایا کہ ان کا ایک ساتھی لیموزین ڈرائیو کرتا ہوا کسی ویران سی جگہ پر لے جا کر اسے کھڑا کر دے گا۔

جب وہ کام ختم کر کے مرسیڈیز میں بیٹھ گئے تو داریوش نے سیٹ پر رکھے ہوئے ایک بریف کیس کو کھولا اور اس کی دستاویزات چیک کیں۔ ''میرا خیال ہے کہ کام ہو گیا۔ ہم ان سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکیں گے۔'' اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

خوش جمال و خوش خصال سائرس قدیر کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کے دو ناولز نے ریکارڈ قائم کیا تھا۔ پبلشر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ان کے ادارے سے ناول شائع کروائے۔ وہ اسے منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کو تیار رہتے تھے۔

قدیر اٹھائیس برس کا صحت مند اور کسرتی بدن کا حامل جوان تھا۔ قامت کے لحاظ سے وہ عام نوجوانوں سے ممتاز تھا اس لیے اس کے ساتھی اسے مشورہ دیا کرتے تھے کہ اسے ناول نگاری کرنے کے بجائے والی بال ٹیم میں ہونا چاہیے۔

اس کے لکھنے کا انداز سب سے جدا تھا۔ وہ ہاتھ سے لکھتا تھا اور ہر تحریر کی کاربن کاپی بھی تیار کرتا تھا کہ اگر ایک کاپی ضائع ہو جائے تو وہ دوسری استعمال کر سکے۔ اس وقت وہ تہران کے ایک مضافاتی ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں تہران کے بہت سے مصنفوں نے کمرے کرائے پر لے رکھے تھے، اس سال وہ اپنی کہانیوں کا ایک مجموعہ مارکیٹ میں لانا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی ایک اشتہاری ادارے میں کاپی رائٹنگ کرتی تھی جس کا اسے اچھا معاوضہ مل جاتا تھا۔ وہ دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو سہل انداز سے چلا رہے تھے۔

انہیں قسمت سے کوئی شکایت نہیں تھی سوائے اس کے کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اس بارے میں تردد کا شکار بھی نہیں تھے کیونکہ ابھی ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور وہ قدرت سے ناامید بھی نہیں تھے۔

وہ انگڑائی لے کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ رات تہران کے شانوں پر اتر رہی تھی۔ روشنیاں جلنا شروع ہوگئی تھیں، خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

سائرس نے سوچا کہ اس نے اچھی کہانی لکھ لی ہے لہٰذا اسے انعام ملنا چاہیے۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ ہوٹل کے ریستوران میں جائے اور قہوہ نوش کرے۔ اس کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے نیلی کاپی اٹھائی اور اس پر تاریخ ڈال دی۔ اس کے بعد اس نے کاپی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

ریستوران میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ سائرس نے گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی اور ایک میز کے سامنے رکھی نشست سنبھال لی۔

دفعتاً اس کی نگاہ ہوشنگ پر پڑی جو اشارے سے اسے اپنی میز پر بلا رہا تھا۔ سائرس اپنا کپ لے کر اس کی میز پر چلا گیا۔ ہوشنگ ایک اچھا پبلشر تھا۔ اس کے سیاسی کالم بھی اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔ اسے فخر تھا کہ اس نے کئی ادیبوں کو متعارف کرایا ہے۔ اس کا نصف سر بالوں سے عاری تھا اور چہرے پر باریک سی مونچھیں تھیں جیسے کسی شریر بچے نے پنسل سے ہونٹ کے اوپر لکیر کھینچ دی ہو۔

''تم سائرس قدیر ہو نا؟'' اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہاری تصویر ایک ناول کی پشت پر دیکھی تھی۔ آج کل تو تمہارا ناول بیسٹ سیلر لسٹ پر ہے۔''

سائرس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک جہاندیدہ پبلشر ہو، تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔''

''اگر تم نے اپنا نیا ناول مکمل کر لیا ہو تو میں اس کے بارے میں بات کروں؟'' ہوشنگ نے کہا۔ ''میں اسے شائع کرنے کا خواہش مند ہوں!''

''میں ناول پر نظرثانی کر رہا ہوں۔'' سائرس نے جواب دیا۔ ''پہلے اس مرحلے سے گزر جاؤں تو پھر تم سے یا کسی اور پبلشر سے رجوع کروں گا۔ فی الحال میں کہانیوں کے ایک مجموعے پر کام کر رہا ہوں۔''

وہ تھوڑی دیر تک ادب پر گفتگو کرتے رہے پھر ہوشنگ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آج شام مجھے داراب کے ساتھ رہنا ہے ممکن ہے کہ وہ باہر میرا انتظار کر رہا ہو۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو کل میرے ساتھ ڈنر کرو۔ شیراز سے امان بھی آیا ہوا ہے۔ اسے تو تم جانتے ہو گے؟ وہ شیراز ٹائمز میں مزاحیہ کالم لکھتا ہے۔''

''میں تمہارے ساتھ ڈنر میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔'' سائرس نے معذرت کی۔ ''اس لیے کہ میں کل اصفہان جا رہا ہوں۔ وہاں مجھے آقائے مالک کی پریس کانفرنس کی رپورٹنگ کرنی ہے۔ وہ شاہ کی پالیسیوں کے بارے میں کوئی اہم اعلان کرنے والے ہیں۔''

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' ہوشنگ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''میرا خیال ہے کہ مہینے میں ہماری ایک آدھ ملاقات ہوتی رہے تو یہ ہم دونوں کے حق میں بہتر رہے گا۔''

سائرس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور ہوشنگ سے مصافحہ کیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی راہ ہو لیے۔

سائرس جب اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس کی بیوی افروز بستر پر اوندھی لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔ وہ اس کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال تھا کہ تم سو چکی ہو گی۔'' سائرس نے اپنے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

''یہ کتاب دراصل اتنی دلچسپ ہے کہ میں سونا ہی بھول گئی۔''

وہ گلابی رخساروں والی آہو چشم عورت تھی جس کی قربت میں مشامِ جاں مہکنے لگتا۔ سائرس اس سے شادی کرنے کے بعد اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ وہ اس کے مسودوں کو سنبھال کر رکھتی اور انہیں باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ اس کی کہانی پر بحث کرتی اور اپنی رائے کا اظہار بھی کرتی تھی۔

''تمہاری کہانی ختم ہو گئی ہو تو مجھے دو، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم نے کیا اینڈ کیا؟'' بقیہ کہانی وہ پڑھ چکی تھی۔

''بسر و چشم، ملکہ عالیہ۔'' اس نے ادب سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور کاپی اس کے حوالے کر دی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھونے لگا تو اس اثنا میں افروز نے بقیہ کہانی پڑھ لی تھی۔ جب اس نے اپنے تکیے پر سر ٹکایا تو افروز نے کہا۔ ''اینڈ اچھا ہے، لیکن کہانی میں تم نے باپ کو بہت سخت گیر دکھایا ہے، کوئی باپ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ بولی۔

''دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے، ہر طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ میرا باپ چونکہ سخت مزاج تھا۔ شاید میں نے اس کا اثر اپنی کہانی میں لے لیا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اس کے باوجود میں یہی کہوں گی کہ تم نے اس میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔'' اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

''اگر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار نہیں کروں گا تو کہانی نہیں بنے گی۔'' وہ بولا۔ ''چنانچہ میں اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا۔'' اس نے وضاحت کی پھر دوسرے کمرے میں جا کر اس کاپی کو الماری کے نچلے شیف میں رکھ کر...... لاک کر دیا جہاں اس کے بہت سے مسودے بھی رکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اصفہان پہنچ کر سائرس نے سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کے بعد اپنی رپورٹ اخبار کو ارسال کر دی۔

دوسرے روز کانفرنس ہال میں اس کی ملاقات ثریا خاکبازان سے ہوئی۔ وہ چھریرے بدن کی مالک تھی اور اس کے بال تراشیدہ تھے۔ وہ دانش گاہ تہران کی سند یافتہ تھی۔ وہاں دو برس کے لیے سائرس اور اس کا ساتھ رہا تھا دونوں ایک دوسرے سے بے حد مانوس تھے پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے شکاگو چلی گئی۔

پریس کانفرنس میں اسے دیکھ کر وہ لوگوں میں راستہ بناتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ ''تم یہاں کیسے آ گئے؟''

''میں اپنے اخبار کی طرف سے اس کانفرنس کی کوریج کے لیے تہران سے آیا ہوں۔'' سائرس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''تم تو عورتوں کے رسالوں میں کالم نویسی کرتی ہو، تم نے سیاست کی دنیا میں کیسے قدم رکھ دیا؟''

''میں اپنے میگزین کی طرف سے تازہ ترین صورت حال پر ایک فیچر تیار کر رہی ہوں جس کا عنوان ہے۔ ''شاہی راج کا مستقبل''... ارے ہاں! تمہارا ایک ناول تو بیسٹ سیلرز لسٹ پر پہنچ گیا ہے۔ تم اس کے بعد کچھ لکھ رہے ہو یا نہیں؟'' اس نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا تو سائرس اسے اپنی نئی تحریروں کے بارے میں بتانے لگا۔

باتیں کرتے ہوئے وہ وہاں سے نکلے اور ایک کافی شاپ میں چلے گئے۔

☆☆☆

پارٹی آفس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے میٹنگ ہال میں بیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ساری نشستیں ایک گول میز کے گرد تھیں۔ اس گول میز کے وسط میں ایک عقاب کا مجسمہ رکھا تھا جو کانسی کا بنا ہوا تھا۔ غالباً وہ پارٹی کا نشان تھا۔ پارٹی لیڈر رہدایتی کے لیے ایک قیمتی کرسی رکھی ہوئی تھی۔

اپنی محنت سے اس نے پارٹی میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس کے فیصلوں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پارٹی کو اس وقت فنڈز کی ضرورت ہے۔ وہ کسی طریقے سے بھی حاصل کیے جائیں اس کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ لڑکی اور اس کی دستاویزات اب ہمارے پاس ہیں تو ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

”کیا ہم ان دستاویزات کو انقلابیوں کے حوالے کردیں گے؟“ داریوش نے پوچھا۔

”ہاں، وہ اس کی اچھی قیمت دے سکتے ہیں۔“ ہدایتی نے کہا۔ ”مگر شاہ کی پارٹی سے بھی سودے بازی ہو سکتی ہے مگر اس میں ایک خطرہ ہے جب شاہ کے ہرکاروں کو یہ خبر ملے گی تو وہ خوں خوار بھیڑیوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھریں گے۔ چنانچہ ہم ان دستاویزات کو دو حصوں میں تقسیم کردیں۔ ایک حصہ ہم انقلابیوں کو دیں گے اور دوسرا شاہ کے حمایتیوں کے سپرد کردیں گے۔ ہم نہایت سادگی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ یہی کچھ لگا ہے۔ پھر یہ کہ اردنا کی موجودگی میں وہ کچھ نہیں کہہ سکیں گے۔ وہ اپنی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہو گی۔“ وہ بولا اور پارٹی میٹنگ تھوڑی دیر بعد ختم ہوگئی۔

☆☆☆

وہ اس وقت ایک ہوٹل میں تھے۔ ملیحہ کو ایک فون کال کا انتظار تھا جو ایرج کی طرف سے آنے والی تھی۔ اس کے ساتھ اس کمرے میں زریاب تھا۔ وہ کھڑکی کے نزدیک کھڑی تھی اور ٹریفک کا جائزہ لے رہی تھی۔ زریاب غسل کر کے باہر نکل آیا تو ملیحہ نے کہا۔ ”یہ انتظار تو مار ڈالتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایرج کب ہمیں فون کرے گا؟“

زریاب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور تولیے سے منہ پونچھنے لگا۔ پانچ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو اس نے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ تھوڑی دیر تک بات کرتا رہا، اس کے بعد اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر ملیحہ سے بولا۔ ”خبر ملی ہے کہ کمیونسٹوں نے ان دستاویزات کا انقلاب کے داعیوں سے سودا کرلیا ہے۔ کل صبح سات بجے ان کا ایک ایجنٹ ان دستاویزات کو بریف کیس میں رکھ کر لائے گا اور ان کے حوالے کر دے گا۔ اس بریف کیس پر ایک اژدہے کا مونوگرام بنا ہوا ہے۔“

”اس وقت تو ریلوے اسٹیشن پر ہجوم ہوگا۔ کیا ایرج کو معلوم ہے کہ دستاویزات کون لا رہا ہے؟“ ملیحہ نے پوچھا۔

”نہیں، مگر اسے یہ معلوم ہے کہ لانے والا چوڑے نالے پر بنے ہوئے پل کو پار کر کے وہاں تک پہنچے گا۔ اس کا نام بروجردی ہے۔ انقلابی صرف ان دستاویزات کو چیک کرنے کے لیے پانچ ہزار امریکی ڈالر ادا کر رہے ہیں۔“

ملیحہ نے تہران کا ایک نقشہ نکالا اور میز پر پھیلا دیا۔ وہ بولی۔ ”جب وہ نالے کو پار کر کے اس گلی میں آئے گا اور پارک کی طرف بڑھنا چاہے گا تو تم اسے یہاں روک سکتے ہو۔“ اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص کو تم بریف کیس سے پہچان سکتے ہو۔“ ملیحہ نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اس پر اژدہے کا مونوگرام بنا ہوا ہے، جو غالباً کمپنی کا نشان ہے۔“

”تم صبح کے وقت کہاں ہوگی؟“ زریاب نے سوال کیا۔

”اسٹیشن پر۔“ وہ بولی۔

زریاب نے اس کی طرف سے پیٹھ موڑ لی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

☆☆☆

بروجردی کو پارٹی میں زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی مگر اسے توقع تھی کہ جب وہ اس مشن کو مکمل کرلے گا تو اس کا شمار عہدے داروں میں ہونے لگا۔ وہ اکتیس برس کا ایک جوان شخص تھا۔

پارٹی آفس سے اسے ایک بریف کیس دیا گیا تھا جو اسے اسٹیشن تک پہنچانا تھا۔ اسٹیشن تک پہنچنے سے پہلے اسے ایک نالا پار کرنا تھا۔ وہ نالا اس علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا اس کا پاٹ بھی بہت چوڑا تھا اسی لیے اس پر پل بنایا گیا تھا۔

نالے کو جانے والی گلی سنسان تھی اور وہاں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے نالا پار کیا اور کوچۂ مرجان پر آ گیا۔ اچانک دو رویہ درختوں کی آڑ سے ایک شخص نکلا اور اس کے پہلو میں چلنے لگا۔ اس کے جسم پر سفید پتلون اور قمیص تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ہلکا چاکلیٹی سوئٹر پہن رکھا تھا۔ وہ ایک عام شکل وصورت کا نوجوان تھا۔

”ذرا سنیے گا۔“ اس نے کہا۔

بروجردی ٹھہر گیا۔ ”جی فرمائیے؟“

”میں ریلوے اسٹیشن جانا چاہتا ہوں۔ اس کا راستہ کون سا ہے؟“

بروجردی کہنے والا تھا کہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ چل سکتا ہے، کیونکہ وہ خود بھی اسی سمت میں جا رہا تھا، لیکن پھر خیال آیا کہ اسے ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اسٹیشن تک تنہا جائے۔

”وہ ٹاور ہے نا؟ وہ دیکھ رہے ہو؟ تمہیں وہاں تک جانا ہے۔ اس طرف سے ایک گلی وہاں تک جاتی ہے اگر تم...“

تبھی اس کے پیٹ میں درد کی ایک خوفناک لہر اٹھی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس آنے والے نوجوان نے اس کے پیٹ میں ایک خنجر پیوست کر دیا تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔ اگر وہ یہ کام نہ بھی کرتا تو چند لمحوں کی بات تھی پھر وہ بریف کیس خود ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔

☆☆☆

سائرس کو اصفہان کے ایک بڑے پبلشر نے آفر دی کہ اگر وہ اپنے زیرِ تکمیل مسودے اسے دکھا دے تو اس کی اشاعت کے بارے میں فیصلہ کر کے اسے بھاری رقم دے سکتا ہے۔

سائرس نے نہ صرف یہ کہ افروز کو اصفہان بلایا بلکہ اسے ہدایت دی کہ وہ اس کے ناول اور کہانیوں کے سارے مسودے بھی ساتھ لیتی آئے۔ تہران سے اصفہان کے لیے ٹرین صبح ہی روانہ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا اس نے رات ہی کو سفر کی تیاری کر لی۔

افروز نے اپنے شوہر کی ساری زیرِ تکمیل تحریریں ایک بریف کیس میں بھر لیں۔ وہ اس بریف کیس کو ایک اسٹور سے خرید کر لائی تھی۔ وہ ایک عام سا بریف کیس تھا جس کے اوپری حصے پر ایک اژدہا بنا ہوا تھا، اس کا بریف کیس بھورے رنگ کا تھا۔

اس کے علاوہ اس کے پاس دو سوٹ کیس بھی تھے۔ جن میں اس کے اور سائرس کے کپڑے تھے۔ وہ ٹیکسی میں اسٹیشن تک تو آ گئی تھی مگر اب اپنا سامان سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ بالآخر اسے ایک قلی دکھائی دیا۔

قلی نے دو ریال طلب کیے۔ افروز نے اسے فوراً ہی ادائی کر دی اور ہدایت دی کہ وہ اس کا سامان 3 نمبر پلیٹ فارم پر پہنچا دے۔

اس کے بعد وہ ٹکٹ لینے کے لیے بکنگ آفس کی طرف چلی گئی۔

ٹرین آنے میں کچھ تاخیر تھی چنانچہ اس نے نیوز اسٹینڈ سے ایک اخبار خرید لیا۔ مسافروں کی سہولت کے لیے پلیٹ فارم پر بہت سی بنچیں پڑی تھیں۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھ کر اسنیکس کو حلق سے اتارنے لگی اور کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لیتی ہوئی تیسرے پلیٹ فارم کی طرف بڑھنے لگی۔ ٹرین آنے میں کچھ تاخیر تھی لیکن اب اسے اپنے سامان کی تلاش تھی۔

☆☆☆

ساڑھے چھ بجے تھے اور فضا میں دھند لکا پھیلا ہوا تھا۔ زریاب نے بروجردی کی لاش نالے میں پھینک دی اور اپنے دستانے بھی اتار کر پانی میں اچھال دیے۔ یہ قتل اس نے اتنی احتیاط سے کیا تھا کہ اس پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بریف کیس اٹھایا اور اسٹیشن کے قریب ایک کیفے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے لیے سبز چائے کا آرڈر دیا۔ اس نے ایک بار پھر بریف کیس کے اوپری حصے کو دیکھا۔ اس پر اژدہے کا مونوگرام بنا تھا جو اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ اس نے اپنا کام درستی سے انجام دیا ہے جب اس کے اعصاب پُرسکون ہو گئے تو اس نے اپنا بل ادا کیا اور بریف کیس تھام کر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ٹکٹ خرید کر وہ آگے گیا، اب اسے ملیحہ کی تلاش تھی جس نے اس سے وہاں ملنے کا کہا تھا۔

☆☆☆

اپنے سامان کو دیکھ کر افروز مطمئن ہو گئی۔ اس کے سوٹ کیس قلی نے پلیٹ فارم پر کچھ اس طرح جما دیے تھے کہ وہ انہیں اٹھا کر نہایت آسانی سے ٹرین میں رکھ سکتی تھی۔ اسی دوران میں ٹرین آ گئی۔ لوگ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ قلی سامان اٹھا کر کمپارٹمنٹس میں رکھ رہے تھے۔ افروز کی نگاہ اپنے سامان پر پڑی تو اسے محسوس ہوا کہ قلی سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس کے دونوں سوٹ کیس تو تھے مگر اس کا وہ بریف کیس وہاں نہیں تھا جس میں اس کے شوہر کے مسودے تھے۔

اس نے وہ دونوں سوٹ کیس تو کمپارٹمنٹ میں رکھ دیے پھر اس کے بعد اس قلی کو تلاش کرنے لگی جس نے اس کا سامان وہاں تک پہنچایا تھا۔ اگر وہ پلیٹ فارم پر تھا تو اسے تلاش کرنا نہایت آسان تھا، اس لیے کہ اس کا نمبر 121 تھا اور اس کے دائیں کان کی لو کٹی ہوئی تھی۔ قلی اسے گیٹ کے قریب کھڑا دکھائی دیا۔ ”اے! تم نے میرا بریف کیس کیوں نہیں اتارا؟“ وہ پوچھنے لگی۔ ”دو سوٹ کیسوں کے علاوہ ایک بریف کیس بھی تو تھا؟ وہ کہاں ہے؟“

”میں نے آپ کا سارا سامان پلیٹ فارم پر رکھ دیا تھا۔ ممکن ہے کوئی اچکا لے گیا ہو۔“ وہ بولا۔

”سوٹ کیس ہیں مگر بریف کیس نہیں ہے۔“ وہ چیخی۔ دو چار راہ گیر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قلی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

”مجھے بتاؤ کہ وہ بریف کیس کہاں ہے؟“ افروز نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ممکن ہے کہ آپ کے خاوند نے وہ بریف کیس اٹھا لیا ہو اور ٹرین میں بیٹھ گئے ہوں۔ آپ ان سے تو پوچھیے۔“ وہ بولا۔

”میرے خاوند اس وقت اصفہان میں ہیں۔ وہ میرے ساتھ نہیں ہیں۔ میں ان سے کیا پوچھوں؟“ افروز نے جھنجھلا کر کہا۔

”معاف کیجیے گا، جس شخص نے مجھے ٹپ دی تھی، میں سمجھا وہ آپ کے خاوند ہیں۔“

”کون؟ وہ کون تھا؟“ افروز نے پوچھا۔

”وہ سیاہ رنگ کی پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوا تھا۔ اس نے نارنجی جیکٹ بھی پہن رکھی تھی۔“

”اس آدمی نے جب تمہیں ٹپ دی تھی، اس کے بعد کیا کیا تھا؟“ افروز نے سوال کیا۔

”وہ بریف کیس کے اوپر مونوگرام کو دیکھ کر چونکا تھا۔ اس کے بعد اس نے اسے اٹھایا اور چلتا بنا۔“ قلی اطمینان سے بولا۔

”اور تم نے اسے بریف کیس لے جانے دیا؟“ اس نے کھا جانے والے لہجے میں کہا۔

قلی نے دیکھا کہ وہ خاتون اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے تو اس نے ٹرالی ایک طرف کھڑی کی اور بھیڑ میں شامل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ احساسِ بے بسی سے افروز کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دفعتاً اسے وہ بریف کیس نظر آ گیا۔ وہ ایک سفید جیکٹ والے کے ہاتھ میں تھا جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

☆☆☆

زریاب کو پلیٹ فارم پر پہنچنے کے بعد ملیحہ کی تلاش تھی کہ ایک عورت نے پیچھے سے اسے آواز دی۔ ”اے مسٹر! ٹھہرو، یہ بریف کیس میرا ہے۔“

”آپ سے غلطی کا احتمال بھی تو ہو سکتا ہے؟“

”مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہو رہی ہے۔“ وہ عورت بولی پھر اس نے بریف کیس لینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ زریاب گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ بہت سے مسافر اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس کیں کیونکہ اس بریف کیس میں انتہائی قیمتی کاغذات تھے۔

”یہ آپ کا بریف کیس نہیں ہے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا اور بریف کیس اسے دکھایا۔

افروز چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد پژمردگی سے بولی۔ ”معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو زحمت دی۔ [illegible] میرا بریف کیس بھورا ہے۔“ وہ مردہ قدمی سے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف چل دی۔ ٹرین چلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

ملیحہ ایک ستون کی آڑ سے نکل کر زریاب کے نزدیک آ گئی۔ ”وہ عورت کیا کہہ رہی تھی؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ زریاب نے بے بسی سے کہا۔ ”مگر اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”دستاویزات تمہیں مل گئیں؟“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

وہ اسے لے کر ایک تنہا گوشے میں آ گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”میں نے ان کاغذات کا جائزہ لیا ہے یہ ادھورے ہیں۔ معلوم نہیں باقی کہاں ہیں... اور وہ خاتون کہہ رہی تھی کہ یہ بریف کیس میرا ہے۔ نہ جانے کیا قصہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”ممکن ہے کہ وہ انقلابیوں سے تعلق رکھتی ہو؟“ ملیحہ نے قیاس لگایا۔ ”مگر میں تو توقع کر رہی تھی کہ وہ کسی آدمی کو بھیجیں گے۔“

”وہ واپس آ رہی ہے۔“ زریاب سرگوشی میں بولا اور اس نے افروز کی طرف اشارہ کیا جو اسٹیشن ماسٹر کے آفس سے نکل رہی تھی۔ جب ٹرین نے پے در پے تین سیٹیاں دیں تو وہ جا کر اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کا پیچھا کیا جائے۔ ان دستاویزات سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ ممکن ہے اس کے ذریعے ہم اروناتک بھی پہنچ جائیں۔“

ملیحہ نے اثبات میں سر ہلایا اور دوڑتی ہوئی ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئی۔ زریاب چند لمحوں تک وہاں کھڑا رہا، اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر کے آفس میں داخل ہو گیا۔ وہ گردن جھکائے ایک فارم پُر کر رہا تھا۔ اس کی آمد پر اس نے سر اٹھا کر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں ایک گم شدہ بریف کیس کی رپورٹ درج کرانے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”ایک خاتون تھوڑی دیر پیشتر یہاں آئی تھی۔ اس نے بھی ایسی رپورٹ درج کرائی تھی۔“

”اچھا تو کیا میری شریکِ حیات ایسی رپورٹ درج کرا چکی ہے؟“

”کیا تمہارا نام سائرس قدیر ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

زریاب نے اثبات میں سر ہلایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ چند منٹ پہلے یہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ بریف کیس مل جائے تو اسے اصفہان کے ایک پبلشر کے پتے پر ارسال کر دیا جائے، میں اس پبلشر کا پتا فارم پر لکھ رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"معاف کیجیے گا میں نے آپ کو زحمت دی۔" زریاب نے معذرت طلب کی اور اس کے آفس سے نکل آیا۔ اس نے بالکونی سے پلیٹ فارم پر نگاہ دوڑائی۔ ٹرین جا چکی تھی اور وہاں سناٹا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ سائرس قدیر کون ہے؟ وہ اور اس کی بیوی قیمتی دستاویزات اور ارونا کے معاملے میں کیسے ملوث ہو گئے؟

☆☆☆

پرویز اسدی اپنے آفس میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ہدایتی نے اسے فون پر بتایا تھا کہ پارٹی کا ایک آدمی بروجردی تہران ریلوے اسٹیشن پر ایک بریف کیس میں دستاویزات لے کر آئے گا۔

اس کے چھوٹے سے آفس میں فلمی اداکاراؤں کی تصویریں لگی تھیں۔ وہ بہ ظاہر فلم ڈسٹری بیوشن کا کام کرتا تھا مگر درپردہ انقلابیوں کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ شاہ اور اس کے حمایتیوں سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اس کے والد کو مظالم کا نشانہ بننا پڑا تھا۔

اس نے وقت مقررہ پر اسٹیشن پر بروجردی کا انتظار کیا، لیکن وہ اسے پلیٹ فارم پر نظر نہیں آیا۔

جب بروجردی دیر تک نہیں آیا تو پرویز نے ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیا۔ اور چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گیا جہاں ایک گھڑی لگی تھی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کا مطلوبہ بریف کیس دو سوٹ کیسوں کے اوپر ہی رکھا تھا۔ اس کا رنگ بھورا تھا اور اس کے اوپری حصے پر ایک اژدہے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ پرویز نے اسے اٹھا لیا اور نزدیک کھڑے ہوئے قلی کو ایک ریال ٹپ دی جس نے وہ بریف کیس وہاں ٹرالی سے اٹھا کر رکھا تھا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

اپنے آفس پہنچ کر وہ فلم کے فوٹو سیٹ دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس نے فوٹو سیٹ کو میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے احمد یار کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ احمد یار، ہدایتی کی پارٹی کا ایک عہدے دار ہے اور اس پر ہر معاملے میں اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

احمد یار نے آفس میں داخل ہونے کے بعد گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔ "بروجردی کہاں ہے؟"

"وہ مجھے اسٹیشن پر نہیں ملا، حالانکہ میں نے اس کا کافی انتظار کیا تھا۔" پرویز بولا۔ "شہزادی کی دستاویزات کہاں ہیں؟"

"تمہارے ہی پاس ہوں گی۔" احمد یار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مذاق چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کیا بروجردی نے تمہیں نہیں دیں؟"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، وہ مجھے نہیں ملا۔ دستاویزات اسی کے پاس ہوں گی۔ تم سکون سے بیٹھو، میں نے پانی چڑھا دیا ہے، تھوڑی دیر میں چائے تیار ہو جائے گی۔ ایک کپ پی کر جانا۔"

"مگر وہ کہاں چلا گیا؟"

"میں ریلوے اسٹیشن پر گیا تھا اور ٹھیک گھڑی کے پاس جا کر میں نے جائزہ لیا تو اس بریف کیس کو دیکھا۔ اسے قلی وہاں ٹرالی سے اتار کر رکھ رہا تھا۔ میں اسے اٹھا کے لے آیا۔" اس نے میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک بریف کیس نکالا اور اسے دکھا کر کہا۔ "اس پر اژدہے کا مونوگرام بنا ہوا ہے۔ تاہم جب میں نے اپنے آفس آ کر اسے کھولا تو معلوم ہوا کہ مجھے دھوکا ہوا ہے، اس لیے کہ اس میں وہ کاغذات ہی نہیں ہیں۔" پرویز نے وضاحت کی۔

احمد یار نے بریف کیس کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور ساری چیزیں باہر نکال لیں۔ اس میں نیلے رنگ کی بہت سی ڈائریاں تھیں، ان کے علاوہ ٹائپ شدہ اور ہاتھ سے لکھے ہوئے کاغذات بھی تھے۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہو۔" پرویز نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مصنف کے مسودے ہیں جس کا نام سائرس ہے۔ غالباً کوئی ناول نگار ہے۔"

احمد یار نے ایک نیلی نوٹ بک اٹھائی تو اسے کھولنے پر اس میں سائرس کا پتا لکھا دکھائی دیا۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے پرویز کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگا۔ "میں نے اس پتے پر اپنے آدمیوں کو دوڑایا تھا، مگر وہاں کوئی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ میرے آدمی نے فلیٹ میں گھس کر تلاشی بھی لی تو ایسا کوئی دوسرا بریف کیس نہیں ملا۔ اس نے آس پڑوس میں پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ ان دنوں وہ اصفہان گیا ہوا ہے۔ میں چاہتا تو اصفہان تک اپنے آدمی روانہ کر سکتا تھا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سائرس اس معاملے میں ملوث نہیں ہے۔ اس نے ہماری دستاویزات نہیں لی ہیں۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ بروجردی کا کیا بنا؟ وہ کہاں چلا گیا؟" احمد یار نے پوچھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے کہ تمہارا آدمی اسٹیشن تک نہیں پہنچا۔" پرویز نے قیاس آرائی کی۔

"بالکل۔" احمد یار نے جواب دیا۔ "اگر وہ اسٹیشن پر نہیں پہنچا تو اس کا مطلب ہے اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔" وہ توقف سے بولا۔ "اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں یہ بریف کیس لے لوں؟ پارٹی کے عہدے داروں کو بھی تو مطمئن کرنا ہے؟ میں اسے دکھا کر انہیں مطمئن کر سکتا ہوں۔"

"لے جاؤ۔ مجھے ان مسودوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

احمد یار نے بریف کیس اٹھا لیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پرویز نے احمد یار کے جانے کے بعد اپنے آدمیوں کو فون کیا اور انہیں ہدایت دی کہ وہ سائرس کا پتا لگائیں اور معلوم کریں کہ اصل خفیہ دستاویزات کہاں ہیں؟

پرویز یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ سائرس ایک معصوم سا مصنف ہے اور اس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ قیمتی دستاویزات اسی کے پاس ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر اپنا بریف کیس تبدیل کر لیا ہے۔

☆☆☆

سائرس اصفہان کے ریلوے اسٹیشن پر بے چینی سے افروز کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا۔ دائیں جانب ثریا کھڑی تھی اور اس کی متلاشی نگاہ بھی ٹرین سے اترنے والوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد افروز دکھائی دی۔ وہ درمیانی کمپارٹمنٹ سے اتر رہی تھی۔ سائرس اس کی طرف دوڑا۔ جب وہ اس کے نزدیک پہنچا تو سوٹ کیس پلیٹ فارم پر رکھے جا چکے تھے۔ سائرس نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے، وہ اسے دیکھ کر مسکرا نہیں رہی تھی، اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر سوگواریت طاری تھی۔

"خوشی ہے کہ تم سلامتی سے یہاں تک آ گئیں۔" سائرس نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بغیر زندگی سونی سی لگنے لگتی ہے۔"

"اوہ سائرس!" افروز کے منہ سے اتنا ہی نکلا اور اس کے بعد وہ سسکیاں لینے لگی۔

"ارے کیا ہوا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے نا؟" پھر وہ اسے اور ثریا کو لے کر قریبی ریستوران میں آ گیا اور اس نے افروز کے لیے کافی کا آرڈر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افروز نے بلاکم و کاست اسے سارا واقعہ سنا دیا اور دوبارہ سسکیاں لینے لگی۔ سائرس کا دل جیسے ڈوب گیا۔ اس کے باوجود اس نے افروز کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "چلو کوئی بات نہیں۔ وہ ساری کہانیاں اور ناول میرے دماغ میں ہیں۔ میں انہیں پھر سے لکھ لوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی کوئی کاربن کاپی مل جائے۔ چلو اب رونا بند کرو اور مسکرا کر ایک بار میری طرف دیکھو۔" اس نے توقف سے کہا۔ "تم نے اس سوٹ کیس میں کاربن کاپیاں تو نہیں رکھی تھیں؟ سوچ کر بتاؤ؟"

ویٹر اس دوران میں کافی کی پیالی ان کی میز پر رکھ گیا تھا۔ افروز نے کافی کے دو گھونٹ لیے اس کے بعد دماغ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم تھوڑی دیر بعد سوالات کرو۔"

"او کے، ہم تہران چل کر دیکھ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تم کاربن کاپیاں وہیں چھوڑ آئی ہو۔" وہ بولا۔ "اس لیے منہ بسورنا چھوڑو اور نارمل ہو جاؤ۔" خود پر قابو رکھتے ہوئے ایسے جملے بولنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ وہ افروز کو تسلی دے رہا تھا مگر خود اس سے ہمدردی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

جب افروز نے یکے بعد دیگرے دو پیالیاں اپنے حلق سے اتار لیں تو وہ ریستوران سے اٹھ گئے۔ اسٹیشن کے باہر انہیں فوراً ہی ٹیکسی مل گئی۔

وہ رات سائرس پر بہت بھاری تھی، اسے اپنا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ بالآخر رات کے کسی پہر سائرس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

افروز نے اصفہان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، اس لیے وہ صبح ہوتے ہی ہوٹل کے کمرے سے نکل آیا اور اس نے ایک بوتھ سے ثریا کو فون کیا کہ وہ تین روز کے لیے تہران جا رہا ہے وہ اس کی غیر موجودگی میں افروز کا خیال رکھے۔ وہ تہران جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا، کیونکہ جلد از جلد گھر پہنچ کر اپنے مسودوں کی کاربن کاپی تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کمپارٹمنٹ میں سامان رکھا اور خود جا کر جنرل کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گیا۔ وہاں تین افراد پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے دو مرد اور ایک عورت۔ ایک مرد دبلا پتلا اور دراز قامت تھا جبکہ دوسرا اس کے برعکس۔ وہ دونوں دروازے کے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے، لیکن ان کی آواز سرگوشیوں سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کے خلاف سازش کر رہے

ہیں۔ سائرس انہیں ریلوے اسٹیشن پر انتظار گاہ میں بھی دیکھ چکا تھا۔

عورت البتہ اس کی طرف سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔ سائرس کو صرف اس کے سیاہ بال دکھائی دے رہے تھے۔

سائرس اس عورت سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ جب ایک بار ٹرین رکی اور وہ عورت اٹھ کر ریستوران کی طرف جانے لگی تو سائرس وقفے سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اچانک اس عورت نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ سائرس کے خرمن پر جیسے بجلی گر گئی۔

اس عورت کا چہرہ بیضوی، آنکھیں سبز اور ہونٹ بے حد پتلے تھے۔ دودھیا رنگت اور صراحی دار گردن کی وجہ سے وہ چاند کی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ گلابی رنگ کا کوٹ اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔

وہ ڈائننگ ہال میں جا کر دروازے کے قریب والی میز پر بیٹھ گئی۔

سائرس نے اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیا۔ جب ویٹر کھانا لے آیا تو تھوڑی دیر بعد سائرس اپنی جگہ سے اٹھا اور اس عورت کے قریب پہنچ گیا اور اپنی گردن کو خم کر کے بولا۔ میری عادت ہے کہ میں تنہا کھانا نہیں کھاتا۔ اگر اجازت ہو تو میں اپنا کھانا آپ کی میز پر لے آؤں؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح ایک بھوکا کھانا تو کھا لے گا۔" وہ محظوظ ہو کر بولی۔

سائرس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ اپنی ٹرے اٹھا کر اس کی میز پر لے گیا اور اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے سائرس کہتے ہیں۔ میں ناول نگار ہوں۔"

"میں سمجھ گئی، آقائے سائرس قدیر، آپ فکشن ناول نگار ہیں اور میں آپ کی برابری نہیں کر سکتی۔ یہ بتائیے کہ گفتگو کا موضوع کیا ہونا چاہیے۔ ادب، موسم یا ایران کی سیاست؟"

"ہم کیوں نہ سرگزشت سے اپنی گفتگو کا آغاز کریں؟"

"آپ میری کہانی غالباً اس لیے سننا چاہتے ہیں کہ اسے مرکزی خیال بنا کر کوئی کہانی لکھ سکیں، تو سنیے میں زاہدان میں پیدا ہوئی۔ میں نے ایک اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اچھے لوگوں سے ملاقات کی، میرا ماحول اچھا تھا۔ چند ماہ پہلے مجھے ایک آرٹسٹ سے محبت ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ چھٹیوں میں ہم اصفہان گئے۔ وہاں کسی موضوع پر اس سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ وہ شدید برہم ہو گیا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ میرا انتخاب درست نہیں ہے۔ میں خواہ مخواہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ پس میں نے ایک ٹرین پکڑی اور اسی وقت اصفہان چل پڑی۔ ٹرین میں ایک مصنف سائرس قدیر مل گیا۔ اس نے مجھے اپنی کہانی سنانے پر مجبور کیا تو میں اپنی کہانی سنانے لگی۔ معلوم نہیں کہ یہ کہانی ہے بھی کہ نہیں۔"

"آپ کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ مگر مجھے آپ کی کہانی پر اعتبار نہیں آیا۔" سائرس بولا۔ پھر اس نے اپنے مسودوں کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔

"اور اگر ان مسودوں کی کاربن کاپیاں نہ ملیں تو؟" عورت نے پوچھا۔

"پھر میں ان لوگوں کو تلاش کروں گا جنہوں نے بریف کیس تبدیل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بھی اپنا بریف کیس تلاش کر رہے ہوں۔"

"میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ دونوں اپنے اپنے بلز کی ادائی کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

داریوش اپنا طیارہ خود اڑا رہا تھا۔ اس نے تہران کے مضافات میں ایک پرائیویٹ رن وے پر طیارے کو اتارا تھا۔ وہ احمد یار کو دل ہی دل میں مغلظات سنا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اہم دستاویزات ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ پارٹی ہیڈ کوارٹر میں اس کی طرف سے تار آیا تھا کہ بروجردی تہران اسٹیشن تک نہیں پہنچا اس لیے انقلابیوں سے سودا نہیں ہو سکا۔

جب وہ اپنے طیارے سے اترا تو اس کا استقبال کرنے کے لیے احمد یار کھڑا تھا۔ نزدیک ہی ایک کیڈی لاک کھڑی تھی۔

"کار میں کون ہے؟" داریوش نے پوچھا۔

"افراسیاب ہے جناب۔"

"اتنی قیمتی دستاویزات ہمارے ہاتھ آ کر نکل گئیں، یہ سب تمہاری حماقت سے ہوا ہے، احمد یار!" اس نے بلاتمہید کہنا شروع کر دیا۔ "تم اس کے لیے پارٹی کو جواب دہ ہو۔"

"میں نے وہ سب کچھ کیا جو کرنا چاہیے تھا۔" احمد یار نے کہا۔ "اگر کوئی اندیشہ تھا تو آپ کو خود یہاں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کی منظوری ہدایتی نے دی تھی۔"

داریوش نے گونج دار آواز میں پوچھا۔ "بروجردی واپس آیا کہ نہیں؟"

"ابھی تک واپس نہیں آیا۔ پرویز نے جس بریف کیس کو یہ سوچ کر اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے اٹھایا تھا کہ اس میں دستاویزات ہیں، وہ اس نے میرے حوالے کر دیا ہے مگر اس میں ایک ناول نگار سائرس قدیر کے مسودے بھرے ہوئے ہیں۔ ان دستاویزات کی ہم سے زیادہ غالباً انقلابیوں کو ضرورت ہے، اس لیے پرویز نے اپنے کچھ آدمیوں کو سائرس کے فلیٹ پر تلاشی کے لیے بھیجا تھا، مگر وہاں سے کچھ نہیں ملا۔"

داریوش نے فوری جواب نہیں دیا اور ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "آؤ اس مصنف کے فلیٹ تک چلتے ہیں۔ اسے ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کے فلیٹ پر جانا فضول ہوگا، اس لیے کہ سائرس ان دنوں اصفہان گیا ہوا ہے۔"

داریوش کار کا دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ مجبوراً احمد یار کو اس کا ساتھ دینا پڑا۔ "مجھے پرویز کی کسی بات پر اعتبار نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں دھوکا دے رہا ہو۔ اگر ہماری ملاقات سائرس سے ہو گئی تو سمجھو کہ معاملہ حل ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔"

احمد یار نے ڈرائیور کو سائرس کے گھر کا پتا بتا دیا۔ افراسیاب نے کار اسٹارٹ کی اور اس کا رخ ادھر موڑ دیا۔

☆☆☆

ٹرین سے اتر کر سائرس پلیٹ فارم پر سست روی سے چلنے لگا۔ اس کی نگاہیں ملیحہ نامی عورت کو تلاش کر رہی تھیں، مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ جب وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گیا اور اس نے بریف کیس کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ افروز نامی ایک خاتون نے اس بریف کیس کے بارے میں رپورٹ لکھوائی تھی لیکن وہ ابھی تک نہیں ملا۔

جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو اسے دروازہ خفیف سا کھلا دکھائی دیا۔ سائرس کو حیرت تو ہوئی مگر وہ اندر چلا گیا پھر جب اس نے لائٹ آن کی تو چونک کر پیچھے ہٹ گیا، کیونکہ کمرے کی کوئی چیز سلامت نہیں تھی۔ ان کے کپڑے الماریوں سے نکال کر فرش پر ڈال دیے گئے تھے، کرسیاں الٹی پڑی تھیں۔

"اوہ خدایا! کسی نے میرے کمرے کی تلاشی لی ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

وہ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر ساری درازیں اور الماریاں دیکھنا شروع کر دیں، مگر وہاں اس کی کہانیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ صدمے کی بات یہ تھی کہ ان کہانیوں کی کاربن کاپی بھی نہیں تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز اس بلڈنگ کے دروازے پر آ کر رکی جس میں وہ رہتا تھا۔ ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی کار سے اترا اور دربان سے کچھ پوچھنے لگا۔ سائرس نے قیاس لگایا کہ وہ دربان سے کوئی پتا پوچھ رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کار میں سے دو افراد مزید اترے۔ ان تینوں نے دربان کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ چند سیکنڈ ... تک ان کی باتیں سنتا رہا اس کے بعد اس نے سائرس کے فلیٹ کی طرف انگلی اٹھا دی۔ سائرس پردے کی آڑ سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ کیونکہ ان کے حلیے کچھ عجیب سے تھے اور ارادے بھی نیک نہیں لگ رہے تھے۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ اسی خیال سے وہ دروازے کی طرف بڑھا اور زینے سے اترنا چاہا تو قدموں کی دھمک سنائی دی۔ وہ لوگ اوپر ہی آ رہے تھے۔ سائرس کا فشار خون اچانک بڑھ گیا۔ وہ پلٹا اور زینے طے کر کے چھت پر پہنچ گیا تو اس نے چھت کے دروازے میں تالا لگا دیکھا۔ فرار کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔

اس نے کاندھے کا زور لگایا تو دروازہ چوپٹ کھل گیا اس کی کنڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اوپر پہنچ کر وہ چھت پر بنی پانی کی ٹنکی کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

بھاری قدموں کی آوازیں جیسے ہی نزدیک آئیں وہ کسی اسپرنگ کی طرح اچھلا اور آنے والے کے منہ پر مکا مار دیا۔ وہ قوی ہیکل شخص تھا، لیکن اس افتاد کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ مکا لگتے ہی الٹ گیا، اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ سائرس نے اس کی کھوپڑی پر دو ٹھوکریں ماریں تو وہ بے دم سا ہو کر گر گیا۔

سائرس دوڑتا ہوا عمارت کے سرے پر چلا گیا۔ سائرس نے ملحقہ عمارت کی طرف دیکھا۔ اس کی چھت دس فٹ نیچی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چھلانگ لگا دی۔ جب وہ اس چھت پر گرا تو اس کے پاؤں جھنجھنا اٹھے اور آنکھوں تلے تاریکی آ گئی، مگر یہ تاریکی لمحاتی تھی۔ وہ بے اختیار اس سے آگے والی عمارت کی طرف دوڑا۔ جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے اپارٹمنٹ کی چھت پر اسے دو آدمی نظر آئے۔ ایک تو وہی تھا جو اس کے ہاتھوں مار کھا کر چھت پر گر گیا تھا جبکہ دوسرا نیچے سے اوپر آیا تھا۔ وہ بھی صحت مند اور توانا تھا، البتہ اس کا قد کچھ کم تھا۔

اس کی نظر سائرس پر پڑی تو اس نے اپنے بغلی ہولسٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ریوالور نکال لیا۔ سائرس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فوری طور پر کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آئی تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے فوراً ہی اس عمارت کی چمنی کے پیچھے چلا گیا۔ چند ثانیوں بعد وہ اس عمارت کی چھت کے سرے پر گیا تو اس نے کچھ بچوں کو گلی میں کھیلتے دیکھا۔ دوسری عمارت اس سے بارہ فٹ دور تھی۔ سائرس اتنی لمبی چھلانگ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں اتنی لمبی جست کبھی لگائی ہی نہیں تھی۔

دفعتاً ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور اس کے پاؤں کے قریب کنکریٹ کا ایک ٹکڑا اکھڑ کر فضا میں اچھلا۔ اس نے چونک کر اپنے اپارٹمنٹ کی چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں کھڑے دو آدمیوں میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ گویا پہلی گولی اسی نے چلائی تھی، یہ سائرس کی قسمت تھی کہ وہ بچ گیا تھا مگر اب وہ کہاں جا سکتا تھا! کیونکہ دونوں اسی کی سمت آرہے تھے۔

انہوں نے دو چھتیں پار کر لی تھیں اور اب تیسری پر قدم رکھنے والے تھے۔ سائرس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ پلٹ کر عمارت کے زینوں کی طرف جاتا کیونکہ اس اثنا میں وہ لوگ چھت پر آجاتے اور گولیاں برسا کر اسے ہلاک کر دیتے۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور اس نے دوڑ لگاتے ہوئے پوری قوت سے چھلانگ لگا دی۔ وہ دھماکے سے گلی کے پار کی عمارت کی چھت پر گرا اور پھسلتا ہوا گٹر کی طرف چلا گیا۔ اگر اس کے بازو پھیلے ہوئے نہ ہوتے تو بلندی سے نیچے گرنے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی، لیکن اس کی بچت لمحاتی تھی کیونکہ اس کے ایک ہاتھ کی گرفت چھوٹ گئی تھی اور وہ ایک ہی ہاتھ سے لٹکتا رہ گیا۔

گلی کے نیچے کھیلنے والے بچوں نے اسے دیکھ لیا تھا، وہ ہیجانی انداز میں شور مچانے لگے۔ سائرس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا ایک ہاتھ ٹوٹ کر اپنی جگہ سے اکھڑ جائے گا پھر وہ بلندی سے گرے گا اور اس کی ساری ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں گی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اضطراری طور پر اس نے چیخ ماری۔ ”بچاؤ۔“

سائرس کا وہ ہاتھ پھسلتا ہوا نیچے جا رہا تھا کہ ایک سیاہ اور طاقتور ہاتھ نے اسے تھام لیا۔

وہ ایک سیاہ رو شخص تھا جو اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ عمارت کی چمنی صاف کرنے والا ملازم تھا۔ سائرس نے گہرے گہرے سانس لے کر اپنے سینے کے زیر و بم کو معتدل کیا اور پھر اس شخص سے کہا۔ ”جان بچانے کا شکریہ دوست! زندگی نے موقع دیا تو میں اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کروں گا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے کسی ایتھلیٹ کی طرح چھلانگ کیوں ماری؟ تم عمارت کے زینے بھی تو طے کر کے جا سکتے تھے؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اس طرح سے تم محفوظ رہتے۔“

”میں نے سوچا تجربہ کر کے دیکھا جائے کہ میں اتنی لمبی چھلانگ لگا سکتا ہوں یا نہیں۔“ سائرس نے کہا۔

سائرس نے اس سے مصافحہ کیا اور ..... زینوں کی طرف چل پڑا۔ زینے اتر کر گلی میں آگیا۔

اس کی ٹانگوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور گھٹنے جھنجھنا رہے تھے۔ اس کی ہتھیلیوں پر خراشیں آئی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اسے قتل کرنا چاہا تھا؟ وہ کس لیے اس کی جان کے درپے تھے۔

وہ سڑک پار کرنا چاہتا تھا اور دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر اس کی گدی پر کوئی ٹھنڈی سی چیز رکھ دی اور خوف ناک لہجے میں سرگوشی کی۔ ”اگر تم شور نہیں مچاؤ گے اور میری ہدایت پر عمل کرو گے تو عافیت میں رہو گے، ورنہ تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ویسے ہم تمہارے دوست ہیں۔“ وہ ٹھنڈی سی چیز اس کی گدی سے ہوتی ہوئی اس کی کمر سے آلگی۔ اس کا دباؤ بڑھاتے ہوئے اسی شخص نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ”آگے بڑھو۔“

سائرس کو مایوسی ہوئی کہ وہ جن لوگوں سے بچ رہا تھا بالآخر ان کے چنگل میں پھنس ہی گیا۔

وہ آدمی سائرس کو اس گلی تک لے گیا جہاں ان کی سیاہ مرسیڈیز کھڑی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر وہی شخص بیٹھا تھا جس کی ناک پر سائرس نے مکا مارا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی ناک رومال سے دبا رکھی تھی۔ غالباً خون اب بھی رس رہا تھا۔ جب وہ عقبی نشست پر بیٹھ گیا تو اس نے مڑ کر اس کی طرف خوں خوار نظروں سے دیکھا، جیسے اسے کچا چبا جانا چاہتا ہو۔

اب وہ سو فیصد ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھا۔ لیکن ایک بات ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ اسے فوری ہلاک نہیں کرنا چاہتے، بلکہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ پھر کار کی رفتار دھیمی ہو گئی اور اس کے بعد کسی جگہ رک گئی۔ کار کے دروازے کھل گئے اور اس کے بعد سائرس کا بازو پکڑ کر اسے اتار لیا گیا۔

اس کا بازو تھام کر اسے آگے بڑھایا گیا۔ اس کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک اجنبی آواز نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ذرا احتیاط سے قدم اٹھانا، اب ہم تہ خانے میں جا رہے ہیں۔“

وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں کم طاقت کا بلب روشن تھا۔ ”بیٹھ جاؤ، سائرس قدیر!“ اس شخص نے کہا جو ان لوگوں کا باس تھا۔ سائرس ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تمہارا پورا نام کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہی جس سے تم واقف ہو۔“ وہ بولا۔

”مگر تم تہران میں کیوں رہ رہے ہو؟“ پوچھا گیا۔

”اس لیے کہ یہ ایک ترقی یافتہ شہر ہے اور یہاں عروج حاصل کرنے کے مواقع ہیں اور سب ہی یہاں منتقل ہونا پسند کرتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میری سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو میں نے ناول نگاری شروع کر دی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب رہا۔“

”کیا تم اصفہان خیام شاپور کی تلاش میں گئے تھے؟“

”میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔“ اس نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے اور تم مجھے خواہ مخواہ اٹھا لائے ہو۔ میں وہاں اپنے اخبار کی طرف سے رپورٹنگ کرنے گیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہیں پرویز اسدی کی تلاش ہو؟“

”میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تمہیں اپنے مسودوں کی تلاش تھی لہٰذا تم جلدی میں تہران آگئے جبکہ تمہاری بیوی اب بھی وہیں ہے۔“

”تم نے میرے مسودے کیوں لے لیے؟“ سائرس اضطراب سے چیخا۔

”تمہارے مسودے ہم نے نہیں لیے بلکہ کسی دوسرے نے لیے تھے، وہ اب ہمارے پاس پہنچ گئے ہیں۔“

”وہ مجھے واپس چاہئیں۔“ سائرس نے مطالبہ کیا۔

”جب ہماری دستاویز اسے واپس مل جائیں گی تو ہم تمہیں وہ مسودے واپس کر دیں گے۔“ اس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

سائرس کو اب وہ نکتہ مل گیا تھا جس کی بنا پر وہ الجھن کا شکار تھا۔ گویا انہی دستاویزات کی وجہ سے اسے اپنے مسودے نہیں مل رہے تھے۔ ”تمہاری دستاویزات کیسی ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”شہزادی جمیلہ سمنانی کی دستاویزات۔“

”میں نے ایسی کوئی دستاویزات نہیں دیکھیں۔“

”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“ وہ بولا پھر اس نے اپنا ریوالور بغلی ہولسٹر میں رکھ لیا۔ اب سائرس کے لیے اچھا موقع تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور اس نے چشمے والے کو ٹکر ماری اور جب دوسرا اس کی طرف بڑھا تو اس کی کہنی نے کام کیا۔ وہ کہنی کی ضرب سے الٹ گیا۔ اب سائرس کے لیے راستہ صاف تھا۔

وہ راہداری میں دوڑنے لگا، لیکن ابھی چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ سامنے سے کسی نے خوفناک آواز میں کہا۔ ”ہالٹ!“ اس شخص کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی جس کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اسے گولی مار سکتا ہے۔ چنانچہ سائرس ٹھہر گیا۔

وہ دونوں بھی اٹھ کے آگئے اور اسے دھکیل کر پھر اسی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ”اب اسے باہر لے جاؤ اور ٹھکانے لگا دو۔“ اس نے حکم دیا اور نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

دوسرا آدمی آگے بڑھا اور اس نے سائرس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے دھکیلتے ہوئے باہر لائے۔ وہ تہ خانے سے نکل آئے اور اسے پہلے کی طرح کار میں بٹھا دیا گیا۔ جب کار چل پڑی تو سائرس نے پانچ منٹ بعد کہا۔ ”جب تم لوگوں کے پاس ریوالور ہے تو پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے کھول دو مجھے الجھن ہو رہی ہے۔“

اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹا دی گئی۔ کار میں دو آدمی تھے۔ باس ان کے ساتھ کار کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا اور جس کی ناک پر مکا مارا تھا۔ وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ چشمے والے کے ہاتھ میں اب بھی ریوالور تھا۔ وہ ایک کشادہ سڑک پر جا رہے تھے، سگنل کی بتی سرخ ہو گئی تھی چنانچہ بریک لگا کر کار روک دی گئی۔

چند لمحوں بعد ہی سرخ بتی سبز ہو گئی مگر ٹریفک رکا رہا، پیچھے کھڑی ہوئی گاڑیوں نے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ ان لوگوں کی توجہ اس کی طرف نہیں ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بندشوں سے آزاد کرانے کے لیے زور لگایا تو اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا۔

ٹریفک رینگنے لگا تھا۔ اس کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے کا یہ بہترین موقع تھا۔

اس نے چشمے والے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دھکیلا

اوراس کے بعد تیزی سے کار کا دروازہ کھول کر باہر کود گیا۔

فٹ پاتھ پر دوڑتا ہوا وہ ایک پارک کی جانب نکل آیا تھا۔

پارک کی دوسری طرف سڑکوں اور گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ سائرس بلاسوچے سمجھے ایک گلی میں گھس گیا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس کی دوست رخسانہ آفندی یہیں رہتی ہے۔ وہ ایک مکان کے دروازے پر دستک دینے لگا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا، سائرس کی دستک پر ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا اور اسے پہچان کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

جب وہ سائرس کو کار میں بٹھا کر وہاں سے چلے تھے تو داریوش نے ایک موٹر سائیکل سوار اکبر کو ہدایت دی تھی کہ وہ اس کا پیچھا کرے۔ اس نے ہدایت پر عمل کیا اور جب سائرس گاڑی سے اتر کر فرار ہوا تو اس نے سائرس کا پیچھا جاری رکھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اس جگہ سے آگاہ ہو گیا جہاں اس نے پناہ لی تھی۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل موڑی اور سڑک پر واپس پہنچ گیا جہاں سے سائرس فرار ہوا تھا۔ وہ گاڑی سڑک کے کنارے اب بھی کھڑی تھی۔ داریوش کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا اور وہ آسودگی سے سگار کے کش لے رہا تھا۔ جب اکبر نے اپنی موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی کی اور کار کا دروازہ کھول کر داریوش کے پہلو میں بیٹھ گیا تو اس نے نہایت سکون سے پوچھا۔ ''کیا رہا اکبر؟ اس مصنف کو شبہ تو نہیں ہوا؟''

''جی نہیں۔ سب کام سلیقے سے ہو گیا۔'' وہ بولا۔

''خوب، اب وہ کہاں ہے؟''

''اس نے ایک اپارٹمنٹ میں پناہ لی ہے۔''

''معلوم کرو کہ وہاں کون رہتا ہے، اس کی نگرانی کرو۔ وہ جہاں بھی جائے اس کا پیچھا کرو۔ ہمیں وہ دستاویزات ہر صورت چاہئیں۔'' پھر اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ''گاڑی اسٹارٹ کرو، کام ہو گیا ہے۔ ہم نے اسے فرار کرا دیا تا کہ وہ غیر محتاط ہو جائے اور ہمیں ان دستاویزات تک پہنچا دے۔''

احمد یار ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے اکبر کے گاڑی سے اترنے کے بعد انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو خیابانِ شہریار کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆

رخسانہ اس وقت اپنی لائبریری میں تھی۔ سائرس نے اپنی سانسیں اور حواس بحال کیے اور اسے اپنے ساتھ ہونے والی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''مگر ان لوگوں نے تمہیں اغوا کیوں کیا تھا؟'' رخسانہ نے پوچھا۔

''میں اس پر گزشتہ ایک روز سے سوچ بچار کر رہا ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' سائرس نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

رخسانہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ان لوگوں کے چہرے دیکھ چکا ہے اس لیے اسے چاہیے کہ ان لوگوں سے اپنی کہانیاں حاصل کر لے۔ اس سلسلے میں اس نے ایرج سے ملاقات کرنے کی ہدایت دی جو انڈر ورلڈ کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

سائرس قہوہ پینے کے بعد وہاں سے نکل آیا۔

اس کے بعد وہ ایک ریستوران میں گیا جہاں ایرج پابندی سے بیٹھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ملاقات ایرج سے ہو گئی۔ ایرج پختہ عمر کا تھا۔ اس نے سیاہ کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''ایرج کیا تم خیام شاپور نامی کسی شخص کو جانتے ہو؟ میں تمہاری معلومات کی قیمت ادا کروں گا۔''

''مجھے اس کے بارے میں معلوم نہیں مگر معلوم کر سکتا ہوں۔'' ایرج بولا۔

''او کے، اگر میں یہ پوچھوں کہ تم پرویز اسدی کے بارے میں کیا جانتے ہو، تو کیا کہو گے؟'' سائرس نے دوسرا سوال کیا۔

''مجھے ایسے کسی شخص کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔'' اس نے اپنے شانے اچکا کر کہا۔ ''مجھے تھوڑی سی مہلت دو پھر میں ان کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا مگر مجھے کچھ رقم پیشگی چاہیے ہو گی۔''

سائرس نے اسے تین سو ریال دیے اور باقی کام ختم ہونے پر دینے کا وعدہ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے رقم لے کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں تم سے ملاقات کرنا چاہوں تو کہاں مل سکتا ہوں؟'' ایرج نے سوال کیا۔

''اس کے لیے سب سے اچھی جگہ کتب خانہ آریہ مہر ہے۔ میں وہاں اکثر جاتا رہتا ہوں۔'' سائرس نے جواب دیا۔ پھر ایرج سے ہاتھ ملا کر باہر آ گیا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زاہدی اور سعادت سخت سردی کے باوجود سائرس کے فلیٹ کی نگرانی کررہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں گلی میں سائرس آتا دکھائی دیا۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے لاک کھولا ہی تھا کہ گلی میں ایک سیاہ مرسیڈیز آ کر کھڑی ہوگئی۔ زاہدی اندازہ نہیں لگا پایا کہ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں۔

☆☆☆

اروناً نے تکیے پر سے سر اٹھایا اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا۔ سڑکوں پر حسبِ معمول ٹریفک رواں تھا۔

اس نے اپنی ڈائری کی طرف دیکھا جس کے اوراق ہوا سے الٹ پلٹ رہے تھے۔ اس نے ڈائری کو اٹھالیا، وہ اسے پڑھنا چاہتی تھی تاکہ اس کی یادداشت تازہ ہوجائے۔ اس پر وہ کچھ گزرا تھا جو کسی شہزادی پر نہیں گزرا تھا۔

اس نے ڈائری کو درمیان سے کھولا اور پڑھنے لگی۔

میں زندہ ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے؟ زندگی میں مجھے ایسا عذاب سہنا پڑے گا اس کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ مجھے ایک حادثہ پیش آگیا اور ایک فوجی نے میری زندگی بچائی اور ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، اس کا نام زریاب ہے۔ جب میں ایک حادثے میں زخمی ہوگئی تو وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ وہ ایک نرم دل اور مخلص شخص تھا، اس نے میرا علاج کرنے سے پہلے قطعی یہ نہیں پوچھا کہ ہمارے پاس پیسے ہیں یا نہیں؟ ہم اس وقت قم میں تھے مجھے بندر عباس جانا تھا۔ شاہ نے رازداری کے باعث میرے لیے کوئی انتظام نہیں کیا تھا اور یہ سفر مجھے اپنے وسائل پر کرنا تھا۔ شاہ کا کہنا تھا کہ وہ میرے حوالے دو بریف کیس کررہا ہے جنہیں بندر عباس سے گوادر اور پھر وہاں سے کراچی تک پہنچانا ہے۔ میں نے ہامی بھرلی۔ یہ تک نہ سوچا کہ حالات تبدیل ہورہے ہیں اور انقلابی میرے آڑے آجائیں گے اور میری جان خطرے سے دوچار ہوجائے گی۔ میں ایڈونچر پسند ہوں اور ایسے لوگ نتائج کی پروا کیے بغیر کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شیرازی نے مجھے حوصلہ دیا کہ میں ہمت نہ ہاروں، وہ میرا علاج کرے گا اور میں جلد صحت یاب ہوجاؤں گی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کوشش کرے گا کہ میرے جسم پر کوئی داغ نہ آنے پائے، اس نے بتایا کہ حادثہ بہت خطرناک تھا اور میں کئی روز تک بے ہوش رہی تھی۔ اس دوران میں زریاب دلجمعی سے میری خدمت کرتا رہا۔

واقعہ یہ تھا کہ جب ہم ایک بس میں بیٹھ کر قم جارہے تھے تو ایک بوڑھی عورت نے میرے دونوں بریف کیس اٹھا لیے اور بس سے اترنے لگی۔ زریاب نے لپک کر اس بڑھیا کے ہاتھ سے دونوں بریف کیس چھین لیے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ جب ہم قم جا کر اترے تو ایک سڑک پار کرتے ہوئے ایک کار نے مجھے ٹکر ماردی۔ زریاب کے ہوش بحال تھے۔ اس نے بریف کیس اٹھالیے اور مجھے سہارا دے کر اسپتال لے گیا۔

میں نے بعد میں اندازہ لگایا کہ یہ سارا فساد انہی بریف کیسوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے ٹکر بھی اسی لیے ماری گئی تھی۔

یہ سب اس وقت سے شروع ہوا جب انقلاب کے حامیوں نے تہران میں تحریک چلانے کا آغاز کیا تھا۔ شاہ نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ ان کی یلغار کو آسانی سے نہیں روک سکے گا۔

اس نے امریکیوں کو کوئی خفیہ پیغام روانہ کیا تھا اور کچھ خفیہ دستاویزات ان تک پہنچانا چاہتا تھا، لیکن کسی ایجنسی سے خدمت لینے کے بجائے رازداری کے لیے اس کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی اور اس نے مجھے اپنا منصوبہ بتایا۔

تاہم پہلے ہی مرحلے میں ہمارے دشمنوں کو اس کی خبر ہوئی کہ میں خفیہ دستاویزات لے کر جارہی ہوں۔ وہ سب میرے پیچھے لگ گئے اور میری جان کے درپے ہوگئے۔ اگر زریاب میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں کب کی موت کے گھاٹ اتاری جاچکی ہوتی۔

وہ ہفتہ بہت جان لیوا تھا کیونکہ انقلابیوں کا خطرہ ہمہ وقت دامن گیر رہتا تھا۔ ایک ہفتے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ راہ میں جو بھی ہمیں ملتا، ہم اسے بتاتے کہ ہم بھائی بہن ہیں اور بندر عباس کی طرف جارہے ہیں جہاں ہمارے دوسرے اعزا قیام پذیر ہیں۔

بندر عباس میں زریاب کے خالو اور ان کی بہن رہتی تھی۔ انہوں نے ہمیں پناہ دی اور کچھ دن وہیں قیام کیا۔

ہم نے زریاب کے خالو سے اجازت چاہی اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اس موسم میں سفر نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ آگے برف باری کا امکان ہے لیکن میں نے ان کی ایک نہ سنی اور زریاب کو ساتھ لے کر روانہ ہوگئی۔ آگے جانے کے بعد ہمیں زبردست برف باری کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک رات ہم سردی میں ٹھٹھر رہے تھے اور ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں تھا کہ ایک رحم دل شخص نے ہمیں اپنی حویلی میں پناہ دی اور ہم سے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں جارہے ہیں؟

میں اس پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے میں نے جھوٹی کہانی سنادی۔ معلوم نہیں وہ مطمئن ہوا یا نہیں، بہرحال، اس نے کچھ نہیں کہا اور اپنی حویلی کے ایک کمرے میں ہمارا سامان رکھوا دیا۔ اس نے اپنا نام خیام شاپور بتایا تھا۔ اس کے دو بھائی بھی اس کے ساتھ رہتے تھے۔

خیام نے تو نہیں البتہ اس کے چھوٹے بھائی جالوت نے میرے دونوں بریف کیس کھول کر دیکھ لیے جن میں دستاویزات تھیں، معلوم نہیں اس کی سمجھ میں کیا کچھ آیا کہ اس نے ان بریف کیسوں کو غائب کردیا اور خود بھی غائب ہوگیا۔ میرے لیے یہ سانحہ اندوہناک تھا، میں اس کی تلاش میں گھر سے نکل پڑی کہ ایک کار نے ٹکر ماردی اور میں حواس کھو بیٹھی۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ خبر نہیں۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو خیام نے بتایا کہ چونکہ میرا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا لہٰذا وہ مجھے تہران لے آیا اور اس نے مجھے ایک بڑے دماغی اسپتال میں داخل کرادیا۔

جب میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگئی تو خیام شاپور نے بتایا کہ اس نے اپنے دو خاص آدمیوں کو اپنے بھائی کے پیچھے لگا دیا تھا جس سے وہ بریف کیس مل گئے۔ ان کی حفاظت کرنا بھی ایک مسئلہ تھا، اس لیے اس نے ان دونوں بریف کیسوں کو میرے ساتھ اسپتال میں رکھوا دیا۔

شہزادی اپنی ڈائری پڑھتے ہوئے روداد کے اس حصے تک پہنچی تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

☆☆☆

شام بھیگنے لگی تو سائرس ہوٹل نوروز کی طرف چل پڑا۔ ہوٹل کا ریستوراں ”نعمت“ اس وقت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہاں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ سائرس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے میز بک کرائے بغیر وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ دروازے سے دائیں گوشے میں ایک میز پر امان مشہدی بیٹھا تھا۔

وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے سائرس سے نگاہ ملتے ہی ہاتھ اٹھا کر اسے اشارہ کیا۔

وہ مشہدی کی میز کے قریب پہنچ گیا۔ ”تم سائرس قدیر ہوناً؟“ اس نے کہا اور استفہامیہ نظروں سے سائرس کی طرف دیکھنے لگا۔ سائرس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”اگر تم پسند کرو تو یہاں بیٹھ سکتے ہو۔“ اس نے دعوت دی۔ ”ہوشنگ مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا چکا ہے، مجھے تم سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ تم ایک ابھرتے ہوئے ادیب ہو۔“ وہ بولا۔

”یہ ملاقات میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔“ سائرس نے کہا اور بیٹھ گیا۔

”تمہارے لیے کیا منگواؤں؟“ مشہدی نے پوچھا۔

مشہدی تریسٹھ برس کا چاق و چوبند شخص تھا جس کے جسم پر قیمتی سوٹ تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی گھنی مونچھیں تھیں۔

”صرف کافی۔“ اس نے جواب دیا۔

”نعمت“ کے ریوالونگ دروازے کو گھماتے ہوئے دو آدمی اندر آئے۔ سائرس کچھ اس انداز سے بیٹھا ہوا تھا کہ دروازے سے اندر آنے والے اس کی نگاہ میں تھے۔ سائرس نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ یہ دونوں وہی تھے جنہیں اس نے اصفہان سے تہران آتے ہوئے ٹرین میں دیکھا تھا۔ ان کی وہاں آمد اتفاقیہ ہوسکتی تھی اور وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے بھی آسکتے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا اور ملیحہ اندر آئی۔ وہ دروازے کے قریب کھڑی ہو کر ہال پر طائرانہ نگاہ دوڑا رہی تھی کہ سائرس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ہاتھ ہلایا۔ ”میری ایک دوست آرہی ہے۔“ وہ بولا۔

”بہت خوب!“ مشہدی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اسے یہیں بلالو۔“

پھر ملیحہ کی نگاہ گھومتی ہوئی ان دونوں آدمیوں پر ٹھہر گئی جو چہرے سے اوباش دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک دراز قامت اور دوسرا پستہ قامت تھا۔ سائرس نے اس کے چہرے پر سراسیمگی کی لہریں اٹھتی دیکھیں۔ یک بارگی وہ پلٹی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ سائرس کچھ سمجھ پاتا، اس نے ریوالونگ دروازے کو کھولا اور باہر نکل گئی۔

وہ دو آدمی زاہدی اور سعادت تھے، انہوں نے ملیحہ کو باہر جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہوں سے کھڑے ہوگئے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ سائرس کو یقین ہوگیا کہ وہ اس کے پیچھے جائیں گے۔ کوئی نیا کھیل شروع ہونے والا تھا۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے مشہدی پر ایک نگاہ ڈال کر کہا۔

جب وہ نعمت سے نکلا تو اس نے دراز قامت کو نالے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ نالا تہران کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا تھا اور اس کے دونوں کناروں پر ایک دنیا آباد تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سائرس اس کے تعاقب میں دوڑنے لگا۔ وہ اس سے پچاس فٹ دور تھا۔ سائرس اندھادھند دوڑ رہا تھا کہ ایک بچے سے ٹکرا گیا جو سائیکل پر سوار تھا۔

''تمہیں اتنی بڑی سائیکل اور اتنا بڑا لڑکا دکھائی نہیں دے رہا ہے؟'' لڑکے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' سائرس نے اسے سڑک پر سے اٹھاتے ہوئے معذرت کی۔

اس لحاتی وقفے میں وہ دونوں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ بائیں جانب اسے ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ملیحہ ہے یا پھر وہ دراز قامت جو اس کا پیچھا کررہا ہے؟

وہ الجھن میں تھا کہ پست قامت کہاں چلا گیا کہ ایک درخت کی آڑ سے کسی نے چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا نیچے گر گیا پھر اس نے سائرس کے چہرے پر مکا مارا۔ سائرس نے جوابی حملے کے طور پر اس کے سینے پر دو مکے مارے۔ اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور وہ الٹ گیا۔

سائرس اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ سائرس نے اس کی کنپٹی پر لات مارتے ہوئے کہا۔ ''اٹھو، خبیث کہیں کے۔''

چیخم دھاڑ سن کر اس کا ساتھی پلٹ کر آیا۔ اس نے پیچھے سے آکر سائرس کو جکڑ لیا۔ اور پست قامت کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر کھولا تو اس کا لمبا اور پتلا سا بلیڈ روشنی میں چمکنے لگا۔

اس نے چاقو کو اس کی گردن کے قریب لاکر چلایا تو سائرس کی گردن پر ہلکا سا گھاؤ پڑ گیا اور خون بہنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ سائرس نے وہ خون اپنے منہ میں جمع کیا اور پھر پست قامت کے چہرے پر تھوک دیا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور اپنے کوٹ کی آستین سے چہرہ صاف کرنے لگا۔ سائرس نے موقع پا کر لات چلائی اور پست قامت کے پیٹ کے زیریں حصے پر چوٹ ماری۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

دوسرے آدمی نے اس کی گردن میں قینچی ڈال دی تھی اور گردن پر مسلسل دباؤ ڈالنے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کی گردن توڑ دینا چاہتا ہو۔ سائرس اس کے دباؤ سے جھکتا چلا گیا۔ اب اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ اس نے ایک گھٹنا زمین پر ٹکایا اور اس شخص کو پیٹھ پر لیتے ہوئے سامنے دے مارا۔

اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ چاروں خانے چت گرا اور تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا، جیسے اس کی بصارت متاثر ہوگئی ہو۔ سائرس نے تاریکی میں جائزہ لیا تو اسے چاقو دکھائی دیا۔ وہ جھک کر اسے اٹھانے لگا، لحہ بھر کے لیے وہ دراز قامت کی طرف سے غافل ہوگیا۔ اس نے چاقو کو مٹھی میں تھاما ہی تھا کہ دراز قامت نے سرعت سے اٹھ کر اسے ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیا۔ سائرس دھڑام سے گر پڑا۔ اس کا جسم جھنجنا رہا تھا مگر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

دراز قامت اس کے نزدیک آیا تو سائرس نے اس کی گردن پر پے در پے کئی مکے مارے، وہ درد سے کراہنے لگا۔ سائرس نے بڑھ کر اس کے جبڑے پر دو مکے اور جڑ دیے۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا اور منہ سے خون نکلنے لگا۔ اس کی قوتِ مدافعت ختم ہوگئی تھی۔

سائرس سر گھما کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ پست قامت کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ جھک کر دراز قامت کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ دفعتاً بائیں جانب سے ایک کرخت سی آواز آئی اور پست قامت درختوں کی آڑ سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا ڈنڈا تھا۔ اس سے پہلے کہ سائرس سنبھلتا، اس نے ڈنڈا گھمایا اور اس کے سر پر وار کیا۔ سائرس چکرا کر دہرا ہوگیا۔ دوسرا وار ہونے پر اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ لہراتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ دونوں کہیں نہیں تھے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ وہ مرچکا ہے، اس لیے وہ فرار ہوگئے تھے۔ جب سائرس کے اعصاب کام کرنے لگے تو اس نے نالے کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ اس کا دماغ کام کرنے لگا تھا۔ اس نے سوچا وہ دونوں کون تھے؟ وہ اس کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ انہوں نے اس پر حملہ کیوں کیا تھا؟

درختوں کی آڑ سے نکل کر وہ سڑک پر آگیا۔ اس نے سڑک پار کی اور پولیس اسٹیشن کی طرف چل پڑا، وہ سوچ رہا تھا کہ آخر ملیحہ ان دونوں کو دیکھ کر بھاگی کیوں تھی؟ کیا وہ ان سے واقف تھی؟ وہ دونوں اسے دیکھ کر اس کے تعاقب میں کیوں چل پڑے تھے؟

پولیس اسٹیشن پہنچ کر اس نے انسپکٹر کو بتایا کہ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔

انسپکٹر عادل بولا۔ ''آپ رپورٹ لکھوادیں۔''

''تہران کے مرکزی نالے سے ایک لاش ملی ہے۔ میں وہاں جارہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں؟''

سائرس نے پوچھا۔

''کیوں؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''اس لیے کہ میں ایک کہانی نویس ہوں اور مجھے ایسے واقعات کی تلاش رہتی ہے جن پر کہانی بنائی جاسکتی ہو۔''

''اگر آپ کو کہانیاں لکھنے کا شوق ہے تو ساتھ آسکتے ہیں۔ ویسے محکمہ جاتی طور پر یہ نامناسب ہے۔'' پھر دونوں پولیس اسٹیشن سے باہر آگئے۔

لاش وہاں سے تھوڑے فاصلے پر پائی گئی تھی لہٰذا وہ پیدل ہی چل پڑے۔ تقریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد سائرس کو ایک جگہ سے نالے کی دیوار ٹوٹی ہوئی دکھائی دی۔ پانی وہاں سے رس رہا تھا۔

وہاں دو پولیس والے کھڑے تھے اور لاش زمین پر پڑی تھی اسے متوفی کے کوٹ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سائرس کو وہاں ایک ڈاکٹر بھی کھڑا دکھائی دیا۔ عادل نے لاش پر پڑا ہوا کوٹ ہٹا کر ایک طرف ڈال دیا۔ وہ ایک مرد کی لاش تھی۔ اس کے پیٹ سے لے کر سینے تک ایک لمبا شگاف تھا۔ جس سے آنتیں باہر آچکی تھیں۔

ڈاکٹر نے متوفی کا کوٹ انسپکٹر کو دکھایا۔ اس نے اس کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تلاشی لی مگر ایک چھوٹے سے رومال کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس رومال کے ایک کونے پر ایک عقاب کی تصویر کڑھی ہوئی تھی۔ غالباً وہ کوئی خاص نشان تھا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔'' سائرس نے انسپکٹر سے کہا۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ سائرس وہاں سے چل پڑا۔ اسے لاش کا رومال پریشان کررہا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق اس پر بنا ہوا مونوگرام کمیونسٹ پارٹی کے خاص عہدے دار رکھتے تھے، تو کیا متوفی کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا؟

تاہم جو کوئی بھی تھا اس نے مسودے بھول سے اٹھا لیے تھے پھر کسی نے کمیونسٹ پارٹی کے کارکن کو قتل کردیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے پاس دستاویزات تھیں۔ وہ غالباً تہران ریلوے اسٹیشن جارہا تھا تاکہ انہیں کسی اور کے حوالے کرسکے۔

☆☆☆

کتب خانہ آریہ مہر ساڑھے دس بجے بند ہوجاتا تھا لیکن فرح نے سائرس قدیر کو شیشے کے دروازے پر دستک دیتے دیکھا تو کتب خانہ بند کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

وہ اندر جا کر آفس میں ایک کرسی پر گر سا گیا۔ فرح ایک نرم دل اور مخلص لڑکی تھی اور وہ اس سے نئی تخلیقات پر گھنٹوں بحث کرتی تھی۔ اس نے سائرس کے لباس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے جیکٹ پر خون لگا ہوا ہے، تم کہاں سے آرہے ہو؟ مجھے تمہارے ہونٹ بھی زخمی دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا بات ہے کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟'' وہ اس کے نزدیک آکر اس کے زخموں کا جائزہ لینے لگی، پھر اس نے اپنا پرس کھول کر کوئی کریم نکالی اور اس کے ہونٹوں پر ملنے لگی۔ ''میں تمہارا چہرہ گرم تولیے سے صاف کیے دیتی ہوں، تم مجھے پوری بات بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟'' اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

سائرس نے اسے اپنی کہانی سنائی جس میں مسودات کی گمشدگی کا قصہ بھی شامل تھا۔

''کہانی سننے کے بعد میں بھی اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ملیحہ سے تمہاری ملاقات اتفاقیہ نہیں تھی۔ اس کے پیچھے کوئی جذبہ کارفرما تھا۔'' فرح بولی۔

اس اثنا میں ملیحہ بھی وہاں آگئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، لیکن سائرس کے سرد اور ناگوار تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''نعمت میں جو کچھ پیش آیا، میں اس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔''

سائرس کو غصہ آرہا تھا، مگر وہ بے قابو نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ''اگر تم معافی چاہ رہی ہو تو مجھے یہ کہنا چاہیے کہ چلو کوئی بات نہیں۔'' اس نے رسانیت سے کہا۔ ''تمہارے ان دونوں دوستوں نے باہر نکل کر نالے کے قریب مجھ پر قاتلانہ حملہ کردیا۔ ان میں سے ایک نے تو چاقو نکال لیا۔ غالباً میرے ستارے اچھے تھے کہ میں جان بچانے میں کامیاب ہوگیا۔''

فرح نے ملیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کافی پیو گی؟''

''اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم میری تلاش میں یہاں تک کیسے آگئیں؟'' سائرس نے پوچھا۔

''تم نے بتایا تھا کہ اکثر اوقات یہاں آتے رہتے ہو۔ چنانچہ میں یہاں آگئی۔ تم سے ملاقات کی امید نہیں تھی، میں تو تمہیں ایک پیغام دینے آئی تھی۔'' اس نے وضاحت کی پھر اپنا کوٹ اتار دیا۔

''میں یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین ہوں کہ تم ان دو آدمیوں کو دیکھ کر نعمت سے فرار کیوں ہوگئی تھیں؟ پھر انہوں نے باہر جا کر مجھ پر قاتلانہ حملہ کیوں کردیا؟'' وہ بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”وہ پرویز کے آدمی تھے، جو ٹرین سے ہی میرے پیچھے لگ گئے تھے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”مگر وہ تمہارا پیچھا کیوں کررہے تھے؟“

”وہ میرا نہیں، تمہارا پیچھا کررہے تھے۔“ اس نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”ان دونوں کے ذریعے سے پرویز تک یہ خبر پہنچ گئی کہ تم مجھ سے نزدیک ہوتے جارہے ہو، لہٰذا اس نے حسد کے مارے یہ ہدایت دی کہ تمہارا پیچھا کیا جائے۔ جب تم تہران پہنچ گئے تو وہ سارا دن تمہارا تعاقب کرتے رہے۔ انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ نعمت میں مجھ سے ٹکراؤ ہوجائے گا۔ یہ اندازہ مجھے بھی نہیں تھا کہ وہ وہاں ملیں گے۔ جب میری نظر ان لوگوں پر پڑی تو میں خوف زدہ ہوگئی اور وہاں سے بھاگ نکلی۔“ اس نے ساری روداد سنائی۔

سائرس کو اس کی کہانی پر یقین نہیں آیا، تاہم اس نے برملا اظہار نہیں کیا۔ اس سے پہلے اس نے جو کہانیاں سنائی تھیں ان پر بھی اسے اعتبار نہیں آیا تھا۔ ملیحہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فرح نے ایک کپ کافی ملیحہ کو دی اور جاکر ریسیور اٹھالیا پھر اس نے سائرس سے کہا کہ اس کا فون ہے۔

سائرس نے جاکر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایرج کی آواز سنائی دی۔ ”سائرس! میں ایرج بول رہا ہوں۔“ اس نے سائرس کو پتا بتایا کہ وہ کہاں ہے، وہ فوراً بقیہ رقم لے کر پہنچے پھر اس نے فون بند کردیا۔

”اگر تم نے کافی پی لی ہو تو یہاں سے چلا جائے؟“ اس نے ملیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

☆☆☆

سارا دن گزر گیا تھا، احمد یار اور افراسیاب سائرس کا پیچھا کررہے تھے۔ انہوں نے سائرس کو گاڑی سے فرار ہونے دیا تھا اور اس کا ٹھکانا معلوم کرنے کے بعد اس امید پر اس کا پیچھا کررہے تھے کہ وہ انہیں دستاویزات تک پہنچا دے گا۔ اگر افراسیاب کو داریوش کا خوف نہ ہوتا تو وہ کب کا سائرس کا پیچھا چھوڑ دیتا، کیونکہ یہ بے مقصد بھاگ دوڑ اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کررہی تھی۔ وہ سائرس کے پیچھے پولیس اسٹیشن تک گئے اور اس کے بعد نالے تک، جہاں انہوں نے تاریکی میں ایک لاش دیکھی۔ احمد یار ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ فاصلے سے کچھ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ لوگ لاش کا معائنہ کرنے میں اتنے مصروف تھے کہ اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی پھر جب اس لاش کے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا گیا تو احمد یار کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے لاش کو شناخت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بروجردی تھا۔ اب وہ یہ اطلاع داریوش کو دینا چاہتا تھا۔ اس کے اشارے پر افراسیاب نے کار چلادی۔

پھر اس نے سائرس کو نالے پر سے ایک طرف جاتے دیکھا۔ داریوش کو اطلاع دینے کا موقع نہیں تھا اس لیے کہ وہ سائرس کو کھو دیتے۔ اس نے افراسیاب کو ہدایت دی کہ وہ سائرس کا اس طرح سے پیچھا کرے کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔ وہاں سے سائرس کتب خانے تک گیا اور اندر جاکر سکون سے بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں احمد یار کو موقع مل گیا تو اس نے ایک فون بوتھ سے داریوش کو فون کیا۔

”میں احمد یار بول رہا ہوں جناب۔ ہمارا آدمی بروجردی مرچکا ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”سائرس پولیس اسٹیشن تک گیا تھا وہاں سے انسپکٹر کے ساتھ وہ تہران کے بڑے نالے تک گیا، وہاں سے بروجردی کی لاش ملی ہے۔“

”کیا اس کے ساتھ دستاویزات بھی تھیں؟“ داریوش نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”سائرس اس وقت کہاں ہے؟“

”کتب خانہ آریہ مہر پر۔ یہ بیس منٹ پہلے کی بات ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت کتب خانے میں آئی وہ اب بھی اندر ہے۔“

”میں آرہا ہوں۔“ داریوش نے کہا۔

کچھ دیر بعد داریوش وہاں پہنچ گیا۔ اس نے احمد یار سے رات کے واقعات کی تفصیلی رپورٹ طلب کی۔ اس نے من و عن پوری کہانی سنادی۔ وہ سنتا رہا پھر بولا۔ ”تمہیں یقین ہے نا کہ بروجردی کی لاش کے قریب کوئی بریف کیس نہیں تھا؟“

”مجھے یقین ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ بروجردی کیسے مرگیا؟“

”وہ طبعی موت نہیں مرا ہے۔“ داریوش نے کہا۔ ”جہاں تک ان دو آدمیوں کا تعلق ہے تو وہ پرویز کے آدمی ہیں۔ وہ اصفہان سے سائرس کا تعاقب کررہے ہیں۔“

”اور پرویز نے مزید کیا کہا ہے؟“

”میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ ہم کل صبح ملاقات

کریں گے۔ اس دوران، میں دستاویزات کو تلاش کرلوں گا اور اس سے سودا مکمل کرلوں گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے ریلوے اسٹیشن کے قریب ملوں گا اور تنہا ہوں گا۔ اس نے آمادگی ظاہر کی ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ ہم دونوں ہی جھوٹ بول رہے ہیں۔“ اس نے اپنی جیب سے تہران کا ایک چھوٹا سا نقشہ نکالا اور اس پر ایک جگہ دائرہ بنادیا۔ حاشیے میں اس نے لکھا۔ ”صبح چھ بجے۔“

”شہزادی کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟ کیا ہم اسے فروخت کرکے بھاری رقم حاصل نہیں کرسکتے؟“ احمد یار نے کہا۔

”اس ضمن میں پارٹی لیڈر ہدایتی اور میں نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے کہ ہم انقلابیوں اور اس کے علاوہ شاہ دونوں سے معاہدہ کریں گے اور جب ہمارے ہاتھ کثیر رقم آجائے گی تو ہم شہزادی کو قتل کردیں گے۔ انقلابیوں سے کہیں گے کہ شاہ نے اسے قتل کیا ہے اور شاہ کو بتائیں گے کہ اس کا قتل انقلابیوں نے کیا ہے۔“

”مگر ہم دونوں کو یہ کیسے باور کرائیں گے کہ شہزادی اصلی ہے جبکہ دستاویزات کا صرف ایک سیٹ رہ گیا ہے؟“

”ہم انقلابیوں کو وہ سیٹ دے دیں گے جو ہمارے پاس ہے۔ اس کے بعد جب سائرس کی رہنمائی سے دوسرا سیٹ مل جائے گا تو اسے شاہ کے حوالے کردیں گے۔“

اسی اثنا میں سائرس، ملیحہ کے ساتھ کتب خانے سے باہر نکلتا نظر آیا۔ داریوش نے حکم دیا کہ ان کا پیچھا کیا جائے۔

☆☆☆

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر سائرس کی نگاہ ایرج کو تلاش کررہی تھی، مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

وہ جب ہال کے آخری حصے کی طرف آیا تو ایرج دکھائی دیا۔ وہ لائن دار کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

ایرج نے سائرس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے وہ اطلاعات جمع کرلی ہیں جو تمہیں درکار ہیں۔ پرویز اسدی ایک فلم ڈسٹری بیوٹر ہے اور درپردہ انقلابیوں کے لیے کام کرتا ہے کیونکہ اس کے باپ کو شاہ کے آدمیوں نے جاسوسی کے الزام میں ہلاک کردیا تھا جبکہ خیام شاپور ایک صنعت کار ہے اور اسے تہران کے مضافات میں ہلاک کردیا گیا ہے۔ خیام شاپور اپنی گاڑی میں تہران آیا تھا۔ پولیس کو یہ معلوم ہے کہ جب وہ پاگل خانے سے نکلا تھا تو اس کے ساتھ شہزادی سمنانی تھی، لیکن اس کی گاڑی کہیں نہیں پائی گئی۔ مجھے آج ہی اطلاع ملی ہے کہ اس کی گاڑی ایک گیراج میں کھڑی ہے، جو گلزار ہمدانی کے قرب و جوار میں ہے۔ وہ گیراج ہوٹل ماؤنٹین کے بالکل عقب میں ہے۔“

”ان اطلاعات کے لیے تمہارا شکریہ۔“ سائرس نے احسان مندی سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

”کچھ عجیب سا ماحول ہے، میرا خیال ہے کہ یہاں سے چلا جائے۔“ ملیحہ نے کہا۔ باہر نکل کر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ سائرس دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر ”دی ماؤنٹین“ کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

ایرج اس وقت ایک نائٹ کلب میں تھا جہاں سے ہوٹل ماؤنٹین محض چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہاں ایک کال گرل ماہ جبیں کی مٹھی گرم کرکے اسے یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ داریوش کے کمرے میں جو سوٹ کیس رکھا ہے، اس میں کسی مصنف کے مسودے ہیں۔ کال گرل کو یہ معلومات داریوش کے ایک ساتھی سے حاصل ہوئی تھیں۔ ایرج اس کے ساتھ ہوٹل ماؤنٹین کی طرف چل پڑا۔

چوتھی منزل پر پہنچنے کے بعد ماہ جبیں اسے راہ داری میں لے گئی اور پھر آخری کمرے کی طرف۔ ایرج نے دروازے کی ناب کو پکڑ کر گھمایا تو دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ لاک تھا۔ اس نے دستک دی، مگر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا۔

ماہ جبیں الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ ایرج نے اپنی جیب میں سے ایک ماسٹر کی نکالی اور اسے لاک میں گھمانے لگا۔ لاک تھوڑی دیر بعد ہلکی سی ”کلک“ کے بعد کھل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ چھوٹا سا کمرا تھا جس میں مختصر سا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایرج اندازے سے سائرس کے مسودے تلاش کرنے لگا مگر وہ کہیں نہ ملے۔

وہ مایوسی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ اس کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرا گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا تو اسے ایک بریف کیس بیڈ کے نیچے رکھا نظر آیا۔ اس نے بریف کیس نکالا، اس پر ایک اژدہے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ اس نے بریف کیس کو اپنے زانوؤں پر رکھ کر کھولا تو اسے بہت سی کاپیاں اور ڈائریاں نظر آئیں۔ اس نے سارے مسودے اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں کسی نہ کسی طرح رکھ لیے۔ اس کے بعد وہ دروازہ کھول کر نکل آیا۔

ہوٹل سے نکلتے ہی وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور گلستان پیلس کی طرف چل پڑا جہاں مصنف افراہیم رہا کرتا تھا۔ وہ تیسرے درجے کا مصنف تھا مگر ایران کے مضافات میں اس کی جائداد تھی۔ اس لیے وہ ان مسودوں کی اچھی قیمت دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکتا تھا اور بعد میں ان مسودات کو اپنے نام سے چھپوا سکتا تھا۔

☆☆☆

سائرس کو ایرج نے بتایا تھا کہ اس نے ہوٹل ماؤنٹین کے پیچھے ایک گیراج میں خیام کی کار کھڑی دیکھی ہے لیکن اس نے گیراج کی طرف جانے کے بجائے ہوٹل میں جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔

وہ ایک اوسط درجے کا ہوٹل تھا جب سائرس ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا تو پرانے زمانے کے ایک وال کلاک نے نصف شب گزرنے کا اعلان کیا۔

سائرس کو وہاں ایک کرائم رپورٹر اور چند کلرک ٹائپ لوگ بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ ایک میز پر بیٹھ گیا۔ جب ایک ویٹر اس کے نزدیک سے گزرا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے لیے ایک گلاس بیئر لے لیا۔

وہ گلاس لے کر کھڑکی کے قریب گیا تو اسے پارکنگ لاٹ سے ایک ٹیکسی نکلتی دکھائی دی۔ اس کی عقبی نشست پر کوئی بیٹھا تھا۔ ٹیکسی میں تاریکی تھی اس کے باوجود اس نے شناخت کر لیا کہ وہ ایرج ہے۔

ایرج ہوٹل ماؤنٹین میں کیا کر رہا ہے؟ سائرس چونک گیا۔

کیا وہ خیام کے قاتلوں کو ہوشیار کرنے آیا تھا کہ سائرس ان کی ٹوہ لینے آ رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اسے روکنا لازمی تھا۔ اس نے بیئر کا گلاس اور اس کی قیمت میز پر رکھی اور ہوٹل سے نکل کے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھا۔ ایرج جس ٹیکسی میں بیٹھا تھا وہ وہاں سے روانہ ہو کر کافی آگے نکل چکی تھی۔ وہ اس گلی میں چلا گیا جو تاریک تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ کر ٹٹولا تو اس کی انگلیاں ایک مکان کے دروازے کی ناب سے ٹکرائیں۔ گویا اس گلی میں کسی مکان کا دروازہ بھی ہے۔

وہ ایک قدیم طرز کا مکان تھا، جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں اسے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ اس نے ناب کو گھمایا مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ دروازہ لاک تھا۔ وہ عقبی گیراج کی طرف چل پڑا۔ گیراج کی دیواریں زیادہ بلند نہیں تھیں، اس لیے تاریکی کے باوجود ان کاروں کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا جو ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کار پر ترپال پڑا ہوا تھا۔ سائرس گیراج کی باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر کود گیا۔ اس نے ترپال کو ہٹایا تو اسے سیاہ رنگ کی ایک لیموزین دکھائی دی۔ وہ ان لاک تھی۔ وہ پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا پھر اس نے اپنی جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ کار کے ڈیش بورڈ پر خ اور ش کے الفاظ ابھرے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کار خیام شاپور کی ہے۔

سائرس نے سوچا کہ اسے شہزادی سے کیا سروکار؟ اسے تو اپنے مسودے چاہیے تھے جس کے لیے اسے ہوٹل ماؤنٹین میں داخل ہو کر سارے کمروں کی تلاشی لینا پڑے گی۔

☆☆☆

احمد یار نے تہ خانے کے دروازے کے سوراخ سے آنکھ لگائی تو اسے شہزادی سمنانی نظر آئی۔ اس کا چہرہ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا اور اس پر نقاہت طاری تھی۔ دروازے پر متعین دربان کا نام اسماعیل تھا۔ وہ دراز قامت اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ تہ خانے کے دروازے کی چابی اس کی کمر سے لٹکی رہتی تھی۔ اس پر قابو پانا اور شہزادی کو چھڑا لینا مذاق نہیں تھا۔ اس مہم جوئی میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔

وہ اسماعیل کا شانہ تھپتھپاتا ہوا تہ خانے سے نکل آیا اور باہر چل پڑا۔ اس نے ایک بلاک کا فاصلہ طے کیا اور دائیں جانب مڑ گیا۔

☆☆☆

سائرس اس گلی سے نکل ہی رہا تھا کہ اس نے ایک شخص کو مکان کا دروازہ کھول کر باہر آتے دیکھا۔ وہاں تاریکی تھی۔ اس کے باوجود اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ ان میں سے ایک تھا جنہوں نے اسے اغوا کیا تھا۔ سائرس وہیں دیوار سے چپک گیا اور اس نے اپنا سانس روک لیا، مبادا اس کا کوئی ساتھی بھی اس کے ساتھ ہو۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ عمارت سے اس کا کوئی ساتھی برآمد نہیں ہوا اور وہ اکیلا ہی ہے تو اس نے آہستہ قدمی سے اس کا پیچھا کیا اور اس کے بالکل قریب جا کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پھرتی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ چیخ مار کر کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔

”میں تمہارے منہ پر سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں۔“ سائرس نے چند لمحوں بعد کہا۔ ”اگر تم نے شور مچایا یا کسی کو آواز دینے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔“

اس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تو سائرس نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

”میرے مسودے کہاں ہیں؟“ اس نے بلا تمہید پوچھا۔ ”تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گے کہ میں سائرس

ہوں۔“

”وہ داریوش کے پاس ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”غالباً تمہارا اشارہ اس شخص کی طرف ہے جس نے پائلٹوں والی وردی پہنی ہوئی تھی؟“

”ہاں۔“

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“

”میں احمد یار ہوں اور اس کی معاونت کرتا ہوں۔“

”مجھے اپنے مسودات چاہئیں۔“ وہ غرایا۔

”دستاویزات کو کل صبح فروخت کے لیے لے جایا جائے گا۔“ احمد یار نے بتایا۔ ”اس لیے داریوش کسی وقت بھی واپس آ سکتا ہے۔ ایسے میں اس کے کمرے میں داخل ہونا بڑا رسک ہے۔“

”ان دستاویزات کے بارے میں تم لوگوں کا خیال ہے کہ وہ میرے پاس ہیں؟“ سائرس نے پوچھا۔

”کچھ دستاویز غائب ہیں۔ داریوش کا خیال ہے کہ وہ تم نے لی ہیں۔“

گلی کے دوسری طرف کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس دیوار پر آڑی ترچھی لکیریں بنا رہی تھیں۔

”یہ داریوش معلوم ہوتا ہے۔“ احمد یار نے سرگوشی میں کہا۔

وہ کار گلی میں داخل نہیں ہوئی اور بیک ہو کر واپس چلی گئی۔

”تمہارا بریف کیس غلطی سے اٹھا لیا گیا تھا۔ داریوش کو شک تھا کہ تم بھی اس میں ملوث ہو۔ وہ دستاویزات تمہارے پاس ہیں۔“ اس نے وضاحت کی۔

اس وقت سائرس نے قیاس لگا لیا کہ اسے ان لوگوں نے فرار کرایا ہے تاکہ اس کا پیچھا کر کے وہ ان دستاویزات تک پہنچ سکیں۔ ”شہزادی کا کیا ہوا؟“ اس نے سوال کیا۔

احمد یار کے چہرے پر ایک سایہ آ کر گزر گیا۔ اس نے سائرس کے سوال کا فوری جواب نہیں دیا۔ سائرس غرا کر بولا۔ ”اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہیں بتا رہا ہوں۔“ اس نے توقف سے کہا۔ ”شہزادی کو انقلابیوں یا شاہ کے آدمیوں کے ہاتھوں فروخت کیا جائے گا۔ جب وہ دونوں سے رقم وصول کر لے گا تو پھر شہزادی کو ہلاک کر دے گا۔ اب بتاؤ کہ تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو شہزادی کی موت کا الزام وہ انقلابیوں پر ڈال دے گا اور انقلابیوں سے شاہ کے بارے میں یہی بات کہے گا تاکہ وہ لوگ آپس میں الجھتے رہیں۔ اس کے بعد داریوش، شہزادی کو قتل کر دے گا۔“ احمد یار نے بتایا۔ ”میں شہزادی کو بچانا چاہتا ہوں کیونکہ وہ بے قصور ہے۔“

”جب تم میرے مسودے واپس کر دو گے تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں نے شہزادی کو نہیں دیکھا ہے، اس کے باوجود مجھے اس سے ہمدردی ہے اور میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔“

”اگر وہ مل جائیں تو میں انہیں کہاں لاؤں؟“

”یہاں سے نزدیک ہی ایک کلب ہے جس کا نام گرینگو ہے۔ تم مسودے کو لے کر وہاں آ جانا۔ میں تمہیں تین بجے وہاں ملوں گا۔ تم نے اس معاملے میں تعاون نہیں کیا تو میں تمہیں تلاش کر کے قتل کر دوں گا۔“

”میں وہاں تمہیں ضرور ملوں گا۔“ اس نے یقین دہانی کرائی۔

”اچھی طرح سے یاد رکھنا، گرینگو میں تین بجے۔“ اس نے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس مکان کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور کسی نے سرگوشی میں احمد یار کو آواز دی۔

احمد یار کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ وہ مڑا اور اس مکان کے دروازے تک پہنچ گیا۔ ”یہ سائرس قدیر تھا نا؟“

”ہاں۔“ اس نے تصدیق کی۔ اسے یاد آیا کہ چند منٹ پیشتر اس نے کار کی ہیڈ لائٹس چہرے پر پڑتے ہی یہ قیاس آرائی کی تھی کہ وہ داریوش معلوم ہوتا ہے۔ اس کا قیاس درست تھا۔ داریوش مکان کے پچھلے دروازے سے داخل ہو کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہا تھا؟“ داریوش نے پوچھا۔

احمد یار نے اٹکتے ہوئے سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

☆☆☆

سائرس سرائے حسن بانو تک پہنچ گیا جہاں ملیحہ ٹھہری ہوئی تھی۔ اس نے ڈیسک کلرک پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ کمرا نمبر 416 پر جا کر اس نے دستک دی تو اندر سے پوچھا گیا۔ ”کون ہے؟“

”میں سائرس ہوں۔“ وہ بولا۔

دروازہ کھل گیا اور ملیحہ کی صورت دکھائی دی۔ وہ نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ ”اندر آ جاؤ۔ میں تمہارے بارے میں بہت پریشان تھی۔“ اس نے کہا۔ ”معلوم نہیں تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

سائرس اندر آ گیا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لے کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنی اچھی جگہ رہتی ہو۔"

وہ کمرے میں پڑے ہوئے صوفوں میں سے ایک پر گر گیا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ نے اسے تھکن سے چور کر دیا تھا۔

"تم ماؤنٹین تک گئے تھے تو تمہیں وہاں کیا ملا؟"

سائرس نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کیا۔ "یہ بتاؤ تم ٹرین میں کیا کر رہی تھیں؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اپنے محبوب سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا اور میں تہران واپس آ رہی تھی۔" اس نے ملائمت سے کہا۔

"اس سے پہلے تم نے کہا تھا کہ میں نے تم سے کتب خانہ آریہ مہر کے بارے میں بات کی ہے حالانکہ میں نے تمہیں اپنے اس ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا تم وہاں کیسے پہنچ گئیں؟ اگر تم تہران کی رہنے والی ہو تو تمہیں یہاں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہونا چاہیے۔"

"سائرس! معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو..."

"خیام شاپور کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اس سوال کا ملیحہ نے فوری جواب نہیں دیا بلکہ پہلے اس نے سگریٹ سلگایا اور دو چار کش لینے کے بعد بولی۔ "میرا نام حقیقت میں ملیحہ شاپور ہے۔ خیام شاپور میرے والد تھے۔"

سائرس نے سوچا کہ اس کا قیاس درست تھا۔ وہ اب تک اس سے جھوٹ بولتی آ رہی تھی۔

"اگر میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی تو تمہیں بھی یہ بتانا ہوگا کہ تمہیں ہوٹل ماؤنٹین میں کیا ملا؟"

"ہاں، میں یہ بتا دوں گا۔" وہ بولا۔

"وہ سردیوں کی ایک خوف ناک رات تھی۔ میرے والد اپنے آبائی مکان میں ایک جوڑے کو لے آئے۔ وہ ایک طویل سفر کر کے وہاں تک پہنچے تھے۔ وہ عورت کچھ مختلف تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ پُروقار اور نہایت عالی مقام تھی۔ اس کے انداز سے شاہانہ پن جھلکتا تھا۔ وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اس کے پاس ایسی دستاویز تھیں کہ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ شاہ کی کزن ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" سائرس نے پوچھا۔

"وہ بہت درماندہ اور شکستہ تھی۔ اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی پھر ایک روز وہ اچانک غائب ہو گئی۔ میرے والد نے دو سراغ رسانوں کی خدمات حاصل کیں کہ اس کا پتا چلایا جائے۔ انہوں نے اس کا پتا لگا لیا اور اس کی حفاظت کے خیال سے اسے پاگل خانے کی ایک کوٹھری میں بند کرا دیا۔ وہ اس سے بہت سے فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال ان سراغ رسانوں نے شہزادی کو ان کے چنگل سے چھڑا لیا۔ میرے والد اسے تہران کے کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا چاہتے تھے کیونکہ ان کے شاہ سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ تاہم حالات ایسے تھے کہ وہ ان باتوں کی تصدیق کرنے کے لیے شاہ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے تھے۔ ایک سچے شاہ پرست ہونے کے ناتے وہ اتنا کر سکتے تھے کہ شہزادی کو بندر عباس تک حفاظت سے پہنچا دیں۔ وہ جب تہران آئے اور انہوں نے شہزادی کو پاگل خانے سے لے کر مضافات تک کا سفر کیا تو راستے میں ان کی کار پر حملہ کیا گیا اور انہیں قتل کر دیا گیا۔ شہزادی اور اس کی دستاویزات کو ان لوگوں نے غائب کر دیا۔" ہلاکت کا واقعہ سنا کر وہ ملول دکھائی دینے لگی۔

سائرس نے اسے دلاسا دینے کے بعد پوچھا۔ "تم جانتی ہو کہ انہیں کن لوگوں نے قتل کیا ہے؟"

"وہ کمیونسٹ پارٹی کے لوگ ہیں۔ پارٹی کو بہ ظاہر تو ہدایتی چلا رہا ہے لیکن درپردہ پارٹی کے کارکن داریوش کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ دو روز پہلے ان کے ایک آدمی نے دستاویزات کو انقلابیوں کے حوالے کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہم نے مداخلت کی اور ان کا ارادہ ناکام بنا دیا۔ وہ آدمی جو شہزادی کے ساتھ پاکستان جا رہا ہے، اس کا نام زریاب ہے۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے یہ ظاہر کیا ہوا ہے کہ وہ میرا بھائی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا خوف ناک اور بے جگر شخص نہیں دیکھا۔"

"میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم اس روز ٹرین میں کیوں موجود تھیں؟" سائرس نے اپنا سوال دہرایا۔

"زریاب جب ریلوے اسٹیشن گیا تو اس نے تمہاری بیوی کو دیکھا جو اسی جیسا بریف کیس لیے ہوئے تھی۔ زریاب یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس بریف کیس کو کون لینے آئے گا مگر تمہاری بیوی نے اس کے بریف کیس پر ہاتھ ڈال دیا اور کہنے لگی کہ یہ اس کا ہے۔ اس بات سے زریاب کو شک ہوا کہ کہیں یہ عورت کسی پارٹی سے تو تعلق نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس نے کہا کہ ہم میں سے کسی ایک کو اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔ میں نے اس کی تجویز پر عمل کیا اور اسی ٹرین میں سوار ہو گئی جو اصفہان جا رہی تھی۔ بہر حال اس کا پیچھا کرنے پر پتا چلا کہ وہ اصفہان میں تم سے ملنے گئی تھی۔ ہم نے اس ہوٹل کا سراغ لگا لیا جہاں تم دونوں ٹھہرے ہوئے تھے پھر جب تم اصفہان سے تہران آنے لگے تو میں تمہارے پیچھے لگ گئی اور میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم سے ٹرین میں ملاقات کی اس طرح سے کہ تمہیں شبہ نہ ہو سکے۔ میں نے تمہارے بارے میں اپنی تحقیقات مکمل کر لی ہیں سائرس، تم درست کہہ رہے ہو۔" اس نے اپنائیت سے کہا۔

☆☆☆

جب یہ ثابت ہو گیا کہ احمد یار پارٹی سے غداری کر رہا ہے تو داریوش کے اشارے پر اسے بھی شہزادی کے برابر والی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ داریوش اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے ہوٹل ماؤنٹین میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت وہ ایک چرمی کرسی پر بیٹھا شیمپین پی رہا تھا۔

جہاں تک سائرس کے مسودات کا تعلق تھا تو وہ غائب ہو چکے تھے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے اس حقیقت سے واقف ہو چکا تھا۔ اسے احمد یار پر شبہ ہوا، مگر اس نے مسودوں کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تھی۔

داریوش کو اس سے بھی دلچسپی نہیں تھی کہ سائرس کے مسودے کون لے گیا۔ اسے ان دستاویزات کے بارے میں سائرس سے گفتگو کرنا تھی، ممکن ہے کہ ان کی گفتگو کامیابی سے ہمکنار ہوتی اور پارٹی کو ایک گراں قدر رقم ہاتھ آجاتی۔

شہزادی کی نصف دستاویزات اب بھی اسی میز پر رکھی تھیں جو کمرے کے دائیں گوشے میں تھی۔ صبح ان دستاویزات کو وہ پرویز اسدی کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔

داریوش نے وہ خالی بریف کیس اٹھا لیا۔ جس میں سائرس کے مسودے رکھے تھے اس نے بریف کیس کھولا اور اس میں دستاویزات رکھ دیں۔ اس نے مڑ کر دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پتا چلا کہ اس وقت دو بجے ہیں۔ اب اسے ایک گھنٹے کے اندر سائرس سے ملاقات کرنا تھی۔

☆☆☆

جب سائرس کی آنکھ کھلی تو اس نے کھڑکی کے قریب ایک ہیولا سا دیکھا۔ وہ ملیحہ تھی جو تاریکی میں کھڑی سگریٹ پی رہی تھی۔

سائرس اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ملیحہ کو بتایا کہ اس کے والد کی گاڑی اس نے ہوٹل ماؤنٹین کے پیچھے ایک گیراج میں دیکھی ہے۔ وہاں احمد یار سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے گرینگو نامی کلب میں اس کے مسودے لانے کا وعدہ کیا ہے۔

"اگر میں اور زریاب تمہارے ساتھ چلیں تو کیا حرج ہے؟"

"میں اس معاملے کو خود ہی حل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ملیحہ فون کی طرف بڑھی اور نمبر ملا کر زریاب سے باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

کلب میں داخل ہونے کے بعد سائرس نے ایک نشست سنبھالی اور کافی کا آرڈر دیا۔

"ہیلو آقائے سائرس!" اچانک ایک آواز آئی۔

سائرس نے سر اٹھا کر دیکھا تو داریوش کو کھڑے پایا۔

"احمد یار کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" اس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اپنی جیکٹ کی زپ کھینچ کر اسے سامنے سے کھول لیا۔ "میں اس وقت مسلح نہیں ہوں اور یہاں تنہا آیا ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" سائرس نے کہا۔

"میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔" داریوش بولا۔

"تمہارے دماغ میں کیا ہے؟" سائرس نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ایک چھوٹا سا تبادلہ۔ شہزادی کی دستاویزات کے بدلے تمہارے مسودات، بولو کیا کہتے ہو؟"

"وہ دستاویزات میرے پاس نہیں ہیں۔"

"مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔" اس نے اپنی سانپ جیسی گول گول آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی گھنی داڑھی اور مونچھیں خوفناک لگ رہی تھیں۔ "بہرحال تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ وہ دستاویزات کہاں ہیں؟ بس تم مجھے اتنا بتا دو پھر تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور میں تمہارے مسودے واپس کر دوں گا۔" اس نے دروغ گوئی سے کام لیا کیونکہ مسودے تو چوری ہو چکے تھے۔

"یقین کرو مجھے ان دستاویزات کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"شب بخیر، سائرس قدیر۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔" سائرس غرایا اور اس نے اپنا ریوالور جیب سے نکال لیا۔ اس طرح کہ کلب میں بیٹھا ہوا کوئی اور شخص نہ دیکھ سکے۔

"یہ کیا؟" داریوش حیرت سے بولا۔ اس کا تعلق انڈر ورلڈ سے تھا اور تہران کے شوریدہ سر بھی اس کی راہ میں آنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ ایک مصنف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اس جیسے آدمی کو ریوالور دکھانے کی جرأت کیسے کی؟

"میں تم سے اچھی توقعات لے کر آیا تھا، تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟" داریوش نے حیرت سے کہا۔

"اگر میں تمہیں شہزادی کی دستاویزات نہیں دے سکتا تو تم میرے مسودے تو مجھے واپس کر سکتے ہو؟" اس نے ریوالور کا دستہ اس کے گھٹنے پر مارتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔

"تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اس کار میں دو آدمی ہیں، جو یہاں سے ایک بلاک کے فاصلے پر کھڑی ہے۔"

سائرس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی لیکن وہاں کوئی کار دکھائی نہیں دی۔ "میں تمہارے ساتھ اس جگہ تک ٹیکسی میں چلوں گا جہاں تم نے میرے مسودے رکھے ہیں۔ اگر تمہارے آدمیوں نے ہمارا پیچھا کیا تو میں تمہیں ہلاک کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔" وہ بولا۔ سائرس نے کافی کا بل ادا کیا اور اس کے بعد داریوش کو لے کر کلب سے باہر نکل آیا۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی متنفس نہیں تھا اور نہ ہی کوئی گاڑی۔ وہ پیدل ایک طرف بڑھنے لگے۔

جب وہ اس گلی کے اختتام پر پہنچے تو پیچھے سے ایک کار کی تیز روشنی نظر آئی۔ سائرس نے مڑ کر دیکھا، وہ سیاہ رنگ کی مرسیڈیز تھی جو انتہائی تیز رفتاری سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سائرس نے داریوش کو ایک طرف دھکا دیا اور ریوالور نکال کر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور مرسیڈیز کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ انتظار لمحاتی تھا۔ کار جیسے ہی اس کے نزدیک آئی اس نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا، لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ کیونکہ ریوالور کا ٹریگر جام ہو گیا تھا۔ یہ اس شام دوسری بار ہوا تھا۔ اسی کی وجہ سے اس کی جان پر بن گئی تھی۔

کار میں سے کسی نے اس پر فائر کیا، گولی اس کے شانے سے چھوتی ہوئی گزر گئی اور پیچھے ایک دکان کے شوروم سے ٹکرائی تو اس کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا اور لاتعداد کرچیاں فٹ پاتھ پر بکھر گئیں۔ سائرس نے خود کو فٹ پاتھ پر گرا دیا۔ جبکہ داریوش نے کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ وہ چلتی کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

دوسری جانب فٹ پاتھ سے کسی نے اسے آواز دی۔ وہ ملیحہ تھی جو اس وقت فرکوٹ پہنے ہوئے تھی۔ وہ سڑک پار کر کے اس کے نزدیک پہنچا اور اس نے حیرت سے پوچھا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں یہاں..." اس نے سائرس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہنا چاہا تھا کہ نزدیک کھڑی کار کا ونڈ شیلڈ زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا اور فضا میں بہت سی کرچیاں بکھر گئیں۔ سڑک کی طرف سے ایک فائر ہوا تھا۔ سائرس نے ملیحہ کو دھکا دیا اور خود کو بھی فٹ پاتھ پر گرا دیا۔ دو فائر مزید ہوئے اور گولیاں ان کے سروں پر سے گزر گئیں۔ گلی میں وہ سیاہ مرسیڈیز دوبارہ داخل ہو رہی تھی۔ پارٹی کے لوگ خون کی ہولی کھیلنے کے لیے پھر آ گئے تھے۔

سائرس نے ملیحہ کو اشارہ کیا اور خود بھی رینگتا ہوا ایک کار کے پیچھے چلا گیا۔ چار فائر مزید ہوئے لیکن گولیاں کاروں کے ٹائروں پر پڑیں۔ ٹائر پنکچر ہو گئے اور ان سے ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی نکلنے لگی۔ دو فائر اور ہوئے تو اس نے اندازہ لگایا کہ کار کے علاوہ سڑک کی دوسری طرف سے ایک ستون کی آڑ سے بھی فائرنگ ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ محسوس ہوا کہ کوئی پیچھے بھی ہے۔ گویا ان کے بچنے کے امکانات معدوم ہو چکے تھے کیونکہ انہیں تین اطراف سے گھیرا جا چکا تھا۔

چند سیکنڈوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ ایک شخص دکان کی آڑ میں کھڑا تھا۔ وہ اس سے محض پچاس فٹ دور تھا۔ مرسیڈیز بھی زیادہ دور نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوں ہی وہ اپنا کام ختم کر لیں گے مرسیڈیز انہیں لے کر وہاں سے چل دے گی۔ وہ آدمی آڑ سے نکل آیا اور اس نے اپنا ریوالور اس انداز سے اٹھایا جیسے ایک ہی فائر سے اس کا خاتمہ کر ڈالے گا۔ سائرس نے بے بسی محسوس کی۔ وہ فٹ پاتھ پر پڑا تھا اور اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید آنے والا لمحہ موت کا لمحہ تھا۔ اس نے مایوسی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے فائر ہوا، لیکن گولی اسے نہیں لگی۔ اس کے بجائے ایک چیخ سنائی دی اور جس شخص کے ہاتھ میں ریوالور تھا، وہ لہرا کر گرتا دکھائی دیا۔

تقریباً پینتالیس درجے سے ایک فائر اور ہوا۔ اس شخص نے کرب سے چیخ ماری اور فٹ پاتھ پر گر کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ سائرس حیران تھا کہ اس کا ہمدرد کہاں سے پیدا ہو گیا؟ معاملہ الٹا ہوتے اور اپنے ایک ساتھی کو موت سے ہمکنار ہوتے دیکھ کر مرسیڈیز نے یوٹرن کاٹا۔ وہ شخص جو ستون کی آڑ میں کھڑا تھا اس نے دوڑ کر اپنے زخمی ساتھی کو اٹھایا اور مرسیڈیز کی پچھلی نشست تک لے جا کر اسے لٹا دیا پھر وہ خود بھی کار میں بیٹھ گیا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ وہ ان کی صورت دیکھتے رہ

گئے۔

پھر کار سے کسی مردہ شخص کو لڑھکا دیا گیا۔

گلی میں ایک بار پھر موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ سائرس اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے ملیحہ کو اس جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھا جہاں وہ چھپی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک شخص پتھر کی ٹنکی کی آڑ سے نکلا جو فٹ پاتھ پر بنی ہوئی تھی۔

اس شخص کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جسے اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''یہ زریاب ہے۔ فائرنگ کر کے اسی نے تمہیں مرنے سے بچایا ہے۔'' ملیحہ نے اس کا تعارف کرایا۔ ''ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے ورنہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ ہماری کار دو گلی بعد کھڑی ہے۔ تم چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔'' اس نے پیشکش کی۔ سائرس نے وہ پیشکش قبول کر لی۔ وہ تینوں تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چل پڑے۔

وہ اس کی لاش کے پاس پہنچے تو اس کی تصدیق ہو گئی۔ احمد یار کی گردن کٹی ہوئی تھی اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ سائرس نے جھک کر اس کے کوٹ کی تلاشی لی تو اسے اندرونی جیب سے تہران کی اسٹریٹ گائیڈ ملی، سائرس نے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا پھر وہ دوسری گلی میں چلے گئے۔

☆☆☆

وہ آسٹن تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ زریاب نے سنبھال لی۔ سائرس پچھلی نشست پر ملیحہ کے ساتھ بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''احمد یار نے بتایا تھا کہ داریوش کی پرویز اسدی سے ملاقات ہونے والی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی جگہ ہو جہاں ملاقات ہونے والی ہے۔ یہ جگہ میوزیم سے قریب ہے اور یہاں کچے پکے مکانات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اتنی صبح وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔'' سائرس بولا۔ ''ہمیں اس جگہ پہنچ کر ہی ان لوگوں سے نمٹنا ہوگا۔ سردست میں سونا چاہتا ہوں۔ اس وقت تین بجے ہیں اور میں کار کی پچھلی نشست پر نیند لے سکتا ہوں۔ بس ہم پونے چھ بجے یہاں سے چلیں گے۔'' سائرس نے پچھلی نشست پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

جب ملیحہ نے اسے اٹھایا تو چھ بجنے میں بیس منٹ تھے۔ ان ڈھائی گھنٹوں میں اس گلی میں کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ دس منٹ بعد اس جگہ پر پہنچ گئے۔ سائرس نے مصلحتاً کار کو فاصلے پر رکوا لیا تھا۔ وہ کار سے نکل کر اس مقام کی طرف گیا تو اس نے بہارستان چوک میں ایک کار کھڑی دیکھی۔ اس کی باڈی سے ٹیک لگا کر ایک شخص کھڑا تھا، جسے وہ پہلے پرویز اسدی کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ چوک کے قریب دو آدمی اور بھی کھڑے تھے، جو اسے دیکھ کر ایک مسجد کی آڑ میں ہو گئے۔

وہ مڑا اور اس نے کار میں بیٹھ کر ملیحہ اور زریاب کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں بھی وہاں تک جانا چاہیے۔ سائرس نے اس سے اتفاق کیا۔ زریاب آسٹن کو ڈرائیو کرتا ہوا وہاں تک لے گیا مگر وہ چوک سے اتنی دور تھے کہ ان لوگوں کی نگاہ اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

سائرس نے وہاں ایک اور کار کھڑی دیکھی۔ وہ سیاہ مرسیڈیز تھی۔ اس کے اگلے دروازے سے ایک شخص نکا کھڑا تھا جو یقیناً داریوش تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ سائرس نے اندازہ لگایا کہ اس میں شہزادی کی دستاویزات ہوں گی جو وہ پرویز کے حوالے کرنے جا رہا ہے۔ منظرنامہ مکمل تھا اور انہیں اس میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔

''زریاب تم مجھے اپنا ریوالور دے دو۔'' اس نے کہا۔

زریاب نے ریوالور اپنی جیب سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد اسے یہ ہدایت دی کہ وہ آسٹن کو پوری رفتار سے چلا کر ان لوگوں کے قریب پہنچے مگر دائیں جانب کی گلی میں موڑ لے، وہ ہوائی فائرنگ کرے گا لیکن کچھ اس طرح سے کہ ان لوگوں کو پتا نہ چل سکے۔ وہ ایک دوسرے پر شک کرنے لگیں۔

داریوش مرسیڈیز سے نکل کر پرویز کی کار کی طرف بڑھ رہا تھا ادھر سائرس نے ریوالور کی نال کو کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا ہوا تھا۔ جوں ہی کار ان لوگوں کے قریب پہنچ کر دائیں جانب کی گلی میں مڑنے لگی تو سائرس نے درمیانی جگہ پر تین ہوائی فائر کیے۔

پرویز اپنی کار کے پیچھے چلا گیا جبکہ داریوش گھبراہٹ میں گر پڑا اور سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ زریاب کی کار چوک سے آگے نکل گئی اور ایک کچے علاقے میں پہنچ گئی۔ سائرس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ دونوں پارٹیوں نے یہ تاثر لیا تھا کہ ان پر مخالف طرف سے فائرنگ کی جا رہی ہے۔

سائرس نے زریاب کا ریوالور اسے واپس کر دیا اور ملیحہ سے کہا۔ ''میں ان لوگوں کی طرف جا رہا ہوں۔ یہاں سے ایک سڑک سیدھی اس ہوٹل کی طرف جاتی ہے۔'' وہ بولا۔

جب سائرس کار سے اتر گیا تو زریاب نے کار آگے بڑھا دی۔ سائرس وہاں پہنچا تو فائرنگ ہو رہی تھی۔ اسے دو آدمی زمین پر پڑے دکھائی دیے۔ وہ خون میں نہائے ہوئے تھے۔ پرویز کی کار کے قریب بھی ایک شخص اوندھا پڑا تھا۔ کار کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اس کی آڑ لے کر پرویز پر فائرنگ کر رہا تھا۔ داریوش کے قریب ایک بریف کیس پڑا ہوا تھا۔ سائرس نے اسے دور سے پہچان لیا وہ رنگت کی بنا پر کہہ سکتا تھا کہ وہ سوٹ کیس اسی کا ہے۔

داریوش نے بریف کیس اٹھا لیا اور بائیں جانب کی ایک عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایت بھی دے رہا تھا۔ سائرس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کوئی گودام ہے۔ جب داریوش اپنے ایک آدمی کے ساتھ وہاں پہنچا تو اس نے اپنے ریوالور سے اس کا لاک اڑایا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سائرس کے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے عمارت میں چلا گیا۔ عمارت تاریک تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ ہوئی تو داریوش کے ساتھی نے پلٹ کر دیکھا اور سائرس کا ہیولا نظر آتے ہی اس پر فائر کرنے کے لیے ریوالور اٹھایا۔ چند ثانیوں کی بات تھی کہ گولی سائرس کے سینے کے پار ہوتی لیکن پیچھے سے آنے والے پرویز اسدی نے فائر کیا تو گولی اس شخص کی پیشانی پر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ قدموں کی آہٹ تیز ہو گئی اور داریوش وہاں سے بھاگ کر عمارت کے تاریک حصے کی طرف چلا گیا۔ سائرس نے اس کا پیچھا کیا لیکن آگے جانے کے بعد اس کی صورت کہیں دکھائی نہیں دی۔ زینے اوپر تک چلے گئے تھے، وہ ان پر چڑھتا چلا گیا۔ تاریکی میں ایک ٹارچ کی روشنی زینوں پر پڑ رہی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو کچھ نہ ملا۔ ٹارچ کو دو پتھروں کے درمیان دبا دیا گیا تھا۔

اس نے ٹارچ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کسی طرف سے ایک گولی آئی اور اس کے نزدیک دیوار کا پلاستر اکھڑ گیا۔ سائرس نے گھبرا کر ٹارچ ہاتھ سے چھوڑ دی اور وہ لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ براہِ راست نشانے کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ اب روشنی کا زاویہ تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ ایک چھوٹی سی راہداری تھی جس کے اختتام پر داریوش ریوالور تھامے کھڑا تھا۔ ٹارچ کی وجہ سے ہلکی روشنی ہو رہی تھی، اس لیے سائرس نے دیکھ لیا تھا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس نے فوری طور پر خود کو فرش پر گرا دیا۔ فائر ہوا اور گولی اس کے سر پر سے گزر گئی۔ سائرس لڑھکا اور داریوش کی طرف گیا لیکن وہاں پہنچنے پر اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

ایک بند دروازے کے قریب سے گزرنے پر اسے اندر سے کراہ سنائی دی۔ اس نے کندھے کا زور لگا کر اسے کھولا تو تاریکی نے اس کا استقبال کیا۔ وہ فوراً ٹارچ روشن نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک بار پھر کراہ بلند ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ شخص کرب میں مبتلا ہے۔ اس نے ٹارچ جلائی تو اسے ایک آدمی نظر آیا۔ وہ زخمی تھا۔

اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ وہ اپنے پپڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ ''افراسیاب کیا یہ تم ہو؟'' اس نے مرتعش آواز میں پوچھا۔ سائرس خاموش رہا تو اس شخص نے کہا۔ ''تم ڈاکٹر کو لے آئے؟''

''ہاں۔'' سائرس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''داریوش کہاں ملے گا؟''

''وہ چلا گیا... اس عورت کو بھی... اپنے ساتھ لے گیا۔'' اس نے اٹکتے ہوئے بتایا۔ ''وہ اپنے پرائیویٹ... رن وے... پر گیا ہے جو تمہیں معلوم... ہے کہ... تہران کے مضافات جہانِ خانم۔''

''میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔'' سائرس نے اسے تسلی دی۔

اس شخص کا ہاتھ گر گیا اور وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ سائرس نے اس کا کمبل اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ اس عمارت سے باہر آ گیا پھر اسے ہوٹل ماؤنٹین پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ اس کے عقب میں وہ گیراج تھا جہاں کچھ دیر پہلے چھ کاریں کھڑی تھیں۔ اس وقت وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ حد یہ ہے کہ خیام شاپور کی کار بھی غائب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے داریوش اسی کار میں گیا ہے اور یہ تو یقینی ہے کہ اس کے ساتھ شہزادی سمنانی بھی ہے۔

جب وہ گلی سے نکل کر ہوٹل کی طرف جانے لگا تو اسے آسٹن دکھائی دی۔ اس میں ملیحہ اور زریاب تھے۔ ''کیا تم نے اپنے والد کی کار عقبی گیراج سے نکلتے دیکھی ہے؟'' اس نے آسٹن کا دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم یہاں چند منٹ پہلے ہی آئے ہیں، یہاں آنے والی ایک سڑک حادثے کی بنا پر مسدود ہو چکی تھی لہٰذا ہمیں دوسری سڑک سے چکر کاٹ کر آنا پڑا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''داریوش جہان خانم کی طرف گیا ہے۔ اس کے ساتھ شہزادی اور وہ دستاویزات ہیں۔ وہ تمہارے والد کی کار میں گیا ہے۔ جہان خانم میں اس کا ذاتی رن وے ہے۔ یقیناً طیارہ بھی وہیں ہوگا۔'' اس نے اپنی جیب سے تہران کی گائیڈ بک نکال لی۔

زریاب نے آسٹن کو اسٹارٹ کر دیا اور سائرس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تہران کے مضافات میں پہنچ گئے۔

”کیا داریوش کے پاس ذاتی طیارہ بھی ہے؟“ سائرس نے ملیحہ سے پوچھا۔

”اس کا امکان ہے، کیونکہ وہ اسمگلر بھی ہے اور بندر عباس بھی جایا کرتا ہے۔“

ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں ایک میدان میں ہینگر بنے دکھائی دیے۔ جب وہ آخری ہینگر تک پہنچے تو انہیں مطلوبہ کار نظر آگئی۔ اس کے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے اور وہ خالی تھی۔

رن وے کے آخر میں ایک چھوٹا سا سرخ و سفید طیارہ کھڑا تھا جس کے پنکھے گھوم رہے تھے۔ ”وہ رہا۔“ ملیحہ ہاتھ اٹھا کر چیخی۔ ”داریوش اس کے ذریعے فرار ہو رہا ہے۔“

وہ دونوں ابھی طیارے میں بیٹھے نہیں تھے، گراؤنڈ پر ہی تھے۔ داریوش شہزادی کا ہاتھ تھامے اسے طیارے کی طرف کھینچ رہا تھا، وہ مزاحمت کر رہی تھی۔

زریاب نے آسٹن کو رن وے پر ڈال دیا اور طیارے تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچ گئے تو سائرس نے زریاب کا ریوالور نکال لیا اور دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گیا۔ داریوش اس وقت تک طیارے میں بیٹھ چکا تھا اور طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ سائرس نے ریوالور اس کی طرف اٹھا کر چھ فائر کیے۔ طیارے نے یکبارگی رن وے چھوڑ دیا اور فضا میں بلند ہو گیا۔

رن وے پر کوئی اوندھا پڑا تھا۔ غالباً وہ شہزادی تھی جس نے آخری لمحوں میں طیارے سے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ گٹھڑی کی صورت میں وہاں اوندھی پڑی تھی۔ سائرس اس کے نزدیک چلا گیا۔ اس نے ملائمت سے کہا۔ ”میں تمہارا دوست ہوں اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے اپنا سر اٹھا کر سائرس کی طرف دیکھا اور یوں پلکیں جھپکانے لگی جیسے اس کی بات نہ سمجھ پائی ہو۔ اس کا چہرہ دیکھ کر سائرس کو مایوسی ہوئی، اس لیے کہ وہ کسی طور بھی شہزادی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

سائرس نے اس کے نزدیک جا کر اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ وہ اس کے سہارے سے اٹھ جائے لیکن ٹھیک اسی وقت پیچھے سے آواز آئی۔ ”اس سے دور ہٹ جاؤ، سائرس!“ سائرس نے چونک کر اس طرف دیکھا، ملیحہ رن وے کے درمیان کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔ ”میں کہتی ہوں کہ دور ہٹ جاؤ۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”اس کے پاس سے ہٹ جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب میں اسے ہلاک کروں تو تم بھی اس کی زد میں آجاؤ۔“

”تم اسے ہلاک کرنے جا رہی ہو؟“ سائرس کی حیرت ختم نہ ہوئی۔ ”مگر کیوں؟ یہ تو وہی شہزادی سمنانی ہے جسے تم تلاش کر رہی تھیں؟“

”شہزادی سمنانی یہ نہیں، میں ہوں۔“ اس نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اگر تم شہزادی ہو تو پھر یہ کون ہے؟“

”یہ اروناہے۔ ایک دیہاتی عورت جو خیام شاپور کی زمینوں پر کام کرتی تھی، ذہنی طور پر معذور تھی۔ اس نے میری دستاویزات چوری کر لیں اور تہران آگئی۔“

سائرس کو یقین کرنا پڑا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے۔ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ احمق وہ خود تھا۔ ”اس سے پہلے تم نقلی زندگی بسر کرتی رہیں۔ جھوٹ بول کر دوسروں کو غلط راستے پر ڈالتی رہیں۔ تم اسے کیوں ہلاک کرنا چاہتی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

اس اثنا میں ارونا کھڑی ہو گئی اور سائرس کے پیچھے چلی گئی، یوں وہ آڑ میں ہو گئی۔ اب ملیحہ اس کا نشانہ نہیں لے سکتی تھی۔

”میں وقت چاہتی ہوں۔ انقلابی مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں جبکہ شاہ کا ایک گروپ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی رہنمائی کروں۔ جب انہیں شاہ کے قریب ہونے کا موقع مل جائے گا اور یہ پرانے لوگوں کو ہٹا دیں گے تب مجھے قتل کر دیں گے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کرنے کے بعد شاہ کو بھی راستے سے ہٹا دیں۔ مجھے ایسے لوگوں سے بھی بچنا ہے۔ شاہ کے لیے یہ لوگ انقلابیوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”اس لیے تم ارونا کو قتل کرنا چاہتی ہو؟“

”تہران اور اس کے گرد و نواح میں کوئی اس حقیقت سے واقف نہیں ہے کہ ارونا اصل شہزادی نہیں ہے۔ میں اسے یوں قتل کرنا چاہتی ہوں کہ انقلابی اور شاہ پرست دونوں کو یہ مغالطہ ہو جائے کہ شہزادی سمنانی ماری جا چکی ہے۔ دونوں مایوس ہو جائیں گے اور میری تلاش بند کر دیں گے۔ اس طرح سے میں آزادی سے اپنا کام کر سکوں گی۔“ اس نے کہا۔

آسمان پر گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو سرخ و سفید طیارہ رن وے پر اتر رہا تھا۔ اس کی نوک ان کی سیدھ میں تھی۔ شہزادی سمنانی ان کی طرف کچھ اور بڑھ

آئی۔

وہ طیارہ گڑگڑاتا ہوا رن وے پر اترا تو شہزادی نے مڑ کر دیکھا۔ سائرس کے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ اس نے اپنے جسم کو تولتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔ شہزادی نے فائر کیا اور اس کی نال نے گولی اگل دی، جو سائرس کے دائیں کان کی لو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ سائرس کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر اور دوسرا ریوالور پر پڑا۔ اس نے شہزادی سے ریوالور چھین لیا۔

وہ طیارہ رن وے پر اترا نہیں تھا بلکہ نیچی پرواز کرتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سائرس نے اسے پہچان لیا کہ وہ داریوش کا طیارہ ہے۔ اس طیارے سے کوئی مہلک اور آتش گیر بم گرایا گیا۔ دھماکا ہوا اور رن وے پر آگ لگ گئی۔ طیارہ پرواز کرتا ہوا ان کے قریب سے گزرا اور دور چلا گیا۔

شہزادی اس کی گرفت سے چھٹکارا پانے کے لیے زور آزمائی کر رہی تھی۔ سائرس کھڑا ہو گیا اور اسے شعلوں کی طرف دھکیلنے لگا۔ شعلوں سے برانڈی کی بو آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ داریوش نے طیارے سے بم نہیں بلکہ برانڈی کی بوتل میں آگ لگا کر اسے گرایا تھا۔ وہ دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے شعلوں کے قریب چلے گئے۔ اس نے دیکھا کہ بریف کیس میں آگ لگی ہوئی ہے اور اسے شعلے چاٹ رہے ہیں۔ یقیناً وہ دستاویزات جل رہی تھیں اور ان کے ساتھ اس کے مسودات بھی کیونکہ اس میں یہی دونوں چیزیں تو تھیں۔

سائرس نے محسوس کیا کہ اس کا دل پھٹا جا رہا ہے۔ وہ منظر اس کی برداشت سے سوا تھا۔

جب داریوش نے یہ دیکھ لیا کہ اس کا مشن ناکام ہو گیا ہے تو اس نے دستاویزات میں آگ لگا کر بریف کیس کو رن وے پر پھینک دیا تھا۔ سائرس نے ان دستاویزات کو بچانے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ خیر و شر اس کی اس جنگ میں کون جیتا اور کون ہارا؟ اس کا فیصلہ کرنا دشوار تھا۔

شہزادی نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تباہی و بربادی کے اس منظر کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شعلے تھوڑی دیر بعد ماند پڑ گئے تو اس نے راکھ کو کریدنا شروع کر دیا مگر اب ان میں کچھ نہیں بچا تھا۔ ”سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب اسے کریدنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ سائرس نے تاسف سے کہا۔

”میرے پاس اس کی نصف دستاویزات ہیں۔“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”مگر وہ تمہارے کام نہیں آسکتیں۔ ان ادھوری دستاویزات کے ساتھ تم پڑوسی ملک کی طرف جا کر کیا کرو گی؟ بہتر ہے کہ شاہ کے پاس واپس جاؤ اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔ اسے یہ بھی بتا دو کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ انقلاب اس کے محل کے در و دیوار پر دستک دے رہا ہے۔ اپنا تخت و تاج چھوڑ کر وہ ایک طرف ہو جائے اور عوام کو حکومت کرنے دے۔ اس لیے کہ دنیا میں شخصی حکومت کو کوئی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

اس نے جھک کر ارونا کا ہاتھ تھاما اور وہاں سے چل پڑا۔ شہزادی نے اسے کئی بار آوازیں دیں لیکن وہ وہاں نہیں رکا۔

☆☆☆

افراہیم اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھا ہوا سائرس قدیر کی کہانیاں پڑھ رہا تھا جو ایرج نے اس کے ہاتھوں فروخت کی تھیں۔ افراہیم ایک ناکام مصنف تھا چنانچہ نوآموز مصنفوں کی کہانیاں خرید کر اپنے نام سے شائع کراتا تھا۔ اسے شہرت حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور وہ اس کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار رہتا تھا۔

عزت، شہرت اور ناموری میں وہ سائرس سے پیچھے تھا، مگر اب پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مسودے اور ان کی کاربن کاپیاں اس کی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ان کا کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنی میز کی نچلی دراز سے ایک قینچی نکالی اور پہلا مسودہ اٹھا کر ایک صفحہ پھاڑا اور قینچی سے اس کے آٹھ ٹکڑے کر ڈالے۔

دو گھنٹے کے بعد وہ سارے مسودوں کے پرزے کر چکا تھا۔ اس کی میز ان پرزوں سے بھر گئی تو اس نے ایک بڑا سا تھیلا اٹھایا اور ان سارے ٹکڑوں کو بھر لیا۔ اس کے بعد وہ اپنے فلیٹ کی عقبی بالکونی میں چلا گیا۔ جس عمارت میں اس کا فلیٹ تھا وہ نالے سے جڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے تھیلے کو الٹا تو کاغذ کے وہ پرزے یکبارگی اڑے اور پھر نالے میں جا کر گرنے لگے۔ نالے کا وہ حصہ ان پرزوں سے بھر گیا۔ چونکہ اس کا پانی رواں تھا، چنانچہ وہ ٹکڑے بہتے ہوئے آگے چلے گئے۔

☆☆☆

صبح دس بجے کی ٹرین سے وہ اصفہان جانا چاہتا تھا تاکہ اپنی بیوی افروز کو واپس لے آئے۔ وہ خود تنہا آسکتی تھی لیکن اس نے فون پر کہا تھا کہ اس بار وہ اصفہان کو اچھی طرح سے دیکھیں گے۔ ساتھ گھومیں گے۔ پہاڑوں کی سیر کریں گے۔ اس نے فرمائش کی تھی کہ سائرس جب بھی آئے تو اپنے ساتھ ایک دوربین ضرور لائے۔ اس وقت ایک دوربین اس کی گردن سے لٹک رہی تھی۔ اس نے اسٹیشن جا کر ٹکٹ خریدا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر ایک نزدیکی ریستوران میں جا کر بیٹھ گیا جو بڑے نالے کے قریب تھا۔

جب ویٹر آیا تو سائرس نے اپنے لیے ایک سینڈوچ اور کافی کا آرڈر دیا۔ اروناکو اس نے اس کے ایک بھائی عیسیٰ کے گھر پر پہنچا دیا تھا جو تہران ہی میں رہتا تھا۔ سائرس نے گاڑی کی چابی خیام کے بھائی عیسیٰ کے سپرد کر دی تھی۔

جب ویٹر نے اس کے سامنے سینڈوچ اور کافی لا کر رکھ دی تو اس نے سینڈوچ اٹھا کر اس کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے آہستہ آہستہ چبانے لگا۔ وہ شہزادی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اب شہزادی کی صورت کبھی نہیں دیکھ سکے گا، اس سے کبھی نہیں مل سکے گا۔ وہ تو آوارہ بادلوں کی طرح ملے تھے اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ زندگی میں ایسے لمحات کم ہی آتے ہیں، لیکن جب آتے ہیں تو امر ہو جاتے ہیں۔

جب اس نے سینڈوچ اور کافی حلق سے اتار لی تو بل ادا کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ اصفہان جانے والی ٹرین کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ نالے کو عبور کرنے کے لیے جگہ جگہ پل بنا دیے گئے تھے۔ جوں ہی اس نے پل پر قدم رکھا تو اس کی نگاہ پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں پر پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ایسے ہی کاغذ استعمال کرتا تھا مگر وہ نالے میں کہاں سے آ گئے؟

اس نے اپنی دوربین آنکھوں سے لگا لی اور ان بہتے ہوئے کاغذ کے پرزوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اسی کی تحریر تھی۔ اس کا زیرِ تکمیل ناول نہ معلوم کس ظالم نے اس کے سیکڑوں ٹکڑے کر کے نالے میں بہا دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ایرج ان مسودوں کو لینے داریوش کے کمرے میں گیا تھا۔ کیا مسودے اس کے ہاتھ لگ گئے تھے اور اس نے ان کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیا ہے؟ مگر کیوں؟

اچانک گڑگڑاہٹ ہونے لگی اور اصفہان جانے والی ٹرین اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ سائرس نے اپنی دوربین گردن سے لٹکا لی اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ٹکٹ وہ پہلے ہی لے چکا تھا، اس لیے اپنے کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی، وہ انتہائی دل گرفتہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں زندہ ہے؟ گزرنے والا ہر لمحہ عذاب تھا۔ اس نے سیٹ پر گر کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ٹرین چلنے میں کچھ دیر تھی۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کہ اس کے کمپارٹمنٹ میں کوئی داخل نہ ہو۔ اس کی دعا مستجاب نہیں ہوئی اور پانچ منٹ بعد کسی نے اپنا سامان لا کر اندر رکھا اور چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ارے! تم سے یہاں بھی ملاقات ہو گئی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم دوسری دنیا میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے۔“

سائرس نے چونک کر اپنی آنکھیں کھول دیں، اس لیے کہ اس نے رخسانہ کی آواز شناخت کر لی تھی۔ ”شیطان کی خالہ تم یہاں کہاں؟“

”میرے اخبار کے ایڈیٹر نے ہدایت دی تھی کہ میں تہران جا کر شہزادی پر ایک فیچر تیار کروں۔ میں فیچر کیا خاک تیار کرتی؟ تہران آئی اور ہر ایک سے پوچھتی رہی کہ اگر اسے شہزادی کا پتا معلوم ہو تو مجھے بتا دے، لیکن شہزادی کا کوئی سراغ نہ لگ سکا۔ مجھے تو یہ سب عمدہ قسم کی گپ معلوم ہوتی ہے۔ ہونہہ! شہزادی، شاہ کا کوئی راز پڑوسی ملک لے جا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ گپ نہیں، حقیقت ہے۔“ سائرس نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن تم وعدہ کرو کہ میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گا وہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گی؟“

”معلوم نہیں تم کس راز سے پردہ اٹھانے والے ہو، بہر حال میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے خود تک محدود رکھوں گی۔“

تب سائرس نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ رخسانہ کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کافی دیر تک اس کی زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں ہو سکا۔ ”اگر یہ سچ ہے تو... تو...“

”ہاں، یہ سچ ہے۔ میری داستان کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔“

”سائرس میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آ رہا ہے۔“ وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ ”تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے، تم اس پر ایک ناول لکھ ڈالو۔ جس کے حالات اور واقعات بالکل صحیح ہوں، کردار حقیقی۔“

”یعنی... یعنی... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”میں بالکل درست کہہ رہی ہوں۔ تم کوشش تو کرو۔“

☆☆☆

سائرس آج کل اپنا نیا ناول لکھ رہا ہے۔ اس کا، اور اس کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ وہ پہلے ناول کی طرح بیسٹ سیلرز ثابت ہوگا، کیونکہ یہ سب کچھ وہ ہے جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے، جو اس پر بیت چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ناول کا وہ خود بھی ایک کردار ہے۔ جیتا جاگتا حقیقی کردار...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk